سسپنس
ڈائجسٹ
ماہنامہ
نومبر
بانی
معراج رسول
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN

جلد44 • شمارہ 11 نومبر 2014 • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313(021) فیکس: 35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

جون ایلیا

راہ گیر

میں گلیوں سے گزر رہا ہوں، بازاروں میں چلتا چلا جا رہا ہوں، چوراہوں پر بٹ رہا ہوں۔ میرا ذہن اور میرا ارادہ نہیں چل رہا۔ بس میرے پیر چل رہے ہیں۔ یعنی میرے پنجے چل رہے ہیں، میری ایڑیاں چل رہی ہیں۔ میں لاہور، کراچی، پشاور اور پشین کا کوئی بھی ایک آدمی ہوں۔ کوئی بھی آدمی، جس کا کوئی نام نہیں ہے، جس کا کوئی پتا نہیں ہے۔ مجھے کسی بھی نام سے پکارا جا سکتا ہے۔ میں رات گئے کسی بھی فٹ پاتھ کے کنارے پڑا ہوا مل سکتا ہوں۔

جس طرح میں نے اپنے آخری جوتوں کو ان کے تلے گھسنے اور تسموں کے ٹوٹنے کے بعد اپنے پیروں سے اتار پھینکا ہے اور اب میرے تلووں کے نیچے کوئی چمڑا نہیں ہے، اسی طرح میرے پیروں کے نیچے کوئی ایسی زمین بھی نہیں ہے جس سے میرے پنجوں، میرے تلووں اور میری ایڑیوں کا کوئی موروثی رشتہ ہو۔ میں نے اپنی زمین اپنے تلووں کے نیچے سے نکال باہر کی ہے۔ اب میں اپنی زمین پر نہیں، روئے زمین پر چلتا ہوں۔

یہ محنت اور مشقت کے شہر کی ایک صبح ہے، ایک دوپہر ہے، ایک شام ہے۔ دھات کے بدن اور گوشت پوست اور ہڈیوں کے قامت دوڑ رہے ہیں۔ چاہے ان میں سے کچھ دوڑتے دکھائی نہ دیتے ہوں۔ پر وہ سب دوڑ ہی تو رہے ہیں، چاہے اپنے باہر دوڑ رہے ہوں یا اپنے اندر۔

مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ بلکہ مجھے تو ان راہ گیروں پر رشک آتا ہے جنہیں کہیں پہنچنے اور کہیں سے واپس آنے کی جلدی ہوتی ہے۔ میں کوئی ایسا شہری نہیں ہوں جس کا ایک ایک لمحہ بہت قیمتی ہوتا ہے۔ مجھے کوئی بھی ضروری کام نہیں ہے اور اگر سچ پوچھتے ہو تو مجھے کوئی کام ہی نہیں ہے۔ پیر چلنے کے لیے ہیں اس لیے میں اپنے پیروں پر چل رہا ہوں۔ اگر پیر سر کھجانے کے لیے ہوتے تو میں ان سے اپنا سر کھجا رہا ہوتا۔ میں تو بس یونہی چلتا چلا جا رہا ہوں۔

یہاں مجھے اپنی زبان کے ایک بہت بڑے شاعر کا ایک شعر یاد آتا ہے۔ یہ شعر مزاح اور ظرافت کی شاعری کا ایک بہت اچھا نمونہ ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ شاعر نے یہ شعر اپنے دل کی بہت سنگین حالت میں کہا تھا یعنی کہا ہوگا مگر شاعر کیا اور اس کے دل کی سنگین حالت کیا۔ بس چپ رہو، کچھ کہو مت۔ وہ شعر یہ ہے

بیٹھا جو پڑا ہے سایۂ دیوار یار میں
فرماں روائے کشور ہندوستان ہے

جان لیا جائے کہ میں بھی فرماں روائے کشور ہندوستان ہوں۔ تم کہو گے کہ اے شخص، تو بھنگ پی گیا ہے۔ میں اس کا یہ جواب دوں گا کہ تم بھنگ پی گئے ہو۔ تم...... ہاں تم جو یہ کہہ رہے ہو کہ میں بھنگ پی گیا ہوں۔ سنو! میں تو اس دن سے بھنگ پیے ہوئے ہوں جس دن ہمارا آدمی، ہمارا شاعر، ہمارا شاہ، ہمارا پیر و مرشد اور ہمارا درویش اپنے ویران تکیے، لال قلعے کو چھوڑ کر اپنے دادا کے مقبرے میں جا بیٹھا تھا۔

میں نے پہلی بار اسی دن بھنگ پی تھی اور اسی رات تراہا بیرم خان پر لڑکھڑایا تھا۔ میں نے پہلی بار ایک جوہڑ کو جمنا سمجھا تھا۔ میں نے اپنے جوتے پیروں سے اتار پھینکے تھے اور میں نے زمین کو اپنے تلووں کے نیچے سکیڑ لیا تھا اور بس یونہی چل پڑا تھا اور رات کے دوسرے پہر پنجہ شریف کے دروازے کے سامنے، جا سلام کیا تھا...... عشق اللہ...... مگر جواب میں "مدد اللہ" نہیں سنا تھا۔

بھول جاؤ، سب کچھ بھول جاؤ اور دور کی بات کی طرح اپنے دھیان میں بھی نہ لاؤ کہ تم پہلی بار کب لڑکھڑائے تھے اور کب راہ سے بے راہ ہوئے تھے اور دہائیوں کہ زمانے کے راستوں میں لڑکھڑانا ہی تمہارا نصیب ہے اور جب بھی گھر سے باہر نکلا کرو تو اپنے دائیں اور بائیں کی طرف کی دیواروں کو دھیان سے پڑھتے ہوئے چلا کرو کہ یہ دیواریں ہی تمہارا نصاب ہیں۔ ان دیواروں پر حکمتیں، بصیرتیں اور ہدایتیں رقم کی گئی ہیں اور رقم کی جاتی رہتی ہیں۔

چشم بددور کہ تمہارا یہ نصاب تمہارے نوجوانوں نے تجویز کیا ہے۔ چشم بددور کہ تمہارے نوجوان جامہ زیب ہی نہیں، اپنے وقت کے جاماسپ بھی ہیں۔ اسی نصاب میں جو سب سے قیمتی نکتہ تعلیم کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ جہاں بھی رہو، وہاں نہ رہو۔

میں گلیوں اور بازاروں میں چلتا چلا جا رہا ہوں۔ میں کہیں سے بھی دیر کر کے نہیں چلا ہوں اور نہ مجھے کہیں پہنچنے کی جلدی ہے۔ میں تو بس چل رہا ہوں، چلتا چلا جا رہا ہوں...... چلتا چلا جا رہا ہوں اس لیے کہ پیر چلنے کے لیے ہیں۔

☆☆☆

آپ کا خط

محترم قارئین

السلام علیکم!

نومبر 2014ء کا دلکش شمارہ جاتے سال کا احساس دلا رہا ہے۔ گزشتہ دنوں مسلمانانِ عالم نے حج کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ عید قرباں کی خوشیاں بھی منائیں، امید ہے کہ سب نے اپنے اردگرد ضرورت مندوں کا خاص خیال رکھا ہوگا بلکہ رشتے داروں کا بھی حقِ اپنائیت ادا کرتے ہوئے روٹھے ہوؤں کو منایا بھی ہوگا...... کیونکہ حج بیت اللہ سے یکجہتی اور عید قرباں سے نفس کشی کا جو درس ہمیں ملتا ہے وہی انسانیت کی معراج ہے۔ عہدِ حاضر میں تصنع اور بناوٹ جس شدت سے ہماری زندگی میں شامل ہوگئی ہے، اس نے دنیا کے سمٹ جانے کے باوجود لوگوں کو ایک دوسرے سے بہت دور کر دیا ہے لیکن عید کا دن دلوں سے کدورتیں دھونے اور پاس آنے کا بہترین موقع فراہم کرتا ہے۔ جس طرح سیلابی ریلے کھڑی فصلیں، قیمتی ساز و سامان اور جانیں اپنے ساتھ بہالے جاتے ہیں اسی طرح آپس کے تعلقات میں بداعتمادی، جذبات میں کھوٹ اور عین دین میں فریب کے سیلاب ہر رشتے کی بنیاد ہلا دیتے ہیں۔ اگرچہ ان باتوں کا تعلق نہ تو سیاست سے ہے اور نہ ہی حکومت کے فرائض میں رویوں کی اصلاح شامل ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو ایسے مثبت ماحول کی تخلیق جو فردِ واحد کے انفرادی رویے سے ہوتی ہے، وہ جس طرح پورے معاشرے پر اثرانداز ہوسکتی ہے اس سے بہترین شہری، کاروباری معاملات میں درستی، معاشی ترقی اور دوستانہ محفلوں میں مثبت رجحانات پرورش پاسکتے ہیں۔ بے شک بات تو بہت معمولی ہے مگر اس کے نتائج غیر معمولی نکل سکتے ہیں بشرطیکہ اس پر سنجیدگی سے عمل کرلیا جائے...... حالیہ دنوں میں انہی مثبت باتوں سے دوری کی بنا پر کراچی کے کچھ علاقوں میں ماحول کی ابتری نے جو تباہی پھیلائی ہے، اس سے کتنے ہی گھر اجڑ گئے۔ شہر میں کھلے عام فروخت ہونے والی کچی شراب سے کتنے گھروں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ کئی گھرانوں کے واحد کفیل بھی مرنے والوں میں شامل تھے۔ پاکستان ایک اسلامی ملک ہے لیکن دہشت گردی، مہنگائی اور بدعنوانی تو جیسے وتیرہ بن گئی ہے۔ کس طرح شراب عوام کو بہ آسانی دستیاب ہے...... لاقانونیت کی یہ بڑی بڑی مثالیں حساس دلوں کو مستقبل کے اندیشوں میں مبتلا کیے ہوئے ہیں۔ معصوم جانوں سے کھیلنے کا یہ سلسلہ آخر کب تک جاری رہے گا...... حادثات رونما ہونے سے پہلے آنکھوں کا بند کرلینا' حادثات رونما ہونے کے بعد نوٹس لیے جانے کے بیانات کا دھوم دھڑکا اور پھر فائل بند...... قصہ ختم...... یہ زہریلا رویہ جانے کتنی نسلوں کی تباہی کا سبب بنتا رہے گا۔ اے رب العزت ہماری سرزمین کو اپنے حفظ و امان میں رکھ...... اس پر بسنے والوں کو نیک ہدایت دے اور آفات سے بچائے رکھ (الٰہی آمین)...... انہی دعاؤں کے سائے سائے ہم چلتے ہیں اپنی خوبصورت محفل کی جانب جہاں کرنی ہے پیارے پیارے دوستوں سے ملاقات۔

✠ **محمد خواجہ،** کورنگی، کراچی سے تشریف لائے ہیں "سرورق پر دیہات کا پس منظر، درخت اور اس سے سہارا لیے حسینہ سوچ میں غرق انتظار رہا۔ انشائیہ میں جون ایلیا جو بھی لکھتے ہیں دل کو لگتا ہے۔ کیا اس ملک کو کبھی سکون اور ترقی ملے گی۔ ایک بے سکونی ہے جو ختم ہونے میں نہیں آرہی ہے۔ بچپن سے بڑھاپا آگیا ابھی سنتا ملک نازک حالات سے گزر رہا ہے۔ میرا خیال ہے اس سے بدترین نازک حالات کبھی نہ ہوئے۔ دولت مند اور مراعات یافتہ طبقہ عیش کررہا ہے۔ نوجوان نسل تعلیم سے بے بہرہ۔ معیارِ تعلیم دو طرح کا، امراء کے لیے الگ غرباء کے لیے الگ۔ موٹر سائیکل، موبائل اور کھیلوں کے شیدائی بچے کیا ملک کے مستقبل کے معمار بن سکتے ہیں۔ قدرتی آفات، سیلاب انڈیا اپنا فالتو پانی سیلاب کی شکل میں چھوڑ دیتا ہے۔ ہم ڈیم بنانے پر تیار نہیں۔ ایک چھپی جنگ ہے۔ خدا اس مملکتِ خداداد پر خاص رحم فرمائے۔ آمین۔ مسافر دیوانہ کو کرسیِ صدارت بہت مبارک ہو۔ آپ کا تبصرہ مدلل اور عمدہ رہا لیکن نام کو صحیح لکھ دیں۔ اعجاز احمد راحیل کے تبصرے مختصر مگر جامع ہیں۔ جنید احمد کورنگی والے بھی اچھے انداز میں تبصرہ کرتے ہیں۔ محمد قدرت اللہ نیازی، احمد خان توحیدی کے تبصرے قابلِ تعریف ہیں۔ تصویرِ زوال، بڑی عمدہ تاریخی کہانی تحریر کی ہے۔ سلطنتِ عثمانیہ کا دور کوئی معمولی نہ تھا۔ سلطان سلیمان نے ترک افواج سے یورپ کو روند ڈالا۔ لیکن سلطانوں کی عیاشیاں، کثرت سے عورتیں اور کنیزیں، ان سے اولادیں محلاتی سازشوں کا گڑھ بن کر سلطنت کی تباہی کا باعث بنتی ہے۔ قید خانہ، سیارہ ایک عجیب سیارہ اور عجیب و غریب دنیا کی کہانی ہے۔ ایک واحد زندہ شہر۔ ایک جیل خانہ لیکن انسانی جبلت میں آزادی اور پُرسکون زندگی کا حصول۔ کتنی شدید مشقت اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک نئی دنیا آباد کرلی۔ ستاروں پر کمند، یہ رسالے کی شاہکار داستان ہے۔ ایک حوصلہ مند اور پرجوش انسان کو ایک تجربہ کار مل گیا۔ ایسا استاد جو فولادی اعصاب اور وجود رکھتا ہے۔ کہانی میں ایسی دلچسپی اور ربط و ضبط کہ کہانی کی قسط ختم ہوجاتی ہے اور وقت تھم جاتا ہے۔ نیکی آباد، ملک صفدر حیات کے کارنامے لاجواب۔ لیکن اس کہانی میں وہ سنسنی اور دوڑ دھوپ نہ تھی۔ ایسا لگا کہ کوئی اجنبی طاقت سب کچھ حل کرتی گئی۔ تحفہ ایک بہت مختصر اور بے رنگ کہانی۔ ایک لڑکی لڑکے کو عجیب طرح بے وقوف بنا کر نکل گئی۔ اس نے غریبی کا ڈراما رچایا اور جاتے ہوئے چہرے پر سجانے کے لیے ہنستا ہوا اور منہ بسورتا فیس ماسک۔ محفلِ شعر و سخن، سب سے پیارا شعر فہیم شناس صدیقی کا۔ پھر حاجی زاہد اقبال تمام اشعار اپنی جگہ بہت پیارے، ایک عجیب لطیف سا احساس جاگ اٹھتا ہے۔ وعدہ تو کیا ہوتا، ڈاکٹر صاحب نے بڑی دلگیر کہانی لکھی۔ ایک شخص اتنی اچھی پیاری لڑکی کو صرف اس لیے چھوڑ دیتا ہے کہ وہ ایک خراب عادت شراب پینا نہیں چھوڑے گا۔ یہاں انا کا مسئلہ نہیں تھا۔ وہ شخص پاگل تھا۔ ایک جھوٹا یا جھوٹا ہی وعدہ کرتا۔ تقدیر، ارنسٹ عزت دار، محنتی دیانت دار بھی تھا اور قدرت اس سے یہ چاہتی تھی لیکن اس نے تقدیر سے نہیں قدرت سے ٹکر لی۔ انجام، نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم۔ دیدۂ تر، امجد رئیس صاحب

نے جنگ کی ہولناکی پر کہانی تحریر کی۔ جنگ کے اختتام پر بڑی اندوہناک کیفیت، دو دوستوں اور دو بھائیوں کی کہانی۔ دوست نے اپنے دوست کی تکلیف اور زخموں کا حال دیکھتے ہوئے اسے زندگی سے نجات دے دی۔ شرمات، ایک پیار بھرے دل رکھنے والے بوڑھے شخص کی داستانِ حیات۔ اپنی بیٹی پر سب کچھ نچھاور کرنے والا شخص اپنی ہی اولاد کے ہاتھوں مجروح ہوگیا۔ حضرت ابراہیم، رضوانہ ساجد نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بہت اچھی تحریر لکھی ہے۔ یہ اس کا دوسرا حصہ، یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں حضرت ابراہیم کی پوری سوانح حیات شاید ہی کسی مسلمان کو ازبر یاد ہو۔ احتساب، منیر ادیب صاحب نے پُرتاثیر کہانی تحریر فرمائی۔ یہ شمارہ کی آخری کہانی تھی۔ اس کو پڑھنے کے بعد میں یقین سے لکھ رہا ہوں کہ شمارہ مکمل ہوا۔ ایک انسان جو اس قدر ستم ظریفی حالات کا مارا ہو جسے قدرت نے امتیاز اور عظمت والا انسان بنایا۔ چاہتا تو پوری طرح انتقام لیتا اور اپنی عظمت میں بے تحاشا اضافہ کرتا۔ لیکن وہ 24 سال اپنے ماضی میں گم رہا۔ اس عظیم انسان نے سب کچھ کھو کر بھی اپنے ضمیر کو زندہ رکھا۔ کترنیں، ہمیشہ کی طرح لاجواب، مزاح بھی ہے۔ نصیحت آمیز حکایتیں اور خوبصورت باتیں۔ واقعی ان سب کو چننا اور ترتیب دینا بھی ایک انتہائی کمال ہے۔"

✠ **محمد قاسم رحمان،** ہری پور سے چھپے آرہے ہیں "سسپنس سے رشتہ زیادہ پرانا نہیں ہے۔ اصل میں، میں جب بھی کسی بک اسٹال پر جاتا تو جاسوسی اور سسپنس کو سب سے نمایاں دیکھتا۔ ایک مرتبہ میں نے سیلزمین سے ان کو نمایاں رکھنے کی وجہ پوچھی تو جواب ملا کہ یہ بہت معیاری رسالے ہیں اس لیے لوگ انہیں خریدنے کے لیے بے چین ہوتے ہیں۔ میں نے بھی دونوں رسالے خرید لیے تب سے مسلسل پڑھ رہا ہوں۔ اکتوبر کا سسپنس کل ہی ملا میرے پسندیدہ تبصرہ نگاروں میں طاہر ہنگورار، سید اکبر شاہ، ادریس احمد خان، قدرت اللہ نیازی، الیلیٰ اور تصور الحسن شامل ہیں۔ سید اکبر شاہ آپ میرے کلاس فیلو ہیں۔ یعنی میں بھی 10th کلاس کا اسٹوڈنٹ ہوں۔ خط لکھنے کی جلدی کی وجہ سے اب تک ماروی، ستاروں پر کمند اور کچھ اشعار ہی پڑھ سکا ہوں۔ مغل انکل کی یہ داستان بھی حسبِ معمول زبردست ہے۔ میرا ایک دوست اسامہ ملک جو جاسوسی اور سسپنس کا رسیا ہے، اس کی طرف سے سلام قبول کریں۔"

✠ **متین سلطان،** کراچی سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں "سسپنس سے وابستگی کو ایک طویل وقت بیت گیا۔ شمارہ بروقت ملنے کے باوجود زندگی کی مصروفیات کی وجہ سے میرے الفاظ صفحہ قرطاس کی رونق بڑھانے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اکتوبر کا شمارہ اپنی تمام رعنائیوں کے ہمراہ چلبلاتی دھوپ میں روح افزا کے ٹھنڈے خمار مشروب کے مانند ملا۔ سرِ ٹائٹل کتابی چہرہ سرمگیں آنکھیں، چاند کا ٹکڑا، حسین کھمزادا کرجی کے فنِ مصوری کا عمدہ انتخاب...... عید الاضحیٰ کے حوالے سے میرا پیغام اپنی خوشیوں میں سب کو شریک کیجیے گا...... سچے موتیوں کی لڑی جون ایلیا کا انشائیہ انداز قابلِ تعریف...... اداریے میں موجودہ حالات پہ لکھی گئی آپ کی باتیں قابلِ غور...... سیلاب زدگان کی حالت زار پر دل ملول...... دھرنے اور جلوس کا اونٹ نہ جانے کس کروٹ بیٹھے گا؟ ویلڈن برادر ابرار وارث کو خصوصی سلام۔ تصوف کے صفحات کا حسین تحفہ رضوانہ ساجد کی حضرت ابراہیم علیہ السلام دل و دماغ کو معطر و منور کرگئی...... تاریخ کے اوراق سے ابنِ اقبال کا انتخاب تصویرِ زوال بہت عمدہ...... کاشف زبیر کی قید خانہ ست بیری اور روبی پہ مشتمل سیارہ کہانی اچھی رہی...... مجنوں کے تعاقب، مجنوں کے دیوتا طاہر جاوید مغل کی ستاروں پہ کمند مغل جی کے شایانِ شان الفاظ قلمبند کرنے سے یکسر قاصر...... تنویر ریاض کی انگریزی ادب سے نجی امداد مارش کی جان چلی گئی اور جیکب و دیگر لوگوں کی موج ہوگئی...... ملک صفدر حیات کی نیکی آباد اچھی رہی...... ڈاکٹر شیر شاہ سید کی کہانی وعدہ تو کیا ہوتا میں مجنوں کے اسیر کسی کی چاہ میں فقیر اقبال کی شراب نوشی کی سخت مذمت...... محی الدین نواب کی ماروی کچھ زیادہ ہی تیز ہوگئی ہے۔ اویس علی کی تقدیر میں بہ حیثیت چور ارنسٹ کے ساتھ بہت اچھا ہوا...... جنگی حالت کی عکاسی امجد رئیس کی دیدۂ تر طول کرگئی...... اثر نعمانی کی دلکش تحریر طریقہ کار مغربی معاشرے کی پولیس اپنی عوام کے لیے خادم اور ہماری پولیس عوام کے لیے وبالِ جان...... نگارت نصر کی شہ مات میں مطلب پرست بیٹی اپنے بوڑھے ضعیف باپ کا جذباتی استحصال کرتی رہی، افسوس ناک کہانی...... محفلِ شعر و سخن عمدہ رہی...... کترنیں محظوظ کرگئیں۔"

✠ **رضوان تنولی کریڈوی،** اورنگی ٹاؤن، کراچی سے محفل میں شریک ہیں "16 تاریخ سے خاص انسیت اور پیار اس خوب صورت تاریخ کو محبوب سسپنس صبح صبح کے اسٹال کی نمایاں زینت بن کے عاشقان کا منتظر ہوتا ہے۔ اکتوبر کے سرورق کی بکھری زلفوں والی نازنین دلنشین کے لیے عرض کروں گا...... نصیب جن کو تیرے رخ کی دید ہوتی ہے وہ خوش نصیب ہیں خوب ان کی عید ہوتی ہے...... حجازِ مقدس میں لاکھوں فرزندانِ توحید اسلام کی لبیک اللھم لبیک کی پرکیف ساعتوں کے وقت میرے دونوں ہاتھ اور لب پیارے پاکستان کی سلامتی کے لیے دعاگو ہوں گے۔ اداریے میں آپ کی باتیں روح فرسا حقیقت ہیں۔ صدارت کا قلمدان مسافر دیوانہ کے حصے میں آیا۔ دلکش انداز میں لکھا گیا تبصرہ قابلِ تعریف ہے مبارکاں۔ بھائی ابرار وارث شادی کی مبارک باد...... زبیر حسین آپ کی فرمائش سرآنکھوں پہ لیجیے ہم شامل محفل...... ماسٹر تبصرہ نگار تفسیر عباس بابر اور بابر عباس کی کمی محسوس ہوئی...... علی رحمٰن، محمد یوسف سانول محفل میں خوش آمدید...... پیارے دوست احساس عاجز کا ایکسیڈنٹ ہوا صحت یابی کے لیے دعاگو...... کہانیوں پر ابتدا محبوب تحریر سسپنس کے ابتدائی صفحات ابنِ اقبال کی "تصویرِ زوال" سے کی۔ عمدہ پیرائے میں لکھی تحریر من کو بھاگئی...... کاشف زبیر کی "قید خانہ" ست بیری کی کوشش بار آور ہوئی اور کچھ لوگوں کے ساتھ روبی کو سیارے کے قید خانے سے لانے کے ساتھ اپنے نئے شہر کو آباد کرنے میں کامیاب ہوگیا...... پیارے طاہر جاوید مغل کی ستاروں پہ کمند محبت کے لطیف جذبات والوں کے لیے انمول تحفہ...... تنویر ریاض "نجی امداد" کے ساتھ اچھے رہے۔ سراغ رساں گریگوری کو سزا ملنی چاہیے تھی اور سارہ کو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ ملتی تو اچھا ہوتا...... ملک صفدر حیات اپنے روایتی انداز میں "نیکی آباد" کے ہمراہ جلوہ گر ہوئے بہت عمدہ۔ محفلِ شعر و سخن میں ذاکر علی گور چانی، رمضان پاشا، بادیہ ابنِ ماہا ایمان، ادریس احمد خان، ابرار وارث، احمد خان توحیدی، محمد اقبال، محمد اشفاق سیال کا انتخاب پسند آیا...... ڈاکٹر شیر شاہ سید "وعدہ تو کیا ہوتا" اقبال، شبنم کی بات مان لیتا تو بہتر رہتا۔ ویسے شبنم کا برقعے میں ملبوس ہونے کا پڑھ کے خوب لطف آیا گویا گنگا الٹی بہہ گئی۔ اویس علی کی "تقدیر" چور بے ایمان ارنسٹ کے ساتھ جو ہوا اچھا ہوا...... آنسوؤں کی لہروں میں ڈوبی امجد رئیس کی دیدۂ تر عبرت اثر منظر کوزی کی حالت نے افسردہ کردیا...... رضوانہ ساجد کی خوب صورت تحریر حضرت ابراہیم علیہ السلام بہت عمدہ رہی...... اثر نعمانی کی "طریقہ کار" انگلش ادب سے ایک شاہکار اسٹوری آف دی منتھ ثابت ہوئی...... نگارت نصر کی "شہ مات"

جذباتی استحصال کا شکار، رشتوں کا عجب گورکھ دھندا جیتی کی مطلب پرستی، شفیق باپ کی محبت اچھی کہانی رہی...... آخری صفحات کا خصوصی تحفہ تھی صغیر ادیب کی "احتساب" عمدگی سے سسپنس کا حق ادا کرگئی...... کترنیں بھی معیاری رہیں کستوری لگا کے...... گویا اکتوبر کا شمارہ سرورق سے پس ورق تک بہترین رہا۔"

✠ **محمد یوسف سانول ساکن میکن**، نورپور تھل ضلع خوشاب سے چلے آرہے ہیں "سب سے پہلے میں ادارے کا مشکور ہوں۔ خط شائع ہونے کی بہت خوشی ہوئی۔ پہلے کی طرح سرورق بہت ہی دیدہ زیب تھا۔ اس کے بعد سیدھا محفل شعروسخن میں جہاں تمام دوستوں کے انتخاب اچھے لگے لیکن محمد قدرت اللہ نیازی کا انتخاب بہت ہی اچھا تھا۔ اس کے بعد مغل صاحب کی "ستاروں پہ کمند" پر کمند پھینکی اور ستار پر لٹکتے رہے یقین کریں کہ عادل کی پٹائی، کرشل اور لیوپڈ کی ملاقات، گاؤں کے حالات، عادل کا سرسرور کے ساتھ کامیابی کی طرف سفر، شہزادی کا گم ہونا، قاسم وغیرہ کا نوبل راک پہنچنا، ہمایوں کا عادل کو اپنے حالات سے آگاہ کرنا، عادل کا اچانک بیمار ہونا اور پھر لیوپڈ سے پیچھے رہنا اور آخر میں جوائنٹ قواالامان...... یقین کریں کہ ایسا لگتا ہے کہ میں ان کرداروں کے ساتھ ساتھ ہوں۔ باقی شمارہ زیر مطالعہ ہے وقت کی کمی کی وجہ سے پڑھ نہیں پا رہا کیونکہ میرا ایک عزیز دوست C.M.M میں ایڈمٹ ہے اور میں اس کے ساتھ ہوں ادارے کے توسط سے قارئین سے دعا کی اپیل ہے کہ خدا میرے بھائی کو صحت یاب کرے۔ امید ہے سابقہ معیار کی طرح اس بار بھی شمارہ اچھا ہوگا۔"

✠ **یوسف مرزا**، ملتان سے تبصرہ کررہے ہیں "عرصہ دراز کے بعد اکتوبر 2014ء کا دلچسپ شمارہ دشوار اور کٹھن دور میں تفریح کا سامان لیے سامنے ہے۔ ٹائٹل پر حسینہ دلنواز کو دیکھا تو سحر زدہ ہوئے۔ روٹین کے مطابق سب سے پہلے جون ایلیا کا انشائیہ پڑھا تو بہت کچھ سوچنے سمجھنے کو ملا۔ آگے پہنچے محفل یاراں میں تو سب سے پہلے تخت پر بیٹھے مسافر دیوانہ صاحب کو براجمان پایا۔ تمام خطوط کے مطالعے کے بعد اپنے پیارے رائٹر طاہر جاوید مغل صاحب کی کاوش کو کھنگالا۔ مغل صاحب اسٹوری میں عادل اور شہزادی کے ساتھ ساتھ تھوڑا تفریح کے لیے مذاق بھی دیتے ہیں۔ مجموعی طور پر اسٹوری پلاٹ عمدہ اور جاندار ہوتا جارہا ہے۔ نواب صاحب کی قسط وار کہانی میں جہاں مرینہ اپنی تگ ودو میں مصروف ہے، وہاں مراد اور محبوب کی دیوانگی بھی عروج پر ہے۔ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔ آگے بڑھے صفدر صاحب کا کیس پڑھا اور ایک ہی نشست میں مکمل کیا۔ کاشف زبیر کی قید خانہ پڑھی جو بہت عمدہ اور لاجواب تحریر تھی۔ ڈاکٹر شیر شاہ کی کہانی نے ہمیشہ کی طرح سحر زدہ کیا۔ یقیناً یہ کہانی بہت سے ذہنوں پر اچھے نقوش چھوڑے گی۔ باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔ میری طرف سے تمام حاجیوں کو حج بیت اللہ کی سعادت پر مبارک باد۔ ایڈوانس۔ آخر میں اس رسالے کی وساطت سے اس عزم کا اظہار کرنا چاہوں گا۔ سیلاب کی تباہ کاری کی وجہ سے جہاں پوری قوم سیلاب زدگان کا ساتھ دے رہی ہے، حتیٰ الوسع میں بھی ان کے ساتھ ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ملک پاکستان اور اس میں بسنے والی پوری قوم کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ آمین ثم آمین۔"

✠ **بشریٰ افضل**، بہاولپور سے چلی آرہی ہیں "21 ستمبر کو سسپنس ملا۔ ٹائٹل پر صنفِ نازک کا راج تھا۔ ذاکر صاحب دیکھ لیں کہیں صنف مخالف ناشتہ ہی نہ کرلیں۔ لٹ ابھی سلجھا جارہے بالم کی تصویر بنی نظر آرہی ہے۔ اسٹائل بھی خوب صورت ہے، مجموعی طور پر ٹائٹل ایک ہی نظر میں بھا گیا، دیکھنے کا انداز تو دل میں اتر گیا۔ مرحوم جون ایلیا نے ایک صفحے میں پوری کہانی مکمل کردی۔ اپنی محفل میں پہنچے، انکل نے ملکی حالات کی بہترین منظر کشی کی ہے۔ محفل میں کسی مسافر کو کرسی صدارت پر بیٹھے دیکھا۔ یہ تو لکھنے والے کا نام ہے ارے! واقعی آپ کا نام مسافر ہے یا تخلص ہے، بہرحال مبارک ہو۔ شکیل کاظمی صاحب کا کس نے دل دکھایا ہے جو ناراض ہیں۔ بھئی اصل ناموں سے لکھا کریں۔ اعجاز احمد ہمیں دعاؤں میں یاد رکھنے کا شکریہ۔ (وعدہ تو کیا ہوتا) واقعی اگر جھوٹا وعدہ بھی کرلیتا تو شبنم کے ساتھ جو ہوا وہ نہ ہوتا۔ اگر قسمت میں ہوتا تو مل ہی جاتے۔ محفل شعروسخن میں ذاکر علی گورچانی کا شعر پسند آیا۔ (تحفہ) ایک لڑکی نے کتنی خوب صورتی سے مسافر کو بےوقوف بنا کر لوٹ لیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعات پڑھے۔ عیدالضحیٰ کے موقع پر یہ ایمان افروز واقعات پڑھنا اچھا لگا۔"

✠ **مہرین ناز**، حیدرآباد سے محفل کی زینت بنی ہیں "اے خدا میرے بدخواہ کے اندر سے خیر کو اس طرح ابھار دے جس طرح تھوہر کے درخت میں لال پھول پھوٹ پڑتے ہیں۔ ہم باتیں بنانے والے سوائے باتیں بنانے کے اور کیا کرسکتے ہیں۔ ہم زندہ قوم ہیں اور زندگی تک ہی دوسروں کو یاد رکھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے صرف قلم کی طاقت سے ارباب اختیار کوئی مثبت حکمت عملی پر عمل کرتے ہیں۔ شاید ان کے پاس یہ باتیں (جو ہم یا آپ یا آج کا ہر رسالہ ابتدائیہ میں کررہا ہے) پڑھنے کا وقت بھی نہیں۔ یہ تو نقار خانے میں طوطی کی آواز کا ہم پلہ بھی نہیں، شاید پاکستانیوں کی خوبی اول ہے، کچھ کریں یا نہ کریں شور ضرور مچائیں گے۔ ہمارا جگ بھاتا سسپنس ڈائجسٹ 16 ستمبر کو ہی مل گیا۔ سرورق پر دوشیزہ کی شرارتی آنکھیں اچھی لگیں۔ انشائیہ میں جون ایلیا کا انداز اور قوت برداشت لفظ لفظ سچ! اداریہ میں ادارے والوں نے آخر کار ہم تبصرہ نگاروں کو عقل مند تسلیم کرہی لیا۔ محفل میں وارد ہوئے تو دیوانے مسافر سے واسطہ پڑا۔ سعدیہ ذیبر محفل میں شرکت کی دعوت میں نے دی تھی، آپ کو۔ اشوک کمار آپ دہلی سے ہمارے لیے کیا سوغات لائے ہیں۔ کہانیاں تمام مصنفین کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہیں، پھر ادارے والوں کے سلیکٹرز ہمارے مزاج آشنا ہیں۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی وعدہ تو کیا ہوتا، ام الخبائث کا ایک اور نقصان! ایک محبت کرنے والی لڑکی شبنم کی زندگی تباہی کی طرف چلی گئی۔ ساتھ مرد کی خودغرضی بھی سامنے آئی۔ آخری صفحات ہمارے سب سے زیادہ دلپسند ہوتے ہیں اور ہمیں کبھی مایوسی بھی نہیں ہوئی۔ اس بار تو ش صغیر ادیب ہمارے لیے جاتی گرمیوں کا تحفہ لائے ہیں، احتساب کی صورت میں۔ ایسی شاندار اسٹوری جس پر ہر زاویے سے نظر ڈالی گئی۔ بشو نے شیخ طاہر کی شخصیت کس طرح حاصل کی، زبردست۔ شبہات، بے لگام مغربی معاشرے کی بڑی خامی، جیتی جیسی بیٹیاں اپنے والدین کو بھی دھوکا دینے سے باز نہیں آتیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دوسرا حصہ بھی معلومات میں اضافہ کرگیا۔ رضوانہ ساجد، جزائے خیر۔ ابتدائی صفحات پر ایچ اقبال صاحب تصویر زوال کے ساتھ جلوہ افروز ہوئے۔ تاریخ کے الٹ پھیر کا گھن چکر بدلتے چہروں کے درمیان تیغ وشمشیریں واقعات کی ترتیب بہترین رہی۔ شہزادی مہر ماہ سلطان، شہزادہ بایزید اور سلطان سلیمان خان کے کردار پسند آئے۔ محفل شعروسخن اپنے جوبن پر تھی۔ تفسیر عباس بابر اور رضوان تنولی کے مرسلے اچھے لگے۔"

✠ **ادریس احمد خان**، ناظم آباد کراچی سے محفل میں حاضر ہوئے ہیں "سسپنس کے دیدار سے مستفید ہوئے گویا کہ عید سے پہلے عید ہوگئی۔ سرورق آپ اپنی مثال تھا۔ انشائیہ میں علم و حکمت کے شہ پارے سے موتی چنے۔ اداریے میں حالات وواقعات نو سے آگاہ ہوئے۔ جہاں مسافر اور وہ بھی دیوانے نمبران سے ملاقات ہوئی، مبارکباد۔ سب سے پہلے طاہر جاوید مغل صاحب کی ستاروں پہ کمند پڑھی۔ جو گوناگوں دلچسپیاں کے ساتھ اپنا سفر جاری وساری رکھے ہوئے ہے۔ اس کے بعد ایچ اقبال صاحب کی تصویر زوال سے نبرد آزما ہوئے۔ ایچ اقبال کا قلم بلاشبہ تحریر سے نظر نہ ہٹانے نہیں دیتا۔ حتیٰ کہ تحریر ختم شد ہو جائے۔ تیسری کہانی مادری، محی الدین نواب کی مادری تھی جواب بھی پڑھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ کاشف زبیر کی قید خانہ دلچسپی کا محور تھی۔ فہیم امداد نے بھی متاثر کیا۔ ملک صاحب کی لفظوں کے ہیر پھیر کے ساتھ نیکی آباد اچھی لگی۔ تحفہ میں تحفہ یا کیسی نے کیا خوب تحفہ دیا۔ مزہ آیا۔ معیاری اشعار نے بھی لطف سے ہمکنار کیا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید صاحب کی وعدہ تو کیا ہوتا، کیا خوب تحریر تھی۔ تقدیر بھی اچھی لگی۔ دیدہ تر واقعی عجلہ بازی میں کیا گیا فیصلہ بھی کسی نقصان کا باعث ہوتا ہے۔ اقوال زریں پر مشتمل شہ پاروں نے بھی کافی محظوظ کیا۔ روح کو جلا بخشنے والی ایمان کو مستحکم کرنے والی تحریر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالات وواقعات نے بھی آگاہی کا ورود کیا جو کہ مسلسل دو اقساط کے ساتھ سلسلہ جاری ہے۔ اثر نعمانی کی طریقہ کار کے متعلق بھی تقدیر کی طرح کا تاثر قائم ہے۔ کمال انداز رہے۔ شبہات میں ایک باپ کو بےوقوف بنانے والی اولاد کی کہانی تھی۔ جو حقیقت سے قریب تر نظر آئی کہ اولاد اپنے ماں یا باپ کو جوان ہونے پر بےوقوف سمجھتی ہے۔ کہانی احتساب ایک بہترین کہانی تھی۔ آنے والی عیدالاضحیٰ کی تمام عالم اسلام کو مبارک باد۔"

✠ **محمد جاوید**، تحصیل علی پور میں تشریف لائے ہیں "ستمبر کی بارش سے دھلی اجلی دھوپ کی تمازت سے تمتماتے سپید رخساروں پر اٹکھیلیاں کرتی ہوئی نافرمان زلفیں سفید پری کے گہرے سرخ لبوں پر مچلتی ہوئی چنچل مسکان اور مست مست شوخی سے بھرپور تنور تحیری آنکھوں پر تنی ہوئی سیاہ پلکیں شل دو دھاری تلوار کی تیز دھار سے جب سسپنس کے اسیر کے قلب کو قاش قاش کرگئیں، واللہ ہماری بےتاب نگاہوں کی بےتاب تتلیاں بے تابانہ انداز میں شوخ حسینہ کے شل بدر چہرے پر بار بار محو رقص رہیں، اف۔ روحانی راہنما جون ایلیا کا انشائیہ اور انکل جان کا نصیحت انگیز اداریہ پڑھا اور یہ سوچ کر چل پڑے کہ ابھی ہمارے علاوہ کسی کا بھی سدھرنے کا موڈ نہیں، بات کرو حق کی۔ ش صغیر ادیب کے قلب قلم سے لوح دل پر رقم کاوش جسد ترابی میں محصور کسی روح کو مضطرب اور نگاہوں کو نم ناک کرتی رہی کہ آنکھوں کے پھول شبنم کی بوندوں پر بیچ گئے، خوب صورت خواب دیکھنا ہر آنکھ کا حق ہے مگر جاگتی آنکھوں کے ہر سپنے حقیقت بنا نہیں کرتے، لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ اثر نعمانی کی تلاش طریقہ کار میں قانون فاتح اور جرم مفتوح ٹھہرا۔ افسوس کہ عشق حسن کی تھی ہی جائز شرط نہ مان کر حسن بےمثال کی سلطنت کا شہنشاہ نہ بن سکا۔ یہ خیالات تحریروں کے شیر ڈاکٹر شیر شاہ سید کی کاوش وعدہ تو کیا ہوتا کے لیے ہیں، دیدہ تر میں زندگی کچھ چند قدموں کے فاصلے پر مصروف کوڑی سے دوڑی کہ موت کے خواہش مند کوڑی کو موت نے اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ تقدیر بھی کبھار ایسے ہی بھیانک مذاق کرتی ہے۔ ستاروں پر کمند دل کی پرسکون دنیا میں ہنگامہ برپا کرنے میں ناکامیاب نہیں رہی، حصول زر برائے زن کی چال تو ٹرنگ ودو میں مسلسل معروف شہزادی کا شہزادہ عادل ناقابل تسخیر جوبلی کو چیمپئن لیوپڈ کو شکست دے کر سر کرلے گا تاہم مقبول قلم کار طاہر جاوید مغل سے کچھ بعید نہیں کہ کب کونسے قاری کی سوچ کے برعکس چال چل جائیں۔ فہیم امداد ایک شخص کی حادثاتی موت کئی افراد کے لیے خوشحالی کے قہقہے بن گئی۔ غریب کی محبت بھی غریب کی طرح مجبور ومقہور رہتی ہے مگر مادری کا مراد اب غربت محرومیت کی بھٹی میں تپتا ہوا محروم و غریب نہیں بلکہ مہلک موت کے حلق سے زندگی چھین کر جینے والا جاں باز مسافر بن چکا ہے۔ بیم مادری کا سفر مراد محبت محبوب مہلک مصیبتیں موت کے سنگ سنگ جاری وساری ہیں۔ نیکی آباد میں اگر مندل کو چھوٹی سی نیکی کی جزا ملی تو راہ چلتے غیر مرد کے ساتھ دل لگی کی ناقابل فراموش سزا بھی ملی ہے۔ انگلش کہانیوں کے مترجم کاشف زبیر کی دریافت قید خانہ تعمیری کہانی ثابت ہوئی جس میں حضرت انسان اپنی آزادی اور بقا کے لیے دشمنوں سے برسرپیکار دکھایا گیا ہے۔ شبہات بیٹی کے ہاتھوں بےبس باپ کی کہانی پڑھ کر دکھ ہوا، رشتوں کی بےتوقیری مغرب کا وتیرہ وخاصہ ہے۔ تقدیر میں تدبیر وتقدیر کے درمیان آنکھ مچولی، تدبیر ہار گئی۔ تحفہ میں فریڈ وکیتھی کا چند لمحوں کا انوکھا ساتھ اور تحفہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔ محفل شعروسخن میں شاعروں نے تو گویا آگ میں پھول کھلا دیے لیکن مسز رباب احمد اور ریاض بٹ کے شعروں کے پھول کی خوشبو تو دل میں اتر گئی۔ ہر زوال کو عروج اور ہر عروج کو زوال قانون مشیت ایزدی ہے، سلطنت عثمانیہ کا ترکی سے حربی کی جانب رینگتے ہوئے سفر کا احوال اچھا لگا۔ دنیائے ادب کے معروف قلم کار علیم الحق حقی کی موت کا پڑھ کر دل کو جھٹکا سا لگا۔ اس دھچکے سے ابھی سنبھلنے ہی نہ پائے تھے کہ ایک اور سانحہ ارتحال ہماری مختصر نگاہ ملا تیر جاتا تو ہے ہی یہاں سے یا پھر اس جہان سے۔ دونوں مرحومین کی مغفرت کے واسطے اللہ پاک کی بارگاہ میں ہاتھوں کے کشکول بلند کیے۔"

✠ **شبانہ حسین**، لاہور کینٹ سے تبصرہ کررہی ہیں "زندگی کی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اپنے سسپنس ڈائجسٹ سے کبھی غافل نہ ہوئے۔ اکتوبر کا سسپنس 16 ستمبر کو ہی مل گیا۔ سرورق کی حسینہ درشت کا سہارا لیے حسین مسکراہٹ کے ساتھ پسند آئی۔ ایلیا صاحب کے انداز سے ہمیں بہت کچھ اندازہ ہوگیا۔ اداریہ کی ہمدردانہ باتیں دل میں اتر گئیں، عقل مندوں کی محفل میں دیوانوں کا راج ہے، ہمارے ملک کی زندہ مثال ہے، پھر بھی مبارک باد۔ شوکت شہریار کی قسمت کھل گئی کہ وزارت مل گئی۔ لگتا ہے 2015ء تک اس محفل پر 12,14 سال کے بچے ہی قبضہ کرلیں گے۔ اشوک کمار صاحب دہلی کی سیروں پہ تھے۔ ابن مقبول برادر اچھے تبصرے کے ساتھ کافی دنوں بعد نظر آئے۔ رمضان پاشا انکل جی ہم نے آپ کو یاد کیا تھا۔ اللہ آپ کو لمبی عمر عطا کرے۔ آغا بھائی آپ بھی محفل میں حاضر ہوا کریں۔ صفحات اول میں ایچ اقبال صاحب تصویر زوال کے ساتھ حاضر ہوئے۔ کہانی لاجواب تھی۔ شہزادی مہر ماہ سلطان، خرم سلطان، فرہاد پاشا کے کردار خوب تھے۔ سلطان سلیمان جیسے فرماں روا کاش آج کے دور میں بھی ہوتے۔ نیکی آباد ملک صفدر حیات صاحب کی شاندار اسٹوری تھی، ان چھوٹی چھوٹی نیکیوں سے ہمیں بڑے اجر ملتے ہیں۔ طریقہ کار میں اثر نعمانی صاحب ایک عجیب سی کہانی لائے۔ شبہات میں نگارت نصر نے مغربی معاشرے کی ایک اور خرابی کی نشاندہی کی۔ وہاں کے بچے بھی اپنے والدین کو دھوکا دیتے ہوئے نہیں شرماتے لیکن ان کا انجام برا ہوتا ہے۔ جناب طاہر جاوید مغل صاحب کی ستاروں پہ کمند جوں جوں آگے بڑھ رہی ہے، اس میں اور نکھار آتا جارہا ہے۔ نیا حصہ پہلے سے زیادہ دلچسپ ہوتا ہے، مغل صاحب زور قلم اور زیادہ، اس بار تو شہزادی کی

پہاڑوں تک پہنچ گئی۔ ماروی میں محی الدین نواب صاحب اپنا اسٹائل لے کر آتے جارہے ہیں جو ان کی کہانیوں کا خاصہ ہوتا ہے۔ یہ قسط پسند آئی ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی وعدہ تو کیا ہوتا، دل پسند اسٹوری تھی۔ مرد کی جفا عورت کی وفا، خانی شراب شبنم کی محبت اس کو برائی سے روک رہی تھی مگر اس اچھائی نے خود اس کی زندگی خراب کردی۔ احتساب، دل کو چھو لینے والی لاجواب تحریر، رش صغیر ادیب بہت دنوں بعد آئے پھر بھی قارئین سسپنس کے دل جیت لیے۔ بشو، شیخ طاہر کیسے بنے کہانی تو اتر سے آگے بڑھتی گئی۔ استاد سمندر اور شالی والا حصہ زبردست رہا، زینت کا کردار بھی دل کو بھا گیا۔ رضوانہ ساجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے احوال زندگی کا دوسرا حصہ میں عید قرباں آب زم زم کے متعلق معلومات میں اضافہ کرگئی۔ اللہ پاک ان کو جزائے خیر عطا کرے۔ محفل شعروسخن بہترین تھی۔ مرسلے بھی اچھے لگے۔ اکتوبر کا سسپنس بیسٹ ان بیسٹ رہا۔"

✠ **عاطف شاہین 18** ہزاروی سے دو ماہ کی غیر حاضری کے بعد ایک بار پھر حاضر ہیں۔ "جنہوں نے یاد رکھا ان کا شکریہ اور بھلا دینے والوں سے گلہ نہیں، جب دل وطن عزیز کے حالات کی وجہ سے شکستہ ہے مگر اس وقت سسپنس کی حاضری باعث سکون ہے۔ کلی طور پر نہیں تو جزوی طور پر تو ضرور ہے۔ انشائیہ میں جون ایلیا امراؤ کا ذکر کر رہے ہیں جن میں احساس نام کی چیز معدوم ہو چکی ہے۔ شاید اس قوم کے مقدر میں صرف مظالم کو برداشت کرنا ہی ہے۔ خطوط میں صدارت مسافر کے حصے میں آئی، مبارک۔ اچھا تبصرہ تھا۔ طلحہ رحمان جو کہ میرے بھائی وارث علی (ابرار وارث) کے شاگرد ہیں، کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے well come۔ اور پوزیشن لینے پر مبارک۔ نعیم الحق کی وفات پر اہل خانہ سے تعزیت اور صبر و استقامت کی درخواست۔ اللہ نعیم الحق کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے، آمین۔ کہانیوں میں ماروی کو پڑھا۔ مراد کے لیے قتل کرنا اب مچھر مارنے کے مترادف ہو گیا ہے۔ محبت بھی کیا کیا کرواتی ہے۔ مراد اب کروڑوں میں کھیلنے والا ہو چکا ہے۔ ستاروں پر کمند پڑھی۔ پچھلی اقساط سے قدرے بہتر تھی۔ میری طاہر جاوید صاحب اور محی الدین صاحب سے گزارش ہے کہ پلیز اسٹوری میں کچھ رومانس بھی لائیں۔ بس ایکشن ہی ایکشن ہے۔ محفل شعروسخن میں ابرار وارث، قدرت اللہ، مہرین ناز اور اعجاز احمد کے اشعار دل کو لگے۔ باقی شمارہ زیر مطالعہ ہے۔"

✠ **علی رحمٰن،** منڈیلیانوالی سے تشریف لائے ہیں "ماہ شمارہ اکتوبر معمول سے کافی ہٹ کر 18 تاریخ کو ملا۔ سرورق پر بنی دیہاتی لڑکی زمین پر ہاتھ رکھ کر بیٹھی تھی اور ہمیں بلا رہی تھی ہم نے صاف انکار کیا۔ جون ایلیا کا انشائیہ اندازہ کی ہمیں سمجھ نہیں آئی پھر خطوں کی محفل میں پہنچے۔ اپنا پہلا خط شائع ہونے کی خوشی ہوئی۔ مسافر دیوانہ صاحب آپ کی طبیعت بوجھل ہے جبکہ ہمیں ملیریا بخار ہو گیا اس لیے رسالہ اتنا پڑھا نہیں گیا۔ حمید ہارون کی والدہ کو اللہ جنت الفردوس میں جگہ دے۔ کہانیوں کی ابتدا طاہر جاوید مغل کے خوب صورت ناول ستاروں پر کمند سے کی۔ دعا ہے نوبل راک پر عادل پہنچے اور لیرڈ کو شکست ہو۔ ہمایوں کی دکھ بھری کہانی پڑھی۔ مانکا نے زادہ زندہ تھا اور کمینے نے شہزادی کو اغوا کیا۔ ماروی میں مرینہ کا انجام اچھا ہو گیا۔ سیٹھ گردھاری نے خود اگر لیا۔ پپا اور شہباز کا انجام بھی اچھا ہو گیا۔ بخار کی وجہ سے آدھا رسالہ رہتا ہے۔ محفل شعروسخن اچھی رہی۔ ویسے تمام دوستوں کے شعر اچھے تھے مگر مہرین ناز، ابرار وارث، رمضان پاشا اور محمد قدرت اللہ نیازی کے شعر بہترین تھے۔ ادریس علی کی کہانی میں ارنسٹ کے ساتھ اچھا ہو گیا۔"

✠ **عنبر سراج،** داؤد آباد، سکندر پور سے محفل میں تشریف لائے ہیں "ہم سسپنس باقاعدگی سے تو نہیں پڑھتے مگر جب بھی ہمارے بھائی گھر پہ ہوں تو یہ موقع میسر آہی جاتا ہے۔ ہمیں طاہر انکل کی کہانی بہت اچھی لگتی ہے اور ہم بھائی سے چھپ کر اس کہانی کو لازمی پڑھتے ہیں اور کبھی تو اگر بھائی باہر نہ جائیں تو ہم میں سے ایک واش روم میں بند ہو کر پڑھتا ہے اور پھر دوسرے کو بتا دیتا ہے۔ اس کے علاوہ باقی پڑھنے والوں کی نوک جھونک بھی اچھی لگتی ہے۔ ابھی ہم صرف طاہر انکل کی کہانی ہی پڑھ پاتے ہیں کیونکہ ایک ہفتے تک تو رسالے کو ہاتھ لگانا بھی ناممکن ہوتا ہے۔ اب اجازت اگلی بار مزید کہانیوں پہ تبصرہ کریں گے۔"

✠ **اعجاز احمد راحیل،** ماہی، ساہیوال سے تبصرہ کر رہے ہیں "ہم تعبیر کی جستجو میں خواب دیکھتے رہتے ہیں، خواب ہماری آنکھوں کا اثاثہ اور خواہشوں کا اساس ہوتے ہیں اور اثاثہ بھلا کسے عزیز نہیں ہوتا......؟ میرے خوابوں کی تعبیر 19 ستمبر کو آخر پوری ہوئی اور میرا اثاثہ مجھے مل ہی گیا...... سرورق پر مجوبہ دلنواز کمال مصور کا عمدہ نمونہ ہے۔ جون ایلیا صاحب کا انداز لاجواب رہا۔ یقیناً ہمیں اپنی قوت برداشت کا اندازہ لگانا چاہیے۔ اداریہ میں اس دفعہ عقل مندوں کو واضح اشارے دیے گئے مگر کیا کریں جی......؟ تخت شاہی پر ہمارے ہی شہر کے مسافر دیوانہ صاحب کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ آپ کا مجھے مغل صاحب کا دیوانہ کہنا بہت اچھا لگا اور بے اختیار منہ سے نکل گیا اب تو دیوانے بھی ہم کو دیوانہ کہتے ہیں۔ سب سے پہلے اپنے محبوب قلم کار طاہر جاوید مغل صاحب کی بے مثل تحریر ستاروں پر کمند پڑھی، فرط جذبات سے اس قدر مغلوب ہوئے کہ آنکھیں نم ہو گئیں۔ عادل کا کردار تو گویا مانند سانس ہے۔ یوں لگتا ہے ہم نے نوبل راک کے سامنے بیٹھ کر یہ سارے منظر دیدہ تر سے دیکھے ہیں۔ ماروی بھی اس دفعہ کافی سپرہٹ رہی، مراد علی تو چھا گیا ہے جبکہ محبوب علی چانڈیو بھی اپنی راہیں صاف کرنے کا سوچ رہا ہے یہ محبت ہوتی ہی ایسی ہے۔ آخری صفحات پر رش صغیر ادیب کی ناقابل فراموش روداد دل کی آنکھوں سے پڑھی۔ لفظ لفظ کرب و اذیت کی غماز سطر سطر درد و کسک کی بھرپور عکاسی کرتی بشو کی داستان زیست محبت اور صبر و استقامت کی عمدہ مثال ہے۔ ابتدائی صفحات پر ایچ اقبال صاحب کی آمد مبارک رہی۔ نہ جانے کیوں انسان اپنوں پہ اعتماد کر کے دھوکا کھاتا ہے۔ ملک صفدر حیات کی ڈائری سے لی گئی، تنگی آباد جیسی سبق آموز تحریر دلی خوشی کا باعث بنی بلاشبہ نیکی کبھی رائگاں نہیں جاتی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی وعدہ تو کیا ہوتا ام الخبائث کی تباہ کاریوں پر مبنی پرسوز تحریر بیسٹ رہی۔ دیدہ تر بھی بہت اچھی لگی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سوانح حیات ایمان کو جلا بخش گئی، بے شک اللہ اپنے بندوں کی آزمائش کرتا ہے اور ان کا ساتھ بھی دیتا ہے۔ شرمات سگے رشتوں کے ساتھ دھوکا کرنے والے کبھی سکھ کی نیند نہیں سو پاتے...... محفل شعروسخن میں مہرین ناز کا شعر بیسٹ رہا۔ مجموعی طور پر شمارہ اچھا لگا۔"

✠ **ماہ تاب گل رانا،** راجن پور سے محفل کی زینت بنی ہیں "سسپنس ڈائجسٹ میں دوسری مرتبہ حاضر ہو رہی ہوں، جاسوسی میں کچھ عرصہ تک باقاعدگی سے خط لکھتی رہی ہوں۔ پھر میری شادی ہو گئی تھی اور جہاں ہوئی وہ ایک دیہات ہے جہاں پوسٹ آفس نہیں ہے سو شادی کے بعد بمشکل ایک دو مرتبہ خط لکھ پائی لیکن جاسوسی، سسپنس، سرگزشت سے ریڈر شپ برقرار رکھی اور تقریباً ہر ماہ خط بھی لکھے جو کہ کچھ وجوہات کی بنا پر میری الماری کی زینت بن گئے لیکن اس مرتبہ تو میں نے سوچ لیا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے خط لکھنا ہے۔ اپنا پیارا سسپنس 20 تاریخ کو ملا۔ سرورق کچھ خاص نہیں۔ جو ماڈل سرورق پہ بنی ہوئی تھی اس سے اچھی شکل تو آئینے میں نظر آجاتی ہے۔ (ماشاءاللہ...... یہ خوش فہمی تو نہیں ہے کہیں؟) فہرست میں کاشف زبیر اور اثر نعمانی (مرحوم) کا نام دیکھ کر خوشی ہوئی۔ انشائیہ اور انکل جی کا ابتدائیہ پڑھ کے اداسی نے آن گھیرا تو سکتے بیٹھے تبصروں میں پناہ لی۔ محفل میں کچھ نئے لوگ نظر آئے اور کچھ پرانے غائب۔ کرسی صدارت پر براجمان نظر آئے مسافر دیوانہ مبارکباد۔ کرسی وزارت پر شوکت شہریار کا قبضہ تھا۔ علی رحمٰن! ویلکم اور شکر ہے کہ بروقت عمر یاد آگئی اور پھر حسینہ تو آپی! آپا ہی لگی ہوگی نا؟ سعدیہ بخاری! آپ بہت اچھا لکھتی ہیں اور باقی خطوط میں اعجاز احمد راحیل، مہرین ناز، محمد صفدر معاویہ کے خطوط پسند آئے اور بشریٰ افضل! آپ کا تبصرہ اچھا لگا لیکن اس میں آپ کا وہ مخصوص انداز نظر نہیں آیا اور اس مرتبہ محفل کیا وہ تحریر ذکری میرا مطلب ہے کہ ایک دوسرے کے پوائنٹ پکڑ کر تبصرے کرنا' ایسا کچھ نہیں تھا اور نہ انکل جی کے کرارے جوابات۔ پرانے دوستوں میں ماہا ایمان، تنسیر عباس بابر صاحب کی کمی محسوس ہوئی۔ ساری پریاں کہاں کھو گئی ہیں۔ جلدی سے واپس آئیں۔ یہاں بہت سے تبصرہ نگار بھی موجود ہیں لیکن وہاں دو چیزوں کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ ایک آپ کی قینچی اور دوسرا آپ کے مزے مزے کے جوابات۔ خیر اپنی محفل سے فارغ ہو کر کہانیوں کا رخ کیا تو ابتدائی صفحات۔ اف! یہ میرا سلطان ہر جگہ چھا گیا ہے۔ کوئی ایسی جگہ نہیں کہ جہاں سلطان سلیمان، مہرماہ سلطان اور خرم سلطان کا دیدار نہ ہو۔ کاشف زبیر صاحب کی قید خانہ بہترین کہانی تھی۔ کیا زمین پر بھی کچھ عرصے بعد یہی حالات ہوں گے؟ پھر پہنچی جی اپنے ہردلعزیز مصنف جناب طاہر جاوید مغل صاحب کی ستاروں پر کمند پہ۔ بلاشبہ شاہکار تحریر ہے اور یہ مغل انکل اتنے بہادر اور پختہ عزم والے ہیرو پتا نہیں کہاں سے ڈھونڈ لاتے ہیں اور شکر ہے کہ اس تحریر میں مغل صاحب کی دوسری تحریروں کی طرح ہیرو کی شادی شدہ نہیں ہے۔ بہر حال تحریر زبردست ہے۔ خاص طور پہ ہمایوں کا کردار دلچسپ ہے۔ آخری صفحات پر احتساب بلاشبہ ایک زبردست تحریر تھی۔ بہت ہی اچھی۔ کافی عرصے کے بعد اس طرح کی کوئی تحریر پڑھی۔ طریقہ کار بھی ایک سبق آموز تحریر تھی۔ اس کو پڑھ کے محاورہ یاد آیا۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ دیدہ تر اف خدایا۔ بہت دلدوز تحریر تھی۔ پڑھ کے بہت عجیب سی کیفیات نے جکڑ لیا۔ بہر حال مجموعی طور پہ یہ شمارہ بہترین تھا اور انکل جی! مزید لکھنے سے معذرت کہ میری ننھی پری کا رونا شروع۔ جی ہاں میری زندگی کا سب سے حسین تحفہ میری سات ماہ کی بیٹی زینب نور۔ (اللہ آپ کو بیٹی کے سنگ خوش رکھے)"

✠ **محمد قدرت اللہ نیازی،** حکیم ٹاؤن، خانیوال سے تبصرہ کر رہے ہیں "اکتوبر 2014ء کا شمارہ ایک گرم دوپہر میں موصول ہوا۔ حسینہ بارڈ لفظوں کی ویب لگ رہی تھی۔ جون ایلیا قوم کی برداشت کا اندازہ لگانے میں ہلکان ہوئے جارہے ہیں۔ قوم کی برداشت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ پچھلے 67 سال سے کئی بار ہمیں سیلاب سے دوچار ہونا پڑا مگر مجال ہے کہ ہم نے کوئی ڈیم بنانے کی کوشش کی ہو۔ پاکستان کو عالمی عدالت انصاف میں پچھلے دنوں جس سبکی کا سامنا کرنا پڑا وہ سب ہی کو معلوم ہے انڈیا نے موقف اختیار کیا کہ پاکستان سارا پانی ضائع کر دیتا ہے اس کے پاس ذخیرہ کرنے کی گنجائش ہی نہیں اور پانی سمندر میں جا گرتا ہے وہ پانی ہم ڈیم بنا کر کام میں لارہے ہیں تو ان کا کیا حرج ہوا؟ اور بھارت کے اس موقف کو قبول کر کے فیصلہ اس کے حق میں دے دیا گیا۔ محفل یار اس میں ایک مسافر کو کرسی صدارت پر استراحت فرماتے پایا۔ ابرار وارث! یار تو ہم بھی نہیں آتے، اس لیے محفل میں موجود ہوتے ہیں بس یہ ہے کہ چھپ چھپ کر پڑھنا پڑتا ہے۔ علی رحمان! خوش آمدید۔ بابو سال میں یہ حال ہے تو آگے کیا ہوگا۔ صفدر بھائی کاٹ دار الفاظ کو ادارے کی قینچی کاٹ دیتی ہے۔ محمد یوسف سانول خوش آمدید۔ سسپنس کی محفل کو ہر وقت نئے نئے ممبر ملتے رہتے ہیں یہ سسپنس کے منتظمین کی محنت کا صلہ ہے۔ ابن مقبول! آپ کا انداز بیان پسند آیا۔ بشریٰ افضل! ہم آپ کے "ہم خیال" ہیں، نوک جھونک شامل ہونی چاہیے۔ ذاکر علی گورچانی! آپ کے دوست جیسے ہزاروں خاموش قاری موجود ہوں گے ان کی محبت سسپنس نے متاثر کیا۔ ستاروں پر کمند میں عادل کو پائنتری چوٹی پر سب جانے کی وجہ اس بار سامنے آگئی۔ نوبل راک پر تمام کرداروں کو جمع کیا جا چکا ہے لیرڈ اور عادل میں مقابلے سے کہانی میں سنسنی مزید بڑھ جائے گی یقیناً عادل فاتح ہوگا۔ مانکا نے زادہ کی کارروائیاں ہضم نہیں ہوئیں سدھ سکتے سے اشفاد اور سید حاعادل کی راہ پر لگ کر مجھوں پہنچ گیا اور دورجنوں مسلح افراد کی موجودگی میں شہزادی کو اغوا کر کے لے آیا۔ امید ہے اگلی قسط آخری ہوگی۔ (جی بالکل درست فرمایا) ماروی میں مراد اور مرینہ کی جنگ جاری ہے۔ مراد کئی بار اسے زک پہنچا چکا ہے، دوسری طرف محبوب کے متعلقین اسے نئی راہ پر لا چکے ہیں۔ کہانی بہتری کی طرف گامزن ہوتی نظر آرہی ہے۔ ایچ اقبال نے تصویر زوال لکھ کر میرا سلطان ڈراما سیریل دیکھنے والوں پر احسان کیا جو سلطان سلیمان کے ہی متعلق ہے۔ کاشف زبیر کی قید خانہ مستقبل بعید کے بارے میں لکھی جانے والی سائنس فکشن اسٹوری تھی۔ سٹ بیری کی جدوجہد متاثر کن تھی۔ سلیم انور کی تحفہ میں کیتھی کے بارے میں جو خیالات فریڈ کے تھے بہت فطری تھے۔ محفل شعروسخن میں جس کا انتخاب سب سے زیادہ پسند آیا وہ ہے جبران احمد ملک "روتے روتے ہم نے بھی کہہ دیا کون ہو تم" واہ کیا بات کہی ہے ظالم۔ اثر نعمانی کی واردات طریقہ کار میں اپنی پاکستانی پولیس کے طریقہ کار کی جھلک واضح نظر آئی۔ آخری صفحات پر رش صغیر ادیب احتساب کا تحفہ لے کر آئے۔ بہت زبردست تحریر تھی۔ طوالت کی وجہ سے ایک نشست میں ختم کرنا تو ممکن نہ تھا لیکن اسے ادھورا چھوڑ کر اٹھنا بھی مشکل ثابت ہوا۔"

✠ **رمضان پاشا،** گلشن اقبال، کراچی سے تشریف لائے ہیں "اکتوبر 2014ء کا سسپنس کا گیٹ اپ بہت عمدہ تھا۔ انشائیہ حسب روایت تلخ و ترش تھا۔ آپ کے خط، محفل میں پہلی بار آنے والے صاحب تبصروں میں بھی پہلے نمبر پر ہیں۔ موصوف دیوانے بھی ہیں، اور مسافر بھی تبصرہ اچھا تھا۔ مبارکباد۔ محفل میں آپ نے نوک جھوک پر پابندی لگا کر اچھا نہیں کیا۔ (کسی کی عزت نفس مجروح ہو...... یہ بھی تو اچھا نہیں) تازہ شمارے کی غیر ملکی کہانیاں سب کی سب بہت اچھی تھیں، خاص کر قید خانہ مجھے بہت پسند آئی۔ تقدیر دوسرے نمبر پر تبصرے پہ دیدہ تر، ستاروں پر کمند اور ماروی کی اس ماہ اقساط بہت ہی دبنگ تھیں، مگر میں ماروی کو زیادہ نمبر دوں گا۔ تنگی آباد اس مرتبہ ملک صاحب کو مجرموں کو قابو کرنے کا موقع نہیں ملا، ایسا پہلی بار ہوا ہے، کہانی اچھی تھی۔ شہ مات نے بھی بور نہیں

کیا۔ اشعار کی محفل میں ماہا ایمان، ڈاکٹر ناہید اختر اور اعجاز احمد راحیل کے اشعار قابلِ داد ہیں۔ آخری صفحات کی کہانی احتساب کے بارے میں کیا لکھوں، اس کے مصنف کا نام ہی کافی ہے، ش صغیر ادیب!"

✠ **مرزا طاہر الدین بیگ**، میرپور خاص سے چلے آرہے ہیں "اکتوبر کا سسپنس جون ایلیا کی زبردست تحریر سے شروع کیا۔ ہماری قوم چاروں طرف سے مصائب کا شکار ہے۔ آپ کی محفل میں دل پسند خطوط ہیں اور سب ہی اچھے ہیں۔ سدرہ بانو ناگوری۔ خوب لکھ رہی ہیں۔ سعدیہ بخاری صاحبہ کا تبصرہ بھی اچھا تھا۔ مسافر دیوانہ صاحب امید ہے کہ آپ کی طبیعت اب سنبھل گئی ہوگی۔ ایچ اقبال صاحب تاریخ کے اوراق سے دلچسپ روداد بیان کرتے ہیں اور خوب کرتے ہیں۔ ش صغیر ادیب صاحب کا احتساب بہت اچھی تحریر تھی مگر انجام کچھ عجیب سا لگا۔ ستاروں پر کمند اپنی پوری جولانی پر ہے۔ ہاں یہی لوگ تو ہیں کہ جن کا حوصلہ اور ہمت انہیں بلندیوں پر لے جاتا ہے اور انجام کار قدرت انہیں ان کا گوہرِ مقصود عطا کرتی ہے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ نیکی آباد ملک صاحب کا زبردست کارنامہ، یہ تحریر عرصے تک یاد رکھی جائے گی۔"

✠ **محمد اکبر تارچ**، لودھراں سے محفل میں حاضر ہیں "اکتوبر کا خوب صورت شمارہ ہاتھوں میں آیا تو بہت خوشی ہوئی کیونکہ ہمیں پہلے ہی اپنے ذرائع سے پتا چل گیا تھا کہ ہمارا تبصرہ شائع ہوگیا ہے۔ سرورق بھی اس دفعہ بہت پسند آیا۔ انشائیہ اور اداریہ پڑھنے کے بعد اپنی محفل میں حاضری دی۔ ساہیوال کے مسافر دیوانہ صاحب کرسی صدارت پر براجمان نظر آئے۔ آپ کے طاہر جاوید مغل صاحب اور بھائی اعجاز احمد راحیل کے بارے میں خیالات پڑھ کر خوشی ہوئی۔ محمد صفدر معاویہ کا تبصرہ بھی عمدہ رہا۔ اعجاز احمد راحیل بھائی آپ کا انداز تحریر من کو بھا گیا۔ تصویر زوال ماضی کی داستان ایچ اقبال نے خوب صورتی سے بیان کی۔ شہزادی مہرماہ سلطان اور کارل کا کردار اچھا لگا۔ ستاروں پر کمند نے تو دل جیت لیا۔ عادل کی ہمت اور طاہر جاوید صاحب کے انداز بیاں کو داد دیتے ہیں۔ یحییٰ ابدالی بھی بہترین اسٹوری ہے۔ ملک صفدر حیات کی نیکی آباد بیسٹ اسٹوری ہے۔ سچ ہے نیکی ایک ایسا شجر ہے جس کی چھاؤں ضرور ملتی ہے۔ ماروی بھی اب کافی ترقی کر گئی ہے۔ مراد علی تو چھلاوا بن گیا ہے۔ وعدہ تو کیا ہوتا بھی عمدہ تحریر ہے۔ ہمیں اپنوں سے وعدے کر لینے چاہئیں۔ اثر نعمانی صاحب کی طریقہ کار بھی بے مثل تحریر ثابت ہوئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی داستان پڑھ کر ایمان تازہ ہوگیا۔ محفل شعر و سخن میں اعجاز احمد راحیل اور مہرین ناز کے انتخاب عمدہ رہے۔"

✠ **رانا حبیب الرحمٰن**، سینٹرل جیل لاہور سے محفل میں شریک ہیں "میرے خط لکھنے کی تو کئی وجوہات ہیں لیکن ان میں ایک تو سسپنس سے وہ محبت ہے جو ہم ہر ماہ پڑھ کر اس کا اظہار کرتے ہیں، دوسری وجہ وہ دوست جو اسے پڑھتے اور اس میں اپنی چاہت کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ تیسری وجہ صوبہ پنجاب میں سیلاب کی تباہ کاریاں، پانی کا سیلاب، بجلی کے بلوں کا سیلاب، معیشت کی تباہ کاری کا سیلاب۔ روزگار کی تباہ کاری اور غربت کا سیلاب۔ اشیا کی مہنگائی اور لوڈشیڈنگ کا سیلاب۔ جرائم کا سیلاب اور دھماکوں کا سیلاب۔ نشے اور موبائلوں کا سیلاب۔ اتنے زیادہ سیلاب ہیں کہ میرا دل چاہتا ہے کہ ایک کتاب لکھوں جس کا عنوان سیلاب کی تباہ کاریاں لکھوں اور ہر سیلاب کی مکمل تفصیل لکھوں۔ پنجاب میں پچھلے دنوں چند شہروں کے علاوہ تمام پنجاب ڈوبا ہوا تھا۔ میرے خیال میں پاکستان ایک بریانی کی ایسی دیگ ہے کہ اس میں سے چاول ختم ہونے کا نام نہیں ہے سب مل کر کھا رہے ہیں۔ اس قدرتی آفت سے بچاؤ والے وعدے کرنے والے پتا نہیں کس نشے میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ستاروں پر کمند، تحفہ، احتساب اور ماروی بہت پسند آئیں۔ باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔ مسافر دیوانہ کون ہے پتا نہیں۔ دہشت خیال کیوں ہے پتا نہیں، یہ نام شاید کسی کہانی کا ہے۔ ابرار ارشد، سعدیہ بخاری، علی رحمٰن، جنید احمد ملک، رمضان پاشا، مہرین ناز، قدرت اللہ نیازی کے تبصرے پسند آئے۔ محفل شعر و سخن میں فہیم شناس، بشیر احمد بھٹی، مہرین ناز، نادیہ ایمان، سوہائی، مہ جبین اور ساز پری کے اشعار پسند آئے۔"

✠ **اطہر حسین**، ڈیفنس کراچی سے حاضر ہوئے ہیں "اکتوبر کا سسپنس جب ملا تو عجیب سی راحت ملی۔ تاہم ایلیا صاحب کا انشائیہ پڑھا تو ہم بھی "اندازے" لگانے کی کوشش میں مصروف ہوگئے۔ اداریے کو پڑھ کر افسردہ ہوگئے کہ جانے ہم لوگوں کو کب کوئی مخلص راہنما ملے گا۔ ملکی حالات بد سے بدتر ہوتے جارہے ہیں۔ سرحد پر بھارتی جارحیت بڑھتی جارہی ہے اور بھارت بدمست ہاتھی کی طرح اپنی سرکشی دکھا رہا ہے۔ جانے اس کے عزائم کیا ہیں مگر نقصان تو عام آدمی کا ہی ہو رہا ہے۔ کتنی جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔ بہرحال اللہ پاک ہمارے ملک کو حفظ و امان میں رکھے۔ کہانیوں میں پہلے ستاروں پر کمند پڑھی۔ مغل صاحب کی تحریر دلوں پر اثر کرتی ہے اور یہی ایک رائٹر کی قابلیت کا ثبوت ہے۔ ان کی تحریر جب تک مکمل نہ پڑھ لی جائے، اسے ادھورا چھوڑنا ناممکن لگتا ہے۔ ماروی میں کچھ خاص مزہ نہیں یوں تو محی الدین نواب کا نام بہت بڑا ہے مگر نہ جانے کیوں ماروی میں وہ بات نہیں جو ان کی کہانیوں میں ہوتی ہے جو حالات و واقعات بیان کیے جارہے ہیں وہ غیر حقیقی سے لگتے ہیں یہ ہماری ناقص رائے ہے۔ خیر...... ایچ اقبال کی تصویر زوال بڑی عمدہ تاریخی کہانی تھی۔ قید خانہ کاشف زبیر صاحب کی بہترین تحریر تھی جس میں انسانی جبلت کے پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے کہ انسان کو بھلے آسائشات میسر ہوں مگر آزادی کے حصول کے لیے وہ آسائشات کو بھی ٹھکرا دیتا ہے۔ ملک صفدر حیات کی کہانی نیکی آباد بس گزارے لائق تھی۔ تحفہ بھی بس ٹھیک تھی۔ وعدہ تو کیا ہوتا دل کو چھو لینے والی تحریر تھی۔ رضوانہ ساجد نے حضرت ابراہیمؑ کے واقعات بیان کیے۔ جنہیں پڑھ کر ایمان تازہ ہوگیا اور قربانی کی عظیم مثال ملی۔ دیدۂ تر میں جنگ کی تباہ کاریوں سے آگاہ کیا گیا اور ایک دوست نے اپنے دوست کی تکلیف ختم کی۔ شہ مات بہتر کہانی تھی۔ شمارہ کی آخری کہانی ش صغیر ادیب صاحب کے قلم کا شاہکار تھا۔ بشو کے حالاتِ زندگی نے آنکھوں کو نم کر دیا۔ لیکن اس نے ثابت قدمی سے حالات کا مقابلہ کیا اور معاشرے کو آئینہ دکھایا۔ بہترین تحریر تھی۔ کترنیں بھی اچھی تھیں۔ مجموعی طور پر شمارہ بہترین تھا۔"

✠ **ہارون بیبرس** ...... مردان سے تشریف لائے ہیں "سرورق سے آنکھیں چار ہوئیں تو میں حیران ہوئے بنا نہیں رہ سکا۔ ارے ذاکر انکل، یہ کیا...... سپر اسٹار صائمہ، سونے پہ سہاگا صائمہ کی آنکھوں میں سرمہ سلائی...... میں بے اختیار گنگنانے لگا۔ "اگر تیری آنکھوں میں کاجل نہ ہوتا" ویلڈن ذاکر

انکل، سرفہرست جناب اعجاز احمد راحیل بھائی کے ہم شہر مسافر دیوانہ صاحب ٹھہرے۔ موصوف کے لکھنے کا انداز بہت اچھا لگا۔ دیگر پختہ تبصرہ نگاروں کی طرح جناب بھی پختہ قلم کے مالک رہے۔ مبارک باد قبول ہو بھائی۔ جناب ادریس احمد خان صاحب! آپ کی صحت اب کیسی ہے؟ ابتدائی صفحات پر من پسند رائٹر ایچ اقبال صاحب کی سلطنت عثمانیہ کے پس منظر میں لکھی ہوئی کہانی...... سلطان سلیمان عالی شان کے دور کے حالات و واقعات سے کافی حد تک آگاہی حاصل ہوئی۔ سلطان خرم کی خودسری اور شہزادی مہرماہ سلطان کی بے بسی...... واہ واہ۔ ادارے سے درخواست ہے کہ اگلی بار سلطنت عثمانیہ کے ہیرو یعنی خیر الدین باربروسہ کے معرکوں اور یورپ کے خلاف بحری جنگوں پر تھوڑی سی روشنی ڈالی جائے۔ ستاروں پر کمند اس بار فل ایکشن میں رہی۔ اب پتا چلا کہ معصوم کرسٹل وحشی لیوپڈ کے پنجرے میں کیوں پھڑپھڑا رہی تھی۔ میرے خیال میں عادل تو بلی راک جیتے گا پر شاید کرسٹل کو کھودے۔ یہی تو مغل صاحب کے قلم کا خاصہ ہے نا۔ اس بار ملک صفدر حیات صاحب بھی کافی ایکشن میں نظر آئے۔ تاجے کی موت کا قطعی دکھ نہیں ہوا۔ دکھ ہوتا اگر صندل کو کچھ ہوتا اور کیونکر ہوتا، نیکی نے جو یاوری کی اور پھر ملک صاحب کے ہوتے ہوئے مظلوموں اور معصوموں کو دکھ کیونکر پہنچے گا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید صاحب کی وعدہ تو کیا ہوتا بھی، بہت اچھی رہی۔ نواب صاحب کی ماروی نے اب خوب ریس پکڑی ہے۔ مراد کے مقابلے میں محبوب صاحب بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ ماروی محبوب صاحب کی ہے اور مرینہ مراد کی ہے۔ یہ ڈائیلاگ دل کو لگا جب مرینہ فون پر کہتی ہے "ہیلو...... کون؟" مراد کہتا ہے "تمہاری موت"...... اسلامی صفحات پر رضوانہ ساجد صاحبہ کے قلم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سوانح حیات نے تو رلا کے رکھ دیا۔ وہ منظر قابلِ رشک تھا جب حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت حاجرہ بی بی اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو لق و دق صحرا میں چھوڑ کے جانے لگتے ہیں تو حاجرہ پیچھے سے ان کا دامن پکڑ لیتی ہیں اور قدموں سے لپٹ جاتی ہیں۔ حضرت ابراہیم کہتے ہیں کہ یہ میرے دوست کا حکم ہے۔ بے اختیار آنسو چھلک پڑے اور ڈائجسٹ کے صفحات پر جذب ہوگئے۔ آخری صفحات پر اس بار سات سمندر پار سے فیورٹ رائٹر جناب ش صغیر ادیب صاحب حاضر خدمت رہے۔ ہوس، لالچ، خودغرضی اور مطلب پرستی کی تصویر عیاں کرتی تحریر احتساب، اعلیٰ درجے کی تحریر تھی۔ بشو کے بچپن کے حالات اور پھر استاد سمندر اور زینت سے دوستی اور جدائی...... ش صغیر ادیب صاحب کو دونوں ہاتھوں کی سلامی۔"

✠ **کامران خالد**، ملتان سے خط لکھ رہے ہیں "سسپنس اس دفعہ 15 تاریخ کو موصول ہوا اگر مت پوچھیے کہ ہمیں اس کے لیے کتنی مشکلات سے گزرنا پڑا۔ ایک دفعہ بک اسٹال پر پہنچے تو بک اسٹال والے نے معذرت چاہی کہ سسپنس ختم ہو چکا ہے۔ مرتے کیا نہ کرتے کے مصداق شدید گرمی میں پیدل چلتے ہوئے دوسرے بک اسٹال پہنچے اور جب گھر پہنچے تو ہمارا حلیہ بگڑ چکا تھا۔ خیر ٹھنڈا شربت پی کے ہماری جان میں جان آئی۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ، ہم بھی اسی وقت سسپنس لے کے بیٹھ گئے۔ سب سے پہلے ش صغیر ادیب کی کہانی سے پڑھنا شروع کیا۔ یقین جانیے ساری تھکان پل بھر میں رفو چکر ہوگئی۔ مزہ آگیا۔ کہانی نے اپنے سحر میں یوں جکڑا کہ ختم ہونے تک اسی میں گم رہے۔ ہوش تب آیا جب امی نے کھانے کے لیے بلایا اور ہم نہیں اٹھے تو کھری کھری سنائیں۔ خیر مجبوراً کھانا زہر مار کیا۔ جلدی جلدی الٹا سیدھا کھانا کھایا اور پھر آن پہنچے سسپنس کے پاس۔ بس پھر کیا تھا کمرے کی کنڈی لگائی اور زور سے ہانک لگائی کہ کوئی ہمیں بلانے یا ڈسٹرب کرنے کی کوشش نہ کرے۔ بدولت آرام فرما رہے ہیں۔ دوسری کہانی ہر دلعزیز طاہر مغل صاحب کی پڑھی۔ طاہر صاحب کے کیا کہنے۔ ان کی تحریر میں تو پتا نہیں کیا شامل ہوتا ہے کہ بندہ ساکت و صامت سکتہ زدہ سا کہانی میں یوں گم ہوتا ہے کہ دوبارہ واپسی کے لیے خود کو کافی دیر تک کمپوز کرنا پڑتا ہے۔ چھوٹی کہانیاں بھی لاجواب تھیں۔ ماروی ہم نے پڑھی نہیں کیونکہ ماروی پڑھ کر بوریت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ معذرت کے ساتھ، مجموعی طور پر شمارہ لاجواب تھا۔"

✠ **شاہین تبسم**، حیدرآباد سے لکھتی ہیں "سسپنس کا شمارہ ایک کزن نے ہاتھوں میں تھما دیا۔ یوں تو ہم نے کبھی سسپنس نہیں پڑھا مگر جب پڑھنے بیٹھے تو ایسے گم ہوئے کہ نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا۔ اتفاق کہ رسالہ کھولا تو سب سے پہلے ستاروں پر کمند پڑھنا شروع کی۔ بس پھر کیا تھا۔ کہانی کے سحر میں ایسے کھوئے کہ پھر پتا نہ چلا کہ کب کہانی ختم ہوگئی کہانی پڑھ کر ہم نے اپنی کزن کو فون کیا اور اس سے پچھلے شماروں کی بابت معلوم کیا کہ آیا اس کے پاس موجود ہیں۔ اس کا جواب ہاں میں سن کر دل کو طمانیت پہنچی کیونکہ ہمیں طاہر مغل صاحب کی کہانی کی پچھلی قسطیں پڑھنی ہیں...... نہ جانے کیا جنون سوار ہوگیا۔ یہ کسی بھی ڈائجسٹ کے لیے میرا پہلا خط ہے اور میں ستاروں پر کمند پڑھ کے یہ خط لکھ رہی ہوں۔ میرے خیال میں اس طرح کی تحاریر پرچے کی جان ہوتی ہیں اور بلاشبہ اپنی الگ اہمیت رکھتی ہیں۔ ماروی پڑھی مگر ستاروں پر کمند کے آگے پھیکی پھیکی سی لگی۔ رضوانہ ساجد کی تحریر میں ایمان افروز واقعات پڑھے۔ بہت اچھا لگا۔ ش صغیر ادیب کی کہانی پڑھی۔ کیا شاندار تحریر تھی۔ ایک ہی نشست میں ختم کر ڈالی۔ خطوط کی محفل دیکھی اور تمام لوگوں کے خطوط پڑھے۔ اب اگلے ماہ اپنا خط بھی پڑھوں گی۔ شاید جگہ مل جائے۔ ویسے سسپنس میں کہانیوں کا معیار بہت ہی اچھا ہے۔ ہر کہانی بھلے وہ چھوٹی ہو یا بڑی، اپنے آپ میں بیلنس ہے۔ گو کہ مجھے شاعری سے کوئی لگاؤ نہیں مگر جب رسالہ پڑھنے بیٹھی تو لگے ہاتھوں شاعری بھی پڑھ ڈالی۔ یقین جانیں پہلی دفعہ شاعری پڑھنے میں بوریت نہیں ہوئی۔ بہت اچھے اشعار تھے۔ یقیناً اس قسم کا معیاری رسالہ نکالنے میں ادارے کے تمام اراکین کی محنت شامل ہے۔ رسالہ پڑھ کے ہم کافی دیر سوچتے رہے کہ کاش ہم بھی ادارے کے اراکین میں شامل ہوتے۔ میں سسپنس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ اس نے ہمارے اندر سوئے ہوئے مطالعے کے شوق کو بیدار کیا۔ اب ہم اپنی کزن سے پچھلے شمارے منگوا کر ستاروں پر کمند کی پچھلی تمام قسطیں پڑھیں گے۔ چھوٹی کہانیاں کچھ پڑھی ہیں لیکن جو پڑھی ہیں وہ تمام کی تمام بہت اچھی ہیں۔ اللہ پاک سسپنس کو مزید ترقی دے آمین۔ امید ہے کہ ہمارا خط آپ ضرور شامل کریں گے۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔
انجم فاروق ساحلی، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور۔ ایم افضل کھرل، تحصیل و ضلع ننکانہ صاحب۔ محمد رمضان ساحل، پشاور۔ محمد رشید سیال، سوہڑی ضلع سکھر۔ افتخار شیخ، لاہور۔ ناصر رضا، گوجرانوالہ۔ منصور احمد، کراچی۔ کامران واسع، حیدرآباد۔ افتخار حسین، ملتان۔ حمید رضا، کوئٹہ۔ مشتاق خان، اسلام آباد۔

لاوارث

الیاس سیتاپوری

کامیاب وہی رہتا ہے جو جانے والے کل کے آئینے میں آنے والے کل کا عکس دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو... اگر یہی بات ایک سلطنت سے دوسری سلطنت کے بارے میں کہی جائے تو بے جا نہ ہوگی لیکن افسوس... تاریخ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمام حکمرانوں نے تقریباً یکساں روش ہی اختیار کی اور وہی حال ان کے اعمال کا رہا۔ انیس بیش کے فرق سے سازشیں بھی وہی رہیں اور عنایات کا انداز بھی ویسا ہی رہا۔ اسی لیے سمٹنے والی بساط کی ہر چال پھر سے بچھائی جانے والی بساط میں ذرا نئے انداز سے منتقل ہوگئی۔ زیرِنظر تحریر میں بھی ایک ایسے وارث کے متعلق انکشافات ہیں جس کا کوئی وارث ہی نہ تھا۔ یہ تاریخ کی عجب منطق تھی کہ اس کا ایسے حالات میں جنم ہوا کہ رفتہ رفتہ پیش آنے والے واقعات نے ذرے کو آفتاب بنا ڈالا۔ یہ تقدیر بھی عجب شے ہے کسی پر اتنی مہربان کہ فرش سے عرش پر پہنچادے اور کسی سے اتنی پریشان کہ زمین سے بھی پاتال میں دھکیل دے۔ گزرے ہوئے ماہ و سال کے نشیب و فراز کا یہی اظہار تاریخ کہلاتا ہے جس کا ورق ورق جب کھلتا ہے تو پڑھنے والی آنکھوں میں حیرت کا رنگ نمایاں ہوتا جاتا ہے۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

پریشان حال عبداللہ کا نسب خلفائے عباسیہ سے مل جاتا تھا لیکن جب اس نے ہوش سنبھالا تو اپنے ساتھ ہی بغداد اور عالمِ اسلام کو پریشانی اور انتشار میں مبتلا دیکھا۔ چنگیز خاں ماوراءالنہر کی اینٹ سے اینٹ بجا کر واپس گیا تو کچھ عرصے بعد اس کے پوتے ہلاکو خاں نے بغداد کو انسانی خون کے سمندر میں ڈبو دیا۔ شان و شوکت رکھنے والے خاک و خون میں لٹا دیے گئے۔ خلیفہ معتصم باللہ کو قالین میں لپیٹ کر اس طرح ہلاک کر دیا گیا کہ اس کے خون کا ایک قطرہ تک زمین پر نہ گرا۔ شاہی خاندان تباہ و برباد کر دیا گیا۔ زیادہ تر مارے گئے جو زندہ بچ گئے، انہوں نے قرب و جوار کے شہروں اور ملکوں میں پناہ لی اور ایک عام آدمی کی طرح گمنامی پر قناعت کر لی۔

عبداللہ کا تعلق بھی اسی شاہی خاندان سے تھا اور وہ کرمان کے ایک غیر معروف قصبے میں نہایت روکھی پھیکی اور عسرت کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس نے آنکھ کھولتے ہی اور ہوش سنبھالتے ہی اپنے چھوٹے سے خاندان کو محرومیوں کا شکار دیکھا۔ ذرا ذرا سی خواہشیں اسے ذلیل و خوار کر دیتی تھیں۔ اس نے اپنے باپ سے یہ سن رکھا تھا کہ کبھی اس کے آباؤ اجداد عالمِ انسان کے سب سے بڑے حکمران تھے اور بادشاہوں کا عزل و نصب ان کے ادنیٰ سے اشاروں پر موقوف ہوتا تھا لیکن آج یہ ساری باتیں ہوائی سی محسوس ہوتی تھیں۔ باپ نے مرتے وقت اپنی سب سے قیمتی شے شجرۂ نسب اس کے حوالے کیا تھا اور تاکیداً کہا تھا کہ بیٹے عبداللہ! اس کی تو اپنی جان سے زیادہ حفاظت کرے گا اور معلوم نہیں

کب یہ تیرے کام آجائے۔

باپ مر گیا، اس نے کسی غریب خاندان میں شادی کرلی۔ گزر اوقات کے لیے اس نے مدرسی کا پیشہ اختیار کیا۔ قصبے میں غربت زیادہ تھی ثروت کم۔ لوگ جو کچھ دے دیتے اسے صبر و شکر سے قبول کرلیتا اور جو کچھ ملتا اسے بہت ہی احتیاط سے خرچ کرتا۔ اس احتیاط نے بخل کی شکل اختیار کرلی۔ رفتہ رفتہ یہ عادت فطرتِ ثانیہ بن گئی۔ وہ اپنی خواہشوں کو دبانے لگا اور پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ خرچ کرنا ہی بھلا بیٹھا اور اس کی کوشش یہ رہنے لگی کہ اگر اس کی خواہشیں کسی طرح خرچ کیے بغیر ہی پوری ہوجائیں تو بہتر ہے ورنہ اپنی محرومی پر صبر کرلیا جائے۔ قصبے والوں کو جب عبداللہ کی اس عادت کا علم ہوا تو وہ مل جل کر اس کی خواہشیں پوری کرنے لگے۔ عبداللہ کی بیوی غریب خاندان کی ضرور تھی لیکن غیرت مند تھی۔ اسے اپنے شوہر کی یہ عادت بالکل پسند نہیں تھی۔ شروع شروع میں تو اس نے اپنے شوہر کی اس عادت کے خلاف احتجاج کیا لیکن جب اس کا یہ احتجاج بے اثر ثابت ہوا تو اس نے پُرسکوت منفی رویہ اختیار کیا۔ وہ عبداللہ کی بیوی ہونے کے باوجود ذہنی طور پر اس سے دور ہوتی چلی گئی۔

عبداللہ نے یہ دلچسپ روش اختیار کی کہ وہ خود کو خرچ سے بچانے کے لیے قصبے والوں کا مہمان بننے لگا۔ مان نہ مان میں تیرا مہمان۔ آج کا کھانا قصبے کے بڑھئی کے گھر تو کل کا کھانا لوہار کے گھر، پرسوں کا کسی دکاندار کے پاس۔ اس نے مہینے کے تیس دنوں کو تیس گھرانوں میں تقسیم کردیا تھا۔ اس طرح وہ کسی گھر پر وبال نہیں بنتا تھا۔ لوگ شرفِ میزبانی پر بہت خوش ہوتے لیکن اس دوران ایک نئی مصیبت اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی بیوی نے شوہر کی اس عادت کے خلاف ہنگامہ کھڑا کردیا۔

اس نے کہا۔ ”میں اس بھیک میں تمہارا ساتھ نہیں دوں گی۔“

عبداللہ نے حیران ہوکر سوال کیا۔ ”کیسی بھیک؟ کہاں کی بھیک؟ یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟“

بیوی نے تنک کر جواب دیا۔ ”میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں، تم اسے بھیک مانگنا کہو یا نہ کہو لیکن یہ طے ہے کہ یہ کام بھک منگوں ہی کا ہے اور اس کام میں، میں تمہاری شریک نہیں ہوسکتی۔“

عبداللہ کو غصہ آگیا، چیخ کر بولا۔ ”نہ بن میری شریک کار...... اری بدبخت! ہم کسی کو شرفِ میہمانی بخش کر اسے میزبانی کا ثواب بہم پہنچاتے ہیں۔ یہ بھی ایک قسم کی نیکی ہے جو تیری ناقص عقل میں نہیں آتی۔“

بیوی نے اپنا مختصر سامان سمیٹا اور بچے کو گود میں اٹھالیا۔ عبداللہ نے پوچھا۔ ”یہ کیا...... یہ تو کر کیا رہی ہے؟“

بیوی نے جواب دیا۔ ”اب میں اس گھر میں نہیں رہوں گی، جب تک میں اپنے باپ کے گھر رہی کسی کا ایک وقت کا بھی احسان نہ اٹھایا اور اب جب میں اپنے گھر کی ہوچکی ہوں تو میرے تیرے گھر کے ٹکڑوں پر زندگی گزاروں...... نہیں، ہرگز نہیں۔ مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا۔“

عبداللہ نے کہا۔ ”اگر تو نے مجھ سے علیحدگی کا فیصلہ ہی کرلیا ہے تو اور بات ہے ورنہ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ایک عورت اپنے شوہر کا حکم نہ مانے۔“

بیوی نے جواب دیا۔ ”میں تمہارا ہر حکم مان سکتی ہوں لیکن تمہاری موجودگی میں دوسروں کے ٹکڑوں پر زندہ رہنا ہرگز پسند نہیں کروں گی۔“

عبداللہ نے کہا۔ ”تیری مرضی، میں یہ معاملہ تیرے خاندان والوں کے سامنے پیش کروں گا۔ وہ جو فیصلہ کریں گے اس پر تو رضامند ہوجائے گی؟“

بیوی نے جواب دیا۔ ”ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتی لیکن مجھے نظر تو یہی آتا ہے کہ... اب ہم دونوں زیادہ دن تک ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔“

عبداللہ اپنی بیوی کا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا اور اس کی گود کے بچے کو محبت بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔ کبھی وہ بیوی کو دیکھتا اور کبھی بچے کو۔ اس کے اندر ایک جنگ جاری تھی، خوف ناک جنگ۔ ایک طرف طبیعت کی کنجوسی تھی، بخل تھا اور دوسری طرف بیوی بچے کی محبت تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کسے چھوڑے اور کسے پکڑے۔

بیوی نے ترشی سے کہا۔ ”میرا راستہ کیوں روکے کھڑے ہو؟“

عبداللہ نے اپنے پھیلے ہوئے ہاتھ سمیٹ لیے اور غیر جذباتی آواز میں بولا۔ ”اب تم جاسکتی ہو اور میں نہایت غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بیوی اور بچے کے بغیر تو میں زندہ رہ سکتا ہوں لیکن درہم و دینار کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ مجھے اپنے مستقبل کے لیے دولت جمع کرنی ہے۔ مال و زر اکٹھا کرنا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ بچت کروں۔“

بیوی آگ بگولا ہوکر غصے میں باہر نکل گئی۔ بڑبڑاتی ہوئی بولی۔ ”بخیل انسان اگر بیوی بچہ اتنے ہی غیر ضروری

ہیں تو اب میں اس گھر میں قدم تک نہ رکھوں گی، چاہے تو کتنی ہی خوشامد کیوں نہ کرلے۔“

بیوی، بچے کو لے کر چلی گئی۔ عبداللہ سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تو تنہائی کا احساس اسے ستاتا رہا، آخر اس کے ہونٹوں پر ہنسی کھیل گئی۔ بولا۔ ”ارے واہ، اس میں پریشانی کی کیا بات ہے، آخر بیوی بچے کے بغیر بھی تو رہ چکا ہوں۔ بس عادی ہونے کی بات ہے، رفتہ رفتہ عادی ہوجاؤں گا۔“

بیوی کی عدم موجودگی میں عبداللہ نے اپنے منصوبے پر بڑی دیانت داری اور لگن سے عمل کیا۔ پچیسویں دن کا کھانا بیوی کے گھر والوں میں کھانا تھا۔ وہ اپنے منصوبے کے مطابق اپنی سسرال پہنچ گیا۔ اس کا سسر داماد کی آمد سے پہلے ہی مطلع ہوچکا تھا۔ اس نے عبداللہ کے پہنچنے سے پہلے ہی خاندان والوں کو اکٹھا کرلیا تھا۔

عبداللہ پہنچا تو ہر ایک نے خوش اخلاقی سے اس کا استقبال کیا لیکن اس کے سسر نے کراہیت سے منہ پھیر لیا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد لوگوں نے خوش گپیاں شروع کردیں۔ ان میں سے بعض عبداللہ کی ہجو و تضحیک میں مشغول ہوگئے۔ ان مہمانوں میں ایک ایسا شخص بھی موجود تھا جو ہندوستان کی سیر کرکے وہاں واپس پہنچا تھا۔

خاندان والوں نے عبداللہ سے پوچھا۔ ”عبداللہ! کیا تو بتاسکتا ہے کہ اپنی بیوی اور بچے کے بارے میں تیرے کیا ارادے ہیں؟“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”میں ان کے بارے میں نہیں سوچا کرتا، جو اپنا راستہ بدل کر شوہر کا ساتھ اور گھر چھوڑ دیا کریں۔ میری بیوی نے بھی یہی کیا اس لیے میں بھی یہ قدم اٹھانے پر مجبور ہوگیا۔“

سسر نے کہا۔ ”تم میری بیٹی کو طلاق دے دو۔“

عبداللہ نے پوچھا۔ ”یہ مطالبہ تیرا ہے یا تیری بیٹی کا؟“

”میرا بھی اور میری بیٹی کا بھی، کیوں؟“

عبداللہ نے کہا۔ ”میں اپنی بیوی سے خود معلوم کروں گا اگر وہ طلاق کی ضد کرے گی تو میں طلاق بھی دے دوں گا۔“

ہندوستان کے سیاح نے ہنس کر دریافت کیا۔ ”کیا باتیں ہورہی ہیں؟“

سسر نے اعلان کیا۔ ”میں اپنی بیٹی کے لیے اس سے طلاق کا مطالبہ کررہا ہوں۔“

سیاح نے دریافت کیا۔ ”کیا یہ درست ہے کہ عبداللہ خلفائے بنو عباس کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے؟“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”ہاں، یہ بالکل درست ہے۔ اگر تو چاہے تو میں اپنا شجرۂ نسب بھی تجھے دکھاسکتا ہوں۔“

سیاح نے بے دلی سے کہا۔ ”میں تیرا شجرۂ نسب دیکھ کر کیا کروں گا لیکن تجھے ایک شاندار مشورہ ضرور دوں گا۔“

عبداللہ نے پُرشوق لہجے میں کہا۔ ”کیسا مشورہ...... ذرا میں بھی تو سنوں؟“

سیاح نے جواب دیا۔ ”اگر تجھ میں سیر و سفر کی ہمت ہے تو ہندوستان چلا جا، زندگی موت کا کوئی بھروسا نہیں، وہاں کا بادشاہ محمد تغلق عباسی خلیفہ کی بڑی عزت کرتا ہے اور تو چونکہ عباسی خاندان ہی کا ایک فرد ہے اس لیے مجھے یقین ہے کہ بادشاہ تجھے اتنا نواز دے گا کہ اتنا تیرے خواب و خیال میں بھی نہ ہوگا۔“

عبداللہ نے معصومیت سے پوچھا۔ ”کیا ہندوستانی بادشاہ میرے افلاس کا علاج کرسکتا ہے؟“

”بالکل کرسکتا ہے۔“

عبداللہ خیالی محل تعمیر کرنے لگا، پھر پوچھا۔ ”کیا وہ بہت زیادہ فراخ دل ہے؟“

سیاح نے جواب دیا۔ ”خیال اور تصور سے زیادہ...... تو وہاں چلا جا لیکن شرط یہی ہے کہ تو اپنا شجرۂ نسب بھی اپنے ساتھ لیتا جا، اگر تو بادشاہ کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہوگیا کہ تیرا شجرۂ نسب درست ہے تو اتنی زیادہ دولت اور عزت حاصل کرلے گا کہ اتنا تیرے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا۔“

خاندان کے کئی بڑے بوڑھے عبداللہ سے الجھ گئے اور اسے طلاق دینے پر مجبور کرنے لگے۔ عبداللہ نے جواب دیا۔ ”میں اس وقت تک طلاق نہیں دوں گا جب تک میری بیوی خود طلاق کا مطالبہ نہیں کرے گی۔“

کسی بزرگ نے عبداللہ کے سسر سے دریافت کیا۔ ”لڑکی کیا کہتی ہے؟“

سسر نے جواب دیا۔ ”وہ اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔“

بڑے میاں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”تب پھر کیا ہے، دونوں کو آمنے سامنے کھڑا کرکے طلاق نامہ لکھوالو۔“

کچھ دیر بعد دونوں ایک چھوٹی سی چوپال میں جمع ہوگئے۔ ان کے دائیں بائیں خاندان کے بزرگ کھڑے ہوگئے۔ لڑکی کا باپ جلاد کی طرح ان دونوں کے درمیان کھڑا ہوگیا۔ عبداللہ کا بچہ اس وقت بھی ماں کی گود میں تھا۔

بچے کے نانا نے بآوازِ بلند کہا۔ ”زبیدہ! ہم خاندان کے بزرگ تیرے خسیس شوہر سے طلاق کا مطالبہ کررہے ہیں لیکن تیرا شوہر عبداللہ کہتا ہے کہ جب تک تو خود اپنی زبان

سے طلاق کا مطالبہ نہیں کرے گی تیرا شوہر تجھے طلاق نہیں دے گا۔ اس لیے ہم خاندانی بزرگ خاندان کی عزت و وقار کے نام پر تجھ سے درخواست کرتے ہیں کہ تو اپنی زبان سے بھی طلاق کا مطالبہ کر دے۔"

زبیدہ خاموش کھڑی اپنے شوہر کی صورت دیکھتی رہی۔ عبداللہ بھی بڑی حسرت سے اس کی صورت تکتا رہا۔ اس وقت اس کے پائے ثبات میں لرزش سی آگئی تھی۔ بیوی اور بچے کی محبت غالب آرہی تھی۔

زبیدہ کے باپ نے اصرار کیا۔ "زبیدہ! کیا سوچ رہی ہے؟ وقت مت ضائع کر، یہ حسین نوجوان بالآخر تجھ سے بھی بھیک منگوا دے گا۔ تو اس سے طلاق کا مطالبہ کر دے۔"

عبداللہ نے زبیدہ کو بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ جلدی سے بول پڑا۔ "زبیدہ! کیا تو واقعی طلاق چاہتی ہے؟"

زبیدہ نے جواب دیا۔ "میں دوسروں کے ٹکڑوں پر زندہ رہنا نہیں چاہتی۔"

باپ نے بے چینی سے کہا۔ "فضول باتیں نہ کر، سیدھی سادی طلاق کی بات کر۔"

زبیدہ نے عبداللہ سے کہا۔ "اگر تم یہ وعدہ کرو کہ مجھے اور میرے بچے کو عزت و آبرو سے رکھو گے تو میں طلاق کی بات نہیں کروں گی۔"

عبداللہ نے جواب دیا۔ "زبیدہ! میں جو کچھ بھی پس انداز کروں گا، وہ مستقبل میں تیرے اور تیرے بچے ہی کے کام آئے گا۔"

زبیدہ نے چڑ کر کہا۔ "عبداللہ! معلوم نہیں تم اتنی نادانی کی بات کیوں کرتے ہو۔ جو رقم آج کام نہ آسکی، وہ پس انداز ہونے کے بعد کل کس طرح کام آئے گی؟"

زبیدہ کے باپ نے غصے سے کہا۔ "میں پھر یہی کہوں گا کہ تو فضول باتوں میں خواہ مخواہ ہم سب کا وقت برباد کر رہی ہے۔"

زبیدہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ عبداللہ نے کہا۔ "اگر تو واقعی طلاق چاہتی ہے تو میں انکار نہیں کروں گا کیونکہ ابھی ابھی اچانک مجھ پر انکشاف ہوا ہے کہ میں تیری دل شکنی نہیں کرسکتا۔ میں تجھے خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔"

زبیدہ نے روہانسی آواز میں کہا۔ "خوب، اپنی ہر بات کی تم اپنے عمل سے تردید کیے جا رہے ہو۔ مجھے خوش دیکھنا چاہتے ہو اور مجھ سے دریوزہ گری بھی کروانا چاہتے ہو۔"

ایک کہن سال بزرگ نے طیش میں کہا۔ "لڑکی! تو سیدھی طلاق کی بات کر، اب ان فضول باتوں کا وقت نہیں رہا۔"

زبیدہ نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا، بولی۔ "میں طلاق نہیں لوں گی۔ مجھے دوسری شادی نہیں کرنی ہے پھر طلاق لے کر کیا کروں گی۔ ہاں یہ وعدہ کرتی ہوں کہ عبداللہ سے انتہائی محبت کرنے کے باوجود جب تک یہ اپنی خست ترک نہ کر دے، اس کے پاس نہیں جاؤں گی۔" پھر اپنے باپ اور دوسرے بزرگوں کی طرف سرسری نظر ڈالی۔ پوچھا۔ "میرے بزرگو! میرا خیال ہے میں اپنے خاندانی وقار کو اس طرح بھی برقرار رکھ سکتی ہوں۔"

زبیدہ کے باپ نے کہا۔ "تو کیسی حماقت کی بات کر رہی ہے زبیدہ! کیا تو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول نہیں سنا کہ اگر تجھ سے یہ کہا جائے کہ فلاں پہاڑ نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو اس پر یقین کر لینا مگر اس پر ہرگز یقین نہ کرنا کہ کسی آدمی کی فطرت بدل گئی۔"

زبیدہ نے سوگواری سے جواب دیا۔ "اس قول سے آپ کو یہ یقین دلانا چاہتی ہوں کہ میری فطرت بھی نہیں بدلے گی، میں نہ تو اس خسیس شخص کے پاس رہ سکتی ہوں اور نہ ہی طلاق لے کر دوسری شادی کر سکتی ہوں۔"

عبداللہ کچھ دیر کھڑا بیوی کی پشت پر نظریں جمائے رہا پھر اس کے قریب جا کر اس کے سر کو بوسہ دیا، بولا۔ "زبیدہ! میں بھی تجھ سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اگر خست میری فطرت نہیں ہے تو میں اس عادت کو ترک کرنے میں کسی نہ کسی دن ضرور کامیاب ہو جاؤں گا اور تجھے ایک بار پھر اپنے ساتھ رکھنے کی کوشش کروں گا اور اگر بالفرض محال میں اپنی فطرت نہ بدل سکا تو میں تیری ہی طرح تجھے یہ یقین بھی دلا دوں کہ میں بھی دوسری شادی نہیں کروں گا۔"

اس کے بعد عبداللہ نے اپنے بچے کو گود میں لے کر جی بھر کے پیار کیا اور بیوی کو دیکھے بغیر چپ چاپ چوپال سے باہر نکل گیا۔

عبداللہ کے کئی دن بڑی پریشانی اور کرب سے گزرے۔ وہ کبھی ٹہلنے لگتا، کبھی لیٹ جاتا، کبھی قصبے کی گلی کوچوں میں بے مقصد آوارہ گردی کرنے لگتا۔ کئی بار زبیدہ اور اپنے بچے کا خیال آیا اور پاؤں خود بخود اس طرف اٹھنے لگے لیکن پھر وہ سنبھل گیا اور اپنے کلبۂ احزاں میں منہ ڈھانپ کر پڑ رہا۔ اسے دونوں ہی باتیں محال نظر آرہی تھیں۔ وہ نہ تو بخل ختم کرسکتا تھا اور نہ ہی زبیدہ اور اپنے بچے کو چھوڑ سکتا تھا پھر یکایک اسے ہندوستان کے سیاح کا خیال آگیا۔ وہ اس کی تلاش میں نکل گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے کی تلاش بسیار کے بعد ایک طبیب کے مطب میں مل گیا۔ دونوں بڑی گرم جوشی سے ملے۔

سیاح نے کہا۔ "کہو کیا سوچا ہے تم نے؟ اگر تم واقعی ہندوستان جانے میں دلچسپی رکھتے ہو تو جلدی نکل جاؤ، بادشاہ تمہاری قدر کرے گا۔"

عبداللہ نے ہچکچاہٹ سے جواب دیا۔ "میرے پاس جانے کے لیے خرچہ نہیں ہے۔ اس کا انتظام کر لوں تو جانے کا ارادہ کروں۔"

سیاح نے کہا۔ "سفر کا ارادہ کر لو، سارے کام خود بخود ہو جائیں گے۔"

عبداللہ نے پوچھا۔ "خود بخود کہاں سے ہو جائیں گے سارے کام؟"

سیاح نے بحث کرنا فضول سمجھا اور اس کے پاس سے ہٹنے لگا، بولا۔ "دیکھو عبداللہ! میں تو بس ایک ہی بات جانتا ہوں کہ تم کتنے ہی منصوبے بنالو، کام نہیں ہوگا اور ہوگا تو اس طرح ہو جائے گا کہ تمہاری اپنی عقل حیران رہ جائے گی۔"

عبداللہ کو دولت کی ہوس ہندوستان جانے پر اکسا رہی تھی لیکن جب یہ سوچتا کہ اگر ہندوستان میں اس کی قدر نہ کی گئی اور بادشاہ نے اسے اذن باریابی ہی نہ بخشا تو اس کا کیا حشر ہوگا لیکن سیاح نے بادشاہ کی دریا دلی اور عباسی خلفا سے محبت و عقیدت رکھنے کا کچھ ایسے ساحرانہ انداز میں ذکر کیا کہ عبداللہ ہندوستان جانے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے روانگی سے پہلے بیوی اور بچے سے محض اس لیے ملاقات نہیں کی کہ کہیں اس کے ارادے میں ضعف نہ پیدا ہو جائے۔ اس نے اپنے دل میں یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ اگر قسمت نے یاوری کی اور بادشاہ کی نوازشوں اور مہربانیوں نے اسے کسی لائق کر دیا تو وہ زبیدہ اور بچے کو وہیں بلوا لے گا۔

عبداللہ پہلے تو ایک قافلے کے ساتھ قندھار پہنچا، اس کے بعد وہ برصغیر میں داخل ہو گیا پھر اس نے دریائے سندھ عبور کیا۔ دریا کے دوسرے کنارے پر بادشاہ کا وقائع نویس اس کا منتظر کھڑا تھا۔ عبداللہ سے اس وقائع نویس نے دریافت کیا۔

"اس ملک میں تمہارا کوئی عزیز، رشتے دار ہے یا نہیں؟"

"اس ملک میں میرا کوئی بھی نہیں۔ میں تنہا انسان ہوں جسے بادشاہ کی پردیس نوازی یہاں کھینچ لائی ہے۔"

وقائع نویس نے سرگوشی میں سوال کیا۔ "تو تنہا ہے یا کوئی اور بھی ہے تیرے ساتھ؟"

عبداللہ نے تنک مزاجی سے جواب دیا۔ "میں کس طرح بتاؤں کہ میں اس ملک میں بالکل تنہا ہوں۔ بس محبت بھرا دل اپنے سینے میں ضرور رکھتا ہوں۔"

وقائع نویس نے ازراہِ مذاق کہا۔ "میں تیرے محبت بھرے دل کا ذکر بھی شاہی ڈاک میں کر دوں گا۔"

عبداللہ نے وہ دن آرام میں صرف کر دیا۔ مقامی لوگ اس سے ملنا چاہتے تھے لیکن وہ تکان اور پریشانی کی وجہ سے کسی سے بھی نہ مل سکا۔

ایک دن وقائع نویس نے اس سے پوچھا۔ "تیری آمد کی اطلاع اور دوسری تفصیلات بادشاہ کو لکھ کر بھیج دی گئی ہیں، اب تو یہ بتا کہ تیرے حالات اور تفصیلات میں کوئی ایسی بات تو نہیں رہ گئی ہے جو نہایت اہم ہو اور جسے تو سہواً نہ بتا سکا ہو؟"

عبداللہ نے جواب دیا۔ "ہاں، ایک نہایت ضروری بات میں تیرے علم میں لانا بھول ہی گیا تھا۔ تو بادشاہ کو مطلع کر دے کہ میرا تعلق خلفائے بنو عباسیہ کے خاندان سے ہے، میں نے سنا ہے کہ بادشاہ اس خاندان کی بڑی عزت کرتا ہے۔"

وقائع نویس نے جواب دیا۔ "تو نے بالکل صحیح سنا ہے لیکن کیا تو نے بادشاہ کی بابت کوئی اور ضروری بات بھی سن رکھی ہے؟"

عبداللہ نے کہا۔ "یوں تو میں نے بادشاہ کی بابت معلوم نہیں کیا کچھ سن رکھا ہے مثلاً یہ کہ بادشاہ عباسی خاندان کے افراد کی بڑی عزت کرتا ہے، پردیسیوں کی قدر کرتا ہے۔ بادشاہ کی ذات مجموعہ اضداد ہے۔ بادشاہ سخاوت اور داد و دہش میں......"

وقائع نویس نے بات کاٹ دی، بولا۔ "یہ ساری خصوصیات اور اوصاف تو ایک زمانہ جانتا ہے لیکن ایک ایسی صفت جس سے سبھی واقف تو ہیں لیکن اسے ذہن اور حافظے میں محفوظ نہیں رکھتے۔ میں چاہتا ہوں کہ جب تو بادشاہ سے ملاقات کرے تو تجھے بادشاہ کی اس صفت کا علم بھی ہونا چاہیے۔"

عبداللہ نے سوالیہ نظروں سے وقائع نویس کو دیکھا اور دھیمی آواز میں سوال کیا۔ "وہ کون سی صفت ہے جس کا علم تیری نظر میں اتنا زیادہ ضروری ہے؟"

وقائع نویس نے جواب دیا۔ "یہ صفت کہ ہمارا بادشاہ صد درجہ عادل اور راست باز بھی ہے۔ تو کہتا ہے کہ تیرا تعلق خلفائے بنو عباسیہ کے خاندان سے ہے اور تو آیا ہے کرمان کے کسی غیر معروف قصبے سے۔ اگر تو اپنے دعوے کو سچ ثابت نہ کرسکا تو بادشاہ تیرے حق میں فرشتۂ اجل بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ جھوٹوں کو معاف نہیں کرتا۔"

عبداللہ وقتی طور پر خوف زدہ تو ضرور ہوگیا لیکن پھر اپنے شجرۂ نسب کی موجودگی سے ایک توانائی اور قوت بھی محسوس کی۔

وقائع نویس نے بادشاہ کو مطلع کر دیا کہ عبداللہ بغداد کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ بات غلط ہو لیکن ایک ادنیٰ وقائع نویس عبداللہ کے اس دعوے کی تردید یا تصدیق نہیں کرسکتا۔ کہاں بغداد کا شاہی خاندان اور کہاں ہندوستان کا ایک معمولی وقائع نویس پھر بھی اس ناچیز نے عبداللہ کو حضورِ والا کی عدالت اور سیاست سے خبردار کر دیا ہے۔ وقائع نویس کے پرچے نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ بادشاہ نے ایک خط اپنے ہاتھ سے عبداللہ کے نام لکھا اور درخواست کی کہ وہ کسی توقف کے بغیر دہلی آجائے۔ راہ خرچ کے لیے تیس ہزار دینار بھیج دیے۔

عبداللہ فوراً ہی چل پڑا۔ وہ حیران تھا کہ اس کے ساتھ جو کچھ پیش آرہا ہے، کہیں یہ خواب تو نہیں ہے۔

دہلی سے تقریباً نوّے پچانوے میل دور سیرسا میں قاضی کمال الدین صدر جہاں، فقہاء کی جماعت کے ساتھ عبداللہ کے استقبال کو پہلے سے پہنچ چکا تھا۔ صدر جہاں نے عبداللہ کو ایک شاندار محل میں ٹھہرایا اور نہایت عقیدت واحترام سے اس کا شجرۂ نسب ملاحظہ کیا پھر اسی وقت بادشاہ کی خدمت میں اپنا آدمی روانہ کر دیا کہ عبداللہ واقعی خلفائے بنوعباس ہی کے خاندان کا ایک فرد ہے۔ جواب میں بادشاہ نے امیروں کی ایک دوسری جماعت بھی عبداللہ کے استقبال کے لیے روانہ کر دی پھر جب عبداللہ اپنے استقبالیوں کے ساتھ دہلی کے قریب مسعود آباد پہنچا تو وہاں بادشاہ محمد تغلق بھی اپنے امراء کے ساتھ اس کے استقبال کو پہنچ چکا تھا۔ عبداللہ بادشاہ کو دیکھتے ہی گھوڑے سے اتر پڑا اور پاپیادہ بادشاہ کی طرف بڑھا۔ فرطِ ادب اور حالتِ اضطراب میں بادشاہ بھی اپنے گھوڑے سے کود پڑا۔ عبداللہ بادشاہ کے قریب پہنچتے ہی احتراماً زمیں بوس ہوگیا، جواب میں بادشاہ نے بھی یہی کیا اور وہ عبداللہ کے روبرو زمیں بوس ہوگیا۔ وہ ایک عجیب منظر تھا جسے نہ تو پہلے کسی نے دیکھا اور نہ بعد میں کبھی دیکھا گیا۔ بادشاہ اور عبداللہ آمنے سامنے زمیں بوس ہوکر ایک دوسرے کا احترام کر رہے تھے۔ زمیں بوسی کے بعد عبداللہ نے بادشاہ کی خدمت میں کپڑوں کے چند تھان پیش کیے، بولا۔ ''ہندوستان کے عظیم فرماں روا کی خدمت میں ماضی کے حکمران بنوعباس کے ایک عاجز، درماندہ وآوارہ شہزادے کا یہ حقیر سا نذرانہ..... اسے شرفِ قبولیابی بخشا جائے۔''

بادشاہ نے ان میں کا ایک تھان لے کر ادب سے پہلے تو اسے بوسہ دیا پھر سر پر رکھ لیا اور آخر میں کاندھے پر ڈال کر اس طرح زمیں بوس ہوکر عبداللہ کو سلام کیا جس طرح دوسرے لوگ بادشاہ کے ساتھ کیا کرتے تھے پھر بادشاہ کے اشارے پر خالی گھوڑے پیش ہوئے۔ بادشاہ نے ایک گھوڑے کی لگام پکڑ کر سائیس کے انداز میں عبداللہ کی خدمت میں پیش کیا اور درخواست کی۔ ''آپ اس پر سوار ہوجائیں۔''

عبداللہ نے پہلے تو کسی قدر پس وپیش کیا پھر بادشاہ کے اصرار سے مجبور ہوکر گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ بادشاہ نے عبداللہ کے گھوڑے کی رکاب پکڑ لی۔

عبداللہ نے عاجزی سے کہا۔ ''بادشاہ کو اپنے امراء کے سامنے میری اتنی تعظیم نہیں کرنی چاہیے۔''

بادشاہ نے جواب دیا۔ ''یہ میں اس لیے کر رہا ہوں کہ میرے امراء بھی آپ کی اتنی ہی تعظیم کریں۔''

عبداللہ نے کہا۔ ''بادشاہ یا تو خود بھی گھوڑے پر بیٹھ جائے ورنہ میں نیچے اتر پڑوں گا۔''

بادشاہ گھوڑے پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد دوسرے لوگ بھی اپنے اپنے گھوڑوں پر بیٹھ گئے۔

بادشاہ اپنے گھوڑے کو عبداللہ کے گھوڑے کے قریب لے گیا اور اس کے بائیں طرف برابر میں کھڑا ہوگیا۔ شاہی چھتر بردار آگے بڑھے اور چھتر کو اس طرح کھڑا کر دیا کہ بادشاہ اور عبداللہ، دونوں ہی اس چھتر کے نیچے آگئے۔

یہاں بادشاہ نے تواضع کے طور پر اپنے ہاتھ سے عبداللہ کو پان کا بیڑا پیش کیا۔ عبداللہ کے لیے یہ بھی ایک بہت بڑا اعزاز تھا، کیونکہ بادشاہ اپنے ہاتھ سے کسی کو پان نہیں دیتا۔ بادشاہ نے پان پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں خلیفہ ابوالعباس سے بیعت نہ کرچکا تو آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا۔''

عبداللہ نے جواب دیا۔ ''میں خود بھی ابوالعباس کے ہاتھ پر بیعت ہوں۔''

بادشاہ ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ عبداللہ نے کہا۔ ''رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے کہ جس نے بنجر زمین کو زندہ کیا یعنی آباد کیا وہ زمین اس کی ملکیت ہوتی ہے۔ بادشاہ کے احسانات نے ہمیں ازسرِنو زندہ کیا ہے، اب ہم آپ کی رعایا ہیں۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''ایسی باتیں نہ کیجیے کیونکہ میں شرمندگی محسوس کرتا ہوں۔''

اس کے بعد یہ لوگ ان خیموں کی طرف بڑھے جو ان سب کے لیے الگ الگ نصب کیے جاچکے تھے۔ ان میں بادشاہ کا خیمہ دور ہی سے امتیاز کیا جاسکتا تھا۔

شاہی سراچہ (خیمہ) کے سامنے پہنچ کر بادشاہ رک گیا اور اپنے گھوڑے سے اتر کر عبداللہ کی رکاب تھام کر درخواست کی۔ ''آپ گھوڑے سے اتر کر شاہی سراچہ میں تشریف لے چلیں۔''

عبداللہ گھوڑے سے اتر پڑا اور شاہی سراچہ میں چلا گیا۔ بادشاہ نے اپنے لیے الگ خیمہ نصب کروایا۔ وہ رات ان سب نے یہیں گزاری۔ دوسرے دن دارالخلافہ میں داخل ہوئے اور سلطان علاء الدین خلجی اور سلطان قطب الدین خلجی کا تیار کردہ سیری کا محل عبداللہ کے حوالے کر دیا۔ بادشاہ اپنے امراء کے ساتھ اس محل میں خود گیا۔ محل کو ساز و سامان سے پاٹ دیا۔ سونے چاندی کے برتنوں کا ڈھیر لگا دیا گیا۔ چار لاکھ دینار بھی دیے گئے، لونڈی اور غلام بھی پیش کیے گئے۔ سیری کا پورا علاقہ باغوں، مکانوں، زمینوں اور گوداموں سمیت عبداللہ کی جاگیر میں دے دیا گیا۔ اس کے علاوہ سو دیہات بھی دیے گئے۔ دہلی کے مشرقی حصوں کی حکومت بھی بخش دی گئی۔ تیس زریں خچر زینوں سمیت عبداللہ کو عطا ہوئے۔ ان کا چارا دانہ روزانہ سرکاری گودام سے مقرر ہوا۔ عبداللہ کے لیے بادشاہ کا حکم تھا کہ جب یہ بادشاہی محل میں آئے تو گھوڑے سے ہرگز نہ اترے اور جہاں تک بادشاہ کی سواری جاتی ہے عبداللہ بھی جاسکتا ہے۔

عبداللہ پھولا نہ سماتا تھا۔ اسے خلافِ توقع جو کچھ مل گیا تھا، اس پر یقین نہیں آتا تھا۔ وہ بادشاہ کا دل سے مطیع وفرماں بردار ہوگیا۔ یہاں اسے جب بھی اپنا ماضی یاد آتا تو وہ گھبرا کر سوچنا بند کر دیتا۔ کانوں پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کرلیتا۔ وہ اپنے تکلیف دہ ماضی کو اپنی یادداشت اور حافظے سے نکال پھینکنا چاہتا تھا لیکن اپنی ان کوششوں میں وہ اس وقت بالکل ناکام ہوجاتا جب تصور کی آنکھیں سوگوار زبیدہ کو شاکی نظروں سے گھورتا ہوا دیکھ لیتیں۔ وہ تلملا جاتا اور دانت پیس کر کہتا۔ ''زبیدہ! اب میں دہلی میں بیٹھا یہ سوچ رہا ہوں کہ کیا تو مجھ سے واقعی محبت کرتی تھی۔ اگر تجھے مجھ سے محبت ہوتی تو آج تو میرے ساتھ دہلی میں مقیم ہوتی اور میری بے پایاں خوشیوں میں سے اپنا حصہ وصول کرلیتی۔''

پھر سوچتا کہ زبیدہ اور بچے کو اپنے پاس دہلی بلوالے لیکن پھر خرچ پر نظر ڈالتا تو حوصلہ پست ہوجاتا۔

عبداللہ کو اب کوئی غم نہ تھا۔ وہ سارا عیش میسر آگیا تھا جو کسی حکمران وارث کو مل سکتا تھا۔ اس کے در پر حاجت مندوں کا ہجوم رہنے لگا۔ لوگ اس سے سفارشوں کے طالب ہوتے لیکن عبداللہ کسی کے بھی کام نہ آتا۔ امراء اور اعلیٰ عہدے دار اس کی خدمت میں نذرانے پیش کرتے جس سے اس کی دولت وثروت میں دن رات اضافہ ہوتا رہتا۔ اس کے دوستوں کا حلقہ بھی وسیع ہوگیا تھا۔ غیر ملکی تاجر اس کی خدمت میں بڑے قیمتی نذرانے پیش کرتے۔ یہ نذرانے خفیہ طور پر رشوت کی جگہ دیے جاتے تھے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ شخص بڑا خوش نصیب سمجھا جاتا جس کا کوئی کام عبداللہ کے ہاتھوں ہوجاتا۔

مغرب کی نماز پڑھ کر عبداللہ اپنے کمرے میں چلا گیا جو محل کے باغ کے سامنے بنا تھا۔ یہاں ایک بڑی سی کافوری شمع روشن تھی۔ عبداللہ اس کی روشنی میں اپنے آباؤاجداد کی تاریخ پڑھ رہا تھا۔ اسے ہارون رشید اور اس کے ورثاء کی شان وشوکت اور تزک واحتشام کی تفصیل پڑھ کر غصہ آرہا تھا۔ ان کی داد ودہش اور جشن طرب کی روداد یں عبداللہ کے دل پر گھونسے لگا رہی تھیں۔ وہ سوچتا اس کے آباؤاجداد کتنے فضول خرچ تھے۔ اس کے خیال میں ان کی یہ فضول خرچیاں ہی تو تھیں جو آج ان کے ورثاء کوڑی کوڑی کے محتاج شاہانِ عالم کے درباریوں میں صدقہ وخیرات وصول کر رہے ہیں۔ اچانک اس کے ایک غلام نے اسے مطلع کیا۔

''جنابِ والا! ایک خراسانی تاجر اذنِ باریابی کا طالب ہے؟''

عبداللہ کے چہرے پر ایک چمک سی پیدا ہوگئی، پوچھا۔ ''یہ اس وقت خراسانی تاجر کیوں آیا ہے؟ کیا تو نے اسے یہ نہیں بتلایا کہ مابدولت ہرکس وناکس سے ملنا گوارا نہیں فرماتے؟''

غلام نے خوشامد سے کہا۔ ''اس ناچیز نے حسبِ معمول یہ بات کہہ دی تھی لیکن خراسانی تاجر نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اس کا ایک ضروری کام بادشاہ سے آپڑا ہے۔ وہ آپ کے سوا کوئی بھی نہیں کرواسکتا۔''

عبداللہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''بہرحال میں اس کی کوئی سفارش اس وقت تک نہیں کروں گا جب تک میں مطمئن نہ ہوجاؤں۔'' پھر ہاتھ کے اشارے سے غلام کو ذرا اور قریب بلایا اور سرگوشی میں پوچھا۔ ''خراسانی تاجر اپنے ساتھ میرے لیے کیا لایا ہے، کچھ معلوم ہے؟''

غلام نے جواب دیا۔ ''مجھے اس کا کچھ علم نہیں لیکن

تاجر کے ساتھ ایک غلام بھی ہے جس کے کاندھے پر ایک گٹھری رکھی ہے اور ایک عورت بھی ہے جس کی میں اندھیرے کی وجہ سے صورت نہیں دیکھ سکا کہ وہ بوڑھی ہے یا جوان ہے، حسین ہے یا بدصورت۔"

عبداللہ نے کسی قدر تامل سے اجازت دی۔" اچھا تو اسے اس کمرے میں بٹھا جو محل کے دروازے کے قریب ہے تاکہ اسے رخصت کرنے میں دیر نہ لگے، میں آتا ہوں۔"

عورت کے خیال نے عبداللہ کو ذرا مستعد اور پھرتیلا بنا دیا۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا۔ لباس کسی قدر میلا تھا، اسے تبدیل کیا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر سر اور ڈاڑھی کے بالوں کو درست کیا۔ آنکھیں پھیکی پھیکی بے رونق سی محسوس ہوئیں تو ان میں سرمے کی سلائی سے تازگی پیدا کی گئی۔ خشک بالوں میں تیل پڑ گیا، شانے پر طیلسان اس طرح ڈال لی کہ طیلسان کے دونوں سرے گردن کے آس پاس سے گزر کر سینے پر آرہے۔

کچھ دیر بعد بن سنور کر جب عبداللہ خراسانی تاجر کے روبرو پہنچا تو سب سے پہلے عورت کی طرف دیکھا اور اس کا دل زور زور سے اس طرح دھڑکا گویا سینے سے باہر نکل پڑے گا۔ تاجر نے ادب سے سلام کیا اور عبداللہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ عبداللہ نے اس بیس بائیس سالہ لڑکی کو دیکھا تو اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آیا۔ ہوش ربا حسن اور سرو جیسا قد، بڑی بڑی آنکھیں، وہ بھی عبداللہ کو کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ چالاک تاجر اپنے دل میں خوش تھا کہ نشانہ خطا نہیں ہوا۔ اس نے اپنے غلام سے گٹھری لے لی اور اسے کھولتے ہوئے بولا۔

"حضورِ والا! ابھی ملتان ہی میں تھا کہ پتا چل گیا کہ آپ یہاں تشریف رکھتے ہیں۔ میں بغداد سے آیا ہوں۔ مجھے یہاں یہ عجیب بات معلوم ہوئی کہ اہلِ ہند تمام غیر ملکی تاجروں کو خراسانی کہتے ہیں۔"

عبداللہ نے جواب دیا۔" صرف تاجروں ہی کو نہیں بلکہ تمام غیر ملکیوں کو خراسانی کہتے ہیں۔"

تاجر اپنے ہاتھ اس طرح ملنے لگا گویا انہیں دھو رہا ہے، بولا۔" اگر حضور اجازت دیں تو گٹھری کھول دوں اور آپ کے لیے جو حقیر سے نذرانے لایا ہوں، پیش کر کے فخر و سعادت حاصل کر دوں۔"

عبداللہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔" تاجر بڑے لسان ہوتے ہیں، تو ابھی ابھی گٹھری کھولنے جا رہا تھا لیکن اب اس کی اجازت طلب کر رہا ہے، کوئی مضائقہ نہیں۔ میری طرف سے اجازت ہے۔"

تاجر نے گٹھری کے اندر سے نکلنے والے ریشمی تھان کو عبداللہ کے قدموں میں ڈال دیا اور اس کے بعد باری باری قیمتی انگوٹھی، رومال، کھجوریں اور بعض ایسی چیزیں جو بغداد ہی میں مل سکتی تھیں، انہماک اور شوق سے عبداللہ کی خدمت میں پیش کر دیں۔

عبداللہ نے دریافت کیا۔" مجھ سے کوئی کام؟"

تاجر نے جواب دیا۔" میں نیا نیا بغداد سے آیا ہوں، یہاں کے مقامی تاجر مجھ سے حسد کرتے ہیں۔ اسی حسد میں مجھ پر یہ الزام عائد کر دیا گیا کہ میں بادشاہ کے خلاف کسی سازش میں شریک ہوں اور باہر سے گھوڑے لا کر باغیوں کو مضبوط اور منظم کر رہا ہوں حالانکہ میں گھوڑوں کا نہ تو تاجر ہوں، نہ ہی کسی ایسی سازش کا علم رکھتا ہوں جو بادشاہ کے خلاف ہو رہی ہو۔"

عبداللہ نے بے مروتی سے کہا۔" پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ جس چیز کا سرے سے وجود ہی نہ ہو، اس میں تیری شرکت کا الزام عائد کر دیا جائے؟"

تاجر نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔" جناب! یہ مجھ پر تہمت ہے، الزام ہے، بے بنیاد الزام۔ بادشاہ کے آدمی میری تلاش میں ہیں، میں معلوم نہیں کس طرح چھپتا چھپاتا یہاں تک پہنچا ہوں۔ میں پناہ چاہتا ہوں اور سفارش بھی۔ آپ بادشاہ سے میری سفارش کر دیجیے۔"

عبداللہ نے اپنے غلام کو آواز دی۔" قطب الدین، تاجر کے تحائف اندر لے جا۔"

جب قطب الدین تحائف سمیٹنے آیا تو عبداللہ نے اسے ڈانٹا۔" میں نے تجھے ہمیشہ یہی نصیحت کی ہے کہ جب تحفے تحائف آیا کریں تو انہیں میری نظروں کے سامنے سے فوراً ہٹا دیا کر کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ میں ان تحفوں کی طمع میں لوگوں کے غلط سلط جھوٹے سچے کام کرا دیا کروں۔"

غلام قطب الدین تاجر کے تحائف سمیٹ کر اندر لے گیا۔ عبداللہ نے ایک بار پھر لڑکی کو بظاہر اچٹتی مگر نہایت گہری اور ہوس زدہ نظروں سے دیکھا، بولا۔" تیرے تحائف اور نذرانوں کا بہت بہت شکریہ۔ اب ایک بات اور بتا دے۔ تو نے یہ تحائف مجھے نذرانے کے طور پر پیش کیے ہیں یا رشوت سمجھ کر؟"

تاجر نے جواب دیا۔" میں آپ کو رشوت کس طرح دے سکتا ہوں۔ یہ سب کچھ میری طرف سے ہدیہ عقیدت تھا۔"

عبداللہ نے کہا۔" تب پھر اپنے بارے میں میرا

فیصلہ بھی سن لے۔ اگر تو نے کسی سازش میں حصہ نہیں لیا تو بادشاہ تجھے خود ہی چھوڑ دے گا۔ اگر تو واقعی خطا کار ہے تو بادشاہ سے معافی کی امید بھی نہ رکھ اور میں خود نا جائز سفارش کرنے سے رہا۔ اب تو چپ چاپ یہاں سے چلا جا کیونکہ میں کسی شاہی مجرم کو زیادہ دیر اپنے پاس نہیں روک سکتا۔"

تاجر نے فراخ دلی سے کہا۔ "جناب! یہ میری کنیز خیزران ہے اللہ بہتر جانتا ہے کہ اسے شروع سے میں نے آپ کی امانت سمجھا ہے۔ اسے میں ایران سے آپ کے لیے لایا تھا لیکن اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اسے بادشاہ کی نذر کر دیا جائے کیونکہ میں آپ سے ہمدردی اور خلوص کی توقع لے کر آیا تھا جس سے میں محروم رہا۔ اگر میں معاف کر دیا گیا تو یہ کنیز آپ کی ملکیت رہے گی اور اگر معاف نہ کیا گیا تو بادشاہ کو مطلع کر دوں گا کہ وہ اپنی امانت آپ سے حاصل کر لے۔"

عبداللہ کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ خیزران کو پُرشوق نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اگر تو مجھے یہ یقین دلا دے کہ تو بے گناہ ہے تو میں تیری سفارش کر سکتا ہوں۔"

تاجر نے جواب دیا۔ "میں بے گناہ ہوں اور آپ کے بقول میری بے گناہی کے لیے کسی سفارش کی ضرورت ہی نہیں۔ اگر آپ میری سفارش کرنا ہی چاہتے ہیں تو میری بے گناہی اور گناہ گاری کا خیال کیے بغیر ہی کر دیجیے۔"

عبداللہ نے ذرا سکوت اختیار کیا، تاجر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ خیزران سے بولا۔ "خیزران! تو اس وقت تک اسی محل میں رہے گی جب تک میرے مسئلے کا فیصلہ نہ سنا دیا جائے۔ میں جا رہا ہوں۔"

عبداللہ نے سر اوپر اٹھایا، بولا۔ "بغدادی تاجر! ٹھہرو، تم آج کی رات اسی محل میں رہ جاؤ۔ کل بادشاہ سے مل کر سفارش کر دوں گا لیکن سفارش سے پہلے میں ایک بار پھر اس کی وضاحت چاہوں گا کہ اگر میری سفارش سے تمہیں رہائی مل جائے تو اس کے بعد یہ خیزران میری ہو جائے گی۔"

تاجر نے جواب دیا۔ "میں تاجر ہوں اور تاجر قول کے دھنی ہوتے ہیں۔"

عبداللہ نے کہا۔ "اور اس کی وضاحت بھی کر دو کہ خیزران رشوت میں نہیں دے رہے ہو کیونکہ خدا کا فرمان ہے کہ رشوت لینے اور دینے والے جہنمی ہیں۔"

تاجر نے جواب دیا۔ "میں نے خیزران کو تحفے کے طور پر آپ کے حوالے کیا ہے، اس کی وضاحت میں پہلے کر چکا ہوں۔"

عبداللہ نے کہا۔ "تب پھر تو یہیں رہ اور اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کر۔"

عبداللہ نے تاجر کو رات گزارنے کے لیے جو کمرا دیا تھا، اسے باہر سے مقفل کر دیا اور اپنے کمرے سے ملحق کمرے میں خیزران کو ٹھہرایا۔

اس رات عبداللہ بڑی دیر تک جاگتا رہا۔ وہ سونے کی کوشش کرتا مگر نیند کا کہیں پتا نہیں تھا۔ برابر کے کمرے میں کئی شمعیں روشن تھیں حالانکہ خود عبداللہ کے کمرے میں صرف ایک شمع جل رہی تھی۔ کئی بار اس کے جی میں آیا کہ وہ خیزران کے کمرے میں جائے اور ایک کے سوا ساری شمعیں بجھا دے کیونکہ یہ صریحاً فضول خرچی تھی، سراسر بے جا اسراف۔ وہ دیر تک خیزران کے کمرے میں جانے اور نہ جانے کے کشش و پنج میں مبتلا رہا۔ بالآخر وہ بستر سے اٹھا اور آہستہ آہستہ خیزران کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ خیزران نے دروازے اندر سے بند نہیں کیے تھے۔ ذرا سے دباؤ سے کھل گئے۔ وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ خیزران مسہری پر دراز دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہی تھی۔ وہ خیزران کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ تنفس کے اتار چڑھاؤ سے سینہ زیر و بم میں مبتلا تھا۔ بڑی بڑی آنکھوں پر پپوٹوں کی نقاب پڑی تھی۔ عریاں بازو واتنے حسین اور شفاف تھے گویا ان پر سیدہ چھڑک دیا گیا تھا۔ سرخ و سفید رخساروں پر سیاہ بالوں کی لٹیں صبح و شام کے سنگم کا سماں پیش کر رہی تھیں۔ وہ اتنی گہری نیند میں تھی کہ اس کے ہاتھ کہیں تھے پیر کہیں۔ پہلے تو عبداللہ کے جی میں آئی کہ ایک شمع کے علاوہ ساری شمعیں بجھا دے لیکن پھر اس خیال سے باز رہا کہ اس کی یہ حرکت خیزران کو بری نہ لگ جائے۔ کچھ دیر کھڑے رہنے کے بعد اس نے تپائی کھینچ لی اور اس پر بیٹھ کر خیزران کے حسن کا والہانہ انداز میں نظارہ کرنے لگا۔ اس چاند کے ٹکڑے میں ایک سحر تھا، مقناطیسیت تھی کہ عبداللہ اس کے قریب، اس کے سامنے موجود رہنے پر مجبور تھا۔

پھر خیزران نے کروٹ لی اور کروٹ بدلنے کے ساتھ ہی اس کی نیند ٹوٹ گئی۔ نیم وا آنکھوں سے عبداللہ کو دیکھا اور پھر چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔ عبداللہ نے تپائی چھوڑ دی اور خیزران پر جھک گیا۔

"خیزران! تو خوف زدہ مت ہو، یہ میں ہوں عبداللہ۔"

خیزران خوف اور گھبراہٹ میں ادھر ادھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔

عبداللہ نے پوچھا۔ "کیا تو نے کوئی خواب دیکھا ہے؟"

خیزران نے وحشت زدہ آواز میں پوچھا۔ "آپ یہاں اس وقت کیوں آئے ہیں؟"

عبداللہ نے جواب دیا۔ "رات کو میں پورے محل میں گھوم پھر کر خبر گیری کرتا رہتا ہوں چنانچہ جب میں تیرے کمرے کے پاس سے گزر رہا تھا تو میں نے یہاں کئی شمعیں روشن دیکھیں، اسے میں بے جا اسراف میں شمار کرتا ہوں۔ میں تیرے کمرے میں ان شمعوں کو بجھانے آیا تھا۔"

خیزران نے کہا۔ "لیکن اندھیرے میں تو میرا دم ہی نکل جاتا۔"

عبداللہ نے جواب دیا۔ "میں ساری شمعیں تھوڑی بجھاتا، ایک جلتی رہنے دیتا۔"

خیزران نے بے مروتی سے کہا۔ "تو شمعیں بجھا کر چلے جائیے۔ یہ تپائی پر بیٹھے کیا کر رہے تھے یہاں؟"

عبداللہ نے شرمندگی سے کہا۔ "تو بڑی تیز مزاج کی محسوس ہوتی ہے۔ کیا تجھے نہیں معلوم کہ اب تو میری ملکیت ہے اور میں کسی بھی وقت تیرے پاس آ سکتا ہوں۔"

خیزران نے جواب دیا۔ "ابھی آپ یہ نہیں کہہ سکتے کیونکہ میری ملکیت مشروط ہے اور معلوم نہیں کہ میں آپ کی ملکیت ہو جاؤں یا بادشاہ کی ٹھہروں۔"

عبداللہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اب تو میری ہی ملکیت رہے گی کیونکہ میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ بادشاہ سے سفارش کر کے تاجر کو سازش کے الزام سے بری قرار دے دوں۔ اس کے بعد تو علی الاعلان میری ملکیت ٹھہرے گی۔"

خیزران نے بدستور بے مروتی سے کہا۔ "اچھا، اس وقت تو آپ میرے کمرے سے تشریف لے جائیے، صبح بات ہو گی۔"

عبداللہ نے ہنستے ہوئے شوخی سے کہا۔ "جب کمرے میں آیا تو تو خراٹے لے رہی تھی اور معلوم نہیں کتنی دیر سے نیند کے مزے لوٹ رہی تھی۔ اب مجھے دیکھ، میں نے تو ابھی تک پلک بھی نہیں جھپکائی اور پھر بھی یہ حال ہے کہ نیند کا کوسوں پتا نہیں۔"

خیزران عبداللہ کی مداخلت سے تنگ آئی ہوئی تھی، بولی۔ "کیا مجھے اس بات کی اجازت دیجیے گا کہ میں... بے تکلفی سے باتیں کروں؟"

عبداللہ نے جواب دیا۔ "اجازت دینا کیا معنی، اجازت ہے۔ میں خود بھی تکلف سے نفرت کرتا ہوں۔"

خیزران نے کہا۔ "کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ کو اتنی رات گئے تک نیند کیوں نہیں آئی؟"

عبداللہ نے جواب دیا۔ "بس نہیں آئی، اس کا سبب کیا بتاؤں؟"

خیزران نے کہا۔ "لیکن میں تو یہ سنتی آئی ہوں کہ راتوں کو یا تو چمگادڑ جاگتے ہیں یا الو۔ انسان تو نہیں جاگتے۔"

عبداللہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا، بولا۔ "لڑکی! توبہ توبہ، تو کیا بک رہی ہے؟ عابد اور زاہد بھی تو راتوں کو جاگتے ہیں۔"

خیزران نے بے پروائی سے کہا۔ "میں کیا جانوں لیکن آپ تو نہ عابد ہیں نہ زاہد پھر کیوں جاگ رہے ہیں؟"

عبداللہ نے ذرا پس و پیش کے بعد کہا۔ "خیزران! تو شاید میرے ماضی سے واقف نہیں ہے۔ میری ایک بیوی تھی اور ایک بچہ بھی لیکن اب یہاں دہلی میں کچھ بھی نہیں ہے۔ خیزران! تو یقین کر جب سے میں نے تجھے دیکھا ہے، معلوم نہیں کیوں مجھے اپنی بیوی زبیدہ یاد آنے لگی ہے۔ اس کی شکل بالکل تیری ہی طرح ہے۔"

خیزران نے کہا۔ "اب تو اللہ نے بہت کچھ دے رکھا ہے آپ کو، اپنی بیوی اور بچے کو بلوا لیجیے۔"

عبداللہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "خیزران! تو نہیں سمجھتی میری بیوی بڑی فضول خرچ ہے۔ میں اسے بلواتے ہوئے گھبراتا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میں نے اب تک جو کچھ حاصل کیا ہے، وہ یہاں آتے ہی دو دن میں گنوا دے گی۔ اس لیے میرے حق میں یہی بہتر ہے کہ میں بیوی کو نہ بلواؤں۔"

خیزران کو جماہی آ گئی۔ منہ کھل گیا، عجیب سے انداز میں بولی۔ "اب میں آپ سے کیا بات کروں، بات ہی ختم ہو گئی۔"

عبداللہ نے لجاجت سے کہا۔ "کیا میں ایک کے سوا تمام شمعیں بجھا دوں؟"

"بجھا دیں۔" خیزران نے جواب دیا۔ "لیکن اندھیرے میں تو مجھے نیند بھی نہیں آئے گی۔"

عبداللہ نے عاجزی سے کہا۔ "اگر تو نہیں چاہتی کہ تیرے کمرے کی شمعیں بجھائی جائیں تو میں نہیں بجھاؤں گا۔ تو شوق سے جلاتی رہ۔ اگر میں دوبارہ ایسی بات کروں تو جو سزا مناسب سمجھنا دے دینا۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کس طرح تیری دل شکنی کر سکتا ہوں۔"

خیزران نے کہا۔ "آپ برابر میری دل شکنی کیے جا رہے ہیں۔ آپ کی میرے کمرے میں موجودگی مجھے صدمہ پہنچا رہی ہے۔ کیا آپ یہاں سے جانا نہیں چاہتے؟"

عبداللہ کھسیا کر کھڑا ہو گیا، بولا۔ ”اچھا اب میں جاؤں گا لیکن اے شوخ و شریر لڑکی، کل دن میں تجھ سے بہت ساری باتیں کروں گا۔ تو باتوں میں مجھ سے نہیں جیت سکتی۔“

خیزران نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”کل کی کل دیکھی جائے گی۔“

عبداللہ نے جاتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا شمعیں بجھا دوں؟“

”نہیں نہیں، ہرگز نہیں۔ شمعیں بجھانے سے میری دل آزاری ہو گی اور آپ میری دل آزاری کو کس طرح گوارا کریں گے۔“

عبداللہ نے کھسیانے لہجے میں کہا۔ ”اچھا، ساری شمعوں کو جلتا رہنے دے۔ تو بھی کیا یاد کرے گی کہ کس رئیس سے پالا پڑا تھا۔“

جب عبداللہ کمرے سے چلا گیا تو خیزران نے چپکے سے اٹھ کر اندر سے دروازے بند کر لیے اور ہنستی ہوئی بستر پر دراز ہو گئی۔

ساری رات عبداللہ کا بڑا برا حال رہا۔ اسے جب بھی یہ خیال آتا کہ خیزران کے کمرے میں کئی شمعیں فضول جل رہی ہیں تو دل کا برا حال ہو جاتا۔

خیزران یہ سوچ سوچ کر خوش ہو رہی تھی کہ چلیے اس خسیس کو کسی طرح جلانے ستانے کا کوئی موقع تو ہاتھ آیا۔

صبح تاجر نے عبداللہ سے سخت شکایت کی۔ اس نے کہا۔ ”رات کمرے کو باہر سے مقفل کر دینے کی وجہ سے میں رات بھر بیت الخلا نہیں جا سکا جس سے میں بہت پریشان ہوا۔“

عبداللہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ایک رات کی پریشانی ہی کیا۔ اللہ نے چاہا تو آج میں بادشاہ سے ملوں گا اور اس سے تیری سفارش کروں گا۔ میرا خیال ہے بادشاہ میری سفارش ٹال نہیں سکتا۔“

”آمین، خدا کرے ایسا ہی ہو۔“

عبداللہ نے کہا۔ ”جب تک میں واپس نہ آؤں، محل سے باہر نہ نکلنا۔“

عبداللہ نے صدر دروازے میں قفل ڈال کر غلاموں کو حکم دے دیا کہ کوئی بھی آئے، صدر دروازہ نہیں کھولا جائے گا۔

تاجر نے جواب دیا۔ ”میں کس طرح آپ کے احسان کا بدلہ چکاؤں گا، میری سمجھ میں نہیں آتا۔“

عبداللہ نے کہا۔ ”میں بتاؤں گا کہ تو میرے احسان کا بدلہ کس طرح اتارے۔ ابھی پریشان نہ ہو کیونکہ یہ زمانہ بھی گزر جائے گا۔“

بادشاہ کو عبداللہ کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ عبداللہ کا گھوڑا بادشاہ کے سبز محل میں داخل ہو گیا۔ یہاں ہر چیز سبز تھی۔ دیواریں، دروازے، پردے ہر چیز سبز تھی۔ عبداللہ کا گھوڑا محل کے اس حلقے تک چلا گیا جہاں تک بادشاہ کا گھوڑا جا سکتا تھا۔ حاضرین محل زمیں بوس ہو کر عبداللہ کی تعظیم بجا لائے۔ بادشاہ عبداللہ کو سامنے دیکھ کر تخت سے اتر پڑا اور عبداللہ کی تعظیم بجا لایا۔ اس کے بعد ہاتھ پکڑ کر تخت پر اپنے برابر بٹھا لیا، بولا۔ ”حضرت! آپ خوب تشریف لائے، میں تو آپ کو زحمت دینے ہی والا تھا۔“

عبداللہ نے پوچھا۔ ”بادشاہ کو اس عاجز و ناتواں کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی؟“

بادشاہ نے کہا۔ ”آپ جب سے دہلی تشریف لائے ہیں، ملاحظہ فرما رہے ہوں گے کہ میں بادشاہ عادل ہوں یا ظالم؟“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”میں نے تو بادشاہ کو عادل اور سخی دیکھا اور پرکھا ہے لیکن خدا خود فرماتا ہے کہ زمانے کی قسم انسان بڑے خسارے میں ہے۔ بادشاہ کی رعایا بڑی ناشکری ہے اور اس کا یہ ناشکرا پن ہی اس کا سب سے بڑا خسارہ ہے۔“

بادشاہ نے افسوس سے کہا۔ ”لوگ مجھے ظالم کہتے ہیں حالانکہ بات صرف اتنی سی ہے کہ تادیب و تعزیر میں سختی اختیار کرتا ہوں۔ کیا مجرم خود اپنی ذات پر ظلم نہیں کرتا؟ وہ جرم کا ارتکاب کر کے مجھے سزا کا موقع دیتا ہے، تادیب پر مجبور کر دیتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو میں بھی اس کی تادیب سے باز رہوں۔ دنیا کا کوئی بھی عاقل اگر میرے اعمال کو ظالمانہ ثابت کر دے تو میں اپنے اوپر عائد کردہ ظلم کی سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔“

اسی وقت کسی نقیب کی آواز نے بادشاہ کو مطلع کیا۔

”جہاں پناہ کا مجرم مسعود خاں حاضر ہے۔“

بادشاہ نے حکم دیا۔ ”حاضر کیا جائے۔“

ذرا دیر بعد ایک نہایت خوب صورت نوجوان بادشاہ کے سامنے پابجولاں حاضر کر دیا گیا۔

بادشاہ نے عبداللہ سے پوچھا۔ ”یہ نوجوان آپ کو کیسا لگتا ہے؟“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”مجھے تو نہایت معصوم اور بے گناہ نظر آتا ہے۔“

بادشاہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ غصے پر قابو پانے کی کوشش میں پہلو بدل کر رہ گیا۔ اس نے قاضی کمال

الدین سے دریافت کیا۔ ”قاضی کمال الدین! کیا اس نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا؟“

عبداللہ قاضی کو پہچان گیا۔ یہ وہی شخص تھا جو عبداللہ کے لیے دہلی سے دو ڈیڑھ سو میل تک استقبال کو پہنچا تھا۔ قاضی کمال الدین نے جواب دیا۔ ”شہزادے مسعود خاں نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا ہے۔“

بادشاہ نے غصے میں کہا۔ ”قاضی کمال الدین! تم مسعود خاں کو شہزادہ کہتے ہو۔ میں قاضی القضاۃ کو اتنا غیر محتاط نہیں سمجھتا تھا۔“

قاضی کمال الدین نے سہم کر جواب دیا۔ ”حضور والا! میں نے اسے شہزادہ طنزاً کہا ہے کیونکہ اس نے اپنے تحریری اقبال نامے میں خود کو شہزادہ ہی لکھا ہے۔“

بادشاہ نے حکم دیا۔ ”اقبال نامہ پڑھ کر سنایا جائے۔“ قاضی کمال الدین نے بہ آوازِ بلند اقبال نامہ پڑھ کر سنایا۔

”میں کہ شہزادہ مسعود خاں تغلق پسر غیاث الدین تغلق کہ میری ماں دختر علاء الدین خلجی تھی، اقرار کرتا ہوں کہ میں نے اپنے برادر کلاں محمد شاہ تغلق کے خلاف سازش کی تھی کہ اسے قتل کر کے یا بغاوت کر کے اپنی راہ سے ہٹا کر خود بادشاہ بن جاؤں لیکن میں اپنے مقصد میں کامیاب ہونے سے پہلے ہی گرفتار کر لیا گیا۔ میں نے اپنے جرم بغاوت کا اقبال کسی جبر و تشدد یا دباؤ کے بغیر کیا ہے۔

شہزادہ مسعود خاں تغلق بن غیاث الدین تغلق!“

بادشاہ نے مسعود خاں سے کہا۔ ”تو میرا بھائی ہے، سچ بتا کیا میں نے تجھ پر کوئی ظلم کیا؟ میں نے تیرے مرتبے اور اعزاز میں کبھی کوئی کمی کی؟“

مسعود خاں نے جواب دیا۔ ”مجھے اس کا اقرار ہے کہ میں نے اپنے بادشاہ اپنے بھائی کے خلاف بغاوت کر کے سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے۔“

بادشاہ نے دریافت کیا۔ ”تیرے جرم بغاوت میں اور کون کون شریک تھا؟“

مسعود خاں نے جواب دیا۔ ”میرے ساتھیوں کی فہرست کمال الدین کے پاس موجود ہے۔ میں نے اس پر بھی اپنے دستخط کر دیے ہیں۔“

کمال الدین نے دریافت کیا۔ ”سنا ہوں تیری تیار کردہ سازش میں کوئی غیر ملکی تاجر بھی شامل تھا اور تو نے اس کو اس امر پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ باغیوں کے لیے گھوڑے فراہم کرے گا۔“

بادشاہ نے کمال الدین سے دریافت کیا۔ ”کیا وہ تاجر گرفتار کر لیا گیا؟“

کمال الدین نے جواب دیا۔ ”افسوس کہ وہ ابھی تک گرفتار نہیں کیا جا سکا۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”اسے کسی نہ کسی طرح جلد از جلد گرفتار کیا جائے۔“ پھر حکم دیا۔ ”اور مسعود خاں کو شہر کے چوک میں قتل کر دیا جائے۔“

عبداللہ نے افسوس کا اظہار کیا۔ ”شہزادہ مسعود خاں جیسا شخص میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔“

بادشاہ بے چین ہو گیا، بولا۔ ”آقا زادے! آپ مسعود خاں کو نہ تو شہزادہ کہیے اور نہ اس سے اظہارِ ہمدردی کیجیے۔ یہ مجرم ہے اور مجرم کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کرنا حق اور انصاف کے خلاف ہے۔“

عبداللہ نے معذرت کی۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں لاعلمی اور نادانستگی میں بادشاہ کی دل آزاری کی باتیں کر گیا۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”میں آپ کو آقا زادہ سمجھتا ہوں کیونکہ خلفائے بنوعباس کو میں نے ہمیشہ اپنا آقا سمجھا ہے۔ میں آپ سے ہمیشہ ایسی ہی باتوں کی توقع کروں گا جو حق اور انصاف پر مبنی ہوں گی۔“

کمال الدین نے اجازت مانگی۔ ”مسعود خاں کو اسی وقت قتل کر دینا یوں ضروری ہے کہ شاہی فیصلوں کی تعمیل میں تاخیر عدول حکمی کے مترادف ہے۔ کم از کم میرا تو یہی خیال ہے۔“

بادشاہ نے حکم دیا۔ ”میرے فیصلے پر اسی وقت عمل درآمد ہونا چاہیے۔ ابھی فوراً، اسی وقت۔“

جب دربار برخاست ہوا تو بادشاہ، عبداللہ کو اس کے گھوڑے تک چھوڑنے گیا۔ کمال الدین شاہی سپاہیوں کے ساتھ شہزادہ مسعود خاں کو لے کر محل سے باہر نکلا۔ کمال الدین نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔

”تم لوگ مسعود خاں کو لے کر چوک پر پہنچو، میں عبداللہ سے چند ضروری باتیں کر کے ابھی پہنچتا ہوں۔“

عبداللہ کسی سوچ میں گم گھوڑے کو آہستہ آہستہ چلائے لیے جا رہا تھا۔ اس وقت اس کے دل و دماغ پر بغدادی تاجر اور خیزران مسلط تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب وہ تاجر کی سفارش کس طرح کرے گا کیونکہ مسعود خاں کے اقبالی بیان سے یہ ثابت ہو چکا تھا کہ تاجر بے گناہ نہیں ہے اور اس کی تلاش جاری ہے۔ خیزران ایک ہی رات میں معلوم نہیں کیوں، اس کے دل و دماغ پر چھا گئی تھی۔ دربار میں بادشاہ

کے قریب جب وہ بیٹھا تھا تو خیزران اسے کئی بار یاد آئی۔ وہ اس وقت بادشاہ سے تاجر کی سفارش کرنا چاہتا تھا لیکن پھر وہ دربار کا رنگ اور بادشاہ کے مزاج کا اندازہ لگا کے خاموش بیٹھا رہا۔

کمال الدین اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا عبداللہ کے قریب لے گیا، بولا۔ ''آقا زادے! میں آپ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

عبداللہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کمال الدین اس کے پیچھے پہنچ گیا تھا، عبداللہ نے پوچھا۔ ''مجھ سے تمہیں کچھ کہنا ہے؟''

''ہاں۔'' کمال الدین بالکل برابر پہنچ گیا۔ ''ہمارے آس پاس کوئی اور تو نہیں ہے؟''

عبداللہ نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں تو وہاں صرف ایک ہی ہجوم نظر آیا۔ وہ ہجوم مسعود خاں کو چوک کے مقتل کی طرف لیے جا رہا تھا۔ عبداللہ نے جواب دیا۔ ''نہیں، یہاں ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔''

کمال الدین نے رک رک کر کہا۔ ''آقا زادے! آپ خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں آپ کی کتنی عزت کرتا ہوں۔''

عبداللہ نے جواب دیا۔ ''ہاں، خوب جانتا ہوں لیکن تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

کمال الدین نے کہا۔ ''بادشاہ آپ کی بے حد عزت کرتا ہے۔ آپ نے غلطی سے مسعود خاں کو شہزادہ اور خوب صورت ترین نوجوان کہہ کر بادشاہ کی طبیعت میں تکدر پیدا کر دیا تھا۔ اگر آپ کی جگہ یہ باتیں میں کہتا تو آج میں قتل کر دیا جاتا۔ اس لیے آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ آئندہ ایسی غلطی نہیں کریں گے۔''

عبداللہ نے خجالت سے جواب دیا۔ ''مجھے اپنی غلطی کا بعد میں احساس ہو گیا تھا اور آئندہ میں ان باتوں کا بہت خیال رکھوں گا۔''

کمال الدین نے کہا۔ ''حالانکہ میں خوب جانتا ہوں کہ بادشاہ آپ کو کچھ بھی نہ کہے گا لیکن آپ کو احتیاط تو کرنا ہی پڑے گی۔''

عبداللہ نے پوچھا۔ ''میں خیال تو رکھوں گا مگر میں ایک بات ضرور معلوم کرنا چاہتا ہوں۔''

کمال الدین نے کہا۔ ''پوچھیے، آپ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں؟''

عبداللہ نے پوچھا۔ ''مسعود خاں نے اپنے اقبال نامے میں جو کچھ کہا ہے، کیا وہ بالکل سچ ہے؟''

کمال الدین گھبرا گیا، وحشت زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''آپ یہ بیکار سوال کیوں کر رہے ہیں؟''

عبداللہ نے جواب دیا۔ ''میرا سوال بیکار یا فضول نہیں ہے بلکہ اس کی تہ میں ایک خاص مقصد کارفرما ہے۔''

کمال الدین نے کہا۔ ''آپ ایک بات ذہن نشین کر لیجیے کہ مسعود خاں اگر قبالِ جرم نہ کر لیتا تو اسے ایسی اذیتیں جھیلنا پڑتیں جن کے مقابلے میں موت بہت آسان اور خوشگوار شے ہے۔ اس نے سچ کے بدترین عذاب پر جھوٹ کی آسان ترین سزا گوارا کر لی ہے۔ مسعود خاں نے اپنے بیان میں جو کچھ لکھایا کہا ہے، سراسر جھوٹ ہے۔ وہ بے گناہ ہے لیکن اگر کسی طرح بادشاہ کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ میں نے مسعود خاں کو بے گناہ کہہ دیا ہے تو بادشاہ مجھے بھی قتل کروا دے لیکن یہ بات میں آپ سے کہہ رہا ہوں اور اس یقین اور اعتماد کے ساتھ کہ آپ اسے اپنے سینے کے نہاں خانے میں ہمیشہ کے لیے دفن کر دیں گے۔''

عبداللہ نے جواب دیا۔ ''بادشاہ نے مجھ پر احسان کیے ہیں، میں احسان فراموش نہیں بن سکتا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ میں راستی فتنہ انگیز کو جو اکثر اوا اختیار کروں۔''

کمال الدین نے متنبہ کیا۔ ''ہمیں جو تاجر اس سازش کے سلسلے میں مطلوب ہے، اسے کل شام آخری بار آپ کے محل کی طرف جاتے دیکھا گیا ہے۔ اس وقت اس کے ساتھ ایک غلام بھی تھا جس کے سر پر ایک گٹھری رکھی تھی اور غلام کے ساتھ ہی ایک خوب صورت کنیز بھی جس کا نام خیزران بتایا گیا ہے۔ ہم سب پریشان ہیں کہ آخر یہ تینوں گئے کہاں؟ لیکن مسعود خاں کو قتل کر دینے کے بعد میں انہیں بھی تلاش کر لوں گا۔''

عبداللہ کا دل بری طرح دھڑکنے لگا، حیرت سے پوچھا۔ ''اس تاجر کو تم نے میرے محل کی طرف جاتے دیکھا تھا، آخر یہ کس طرح ممکن ہے؟ یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟''

کمال الدین نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''آقا زادے! اس دنیا میں ہر بات ممکن ہے۔ ہو سکتا ہے اس تاجر نے آپ ہی کے محل میں پناہ لے رکھی ہو اور آپ کو اس کا علم نہ ہو۔''

''یہ ناممکن ہے، وہ میرے محل میں پناہ نہیں لے سکتا۔''

کمال الدین نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''وہ آپ کے علم میں نہیں، لاعلمی میں تو پناہ لے سکتا ہے۔''

عبداللہ پریشان ہوتا جا رہا تھا، بولا۔ ''میں تمہارے اس مفروضے کو نہیں مان سکتا۔''

کمال الدین نے کہا۔ ''حضورِ والا! اس وقت میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، میں کسی وقت آپ کے محل میں آکر بات کروں گا۔ ہاں چلتے چلاتے ایک اشارہ دیتا جاؤں۔ اگر آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو بادشاہ اس محل کی تلاشی ضرور لے چکا ہوتا۔''

عبداللہ لرز گیا، سہم گیا، پوچھا۔ ''کیا بادشاہ تلاشی لینے کی نیت رکھتا ہے؟''

''نہیں کیونکہ بادشاہ آپ کے محل کی تلاشی لینے کی ہمت ہی نہیں رکھتا۔''

عبداللہ نے کہا۔ ''کمال الدین! میں اپنے محل جا رہا تھا لیکن تمہاری باتیں اتنی مزے دار ہیں کہ اب مجھے تمہارے ساتھ چوک تک چلنا پڑے گا۔''

کمال الدین نے جواب دیا۔ ''عزت افزائی، نوازش، عنایت، مہربانی، بندہ پروری۔''

عبداللہ کے دل و دماغ میں ایک ہلچل مچ گئی تھی۔ تاجر اور خیزران اسے دو سانپ محسوس ہو رہے تھے جو اسے کسی وقت بھی ڈس سکتے تھے۔

کمال الدین نے کن انکھیوں سے عبداللہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''میں آپ کو کوئی مشورہ تو نہیں دے سکتا لیکن ایک بات آپ کے علم میں ضرور لاؤں گا۔ اگر ہمارا بادشاہ، ماضی کے دوسرے بادشاہوں کی طرح رنگین مزاج اور شوقین ہوتا تو یہ سازشی تاجر اس کنیز کو بادشاہ کی خدمت میں بطور رشوت پیش کر کے اپنی سزا معاف کروا لیتا لیکن افسوس تو یہی ہے کہ ہمارا بادشاہ نہ تو شراب پیتا ہے اور نہ ہی عورتوں کا شوقین ہے اور ایسے کے دل میں جگہ بنانا آسان کام نہیں ہوتا۔''

عبداللہ نے جواب دیا۔ ''جس دن بھی میں نے یہ محسوس کیا کہ بادشاہ کے دل میں میری عزت نہیں رہی، میں اس ملک کو چھوڑ دوں گا۔''

کمال الدین نے آہستہ سے کہا۔ ''چپ ہو جائیے، شاہی جلاد چوک کی طرف جا رہا ہے۔''

عبداللہ نے ایک موٹے تازے کالے کلوٹے کوتاہ قامت شخص کو اپنے قریب سے گزرتے دیکھا۔ وہ تہ بند باندھے ہوئے تھا اور اس کے ہاتھ میں برہنہ تلوار تھی۔ اس نے پاس سے گزرتے ہوئے ان دونوں کو سلام کیا۔

چوک میں بہت بڑا ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا۔ ایک پیپل کے درخت کی جڑ کے پاس مسعود خاں کسی ماؤف الدماغ کی طرح کھڑا ہجوم کو حیرت و تعجب سے دیکھ رہا تھا۔ جلاد اس کے سر پر پہنچ گیا۔ کمال الدین اور عبداللہ بھی ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ جلاد نے قاضی کمال الدین کی طرف دیکھا۔ کمال الدین نے مسعود خاں سے کہا۔

''مسعود خاں! یہ تمہارا آخری وقت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ایک بار اس مجمع کے سامنے اپنے جرم کا اقرار کر لو۔ اس طرح میں تمہیں سزا دینے میں حق بجانب ٹھہروں گا اور خدا کے گھر میں محاسبے سے بچ جاؤں گا۔''

مسعود خاں نے پہلے کمال الدین کی طرف دیکھا پھر ہجوم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''لوگو! میں بادشاہ محمد تغلق کے باپ غیاث الدین تغلق کا بیٹا ہوں۔ میری ماں علاء الدین خلجی کی بیٹی تھی اور تم دو سال پہلے کا وہ واقعہ نہیں بھولے ہو گے جو یہاں اس جگہ، اسی چوک میں پیش آیا تھا۔ یہ ظالم بادشاہ...... جو بدقسمتی سے میرا بھائی بھی ہے، اسی درخت کے نیچے دو سال پہلے میری ماں کو سنگسار کروا چکا ہے۔ بادشاہ نے میری معصوم ماں پر جنسی بداخلاقی کا جرم عائد کیا تھا۔ لوگو! میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنی ماں کی طرح بے گناہ اور بے قصور ہوں۔ مجھے ناحق قتل کیا جا رہا ہے۔''

کمال الدین دوڑ کر مسعود خاں کے پاس پہنچ گیا اور جلاد کو حکم دیا۔ ''تو اس کی تقریر کیوں سن رہا ہے، اڑا دے اس موذی اور فتنہ پرداز کی گردن۔ ورنہ اس کی تقریر سننے کے جرم میں کل ہماری گردنیں بھی اڑا دی جائیں گی۔''

مسعود خاں نے خدا کے صابر و شاکر بندے کی طرح اپنا سر جھکا دیا۔ جلاد کا تلوار والا ہاتھ فضا میں بلند ہوا اور جب شہزادے کی گردن پر گرا تو سر اور جسم علیحدہ ہو چکے تھے.... سربریدہ جسم پھڑکنے لگا اور شہزادے کی ٹانگیں زمین پر گھسٹنے لگیں۔ یہاں تک کہ ایڑیوں کی مسلسل رگڑ سے کچی زمین میں دو ننھے ننھے گڑھے سے بن گئے۔

☆☆☆

عبداللہ نے اپنے محل کا صدر دروازہ کھلوایا تو اسے یہ احساس ہو گیا کہ محل کی فضا کو پراسرار بنا دینا اچھی بات نہیں ہے۔ اسے کمال الدین کی باتوں سے یہ بھی پتا چلا تھا کہ تاجر اور خیزران کی اس کے محل میں موجودگی کا علم کسی اور کو ہو نہ ہو لیکن کمال الدین کو ضرور تھا۔ وہ بدحواس، بھاگا بھاگا خیزران کے پاس پہنچا۔ وہ بالکل مطمئن بیٹھی تھی۔

عبداللہ نے پوچھا۔ ''تاجر کہاں ہے؟''

خیزران نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ''میں کیا جانوں، ہوگا کہیں مجھے کیا پتا۔''

عبداللہ نے کسی قدر نرمی سے کہا۔ ''تو، تو اس وقت یہاں بالکل تنہا ہے؟''

''ہاں، یہاں میں بالکل تنہا ہوں۔ کیوں، کوئی خاص بات؟''

عبداللہ نے سراسیمہ انداز میں ادھر ادھر دیکھ کر دروازے اندر سے بند کرلیے، بولا۔ ''میں اس وقت تم سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ تم انہیں بہت غور سے سنو اور اپنے فیصلے سے مطلع کرو۔''

خیزران نے معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔ ''ظاہر ہے کہ میں جن حالات میں آپ کے پاس آئی ہوں، ان میں سن ہی سکتی ہوں، بول نہیں سکتی۔''

عبداللہ نے کہا۔ ''نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ تم بول بھی سکتی ہو لیکن اسی وقت جب تم میری تمام باتیں خوب اچھی طرح سن لو۔''

خیزران تن کر بیٹھ گئی۔ اس کے دونوں گھٹنے اٹھے ہوئے تھے اور دونوں پیروں کو اس نے اپنے ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ بڑے تیکھے تیوروں سے عبداللہ کو دیکھ رہی تھی۔

عبداللہ نے کہنا شروع کیا۔ ''خیزران! تیرا آقا بغدادی تاجر بغاوت کی جس سازش میں ملوث تھا، اس کا سرغنہ شہزادہ مسعود خاں تغلق قتل کیا جاچکا ہے۔ اب بادشاہ کے آدمی تاجر کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں اور میں جانتا ہوں کہ وہ بہت جلد یہاں پہنچنے والے ہیں۔''

خیزران نے پوچھا۔ ''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

عبداللہ نے کہا۔ ''تو جانتی ہے کہ میں نے تاجر سے یہ وعدہ کیا تھا کہ بادشاہ سے اس کی سفارش کرکے رہائی دلا دوں گا لیکن دربار میں پہنچ کر میں نے محسوس کیا کہ مجھے تاجر کی سفارش نہیں کرنی چاہیے۔ اب میں ایک ایسی مشکل میں پھنس گیا ہوں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔''

''اپنی مشکل مجھے بتائیے، شاید میں اس کا حل نکال لوں۔''

عبداللہ ٹکٹکی باندھے خیزران کو دیکھتا رہا، بولا۔ ''کیا میں اپنے دل کی بات کہہ دوں؟''

''ضرور کہہ دیجیے، ڈر کس بات کا؟''

خیزران کھلکھلا کر ہنس دی، مذاق اڑاتے ہوئے بولی۔ ''مجھ سے جو بھی ملتا ہے، اظہارِ عشق کرنے لگتا ہے۔ آپ بھی مجھ سے محبت کرنے لگے ہیں۔ اب بتائیے میں کیا کروں؟''

''خیزران! میں کیا کہنا چاہتا ہوں، میں اپنا مطلب واضح نہیں کرپارہا ہوں۔ کل رات تیرے آقا تاجر نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر میں اس کی سفارش کرکے رہائی دلانے میں کامیاب ہوگیا تو تو میری ہوجائے گی اور اگر میں ناکام رہا تو تجھے اس کی وصیت کے مطابق بادشاہ کے حوالے کردیا جائے گا۔''

خیزران نے پوچھا۔ ''پھر کیا ہوا، کیا آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے؟''

''نہیں کیونکہ میں نے اس کی سفارش ہی نہیں کی اور نہ اب کروں گا۔''

خیزران نے خوشی آمیز شوخ لہجے میں کہا۔ ''تب تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ میں خوش قسمتی سے بادشاہ کے محل میں پہنچ جاؤں گی اور یہی میری سب سے بڑی خواہش تھی۔''

عبداللہ کا غصے اور حسد سے برا حال ہوگیا، جل کے بولا۔ ''اگر تو یہ سمجھتی ہے کہ بادشاہ کے محل میں تو عیش کرے گی تو یہ تیری خوش فہمی ہی نہیں زندگی کی سب سے بڑی غلط فہمی بھی ہوگی۔''

خیزران کھڑی ہوگئی، عبداللہ کے سامنے تن کر سوال کیا۔ ''کیوں جناب! اسے آپ میری خوش فہمی یا غلط فہمی کیوں سمجھ رہے ہیں؟''

عبداللہ نے جواب دیا۔ ''اسے تو اپنی خوش قسمتی سمجھ یا بدقسمتی کہ بادشاہ عیاش نہیں ہے۔ وہ تجھے خود رکھنے کے بجائے کسی دوسرے امیر یا خدمت گار کے حوالے کردے گا۔ اس سے لاکھ درجہ یہ بہتر ہے کہ تو یہ جوانہ کھیل اور اس شخص کو قبول کرلے جس کی بادشاہ تک تعظیم بجالاتا ہے۔''

''اس شخص کا نام کیا ہے؟ کہاں رہتا ہے، کیا کرتا ہے؟''

عبداللہ نے انکساری سے جواب دیا۔ ''وہ شخص تیرے سامنے کھڑا ہے، عبداللہ..... جو تجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھے گا۔''

خیزران نے عبداللہ کو سر سے پیر تک دیکھا، بولی۔ ''چہ خوب، آپ یہ بھول رہے ہیں کہ میں اپنی مرضی کی مالک نہیں ہوں۔ میں اپنی مرضی سے نہ تو کسی کو پسند کرسکتی ہوں اور نہ قبول کرسکتی ہوں۔ میں جس شخص کی ملکیت ہوں، وہی اس قسم کا کوئی فیصلہ کرسکتا ہے۔''

عبداللہ نے جواب دیا۔ ''تو جو کچھ بھی کہہ رہی ہے، درست ہے لیکن تو یہ بھی تو سوچ کہ تو جانور نہیں ہے، انسان ہے۔ تیری اپنی مرضی بھی تو کوئی چیز ہے۔''

خیزران نے کہا۔ ''میں انسان ہوں اس لیے اخلاقی ضابطوں کی پابند ہوں۔''

عبداللہ نے کہا۔ ''خیزران! میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ تجھے عیش کروادوں گا، تیری خاطر اس دنیا کو جنت بنادوں گا۔''

خیزران پھر ہنسنے لگی، بولی۔ ''کیا آپ مجھے صاف صاف بات کرنے کی اجازت دیجیے گا؟''

''ہاں، ہاں تو آزاد ہے، صاف صاف بات کرسکتی ہے۔''

خیزران نے جواب دیا۔ ''جناب! اگر آپ میرے دل کی بات پوچھیں تو میں یہی کہوں گی کہ میں آپ سے ڈر گئی ہوں، سہم گئی ہوں، خوف زدہ ہوگئی ہوں۔''

''ڈرنے، سہمنے یا خوف زدہ ہونے کا سبب؟''

''آپ ٹھہرے ایک خسیس، بخیل انسان، میں فضول خرچ، بے جا اسراف کی عادی پھر ہم دونوں کس طرح یکجا رہیں گے؟ کس طرح ایک ساتھ رہ سکیں گے؟''

عبداللہ، خیزران کے اس حملے سے چکرا گیا، گھبرا کر بولا۔ ''میں تجھے فضول خرچیوں کی اجازت دے دوں گا۔ تیرے بے جا اسراف پر میری طرف سے کوئی پابندی نہیں ہوگی۔''

خیزران نے کہا۔ ''میں کس طرح یقین کرلوں کہ کسی انسان کی فطرت بھی بدل سکتی ہے؟''

عبداللہ نے جواب دیا۔ ''میں مانتا ہوں کہ انسان کی فطرت نہیں بدلی جاسکتی لیکن انسان قدرو اختیار کا پتلا ہے۔ یہ اپنے آپ کو وقت، حالات اور ماحول کے مطابق بدل بھی لیتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا کے سارے مذاہب ناکام ہوجاتے۔''

خیزران نے فرطِ جوش میں عبداللہ کا ہاتھ پکڑلیا۔ اسے اپنے رخسار پر رکھ کر دبادیا۔ ''آپ بڑے ذہین انسان ہیں۔ میں مان گئی کہ آپ کا تعلق خلفائے جوعباس کی نسل سے ہے لیکن مشکل تو یہ ہے کہ میں اپنے آقا تاجر کو کس طرح رضامند کروں؟''

عبداللہ نے جواب دیا۔ ''تو یہ مجھ پر چھوڑ دے۔ میں خود کوئی حل نکال لوں گا اس کا۔''

خیزران نے بے اختیار ہنسنا شروع کردیا۔ ہنستے ہنستے دہری ہوگئی۔ عبداللہ نے حیرت سے پوچھا۔ ''یہ ہنسی کس بات کی؟''

خیزران نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ''میں سوچ رہی ہوں کہ اگر ہماری باتیں تاجر سن لے تو اپنے دل میں کیا سوچے؟''

عبداللہ نے کہا۔ ''وہ کیا سوچے گا...... پراگندہ اور پریشان ذہن سوچ بھی کیا سکتا ہے۔''

خیزران نے تالی بجائی، بولی۔ ''اب آپ نکل آیئے، کہاں تک مسہری کے نیچے چھپے رہیے گا۔''

اس آواز پر مسہری کے نیچے سے اچانک بغدادی تاجر نمودار ہوگیا۔ عبداللہ اسے دیکھ کر بدحواس ہوگیا۔ خیزران کو ڈانٹنے لگا۔

''خیزران! یہ کیا مذاق کیا ہے تو نے؟''

خیزران نے جواب دیا۔ ''میں نے کوئی مذاق نہیں کیا۔ آپ کے آنے سے ذرا پہلے ہم دونوں کو یہ معلوم ہوا تھا کہ ہماری تلاش و جستجو میں خاکروب چھوٹ چکے ہیں جو گھر گھر جاکر یہ معلوم کرتے رہتے ہیں کہ کس کے ہاں کون سا نیا آدمی آیا ہے اور وہ نیا آدمی کہاں سے آیا ہے، اس کی عمر اور حلیہ کیا ہے۔ ہم دونوں نے اس خطرناک صورت حال کا اس طرح مقابلہ کیا کہ انہیں اپنی مسہری کے نیچے چھپادیا۔''

عبداللہ نے کہا۔ ''پھر بھی تیری نیت کچھ اور تھی ورنہ تو مجھے اس کی مسہری کے نیچے موجودگی کے بارے میں ضرور بتادیتی۔ خیر، اگر ہم لوگ مذاق ہی کی کیفیت میں ہیں تو ایک چھوٹا سا مذاق میں بھی کرگزروں تو تم دونوں کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟''

خیزران نے پوچھا۔ ''کیسا مذاق؟''

عبداللہ نے جواب دیا۔ ''قاضی کمال الدین کو شبہ ہے کہ تم دونوں نے میرے محل میں پناہ لی ہے۔ میں ازراہِ مذاق اس سے جاکر کہتا ہوں کہ ابھی ابھی جب میں اپنے محل میں داخل ہوا تو میں نے بغدادی تاجر اور خیزران کو اپنے محل میں روپوش دیکھا۔''

تاجر لرز گیا، سہمی ہوئی آواز میں بولا۔ ''خدا کے لیے ایسا نہ کیجیے، میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں۔''

اسی وقت ایک غلام بھاگا ہوا آیا، باہر ہی سے مطلع کیا۔ ''حضورِ والا! قاضی کمال الدین تشریف لائے ہیں اور وہ آپ سے فوراً ہی ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔''

عبداللہ کے علاوہ دونوں ہی کے چہرے فق ہوگئے۔ تاجر نے مرتعش آواز میں کہا۔ ''اب کیا ہوگا؟ میں گرفتار کرلیا جاؤں گا؟''

عبداللہ نے تاجر کو کوئی جواب نہ دیا۔ غلام سے پوچھا۔ ''قاضی کمال الدین تنہا آیا ہے یا اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟''

غلام نے جواب دیا۔ ''قاضی کے ساتھ چار سپاہی بھی ہیں۔''

عبداللہ نے کہا۔ ''انہیں باہر بیٹھک میں بٹھاؤ، میں آتا ہوں۔''

تاجر اور خیزران نے محسوس کیا کہ عبداللہ ذرا بھی

پریشان نہیں ہے۔ اس کے چہرے پر زبردست طمانیت پائی جاتی تھی۔

خیزران نے تشویش سے پوچھا۔ ”اب کیا ہوگا؟“

عبداللہ نے شریر مسکراہٹ سے جواب دیا۔ ”اب کیا ہوگا، کوئی نہیں جانتا...... نہ میں، نہ تم، نہ تمہارا مالک تاجر۔ بس خدا ہی جانتا ہے کہ اب کیا ہوگا لیکن اب جو کچھ بھی ہوگا، اس سے میں بالکل پریشان نہیں ہوں اور تم دونوں نے خود بھی میرے چہرے پر طمانیت محسوس کرلی ہوگی۔“

تاجر گڑگڑانے لگا۔ ”خدا کے لیے مجھے بچالیجیے۔“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”تم دونوں اپنے کمرے کو اندر سے بند کرلو، میں قاضی کمال الدین سے بات کرکے واپس آتا ہوں۔ بقیہ باتیں پھر ہوجائیں گی۔ میری عدم موجودگی میں کوئی کتنی ہی کوشش کرے، تم دروازہ مت کھولنا۔“

تاجر نے پریشان لہجے میں کہا۔ ”اگر شاہی سپاہی ہمیں تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آجائیں تو ہمیں کیا کرنا ہوگا؟“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”کس میں اتنی ہمت ہے کہ میرے محل کی تلاشی لے۔ خود بادشاہ تک اتنی ہمت نہیں کرسکتا۔“

عبداللہ کے جاتے ہی ان دونوں نے دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ قاضی کمال الدین، عبداللہ کو آتے دیکھ کر کھڑا ہوگیا۔ عبداللہ ایک شانِ بے نیازی سے بیٹھ گیا اور پوچھا۔ ”کہیے کیسے آنا ہوا؟“

قاضی کمال الدین نے جواب دیا۔ ”میں اس لیے حاضر ہوا تھا کہ اگر کسی وقت بغدادی تاجر آپ کے پاس آجائے تو آپ اسے ازراہِ مہربانی میرے حوالے کردیجیے گا۔“

عبداللہ نے کسی قدر برہمی سے جواب دیا۔ ”قاضی کمال الدین! میں آپ سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے یہ کیوں فرض کرلیا ہے کہ وہ بغدادی تاجر میرے پاس پناہ لینے آئے گا؟“

قاضی کمال الدین نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”مجھے آپ کے محل کے بھنگی سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ وہ بغدادی تاجر اور اس کی کنیز خیزران آپ کے محل کے آس پاس دیکھے گئے ہیں۔“

عبداللہ نے بے مروتی سے سوال کیا۔ ”آپ کو یہی کچھ کہنا تھا یا ابھی کچھ اور کہنا باقی رہ گیا ہے؟“

قاضی نے جواب دیا۔ ”اگر میری کسی بات سے آپ کو دکھ پہنچا ہے تو میں معافی چاہتا ہوں۔“

عبداللہ غصے میں کھڑا ہوگیا، نہایت بداخلاقی سے کہا۔ ”اب آپ جاسکتے ہیں اور خبردار جو پھر کبھی کسی ایسے ویسے کام سے میرے گھر آئے۔ کل میں بادشاہ سے بھی اس کی شکایت کروں گا۔“

قاضی کمال الدین اپنے آدمیوں کے ساتھ کھڑا ہوگیا، بولا۔ ”میں آپ کو اپنا آقازادہ سمجھتا ہوں۔ بخدا میں یہاں کسی بری نیت سے نہیں آیا تھا۔ آپ بادشاہ سے میری شکایت کرکے زیادہ سے زیادہ قتل کروادیں گے، میں سمجھوں گا اپنے آقازادے پر قربان ہوگیا۔“

قاضی کمال الدین اپنے چاروں آدمیوں کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔ ابھی وہ زیادہ نہیں دور پہنچا تھا کہ عبداللہ کا ایک غلام دوڑتا ہوا قاضی کے پاس پہنچا اور کہا۔ ”حضور والا! میرے ولی نعمت فرمارہے ہیں کہ آپ اپنی ایک چیز وہیں چھوڑ آئے ہیں، اسے تو لے لیجیے چل کر۔“

قاضی نے اپنے حافظے پر زور دیا کہ وہ وہاں کیا بھول آیا ہے لیکن کچھ یاد نہ آیا۔ اپنے آدمیوں سے کہا۔ ”تم یہیں رکو، میں ابھی آتا ہوں۔“

قاضی جب دوبارہ عبداللہ کے سامنے پہنچا تو وہ قاضی کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔ قاضی نے اپنی جائے نشست پر بھولی ہوئی شے تلاش کی لیکن کوئی چیز نظر نہ آئی۔ عبداللہ نے پوچھا۔ ”قاضی کمال الدین! آپ کیا تلاش کررہے ہیں؟“

قاضی نے اجنبی انداز میں کہا۔ ”میں اپنی جو چیز غلطی سے یہاں چھوڑ گیا تھا اسے لینے آیا ہوں۔“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”تمہاری چیز یہاں نہیں ہے اندر ہے۔ میرے ساتھ چلیے اور اسے لے کر واپس چلے جائیے۔“

عبداللہ، قاضی کمال الدین کو لے کر خیزران اور تاجر کے کمرے کے در پر کھڑا ہوگیا۔ اس نے قاضی کو اشارے سے سمجھایا کہ وہ یہاں بالکل خاموش کھڑا رہے، کسی بات پر بولے بالکل نہیں۔ پھر دروازے پر دستک دی۔ اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔ اس کے بعد پھر دستک دی، اندر بدستور خاموشی تھی۔ تیسری بار دستک دی اور کہا۔

”خیزران! یہ میں ہوں عبداللہ...... دروازہ کھولو۔“ فوراً ہی دروازہ کھل گیا اور ان دونوں نے اپنے سامنے قاضی کمال الدین کو دیکھ کر بڑی پریشانی محسوس کی۔

عبداللہ نے پہلے بغدادی تاجر کی طرف اشارہ کیا، کہا۔ ”یہ ہے وہ شخص جو شہزادہ مسعود خاں کی سازش میں

شریک تھا۔“ پھر خیزران کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اور یہ ہے اس تاجر کی حسین ترین کنیز خیزران۔“

قاضی کمال الدین نے متذبذب لہجے میں دریافت کیا۔ ”یہ دونوں آپ کے پاس کس طرح آئے؟“

عبداللہ نے کہا۔ ”قاضی کمال الدین! میں اپنے اس تلخ لب ولہجے پر شرمندہ ہوں۔ آپ کے ان چاروں آدمیوں کے روبرو، میں ان دونوں کو آپ کے سامنے کیونکر لاسکتا تھا۔ اس لیے میں نے جو کچھ بھی کہا تھا، وہ ایک قسم کی اداکاری تھی۔“

قاضی کمال الدین پریشان تھا کہ وہ ان باتوں کا کیا جواب دے۔ عبداللہ نے کہا۔ ”دل نہ چاہنے کے باوجود میں ان دونوں کو آپ کے حوالے کردینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔“

عبداللہ نے خیزران اور اس کے مالک بغدادی تاجر کی طرف دیکھا۔ ان دونوں کے چہروں پر خوف اور دہشت سے ہوائیاں اڑرہی تھیں۔ قاضی کمال الدین نے کہا۔ ”اگر آپ مناسب سمجھیں تو ان دونوں کو یہیں رہنے دیں کیونکہ میں ان دونوں کو اس گھر سے اپنے گھر نہیں لے جاسکتا۔“

”آپ اس تاجر کو بادشاہ کے روبرو پیش کرکے اعلیٰ کارکردگی اور وفاداری کی عزت حاصل کرسکتے ہیں۔“

تاجر گڑگڑانے لگا۔ ”عبداللہ! آپ مجھے اپنے ہاتھ سے قتل کردیں لیکن قاضی کمال الدین یا بادشاہ کے حوالے نہ کیجیے۔“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”یہ اس مذاق کا جواب ہے جو تم دونوں نے مجھ سے کیا تھا۔“

قاضی کمال الدین نے عبداللہ کو علیحدہ لے جاکر سمجھایا۔ ”آپ کے لیے یہ بالکل آسان ہے کہ اس تاجر کو اپنے محل میں قید کرکے بادشاہ کو مطلع کردیں۔ اس طرح بادشاہ کی نظر میں آپ کی عزت اور وقعت کئی گنا زیادہ بڑھ جائے گی۔“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”خدا نے مجھے پہلے ہی بڑی عزت دے رکھی ہے۔ اس موقع سے آپ فائدہ اٹھائیں۔“

قاضی کمال الدین کچھ سوچنے لگا۔ عبداللہ کی تیز اور معاملہ فہم نظریں اس کے چہرے پر گڑ گئیں۔ کچھ دیر بعد قاضی نے کہا۔ ”میں ایک شرط پر اس تاجر کو بادشاہ کے حوالے کرنے کی ہمت کرسکتا ہوں۔“

عبداللہ نے پوچھا۔ ”کس شرط پر؟“

قاضی نے جواب دیا۔ ”اگر آپ مجھ سے یہ وعدہ

کرلیں کہ اس معاملے میں آپ اپنی زبان بند رکھیں گے۔"
عبداللہ نے کہا۔ "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟"
قاضی نے کہا۔ "میرا مطلب واضح ہے۔ میں صرف تاجر کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ خیزران کو اپنے پاس رکھ لوں گا کیونکہ تاجر کے ساتھ خیزران کو بھی بادشاہ کے روبرو پیش کردینے کا جو نتیجہ نکلے گا، وہ میں جانتا ہوں۔"
عبداللہ نے پوچھا۔ "کیا نتیجہ نکلے گا، ذرا میں بھی تو سنوں؟"
قاضی نے جواب دیا۔ "آپ خوب جانتے ہیں کہ بادشاہ دوسرے بادشاہوں کی طرح عیاش نہیں ہے۔ وہ خیزران کو خود تو رکھے گا نہیں، کسی نہ کسی امیر کے حوالے کردے گا اور میں نہیں چاہتا کہ یہ پھول سا چہرہ اور حوروں جیسی معصوم شکل وصورت کی لڑکی کسی ایسے ویسے امیر کے حوالے کردی جائے۔ اس کی صحیح قدردانی میں خود کرسکتا ہوں۔"
عبداللہ نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔ "لیکن بادشاہ کو تو خیزران کا علم ہو ہی جائے گا۔"
"ایسی صورت میں کہ اس سلسلے میں آپ خود بتادیں۔"
"میں بتاؤں یا نہ بتاؤں، تاجر اپنے بیان میں خیزران کا ذکر خود کرے گا۔"
قاضی نے جواب دیا۔ "تاجر کی زبان بندی کا میرے پاس علاج ہے۔"
"کیسا علاج، ذرا مجھے بھی معلوم ہو؟"
قاضی نے نہایت راز داری سے کہا۔ "اس کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ ہے کہ اس کی زبان کٹوادوں اور دوسری یہ کہ اسے بادشاہ کی خدمت میں پیش ہی نہ کروں، خود ہی قتل کروادوں۔"
عبداللہ نے کہا۔ "زبان کٹوانے کا عذر کیا پیش کیجیے گا؟"
قاضی نے جواب دیا۔ "یہ کہ تاجر بادشاہ کو بری طرح گالیاں دے رہا تھا۔"
"اور قتل کا کیا جواز پیش کیجیے گا؟"
"یہ کہ تاجر گرفتاری سے پہلے سخت مزاحمت کررہا تھا، مقابلے میں مارا گیا۔"
ان دونوں کی سرگوشیوں میں گفتگو جاری تھی کہ خیزران اور تاجر دونوں ہی ان کے پاس پہنچ گئے۔
عبداللہ نے قاضی سے کہا۔ "تب پھر آپ ایسا کیجیے کہ خیزران کو اپنی امانت کے طور پر میرے ہی پاس رہنے دیجیے۔ جب اس تاجر کا معاملہ رفع دفع ہوجائے اور آپ یہ سمجھ لیں کہ یہ مسئلہ ختم ہوگیا، آپ خیزران کو مجھ سے لے لیجیے گا۔ ورنہ یہ یاد رہے کہ خیزران آپ کے گھر پہنچی اور گھر کے کسی نہ کسی فرد نے حسد میں کسی نہ کسی طرح بادشاہ کو اس کی خبر پہنچادی تو پھر اس کا جو نتیجہ نکلے گا، اس سے آپ مجھ سے زیادہ واقف ہیں۔"
تاجر نے مداخلت کی، بولا۔ "عبداللہ! میں آپ کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ میں نے اپنی خیزران کے لیے آپ کو یا بادشاہ کو منتخب کیا تھا لیکن آپ اس کا قاضی سے معاملہ کررہے ہیں جبکہ اخلاقاً قانوناً یا اصولاً آپ کو اس کا حق ہی نہیں پہنچتا۔ خیزران میری ملکیت ہے، جب تک میں زندہ ہوں میں ہی اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرسکتا ہوں۔"
قاضی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اب تو ہے کہاں؟ پہلے تو، تو اپنا وجود ثابت کر۔ تو، تو شاہی آدمیوں سے مقابلہ کرتے ہوئے ہلاک ہوچکا۔ تیرے بعد خیزران کس کے حصے میں جائے گی اس کا میں، عبداللہ سے بات چیت کرکے ابھی فیصلہ کرائوں گا۔"
تاجر اپنی جگہ سے اچھلا اور خیزران کا گلا دبوچ لیا، بولا۔ "میں اس کا کام تمام ہی کیوں نہ کردوں۔"
عبداللہ نے جست لگائی اور تاجر کی پشت سے اس کی دونوں بغلوں میں اپنے ہاتھ ڈال دیے۔ عبداللہ کے دونوں ہاتھ تاجر کی بغلوں سے گزر کر شانوں سے ہوتے ہوئے گدی پر پہنچ کر مل گئے پھر اس نے پوری طاقت سے تاجر کی گردن جھکادی اور تاجر کے دونوں ہاتھ دباؤ بڑھنے کی وجہ سے پھیلتے چلے گئے جس سے خیزران کی گردن چھوٹ گئی۔ خیزران آزاد ہوتے ہی کمرے میں بھاگ گئی اور اسے اندر سے بند کرلیا۔
اس دھینگا مشتی میں عبداللہ کے غلام اور خدمت گار وہاں پہنچ گئے اور اس عجیب وغریب تماشے سے لطف اندوز ہونے لگے۔ تاجر نے اپنے آس پاس محل کے خدمت گاروں کو موجود دیکھا تو چیخنا شروع کردیا۔
"محل کے خدمت گارو! غلامو! میں بادشاہ کا باغی بغدادی تاجر ہوں۔ بادشاہ کو میری تلاش ہے۔ عبداللہ نے مجھے پناہ دی ہے مگر اس پناہ دینے کے عوض چاہتا ہے کہ میری خیزران کو......"
عبداللہ نے بات پوری نہ ہونے دی اور اس کی گردن کو اتنے زور سے مروڑا کہ تاجر کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

قاضی کمال نے مشورہ دیا۔ "اب اس کا مزید زندہ رہنا خطرناک ہے۔"
عبداللہ نے اپنے غلاموں کو حکم دیا۔ "یہ باغی ہے، اس کی اتنی پٹائی کرو کہ اس کا کام تمام ہوجائے۔"
غلاموں نے تاجر کی پٹائی شروع کردی۔ مکوں اور لاتوں کی یورش نے تاجر کو بے دم کردیا۔ اس کی سانس اکھڑ گئی اور وہ بے ہوش ہوگیا۔ اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ عبداللہ نے اسے رسیوں سے بندھوادیا پھر اسے اپنے کمرے میں اٹھوالے گیا اور غلاموں کو چلے جانے کا حکم دیا۔ جب تخلیہ ہوگیا تو قاضی کمال الدین نے کہا۔ "جناب! اب اس کا زندہ رہنا بہت خطرناک ہے۔ میری ناچیز رائے میں اب اس کا ہلاک کیا جانا بہت ضروری ہوگیا ہے۔"
عبداللہ نے جواب دیا۔ "میں چاہتا ہوں کہ رات کے اندھیرے میں آپ اپنے آدمیوں کے ساتھ میرے محل کے سامنے تشریف لائیں۔ میں اس بندھے ہوئے تاجر کو اپنے محل کے صدر دروازے کے سامنے پیپل کے درخت کے نیچے پھنکوادوں گا۔ آپ اپنے آدمیوں کی مدد سے اس کا کام تمام کرکے اس کی لاش بادشاہ کی خدمت میں پیش کردیجیے گا اور یہی باور کرائیے گا کہ باغی تاجر مقابلہ کرتے ہوئے ہلاک ہوگیا۔"
قاضی نے تشویش سے پوچھا۔ "اور خیزران...... اس کا کیا ہوگا؟"
عبداللہ نے جواب دیا۔ "سردست وہ اسی محل میں رہے گی، بعد میں اسے آپ لے جائیں گے۔"
قاضی کو عبداللہ کا فیصلہ ماننے میں تامل تھا، متذبذب لہجے میں بولا۔ "کیا میں یہ یقین کرلوں کہ اس معاملے میں جو کچھ طے پایا ہے، اس پر ہم دونوں اسی دیانت داری سے عمل بھی کریں گے؟"
عبداللہ نے کہا۔ "آپ کا تو مجھے کوئی علم نہیں کہ آپ اپنے قول پر پورا بھی اتریں گے یا نہیں لیکن میں خود اپنے لیے بدعہدی سخت ناپسند کرتا ہوں۔ خیزران آپ کی امانت ہے، جب چاہیں لے جائیں۔"
قاضی کمال الدین نے کہا۔ "مجھے آپ پر اعتبار ہے۔ اب ایک کرم اور کیجیے۔"
"ارشاد فرمایئے۔"
"میں خیزران کی ایک جھلک دیکھنا چاہتا ہوں۔ ظالم نے غضب کی شکل وصورت پائی ہے۔"
عبداللہ نے جواب دیا۔ "اس وقت وہ بہت ڈری سہمی ہوئی ہے۔ اس نے کمرے کو اندر سے بند کرلیا ہے اور کچھ پتا نہیں کہ میرے کہنے سے کھولتی بھی ہے یا نہیں۔ بہرحال میں کہہ کر دیکھتا ہوں۔"
عبداللہ نے بندھے ہوئے تاجر کو اپنے کمرے میں ہی پڑا رہنے دیا اور خود کمال الدین کو لے کر خیزران کے دروازے پر کھڑا ہوگیا اور دروازے کو تھپتھپا کے آواز دی۔
"خیزران! دروازہ کھول۔ تیرا آقا تاجر میرے کمرے میں بندھا پڑا ہے اور اب اس میں اتنا دم بھی نہیں ہے کہ وہ اپنی آنکھیں کھول کر اپنے ماحول ہی کو دیکھ سکے۔"
خیزران نے دروازہ کھول دیا۔ اس کی مغموم اور سرخ آنکھیں اس کی غمازی کررہی تھیں کہ وہ مسلسل روئے جارہی تھی۔ قاضی کمال الدین نے للچائی ہوئی نظروں سے خیزران کی طرف دیکھا اور خوشامدانہ انداز میں پوچھا۔ "تمہیں زیادہ تکلیف تو نہیں پہنچی؟"
خیزران نے جواب دیا۔ "میں سوچ رہی ہوں کہ انسان کتنا خودغرض ہوتا ہے۔ پہلے یہ تاجر میری محبت کا دم بھرا کرتا تھا پھر جب اس پر وقت پڑا اور اسے یقین ہوگیا کہ بادشاہ کے خلاف سازش کے جرم میں وہ معاف نہیں کیا جائے گا تو اس نے اپنے بچاؤ کی یہ تدبیر نکالی کہ مجھے رشوت کے طور پر اس شخص عبداللہ کے حوالے کردینا چاہا اور پھر ابھی کچھ ذرا دیر پہلے جب یہ معلوم ہوا کہ وہ نہیں بچ سکے گا تو اس نے حسد میں مجھے ہلاک کردینا چاہا یعنی مجھے...... جس سے وہ بہت زیادہ محبت کرتا تھا۔"
قاضی کمال الدین نے مسکراتے ہوئے تسلی دی۔ "خیزران! اب تو بے فکر ہوجا، مطمئن رہ، اب تو جس شخص کے پاس رہے گی، وہ تجھے نہایت عزت واحترام اور محبت سے رکھے گا۔"
عبداللہ نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ "خیزران! اب تو اندر سے دروازہ بند کرلے۔ ہم دونوں چلتے ہیں۔"
قاضی کمال الدین خیزران سے مزید باتیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اب وہ خیزران کی صورت ہی نہیں دیکھنا چاہتا تھا بلکہ اس کی لطیف مترنم آواز بھی سننا چاہتا تھا، بولا۔ "جناب! اب اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ خیزران کو اس وقت دلاسوں کی ضرورت ہے۔ اگر ہم دونوں یہاں کچھ دیر اور بیٹھ جائیں تو کیسا رہے گا؟"
عبداللہ نے جواب دیا۔ "نہیں، اب اس کی کوئی

ضرورت نہیں۔ اگر خیزران کو مزید تسلی دلاسوں کی ضرورت بھی محسوس ہوئی تو اس کے لیے میں جو یہاں موجود ہوں۔"

قاضی کمال الدین بہ مشکل وہاں سے ہٹا اور جاتے جاتے کہتا گیا۔ "جناب! اپنے عہد کا خیال رکھیے گا۔"

قاضی کمال الدین چلا گیا تو عبداللہ خیزران کے پاس واپس گیا۔ اس نے خیزران سے پوچھا۔ "اب تو سچ سچ بتا کہ تو کس کے پاس رہنا پسند کرے گی؟ میرے پاس، سلطان تغلق کے پاس یا قاضی کمال الدین کے پاس؟"

خیزران نے جواب دیا۔ "میں بادشاہ کے پاس تو اس لیے نہیں جاؤں گی کہ وہ عورتوں کا شوقین نہیں ہے اور قاضی کے پاس جانا اس لیے ناپسند کروں گی کہ اس سے میں واقف نہیں ہوں اور رہے آپ تو......"

عبداللہ نے بات کاٹ دی، بولا۔ "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تو میرے ساتھ رہنا پسند کرے گی؟"

خیزران نے جواب دیا۔ "نہیں، یہ بات بھی نہیں۔ میں آپ کو اس لیے ناپسند کرتی ہوں کہ آپ بے حد کنجوس ہیں اور یہ میں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ میں بہت زیادہ فضول خرچ ہوں۔ آپ مجھے برداشت نہیں کر سکیں گے۔"

عبداللہ نے جلدی سے کہا۔ "تو اس کی فکر نہ کر۔ میں تیرے لیے شاہ خرچ بھی بن سکتا ہوں، تو مجھے موقع تو دے۔"

خیزران نے جواب دیا۔ "میں سوچوں گی اور سوچے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کروں گی۔"

عبداللہ نے کہا۔ "خیزران! میں تجھے پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میری بیوی تیری ہم شکل ہے اور تجھے دیکھ کر مجھے سکون ملتا ہے۔"

خیزران نے چڑ کر جواب دیا۔ "آپ کی بیوی اگر واقعی میری ہی طرح ہے تو آپ اسے بلا کیوں نہیں لیتے؟ اصل کے مقابلے میں نقل بیکار ہے۔ میں اپنے علاوہ کسی اور کے حسن کی تعریف سننا سخت ناپسند کرتی ہوں۔"

عبداللہ کھسیا گیا اور خیزران کو اس کے حال پر چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

منصوبے پر اسی طرح عمل کیا گیا جس طرح عبداللہ کے ساتھ طے پایا تھا۔ قاضی کمال الدین نے بادشاہ کو مطلع کیا کہ سازشی تاجر کا سراغ لگ چکا ہے اور اللہ نے چاہا تو وہ ایک دن کے اندر ہی وہ زندہ یا مردہ حاضر کر دیا جائے گا۔ وہ منصوبے کے مطابق مغرب کے بعد چند معتبر آدمیوں کے ساتھ عبداللہ کے قصر کے سامنے پیپل کے درخت کے نیچے پہنچا۔ وہاں بغدادی تاجر زخموں سے چور پڑا کراہ رہا تھا۔ قاضی نے اسے گرفتار کر لیا۔ تاجر جاں بہ لب تھا۔ اس کا راستے میں ہی انتقال ہو گیا۔ دوسرے دن صبح قاضی کمال الدین نے شاہی محل دارسرا میں حاضری دی۔ ایک طرف سے قاضی کمال الدین لاش کے ساتھ دارسرا کے دروازے پر پہنچا، دوسری طرف سے عبداللہ پہنچ گیا۔

محل کے دروازے پر پہرے دار سپاہیوں کا پُرانہایت چاق و چوبند اور مستعد اپنے فرائض انجام دے رہا تھا اور ایک طرف دروازے کے برابر نقارے بجانے والے بیٹھے تھے۔ دروازے کے سامنے ایک چبوترا تھا۔ اس چبوترے پر کئی جلاد بیٹھے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں برہنہ تلواریں تھیں۔

نقاروں کے ذریعے محل کے اندر والوں کو مطلع کیا کہ قاضی کمال الدین اور عبداللہ پہلے دروازے پر آ چکے ہیں۔ یہ لوگ یہاں سے گزر کر دوسرے دروازے پر پہنچے، وہاں بھی یہ عمل دہرایا گیا۔ تیسرے دروازے پر متصدیوں نے ان کے نام لکھے اور اندر جانے کی اجازت دے دی۔

اندر بادشاہ بہت برہم بیٹھا تھا۔ وہ عبداللہ کو دیکھ کر احتراماً کھڑا ہو گیا اور عبداللہ کو اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ قاضی کمال الدین نے بادشاہ کو مطلع کیا کہ بغدادی تاجر کی لاش دارسرا کے پہلے دروازے پر رکھی ہے۔

بادشاہ نے پوچھا۔ "یہ کس طرح ہلاک ہوا؟"

قاضی کمال الدین نے جواب دیا۔ "مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا۔"

بادشاہ نے بے یقینی سے کہا۔ "ہوں، کیا تو سچ بول رہا ہے؟"

قاضی کی جان نکل گئی، بولا۔ "جی حضور والا! کس میں اتنی ہمت ہے کہ حضور کے سامنے دروغ بیانی کرے۔"

اس وقت بادشاہ کے سامنے چند دوسرے مقدمات بھی پیش تھے۔ بادشاہ کے سامنے دو سندھی مولوی بھی موجود تھے۔ ان مولویوں کے قریب ایک ترکی امیر کھڑا تھا۔ بادشاہ نے ترکی امیر سے کہا۔ "تو گجرات کی حکومت سنبھال لے۔" اور دونوں سندھی مولویوں سے کہا۔ "اور تم دونوں اس امیر کے ساتھ جاؤ گے۔"

ایک سندھی مولوی نے پوچھا۔ "ہم دونوں کے فرائض منصبی کیا ہوں گے؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "گجرات کی رعیت تم دونوں کی ہو گی، تم دونوں جو کہو گے یہ امیر اس پر عمل کرے گا۔"

دونوں مولویوں نے بیک آواز کہا۔ "یعنی ہم دونوں

اس امیر پر گواہ کی طرح مسلط رہیں گے اور جو بات درست سمجھیں گے اسے بتادیا کریں گے۔"

بادشاہ کی تیوریوں پر بل پڑ گئے، پوچھا۔" تم دونوں نے کیا کہا، ذرا پھر سے دہرانا؟"

دونوں مولویوں نے پھر یک آواز کہا۔" حضورِ والا! جس بات کو ہم درست سمجھیں گے، اسے بتادیا کریں گے۔"

بادشاہ نے انہیں کچھ اور کہنے کا موقع ہی نہیں دیا، بولا۔" مجھے تم دونوں کی نیت پر شبہ ہے۔شاید تم دونوں نے اپنے دلوں میں یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ لوگوں کا مال کھا کر اس پردیسی ترکی امیر پر اس کا الزام لگاؤ۔"

دونوں مولوی تھر تھر کانپنے لگے، بولے۔" اخوند عالم پناہ! بخدا ہماری یہ نیت نہیں ہے۔"

بادشاہ اور زیادہ جھنجلا گیا، بولا۔" تم دونوں مجھے جھٹلاتے ہو؟" پھر اپنے گردوپیش موجود خدمت گاروں کو حکم دیا۔" ان دونوں کو اسی وقت شیخ زادہ نہاوندی (جلاد) کے پاس لے جاؤ اور اس سے کہو کہ بادشاہ کو جھٹلانے کے جرم میں عذاب کا مزہ چکھادے۔"

خدمت گاروں نے اسی وقت ان دونوں مولویوں کو جکڑ لیا اور وہاں سے باہر کھینچ لے گئے۔

اب بادشاہ قاضی سے مخاطب ہوا۔" قاضی کمال الدین! یہ کام تیرا نہیں تھا۔تو نے ایک ایسا کام کیوں انجام دیا جو میرے کوتوال کا تھا؟"

قاضی کمال الدین کی جان نکل گئی، سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا۔" میں خود کو حضورِ والا کا ایک ادنیٰ غلام سمجھتا ہوں اس لیے بادشاہ کی ہر خدمت انجام دینے کی لگن رکھتا ہوں۔"

"قاضی کمال الدین! اپنی بکواس بند کر اور بغدادی تاجر کی موت کی تفصیل میری زبان سے سننے کا موقع مت فراہم کر۔میں ابن خلیفہ عبداللہ کا بے حد احترام کرتا ہوں اور انہی کے طفیل تجھے معاف کیا جارہا ہے۔" پھر عبداللہ سے کہا۔" اور خیزران آپ ہی کے پاس رہے گی۔یہ کیسا قاضی ہے کہ ایک معمولی عورت پر لوٹ پوٹ ہوگیا۔"

عبداللہ نے عاجزی سے جواب دیا۔" مجھ پر بادشاہ کے یوں ہی کیا کم احسان ہیں کہ ہر روز ان میں چند نئے احسانوں کا اضافہ ہوجاتا ہے۔"

بادشاہ نے قاضی کمال الدین سے کہا۔" کل تیری عدالت میں میرے خلاف ایک مقدمہ پیش ہونے والا ہے۔خبردار جو تو نے اس سلسلے میں میرا احترام کیا۔میں ایک عام مدعا علیہ کی حیثیت سے تیری عدالت میں حاضری دوں گا اور تجھ سے یہ امید رکھوں گا کہ تو میرے مرتبے اور حکومت کی پروا کیے بغیر اس مقدمے کا فیصلہ کرے گا۔اگر تو نے ایسا نہ کیا تو اپنے فریضے سے غفلت اختیار کرنے کے جرم میں مجرم ٹھہرے گا۔"

قاضی نے ادب سے دریافت کیا۔" میں حضورِ والا کے احکام کی بجاآوری کے لیے ہر وقت حاضر اور آمادہ ہوں۔"

بادشاہ نے مزید حکم دیا۔" ابھی ابھی جب تو یہاں سے باہر جائے گا تو شیخ زادہ نہاوندی (جلاد) سے ضرور مل لینا کیونکہ وہ دونوں مولویوں کو اذیتیں دے رہا ہوگا۔تم ان دونوں کو سمجھا دینا کہ اقرارِ جرم میں فائدے ہی فائدے ہیں اور انکار میں نقصان ہی نقصان ہے۔"

جب قاضی کمال الدین آداب بجالا کے باہر چلا گیا تو بادشاہ نے عبداللہ سے کہا۔" مجھے آپ کی یہ بات بہت پسند آئی کہ بغدادی تاجر کو گرفتار آپ نے کیا اور بعد میں اسے ہلاک بھی آپ ہی نے کیا اور اس کامیابی کا سہرا قاضی کمال الدین کے سر باندھ دیا۔بڑی فراخ دلانہ بات ہے۔میں اس سے بہت متاثر ہوا اور اسی خوشی میں قاضی کو معاف بھی کردیا۔"

عبداللہ نے عاجزی سے گردن جھکالی، بولا۔" یہ بادشاہ کی بندہ نوازی اور خدمت شناسی ہے ورنہ میں خود کو اس لائق نہیں سمجھتا۔"

بادشاہ نے کہا۔" آقا زادے! میں آپ سے درخواست ہی کرسکتا ہوں کہ شیخ زادہ نہاوندی (جلاد) کے پاس سے ہوتے ہوئے جائیے گا۔میں ان بے ایمان مولویوں سے بہت ناخوش ہوں۔"

عبداللہ نے جواب دیا۔" بہت بہتر۔"

جب عبداللہ محل کے باہر آگیا تو اس کے پہلے دروازے کے سامنے چبوترے پر اس نے نہاوندی جلاد کو دونوں مولویوں پر جرح کرتے دیکھا۔ان کے پاس ہی قاضی کمال الدین کھڑا تھا۔

نہاوندی جلاد دونوں کو سمجھانے لگا۔" تم دونوں احمق ہو۔کیا تم نے ابھی تک یہ نہیں محسوس کیا کہ بادشاہ تم دونوں کی جان لینا چاہتا ہے۔اس لیے بہتری اسی میں ہے کہ تم دونوں اپنے جرم کا اقرار کرلو اور بادشاہ جو کچھ کہہ رہا ہے، اپنی زبان سے کہہ ڈالو۔"

دونوں نے یکے بعد دیگرے جواب دیا۔" ہماری نیت وہی تھی جو بادشاہ سے عرض کیا گیا۔اس کے علاوہ ہم جو

کچھ بھی کہیں گے، وہ جھوٹ ہوگا۔"

نہاوندی جلاد نے کہا۔" افسوس کہ تم دونوں خود ہی یہ چاہتے ہو کہ میرے عذاب کا مزہ چکھو۔" پھر اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔" ارے، ان دونوں کو میرے عذاب کا مزہ تو چکھاؤ۔"

نہاوندی جلاد کے چار ماتحت دونوں پر جھپٹے اور انہیں چبوترے پر چت لٹادیا۔ذرا دیر بعد دو آدمی لال لال گرم انگارے کی طرح دہکتی ہوئی دو سلیں لائے اور انہیں ان دونوں کے سینوں پر رکھ دیا۔دونوں کی بے اختیار چیخیں نکل گئیں۔ان کی دردناک چیخوں نے لوگوں کو لرزادیا۔ذرا دیر بعد جب یہ سلیں ان کے سینوں سے ہٹائی گئیں تو ان کے ساتھ دونوں کے سینوں کی کھالیں تک اتر آئیں۔

اس کے بعد نہاوندی جلاد ہی کے حکم سے ان زخمی سینوں پر پیشاب اور راکھ ڈال دی گئی۔دونوں بلبلا گئے۔درد کی شدت سے ان پر غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ان دونوں نے شیخ زادہ نہاوندی کو مطلع کیا۔" ہم دونوں وہی بیان دینے کو تیار ہیں جو بادشاہ چاہتا ہے۔"

جلاد نے اسی وقت ان دونوں سے تحریریں لے لیں جن پر لکھا تھا۔" ہماری نیت وہی تھی جس کا بادشاہ نے اظہار کیا تھا اور ہم دونوں گناہ گار اور قتل کے مستحق ہیں۔اگر ہم قتل کیے جائیں تو دین اور دنیا میں ہمیں کوئی دعویٰ نہ ہوگا۔"

نہاوندی جلاد نے اس تحریر پر ان دونوں کے دستخط لے لیے۔اس کے بعد کہا۔" قاضی کمال الدین! آپ اس پر ذرا یہ تو لکھ دیجیے کہ یہ دونوں کسی جبر و اکراہ کے بغیر اپنے جرم کا اقرار کررہے ہیں۔"

نہاوندی جلاد نے یہ تحریر اپنے قبضے میں کی اور دونوں کی گردنیں اسی وقت اڑادیں۔

جب یہاں سے عبداللہ اور قاضی کمال الدین ایک دوسرے سے جدا ہونے لگے تو قاضی نے کہا۔" آقا زادے! اب خیزران کا کیا رہے گا؟"

عبداللہ نے جواب دیا۔" میں نے تو اسے تیری امانت ہی سمجھ کر رکھا تھا لیکن اب یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر بادشاہ کو یہ خبر ہوگئی کہ خیزران تیرے حوالے کردی گئی ہے تو تیری جان خطرے میں پڑ جائے گی۔"

قاضی کے دل پر خیزران نے گہرا نقش چھوڑا تھا، بولا۔" وہ تو ٹھیک ہے لیکن وقت کا انتظار تو کیا جاسکتا ہے۔ممکن ہے کسی وقت بادشاہ ترنگ میں آکر مجھے اجازت دے دیں کہ میں خیزران کو اپنے پاس رکھ لوں۔"

عبداللہ نے جواب دیا۔" اگر تو انتظار ہی پر آمادہ ہے تو بڑے شوق سے انتظار کر، ورنہ میرے خیال میں اب یہ انتظار فضول ہے۔بادشاہ کے مزاج سے تو، تو واقف ہی ہے۔"

قاضی نے کہا۔" بہرحال میں وقت کا انتظار کروں گا۔آپ بھی انتظار کریں۔"

محل میں خیزران اس کا انتظار کررہی تھی۔بڑی بے چینی سے دریافت کیا۔" میرا آقا کہاں ہے؟"

عبداللہ نے جواب دیا۔" خیزران! خوش ہوجا کہ تیرا اس سے پیچھا چھوٹ گیا۔"

اس کے بعد پوری روداد سنادی۔خیزران رونے لگی۔عبداللہ نے پوچھا۔" آخر تو رو کیوں رہی ہے؟"

خیزران نے جواب دیا۔" میں اس کی غریب الوطنی کی موت پر آنسو بہارہی ہوں۔اس کے علاوہ وہ بڑا فراخ دل اور حوصلہ مند شخص تھا۔"

عبداللہ نے کہا۔" خیزران! فراخ دل اور حوصلہ مند تو میں بھی ہوں لیکن ہاں فضول خرچی سے بڑی نفرت کرتا ہوں۔"

خیزران نے جواب دیا۔" اور یہ میری بدقسمتی ہی ہے کہ میں نے ہیرا گنوا کر پتھر حاصل کرلیا۔"

عبداللہ نے چڑ کر کہا۔" یہ کیا بکواس کررہی ہے ناشکری عورت؟ کیا تو ابھی تک میرے آباؤاجداد کو نہیں جانتی؟"

خیزران نے جواب دیا۔" میں عباسی خلفا سے خوب اچھی طرح واقف ہوں لیکن کیا یہ مناسب نہیں رہے گا کہ آپ آئندہ اپنے عظیم المرتبت بزرگوں کا ذکر نہ کریں۔"

" کیوں...... آخر کیوں؟"

خیزران نے جواب دیا۔" اس لیے کہ ان کی جو عزت بن چکی ہے، اسے قائم رہنا چاہیے۔اگر آپ ان حالات میں فخریہ کسی اور کے پاس جاکر یہ کہیں کہ آپ کے آباؤاجداد عالمِ اسلام میں حکمرانی کے فرائض انجام دے چکے ہیں تو وہ کیا کہیں گے؟"

عبداللہ نے چڑ کر کہا۔" اچھا، اب یہ فضول باتیں تو کر نہیں، میں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ میں تجھے کسی اور کے حوالے ہرگز نہ کروں گا۔"

خیزران نے کہا۔" اچھا پھر یہ بھی سن لیجیے کہ میں بخل اور خست کو سخت ناپسند کرتی ہوں۔"

عبداللہ اس کے پاس ہی جا بیٹھا۔اس نے خیزران کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، بولا۔" تیرا ہاتھ بھی میری بیوی زبیدہ ہی کی طرح ہے بالکل اسی کی طرح...... شاید تو میری

بات کا یقین نہ کرے۔"

خیزران نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ "میں یہ بات بالکل ناپسند کروں گی کہ آپ مجھے یا میرے کسی عضو کو اس لیے پسند کریں کہ ان میں آپ کی بیوی زبیدہ کی حیرت ناک مشابہت پائی جاتی ہے۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ آپ مجھے میری وجہ سے، میرے حسن اور میری دلکشی کے پیشِ نظر پسند کریں۔"

"خیزران! کمال ہے کہ زبیدہ باتیں بھی تیری ہی طرح کرتی تھی۔"

"پھر وہی، میں کہتی ہوں کہ اگر آپ نے اپنی باتیں اسی طرح جاری رکھیں تو میں کسی دن عاجز آ کر خودکشی ... کرلوں گی۔"

عبداللہ نے جواب دیا۔ "میری بیوی زبیدہ بھی اسی طرح خودکشی کی دھمکیاں دیا کرتی تھی۔"

خیزران نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ عبداللہ نے کہا۔ "کمال ہے، کسی بات سے عاجز آ کر زبیدہ بھی اسی طرح اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیا کرتی تھی۔"

خیزران ہاتھ چھڑا کر ایک کمرے میں چلی گئی اور اسے اندر سے بند کرلیا۔ باہر عبداللہ اپنی کہے جارہا تھا۔

"زبیدہ بھی میری باتوں سے عاجز آ کر یوں ہی کمروں میں چھپ جایا کرتی تھی۔"

☆☆☆

قاضی کمال الدین کی عدالت میں اتنا ہجوم پہلے نہیں دیکھا گیا تھا۔ ایک طرف کسی امیر کا تیرہ چودہ سالہ لڑکا تیوری چڑھائے کھڑا تھا اور اس کے مقابل کٹہرے میں بادشاہ عام آدمی کی طرح عدالت اور اس امیر زادے کو دیکھنے میں محو تھا۔

عبداللہ اس منظر سے بہت متاثر ہوا، بولا۔ "جب تک یہ صورتِ حال اس ملک میں موجود رہے گی، سارے ملک میں انسانی فلاح و بہبود کے کام ہوتے رہیں گے، خدا مہربان رہے گا۔"

قاضی کمال الدین نے لڑکے سے پوچھا۔ "اب بتا کہ تیرے استغاثہ کی بنیاد کیا ہے؟"

امیر زادے نے بادشاہ کی طرف دیکھا اور بولا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ میں نے اگر صاف گوئی سے کام لیا تو اس کا انجام کیا ہوگا؟"

قاضی کمال الدین نے درشت لہجے میں کہا۔ "امیر زادے! یہ عدالت ہے، یہاں ہیر پھیر کی باتیں نہیں کی جاتیں۔"

امیر زادے نے بادشاہ کی طرف دیکھا۔ بادشاہ نے کہا۔ "امیر زادے! تو مدعی ہے میں مدعا علیہ، یہ عدالت کسی کے ساتھ بھی رعایت نہ کرے گی۔ تو اپنا استغاثہ پیش کر۔"

امیر زادے نے رک رک کر کہنا شروع کیا۔ "حضورِ والا! میں مدعا علیہ کے درباری امیر کا بیٹا ہوں۔ پچھلے ہفتے مدعا علیہ نے بلاوجہ مجھ پر الزام لگایا کہ میں اس کے غداروں سے مل گیا ہوں۔ بس اسی دن سے میں گرفتار ہوں۔"

امیر زادے سے پوچھا گیا۔ "تیرے اس الزام سے بادشاہ اگر انکار کردے تو کیا تیرے پاس گواہ موجود ہیں جو تیرے استغاثے کی تائید میں گواہی دے دیں؟"

امیر زادے نے کہا۔ "میں نے جو کچھ بھی کہا ہے، درست ہے اور میں دو ایسے گواہ پیش نہیں کرسکوں گا جو عدالت میں حاضر ہو کر بادشاہ کے خلاف گواہی دیں۔ ہاں میرے پاس ایک گواہ ایسا موجود ہے جو میری طرف سے گواہی دے گا اور وہ کسی سے مرعوب ہونا تو گویا جانتا ہی نہیں۔"

قاضی نے کہا۔ "اسے حاضر کر۔"

امیر زادے نے بادشاہ کی طرف دیکھا، بولا۔ "میرا گواہ بادشاہ خود ہے۔ عدالت بادشاہ سے کہے کہ یہ خدا کو حاضر و ناظر جان کر یہ بتائے کہ اس نے مجھے ایک بے بنیاد شبہے پر قید کرکے لکڑی کی چھڑی سے پیٹا کیوں؟"

قاضی کمال الدین نے بادشاہ سے پوچھا۔ "کیا امیر زادے کا الزام درست ہے؟ مدعا علیہ محمد تغلق خدا کو حاضر و ناظر جان کر سچ بتائے کہ امیر زادہ جھوٹا ہے یا سچا؟"

بادشاہ نے پژمردہ آواز میں جواب دیا۔ "میری جیسی حیثیت کا آدمی جھوٹ بولنے کی ہمت تک نہیں کرسکتا۔ مجھے اقرار ہے کہ میں نے غلط فہمی میں اس امیر زادے کو قید کروادیا تھا اور لکڑی کی چھڑی سے اس کی پٹائی کی تھی۔"

قاضی نے دریافت کیا۔ "امیر زادے کو لکڑی کی چھڑی سے کہاں اور کن لوگوں کے سامنے پیٹا گیا تھا؟"

امیر زادے کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں، بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "بھرے دربار میں، شرکائے دربار کے سامنے۔"

قاضی نے بادشاہ سے پوچھا۔ "کیا مدعی درست کہتا ہے؟"

بادشاہ نے شرم سے سر جھکا دیا، بولا۔ "ہاں وہ درست کہتا ہے۔"

قاضی نے پوچھا۔ "اور وہ چھڑی کہاں ہے جس سے امیر زادے کو پیٹا گیا تھا؟"

امیر زادے نے جواب دیا۔ "وہ چھڑی نقیب النقباء

کی تھی۔ بادشاہ نے غصے میں چھڑی اس کے ہاتھ سے لے کر میری پٹائی کی تھی۔"

قاضی نے بادشاہ سے پوچھا۔ "مدعا علیہ بتائے کہ مدعی کی بات کہاں تک درست ہے؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "امیر زادہ سچ بول رہا ہے۔"

قاضی نے امیر زادے سے پوچھا۔ "کیا تجھے یاد ہے کہ بادشاہ نے تجھے کتنے بید لگائے تھے؟"

امیر زادے نے جواب دیا۔ "خوب یاد ہیں، میں نے گنے تھے۔ مجھے اکیس بید لگے تھے۔"

قاضی نے بادشاہ سے پوچھا۔ "مدعا علیہ تصدیق یا تردید کرے کہ مدعی سچا ہے یا جھوٹا؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "مجھے بیدوں کی تعداد نہیں معلوم کیونکہ میں اس وقت غصے میں تھا اور اسے اشتعال میں پیٹ رہا تھا۔"

قاضی نے کہا۔ "چونکہ شروع سے آخر تک امیر زادے نے کسی جگہ بھی جھوٹ کا سہارا نہیں لیا ہے اس لیے اس کی بیان کردہ بیدوں کی ضربات کی تعداد کو عدالت سچ مانتی ہے۔" اس کے بعد پھر امیر زادے سے سوال کیا۔

"اب امیر زادہ عدالت کے آخری سوال کا نہایت احتیاط اور غور و فکر کے بعد جواب دے۔ اس کے لیے امیر زادے کو اپنے حافظے اور ضربات کی اذیت پر غور کرنا پڑے گا۔"

بادشاہ، امیر زادہ اور حاضرینِ عدالت دم بخود قاضی کے آخری سوال کا انتظار کررہے تھے۔ قاضی نے کہا۔ "امیر زادے کو یہ یاد ہے کہ بادشاہ نے اس کے جسم کے کن کن حصوں پر بید مارے تھے؟"

امیر زادہ اس آخری سوال پر سوچ میں پڑ گیا، کچھ دیر بعد جواب دیا۔ "میری پشت، دونوں شانے، سر، دونوں ٹانگیں اور بچاؤ کی غرض سے بے اختیار اٹھنے والے دونوں ہاتھ بادشاہ کی مار سے زخمی ہوئے تھے لیکن میں یہ نہیں بتا سکتا کہ کتنے بید میری پشت پر لگے تھے، کتنے شانوں، کتنے ٹانگوں پر اور کتنے ہاتھوں پر۔"

قاضی خاموش ہوگیا اور مقدمے کی روداد کے پیشِ نظر فیصلے پر غور کرنے لگا پھر اس نے لکھنا شروع کیا اور جب لکھ چکا تو اپنا فیصلہ پڑھ کر سنادیا۔

"اس مقدمے میں ایک معمولی امیر زادہ مدعی ہے اور محمد تغلق مدعا علیہ جو اس ملک کا مقتدرِ اعلیٰ بھی ہے۔ مقدمے کی روداد کی جان یہ نکتہ ہے کہ بادشاہ نے اپنے جرم سے انکار نہیں کیا اور مدعی کو راست گو قرار دیا ہے۔ ان حالات میں عدالت کا کام بہت آسان ہوجاتا ہے۔ عدالت محمد تغلق کو مجرم اور ظلم و زیادتی کا سزاوار قرار دیتی ہے اور مدعی امیر زادے کو حکم دیتی ہے کہ وہ بادشاہ کو بھرے دربار میں اسی بید سے اکیس ضربات لگائے اور کوشش کرے کہ یہ ضربات بادشاہ کے انہی اعضا پر لگائی جائیں جہاں جہاں بادشاہ نے اس کے لگائی تھیں۔ اور ضربات لگانے کے دوران مدعی امیر زادہ اس کا خاص خیال رکھے کہ یہ ضربات قریب قریب اتنی ہی شدید یا ہلکی ہوں جتنی شدید یا ہلکی بادشاہ کی ضربات رہی ہوں گی۔"

عدالت میں سناٹا طاری ہوگیا۔ بادشاہ مغموم اور دل شکستہ واپسی کے لیے مڑا اور عدالت سے باہر نکل کر حاجبوں کے سردار ملک فیروز کو حکم دیا۔ "ملک فیروز! میں نے اس امیر زادے کو محل ہزار ستون کے دیوان میں پیٹا تھا۔ تو اسی وقت محل کے دروازے پر رکھے ہوئے دفتر میں اندراجات کے مطابق ان امراء کو دربار میں طلب کرے جنہوں نے اس دن امیر زادے کی پٹائی کا منظر دیکھا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس سزا پر فوراً ہی عمل درآمد ہوجائے۔"

ملک فیروز، بادشاہ کا چچا زاد بھائی بھی تھا۔ اس نے محسوس کیا اس وقت بادشاہ بہت مغموم ہے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "حضورِ والا! اس ناچیز کی رائے میں اگر امیر زادے کو مال و دولت سے نواز دیا جائے تو وہ آپ کی شان میں گستاخی نہیں کرسکے گا۔"

بادشاہ نے افسردہ سی آواز میں کہا۔ "میں اس امیر زادے کے مزاج سے کسی حد تک واقف ہوگیا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ اس سزا کے عوض مال و دولت نہیں قبول کرے گا بلکہ وہ بادشاہ کے تازیانے لگانے کو اپنی زندگی کا عظیم کارنامہ تصور کرے گا اور پھر میری غیرت یہ گوارا نہیں کرے گی کہ میں اس کی خوشامد درآمد کروں اور سزا کے عوض اسے مال و دولت قبول کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کروں۔"

ملک فیروز نے کہا۔ "کیا میں بات کروں؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "کرکے دیکھ لے۔"

ملک فیروز نے امیر زادے سے بات کی لیکن وہ مال و دولت لینے پر آمادہ نہیں ہوا۔ اس نے جواب دیا۔ "حاجبوں کے سردار! تو میری اس خوشی کا اندازہ نہیں کرسکتا جو مجھے بھرے دربار میں بادشاہ کو اکیس تازیانے لگا کر حاصل ہوگی۔ میں حکومت کے عوض بھی اس لذت کا سودا نہیں کرسکتا۔"

امیرزادے کے جواب کا جب بادشاہ کو علم ہوا تو اس نے آہستہ سے کہا۔ ”ملک فیروز! امیرزادے کے اس جواب کا مجھے پہلے سے علم تھا۔ اب تو دربار لگانے کا اہتمام کر۔“

بادشاہ دارسرا چلا گیا اور ملک فیروز محل کے دروازے پر متعین مصدیوں کے پاس، جن کے دفتر میں دربار میں حاضر ہونے والے امراء اور شرکاء کے اندراجات ہوتے تھے۔

☆☆☆

عبداللہ، بادشاہ سے اتنا متاثر تھا کہ بار بار اس کا دل بھر آتا تھا۔ وہ اپنے محل میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر پریشان ہوگیا کہ اس کے کئی ملاقاتی اور دوست اس کے منتظر ہیں۔ عبداللہ نے انہیں بادشاہ کے مقدمے کی روداد سنائی اور کہا۔ ”میں حیران ہوں، اتنی بہت ساری صفات اس ایک شخص میں کس طرح جمع ہوگئی ہیں۔“

ان میں ایک فقیہہ عفیف الدین بھی شامل تھا۔ اس نے کہا۔ ”عبداللہ! آپ اس شخص کی تعریف کررہے ہیں جس کے عدل اتفاقی سے زیادہ اس کا ظلم اور خون ریزی مشہور ہے۔“

عبداللہ نے ناگواری سے کہا۔ ”فقیہہ عفیف الدین! تو بادشاہ کو ظالم مت کہہ۔“

عفیف الدین کے دو دوست ایک ساتھ بولے۔ ”کچھ دنوں پہلے عفیف الدین نے بادشاہ کے اس عمل کی مخالفت کی تھی کہ شہر کے باہر کنوئیں کھود کر بادشاہ کی طرف سے زراعت کا حکم دیا گیا تھا۔ بیج اور آلات کاشت کاری بادشاہ کی طرف سے فراہم کیے گئے تھے۔ بادشاہ نے اس کا معاوضہ یوں وصول کرلیا کہ پوری فصل شاہی گودام میں داخل کروا دی جاتی تھی۔ عفیف الدین فقیہہ ہے اس لیے اس نے بادشاہ کے اس فعل کو ناجائز قرار دیا۔“

عبداللہ نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔ ”ہاں پھر کیا ہوا؟“

دونوں دوستوں نے جواب دیا۔ ”بادشاہ نے انہیں قید کردیا اور کہا کہ تو امورِ سلطنت میں کیوں دخل دیتا ہے۔ گو کہ چند دنوں بعد بادشاہ نے عفیف الدین کو رہا کردیا لیکن یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ عفیف الدین موت کے منہ سے نکل آئے۔“

عفیف الدین نے مسکرا کر کہا۔ ”واقعی یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں نے اس ظالم سے نجات حاصل کرلی۔“

کھانے کا وقت ہوچکا تھا۔ عبداللہ انتظار کررہا تھا کہ عفیف الدین اور دوسرے لوگ چلے جائیں تو وہ کھانا کھائے لیکن وہ لوگ جانے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ کافی دیر بعد عبداللہ نے ازراہِ تکلف اور رسماً پوچھا۔ ”آپ لوگ اس وقت کا کھانا تو میرے ہی ساتھ نوش فرمائیں گے؟“

عبداللہ کا خیال تھا کہ اس طرح یہ لوگ جلدی ٹل جائیں گے لیکن عفیف الدین نے جواب دیا۔ ”حضرت! اس وقت تو ہم سب آپ ہی کے ساتھ کھائیں گے اور آپ کے ساتھ خورد و نوش ہم سب کے لیے ایک اعزاز ہوگا۔“

عبداللہ نے بناوٹی خوش اخلاقی سے جواب دیا۔ ”تب پھر مجھے اندر جانے کی اجازت دیجیے تاکہ میں آپ حضرات کے لیے کھانے کا انتظام کروں۔“

عفیف الدین نے کہا۔ ”بہتر ہے، جب تک ہم لوگ آپس میں باتیں کرتے ہیں۔“

عبداللہ نے اندر جاکر خیزران سے کہا۔ ”خیزران! جب سے تو نے اس گھر میں قدم رکھا ہے، میں فضول خرچیوں کا شکار ہوگیا ہوں۔ تو خود بھی فضول خرچ ہے اور اب جو لوگ میرے پاس آرہے ہیں، وہ سب فضول خرچ ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟“

خیزران نے شوخی سے پوچھا۔ ”کیوں کیا ہوا؟“

عبداللہ نے عفیف الدین اور دوسرے لوگوں کی آمد کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ ”اب وہ سب بضد ہیں کہ اس وقت کا کھانا ساتھ کھائیں گے۔ خیزران! ذرا سوچو تو یہ کتنا غیر اخلاقی فعل ہے کہ میرے پوچھنے پر انہوں نے تکلفاً بھی یہ نہیں کہا کہ وہ کھانا نہیں کھائیں گے۔“

خیزران نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”ہر شخص کا رزق مقرر ہے۔ وہ جہاں ہوتا ہے وہ اسے وصول کرنے وہیں پہنچ جاتا ہے چنانچہ فقیہہ عفیف الدین اور دوسرے لوگ اگر اپنے حصے کا رزق وصول کرنے یہاں آگئے ہیں تو آپ کو اس پر ملول ہونے کے بجائے خوش ہونا چاہیے کہ خدا نے آپ کو اس قابل بنادیا کہ دس آدمی آپ کے ساتھ دسترخوان پر اپنا رزق کھائیں گے۔“

عبداللہ نے جھنجلا کر کہا۔ ”محنت کرکے کھانا چاہیے۔ پرندوں تک کو دانے کی تلاش میں ادھر ادھر سرگرداں رہنا پڑتا ہے پھر کہیں انہیں دانہ ملتا ہے۔ مجھے مہمان کی حرام خوری ذرا بھی پسند نہیں۔“

خیزران شرارت پر تلی ہوئی تھی، بولی۔ ”اگر پرندوں کو اپنے رزق کی تلاش میں ادھر ادھر رہنا پڑتا ہے تو آپ کے ان مہمانوں کو بھی آپ کے محل تک آنے کی زحمت اٹھانا پڑی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی دیکھتی ہوں کہ آپ نے کوئی محنت نہیں کی مگر بادشاہ کی داد و دہش اور تقدیر

نے آپ کو سب سے زیادہ خوش قسمت انسان بنادیا ہے۔“

عبداللہ چیخ پڑا، بولا۔ ”خیزران! تو سر چڑھنے کی کوشش مت کر۔ میں بغداد کے عباسی خلیفہ کے خاندان کا ایک فرد ہوں۔ میرے آبا و اجداد نے جو سخت محنت کی تھی، اس کے صلے میں اگر میں نے یہ دولت اور اعزاز حاصل کرلیا ہے تو تجھے تکلیف کیوں پہنچ رہی ہے۔ اور پھر اس دولت اور اعزاز کو حاصل کرنے کے لیے مجھے ایران سے دہلی تک کا مصائب و آلام سے پُرسفر کرنا پڑا ہے، مجھے جو کچھ بھی ملا ہے یوں ہی نہیں مل گیا۔“

خیزران نے عبداللہ کی خفگی کی کوئی پروا نہیں کی، برابر ہنستی مسکراتی رہی۔

عبداللہ نے مہمان دوستوں کے لیے کھانا تیار کروایا۔ کھانے سے ذرا پہلے ایک ایرانی تاجر نازل ہوگیا۔ وہ عبداللہ کی بیوی کا ایک پیغام لایا تھا۔ اس کی بیوی نے کہلوایا تھا۔

”معاشی بدحالی نے میرا برا حال کردیا ہے۔ لڑکے کی پرورش اور تربیت نے الگ فکرمند کر رکھا ہے۔ میں نے لوگوں سے سنا ہے کہ دہلی کے بادشاہ نے تجھے بہت زیادہ نواز دیا ہے اور تو بادشاہوں جیسی زندگی گزار رہا ہے۔ اگر میں نے غلط نہیں سنا تو پھر تو مجھے اور اپنے بیٹے کو کیوں نہیں بلا لیتا؟ سچ کہتی ہوں کہ اگر میں مرگئی تو تیرا بیٹا دریوزہ گری کرے گا اور اگر بدقسمتی سے ایسا واقعی ہوگیا تو گویا تیرے حکمران آبا و اجداد کی نسل کا یہ بھکاری شہزادہ کہلائے گا۔“

ایرانی تاجر نے کھانے کے دوران اپنے شریکِ طعام اجنبی ساتھیوں سے کہا۔ ”دوستو! یہ کتنی عجیب بات ہے کہ صبح تک آپ کے ساتھ کھانے کا میں گمان تک نہ کرسکتا تھا لیکن اس وقت میں آپ سب کے ساتھ لذیذ غذائیں کھا رہا ہوں۔ سچ ہے دانے دانے پر کھانے والے کا نام لکھا ہوتا ہے۔“

عبداللہ بذاتِ خود بہت کم کھا رہا تھا۔ اس کا ایک لقمہ دوسروں کے تین لقموں کا اوسط تھا۔ جل کر ایرانی تاجر کو جواب دیا۔

”دانے دانے پر کھانے والے کا نام ہی نہیں کچھ اور بھی لکھا ہوتا ہے جس کا کھانے کے بعد پتا چلے گا۔“ پھر کھانے والوں کی تیز رفتاری پر نظر رکھتے ہوئے کہا۔ ”انسان کو چند باتوں کا بڑا خیال رکھنا چاہیے۔ اول اس بات کا کہ جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔ ہر کام میں تحمل اور اعتدال سے کام لینا چاہیے۔ دانتوں کا کام آنتوں سے نہیں لینا چاہیے۔ ہر لقمہ چبا چبا کر کھانا چاہیے۔“

تاجر بڑا پُرمذاق تھا، بولا۔ ”آہستہ آہستہ چبا چبا کر کھانے میں بڑے فائدے ہیں اور مجھے ان فائدوں کا ذاتی تجربہ ہے۔“

عبداللہ نے خوش ہوکر پوچھا۔ ”خدا تیرا بھلا کرے تو بڑا سمجھ دار نظر آتا ہے۔ ذرا ان فائدوں کی بابت شریکِ طعام ساتھیوں کو بھی کچھ بتادے۔“

تاجر نے جواب دیا۔ ”آہستہ آہستہ چبا چبا کر کھانے کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ معدہ کھانا جلدی ہضم کرتا ہے اور بھوک جلدی جلدی خوب کھل کر لگتی ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ زیادہ کھانا کھایا جاتا ہے اور آدمی جتنا زیادہ کھائے گا، اتنی ہی اس کی صحت بھی اچھی رہے گی اور جب صحت اچھی رہے گی تو آدمی ہشاش بشاش رہے گا اور جب آدمی ہشاش بشاش رہے گا تو اس کی عمر بھی زیادہ ہوگی اور زیادہ دن جیے گا۔“

عبداللہ نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا۔ ”تیری ساری نصیحتیں اور پند ناصے اپنے دسترخوان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنے دسترخوان پر اس طرح کھانا چاہیے لیکن جب آدمی کسی کے گھر مہمان جائے تو اسے آدابِ مہمانی کا خیال رکھنا چاہیے۔ میں نے کہیں رسول اللہؐ کی یہ حدیث پڑھی ہے کہ انسان کو اس وقت کھانا چاہیے جب بھوک کھل کر لگ چکی ہو اور کھانے سے اس وقت ہاتھ کھینچ لینا چاہیے جب چند لقموں کی اشتہا باقی ہو اور پھر میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ درازیٔ عمر کے لیے ضروری ہے کہ انسان کم کھائے، کم سوئے اور کم باتیں کرے۔“

ان دلچسپ اور نوک جھونک والی باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ بہت زیادہ کھاگئے۔

عبداللہ سنجیدگی سے معلوم نہیں کیا سوچ رہا تھا۔ کھانے کے بعد اس نے ان سب سے کہا۔ ”دوستو! اگر تم برا نہ محسوس کرو تو میں تمہیں اپنے باغ کی سیر کرادوں۔“

فقیہہ عفیف الدین اور ان کے ساتھیوں کو باغ کی تفریح سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن تاجر نے سوچا کہ باغ میں ضرور پھل ہوں گے۔ مفت میں کھانے کو ملیں گے، بولا۔ ”باغ کی سیر ضرور کرنا چاہیے کیونکہ ادھر ادھر چلنے پھرنے سے ہاضمے پر بڑا خوشگوار اثر پڑے گا۔ میں باغ میں چلنے کو تیار ہوں۔“

مجبوراً عفیف الدین بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ محل کے پیچھے والے باغ میں چلا گیا۔ باغ کے آخری سرے پر خشک درختوں نے سرسبز و شاداب باغ کی رونق کم کردی تھی اور یہ باغ کے حسن پر داغ بن گئے تھے۔ فقیہہ عفیف الدین نے کہا۔

"جناب! ان درختوں کو تو کٹوا دینا چاہیے۔"

عبداللہ کی آنکھوں میں خوشی کی چمک پیدا ہوگئی، بولا۔ "بالکل درست عفیف الدین...... مجھے سب کی رائے سے اتفاق ہے اور میرے خیال سے یہ کام اسی وقت ہونا چاہیے۔"

ایرانی تاجر نے سوال کیا۔ "یہ کام اس وقت کیونکر ہوسکتا ہے؟"

عبداللہ ایک خشک درخت کی طرف بڑھا اور اس کی ایک شاخ توڑتے ہوئے بولا۔ "اس طرح..... دوستو! کیا خیال ہے؟ یہ کام تو ابھی انجام دیا جاسکتا ہے۔ ہم سب مل جل کر ان خشک درختوں کو صاف کرکے رکھ دیں گے۔"

ایرانی تاجر نے جزبز ہوکر سوال کیا۔ "یعنی یہ کام ہم کریں گے؟ میں تاجر ہوں اور یہ لوگ کیا ہیں میں نہیں جانتا لیکن چہرے بشرے سے اس شہر کے معزز ہی نظر آتے ہیں۔ یہ ان درختوں کو کس طرح صاف کریں گے؟"

عبداللہ نے کہا۔ "تم سب میں سب سے معزز میں ہوں۔ عباسی خلفا کے خاندان کا ایک شہزادہ لیکن میں رسول اللہ ﷺ کی سنت پر عمل کرنے کا قائل ہوں۔ آپ ﷺ ہر کام کرلیتے تھے۔ یہاں تک کہ کپڑوں میں پیوند تک لگا لیتے تھے اور اپنی جوتیاں خود گانٹھ لیتے تھے۔ ہمیں کسی کام سے شرمانا نہیں چاہیے۔"

اتنا کہہ کر اس نے تیزی سے کام شروع کردیا۔ عبداللہ کی دیکھا دیکھی فقیہہ عفیف الدین بھی خشک شاخیں توڑنے لگا اور پھر سبھی نے کام شروع کردیا۔

یہ کام زور و شور سے جاری تھا کہ خدمت گار نے اسے مطلع کیا۔ "قاضی کمال الدین ملنا چاہتے ہیں۔"

اس نے جواب دیا۔ "قاضی کو یہیں لے آتا کہ یہ دلچسپ تماشا وہ بھی دیکھ لے۔"

تھوڑی دیر بعد خدمت گار قاضی کمال الدین کو ساتھ لے کر وہیں پہنچ گیا۔ عبداللہ نے اپنا کام چھوڑتے ہوئے کہا۔ "دوستو! تم اپنا کام جاری رکھو، میں ذرا قاضی کمال الدین سے باتیں کرلوں۔"

قاضی کمال الدین نے حیرت سے سوال کیا۔ "جناب! یہ کیا ہو رہا ہے؟"

عبداللہ نے پوری تفصیل کے ساتھ جواب دیا۔ "میرے لیے یہ بات ناقابلِ برداشت ہے کہ کوئی شخص میرا کھانا کھائے مگر میرا کام نہ کرے۔"

قاضی کمال الدین نے کچھ کہتے کہتے زبان روک لی۔ عبداللہ نے پوچھا۔ "تو مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے؟"

قاضی کمال الدین نے جواب دیا۔ "ہاں، میں ایک درخواست لے کر حاضر ہوا تھا مگر اب نہیں کہوں گا۔"

عبداللہ نے کہا۔ "نہیں نہیں، تیرا اور ہی معاملہ ہے۔ تو تو ایک محتاط شخص ہے۔"

قاضی نے جواب دیا۔ "اسی احتیاط نے تو میری زبان پکڑلی ہے۔"

عبداللہ نے اصرار کیا۔ "بخدا تجھے اپنی بات کہنی پڑے گی۔ قاضی، میں تجھے بے حد عزیز رکھتا ہوں۔ تو شرما نہیں، جو کچھ کہنا چاہتا ہے صاف صاف بے تکلفی سے کہہ دے۔"

قاضی کمال الدین نے رک رک کر کہا۔ "یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ میں نے بادشاہ کے خلاف ایک زبردست فیصلہ سنایا ہے اور اس بات سے بھی آپ واقف ہیں کہ بادشاہ کے مزاج کا کچھ پتا نہیں کہ کس وقت کیا کر بیٹھے۔ میں چاہتا ہوں کہ اب جب میں بادشاہ کے سامنے جاؤں تو شاندار نذرانے کے ساتھ جاؤں اور اس کے علاوہ میرے ذمے کچھ لوگوں کا قرض چلا آرہا ہے۔ آج جب میں بادشاہ کے خلاف اپنا فیصلہ سنا رہا تھا تو یہ سوچ رہا تھا کہ اگر میرے قرض خواہوں نے میرے خلاف کوئی مقدمہ کردیا تو بادشاہ مجھے معاف نہیں کرے گا اور اس کی کیا سزا دے گا، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔"

عبداللہ نے کہا۔ "لیکن تیرا مطلب کیا ہے، یہ تو تو نے بتایا ہی نہیں؟"

قاضی کمال الدین نے جواب دیا۔ "اس وقت مجھے پانچ ہزار سرخ تنکوں (اشرفیوں) کی ضرورت ہے۔ چاہتا ہوں آپ مجھے مستعار دے دیں، بعد میں واپس کردوں گا۔"

عبداللہ سوچ میں پڑ گیا۔ قاضی کمال الدین نے بے چینی سے کہا۔ "جناب! یہ سوچنے کا وقت نہیں ہے۔ میں یہ رقم تو آپ سے لے کر ہی رہوں گا۔"

عبداللہ نے نہایت نرمی سے جواب دیا۔ "کمال الدین! تو میری بات کا یقین کر، میں یہ نہیں کہوں گا کہ میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے اور نہ ہی کوئی اور بہانہ کروں گا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کبھی نہ کبھی مجھے میری یہ رقم واپس بھی مل جائے گی مگر......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

قاضی نے کہا۔ "ہاں ہاں کہیے کہیے، جو کہنا ہے صاف صاف کہیے۔"

عبداللہ نے جواب دیا۔ "قاضی کمال الدین! اندر سے میرا دل مجھے مجبور کر رہا ہے کہ تیری مجبوریوں کا خیال

کروں اور پانچ ہزار سرخ تنکے بطور قرض تجھے دے دوں لیکن ہمت جواب دے رہی ہے۔ افسوس کہ میں تیری ضرورت نہیں پوری کرسکوں گا۔"

قاضی کمال الدین نے مایوسی سے کہا۔ "پتا نہیں میرا کیا حشر ہو بہرحال میرے حق میں دعا تو کرہی سکتے ہیں آپ۔"

عبداللہ نے جواب دیا۔ "ہاں، دعا ضرور کروں گا کیونکہ میں جانتا ہوں میری دعا کم ہی قبول ہوتی ہے اور تو کتنا ہی ترقی کرجائے مگر مرتبے اور عزت میں مجھ سے بڑھنے سے رہا کہ میں حسد کروں۔"

قاضی کمال الدین نے مشورہ دیا۔ "اگر میرے کام نہیں آتے تو نہ آیئے لیکن اپنے مرتبے اور عزت کو بچانے کے لیے آپ فقرا اور مساکین پر خرچ ضرور کرتے رہیے کیونکہ ان کی دعائیں آپ کے حق میں مفید رہیں گی۔"

عبداللہ نے جواب دیا۔ "یہ کام میرے بس کا نہیں، افسوس کہ میں دینے دلانے کی خود میں ہمت ہی نہیں پاتا۔"

قاضی کمال الدین مایوس اور افسردہ واپس چلا گیا اور عبداللہ نے ایرانی تاجر کو چھیڑنے کی خاطر کہا۔ "جس طرح دانے دانے پر آدمی کا کھانا لکھا ہوتا ہے، اسی طرح یہ بھی لکھا ہوتا ہے کہ انسان کو دانے کے عوض کیا کیا کرنا پڑے گا۔"

☆☆☆

دیوان ہزار ستون میں امراء اور دوسرے درباریوں کا ہجوم تھا۔ بادشاہ سر پر کلاہ رکھے شہ نشین پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے قاضی کمال الدین امیرزادوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ عبداللہ، بادشاہ کے برابر بیٹھا تھا۔ فقیہہ عفیف الدین اور اس کے ساتھی بھی امراء کی صف میں کھڑے تھے۔

کچھ دیر بعد بادشاہ نے پوچھا۔ "کیا وہ تمام امراء اور درباری موجود ہیں جو اس دیوان میں اس دن موجود تھے جب میں نے اس امیرزادے کو اکیس یا اس کے... لگ بھگ تازیانے لگائے تھے؟"

حاجبوں کے سردار ملک فیروز نے جواب دیا۔ "اخوند عالم! سبھی موجود ہیں۔"

بادشاہ نے کہا۔ "تو اس امیرزادے سے آخری بار دریافت کر کہ کیا وہ مال و دولت کے عوض تازیانوں کی سزا معاف نہیں کرسکتا؟"

ملک فیروز نے بادشاہ کا سوال امیرزادے سے دہرا دیا۔ امیرزادے نے جواب دیا۔ "بادشاہ اگر زبردستی مال و دولت دے کر تازیانوں کی سزا سے بچنا چاہتا ہے تو اور بات ہے ورنہ میں تازیانے لگانے پر بضد ہوں اور اس کے

آنسو

دنیا کا مہنگا ترین محلول آنسو ہے، اس میں ایک فیصد پانی اور 99 فیصد احساسات ہوتے ہیں۔ لہٰذا کسی کو تکلیف پہنچانے سے پہلے سو مرتبہ سوچیں۔

سنہری باتیں

☆ وہ ایک انگلی جو مشکل وقت میں آپ کے آنسو پونچھتی ہے، ان دس انگلیوں سے بہتر ہے جو آپ کی کامیابی پر تالیاں بجاتی ہیں۔

☆ کامیابی کی طرف جانے کے لیے کوئی شاہانہ راستہ نہیں ہے، لیکن کامیاب ہوجانے کے بعد تمام راستے شاہانہ ہوجاتے ہیں۔

☆ اگر آپ اپنی انگلیوں پر اپنی ہی غلطیوں کو گنیں تو دوسروں پر انگلی اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

☆ ماں بھی قدرت کا انمول تحفہ ہے، اولاد کو دکھ میں بھی دیکھے تو آنسو اور سکھ میں بھی دیکھے تو آنسو۔

☆ کسی انسان کا زوال اس وقت شروع ہوجاتا ہے جو وہ خود کو اپنے مخلص دوستوں سے دور کرلیتا ہے۔

مرسلہ: احسان سحر، میانوالی

خوب صورت باتیں

☆ کامیابی آپ کو دنیا سے متعارف کراتی ہے اور ناکامی دنیا کو آپ سے متعارف کراتی ہے۔

☆ وقت اور دولت دو ایسی چیزیں ہیں جو انسان کے اختیار میں نہیں۔ وقت انسان کو مجبور اور دولت انسان کو مغرور بنا دیتی ہے۔

☆ میرے پاس ان لوگوں کے لیے وقت نہیں ہے جو مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ میں ان لوگوں کے ساتھ مصروف ہوں جو مجھ سے محبت کرتے ہیں۔

☆ تکبر سے پاک گفتگو، وقار سے پاک محبت، لالچ سے پاک خدمت اور خود غرضی سے پاک دعا سچے رشتے کی بنیاد ہے۔

مرسلہ: احسان سحر، میانوالی

بعد بادشاہ اگر مجھے انتقامی کارروائی میں ہلاک بھی کر دے تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔"

بادشاہ نے افسردہ آواز میں کہا۔" قاضی کمال الدین! تو امیر زادے کو حکم دے کہ وہ تازیانے لگائے۔"

نقیبوں کے سردار سے اس کا بید لے لیا گیا اور بادشاہ شہ نشین سے اتر کر امیر زادے کے روبرو آ کھڑا ہوا۔ امیر زادے نے قاضی کمال الدین سے نقیبوں کے سردار کا بید لیا اور بادشاہ سے کہا۔" بادشاہ کی شناخت کرے کہ یہ وہی بید ہے جس سے اس نے مجھے مارا تھا یا کوئی اور؟"

بادشاہ نے بید کو اچھی طرح دیکھ بھال کر جواب دیا۔" میں پہچانتا ہوں، یہ وہی بید ہے۔"

امیر زادہ مرعوب ہوتا جا رہا تھا۔ قاضی کمال الدین نے اسے حکم دیا۔" امیر زادہ عدالت کے فیصلے پر عمل کرے۔"

امیر زادے نے لرزتے ہاتھ سے تازیانہ بلند کیا۔ بادشاہ سیدھا کھڑا تھا۔ امراء اور درباری دم بخود تھے۔ ان کی سمجھ سے یہ بات بالا تھی کہ بادشاہ کو واقعی تازیانے لگ سکتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کا یہی خیال رہا ہوگا کہ بالکل آخری لمحوں میں ضرور کچھ نہ کچھ ایسا ہو جائے گا کہ امیر زادہ تازیانے نہیں لگا سکے گا۔

امیر زادے نے لرزتے ہاتھ سے بادشاہ کی پشت پر تازیانہ رسید کر دیا۔ بادشاہ اف کر کے ذرا جھکا پھر سیدھا ہو گیا۔ قاضی کمال الدین، امیر زادے کا ہاتھ پکڑ لینا چاہتا تھا لیکن وہ بادشاہ کے غضب سے بھی واقف تھا کہ انتہائی جبر سے کام لے کر کھڑا رہا۔ امیر زادے کا دوسرا تازیانہ بادشاہ کے شانے پر لگا۔ پانچ، چھ تازیانوں کے بعد امیر زادے کا حیا دُھل گیا اور اس کا ہاتھ شپ شپ چلنے لگا۔ بادشاہ بری طرح پٹ رہا تھا۔

پندرھویں تازیانے سے بادشاہ کی کلاہ سر سے سرک کر دور جا گری۔ بادشاہ نے درخواست کی۔" امیر زادے! مجھے کلاہ اٹھانے کا موقع دے، مہربانی ہوگی۔"

امیر زادے نے جواب دیا۔" ابھی چھ تازیانے باقی ہیں۔ ابھی کلاہ پہننے کا فائدہ؟ یہ دوبارہ بھی گر سکتا ہے۔"

بادشاہ نے کہا۔" تو درست کہتا ہے، کلاہ دوبارہ بھی گر سکتا ہے۔"

فقیہ عفیف الدین نے کہا۔" اخوند عالم! کلاہ کا بادشاہ کے سر سے سرک جانا بدشگونی میں شامل ہے۔"

بادشاہ نے جواب دیا۔" عفیف الدین! مجھے سزا بھگت لینے دے، میں تیری بات کا جواب دوں گا۔"

امیر زادہ تازیانے لگاتا رہا یہاں تک کہ اکیس تازیانے لگ گئے۔ اس وقت تک بادشاہ بے دم ہو چکا تھا۔

سارے درباری امراء اش اش کر رہے تھے۔

امیر زادے نے تازیانہ ایک طرف پھینکا اور بادشاہ کے قدموں پر جھک گیا۔ گڑگڑاتے ہوئے بولا۔" جہاں پناہ! مجھے معاف فرمایا جائے۔"

بادشاہ نے پژمردگی سے جواب دیا۔" تو نے جو کچھ کیا، اپنی مرضی سے نہیں بلکہ یہ عدالت کا فیصلہ تھا اس لیے تیرے معافی مانگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

امیر زادے نے کہا۔" پھر بھی میں شرمندہ ہوں۔"

فقیہ عفیف الدین نے امیر زادے کو ڈانٹا، کہا۔" تو ایک معمولی امیر زادہ ہے مگر اس وقت تو نے جس گستاخانہ جرأت کا مظاہرہ کیا ہے، وہ بہتوں کے لیے لمحۂ فکریہ ثابت ہوگی۔"

بادشاہ نے عفیف الدین کو ڈانٹا۔" تو یہ کیا بک رہا ہے؟ تو اس عدالت کا منصف یا قاضی نہیں جس نے اسے یہ اختیار دیا تھا کہ میرے اکیس تازیانے لگائے جائیں پھر تو یہ بکواس کیوں کر رہا ہے؟"

فقیہ عفیف الدین چپ ہو گیا۔ بادشاہ نے حاجبوں کے سردار ملک فیروز کو حکم دیا۔" اس امیر زادے کو مال و دولت بھی عطا کیا جائے۔"

ملک فیروز نے جواب دیا۔" جو حکم اخوند عالم۔"

بادشاہ نے کہا۔" قاضی کمال الدین! تو ابھی نہیں جائے گا کیونکہ یہاں ایک اور مقدمہ پیش ہونے والا ہے۔"

قاضی کمال الدین کی جان نکل گئی۔ عبداللہ نے قاضی کمال الدین کی سفارش کی۔" قاضی کمال الدین ایک شریف انسان ہے اور اس کا مستحق ہے کہ اسے کچھ مہلت دی جائے۔"

بادشاہ نے جواب دیا۔" میں قاضی کمال الدین کی شرافت کا دل سے قائل ہوں اسی لیے قاضی کمال الدین کو روک رہا ہوں۔" پھر فقیہ عفیف الدین کو آواز دی۔" عفیف الدین! تو ذرا آگے بڑھ۔ میں تجھ سے کچھ پوچھنے والا ہوں۔"

فقیہ کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اس کے پاؤں لرزنے لگے۔ بادشاہ نے عفیف الدین سے پوچھا۔" کیا یہ درست ہے کہ تو نے مجھے ظالم کہا ہے؟"

فقیہ عفیف الدین کچھ کہنے ہی والا تھا کہ بادشاہ نے

متنبہ کیا۔" عفیف الدین! اگر تو نے جھوٹ کا سہارا لیا تو دروغ گوئی کا مجرم بھی ٹھہرے گا۔"

عفیف الدین نے جواب دیا۔" بے شک میں نے بادشاہ کو ظالم کہا تھا۔"

بادشاہ نے عفیف الدین کے دونوں ساتھیوں کو اپنے قریب بلا لیا اور پوچھا۔" کیا تم دونوں نے بھی عفیف الدین کی بات سن کر یہ کہا تھا کہ خدا کا شکر ہے جو تیری خلاصی ہوئی؟"

انکار کی گنجائش ہی نہ تھی کیونکہ جھوٹ بولنے سے ایک جرم اور بڑھ جاتا۔ یکے بعد دیگرے دونوں نے جواب دیا۔" ہاں، ہم نے یہ کہا تھا۔"

بادشاہ نے شیخ زادہ نہاوندی (جلاد) کو حکم دیا۔" ان تینوں کے دو دو ٹکڑے کر دیے جائیں۔"

عفیف الدین کے دونوں ساتھیوں نے گڑگڑا کر عرض کیا۔" اخوند عالم! عفیف الدین کا تو یہ جرم ہے کہ اس نے بادشاہ کو ظالم کہا لیکن ہم دونوں کس جرم میں قتل کیے جائیں گے؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔" تم دونوں نے عفیف الدین کی بات سن کر تردید نہیں کی۔ اس طرح تم دونوں نے اس سے اتفاق کیا اور اسی جرم کے مرتکب ہوئے جس کا ارتکاب عفیف الدین نے کیا تھا۔"

شیخ زادہ نہاوندی نے ان تینوں کو اسی وقت دیوان ہزار ستون کے سامنے لے جا کر دو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ ان کے پھڑکتے ہوئے لاشوں کو بہت سارے امراء نے بھی دیکھا۔

اس واقعے نے عبداللہ کو بہت ملول اور خوف زدہ کر دیا۔ وہ بادشاہ کے پاس سے بہت افسردہ اٹھا۔ بادشاہ نے بھی اس افسردگی کو محسوس کر لیا، بولا۔" آقا زادے! میں نے سلاطین عالم کے حالات پڑھے ہیں اور انہی سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ایک بادشاہ کو اپنا رعب برقرار رکھنے کے لیے سیاست و تادیب کا پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔"

عبداللہ نے جبری مسکراہٹ سے جواب دیا۔" میرے جدِ اعلیٰ ابوالعباس کا تو نام ہی ابوالسفاح (خون ریز) پڑ گیا۔"

عبداللہ نے ایرانی تاجر کو بلوا کر بیوی کو خط لکھ دیا۔" مجھے تیری اور تیرے بیٹے کی پریشانی کا خوب علم ہے لیکن میں مجبور ہوں کیونکہ دہلی کے بادشاہ نے میری جتنی عزت افزائی کی ہے، اس کے پیشِ نظر میں ہندوستان چھوڑنے کا خیال تک اپنے دل میں نہیں لا سکتا۔ ہاں تو میرے دوسرے خط یا پیغام کا انتظار کر، میں کوشش کروں گا کہ تجھ کو بھی یہیں بلوا لوں۔"

☆☆☆

قاضی کمال الدین کئی دن بعد مغرب کے بعد عبداللہ کے محل پہنچا۔ اس وقت پورا محل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور ڈیوڑھی میں بھی گھپ اندھیرا تھا۔ قاضی کو شبہ گزرا کہ شاید عبداللہ نے محل خالی کر دیا ہے لیکن صدر دروازے پر پہرے دار کو دیکھ کر یہ شبہ کسی حد تک دور ہو گیا۔ قاضی کمال الدین نے پہرے دار سے پوچھا۔" عبداللہ کہاں چلا گیا؟"

پہرے دار نے جواب دیا۔" اندر محل میں موجود ہے۔"

قاضی نے کہا۔" خوب، پھر یہ اندھیرا کیوں ہے؟"

پہرے دار نے جواب دیا۔" کیا آپ پہلی بار یہاں تشریف لائے ہیں؟"

" نہیں تو، میں یہاں کئی بار آ چکا ہوں لیکن زیادہ تر دن ہی میں آیا ہوں۔"

پہرے دار نے کہا۔" اس محل کا آقا بہت کفایت شعار ہے، وہ خرچ سے بچنے کے لیے ڈیوڑھی اور محل کے بیشتر حصوں کو تاریک ہی رکھتا ہے۔ اس لیے اس محل پر قبرستان کا گمان ہونے لگتا ہے۔"

اطلاع پاتے ہی عبداللہ نے قاضی کمال الدین کو اندر بلا لیا۔ قاضی نے کہا۔" آپ ڈیوڑھی کو تو روشن رکھا کیجیے، میں تو محل میں اندھیرا دیکھ کر واپس چلا جانے والا تھا۔"

عبداللہ نے جواب دیا۔" اول تو مغرب کے بعد میرے پاس کوئی آتا ہی نہیں اور اگر کوئی آتا بھی ہے تو کبھی کبھی اتفاق سے، جیسے اس وقت تو خود آ گیا ہے۔ اس کبھی کبھی اور اتفاق کے لیے فضول خرچی کرنا میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

قاضی کمال الدین کچھ سوچنے لگا۔ عبداللہ نے پوچھا۔" تو کیا سوچنے لگا؟"

قاضی کمال الدین نے پوچھا۔" یہاں کوئی ہماری گفتگو تو نہیں سن رہا؟"

" نہیں، تم سرگوشی میں ہر بات کہہ سکتے ہو۔"

قاضی کمال الدین نے پوچھا۔" کیا آپ یہاں سے چلے جانے کا منصوبہ بنا رہے ہیں؟"

عبداللہ نے گھبرا کر سوال کیا۔" لیکن تجھے یہ بات کس سے معلوم ہوئی؟"

قاضی نے جواب دیا۔" قیاس سے، اندازے سے۔"

عبداللہ نے افسوس سے کہا۔" ہاں، جب سے میں

نے فقیہ عفیف الدین اور اس کے دونوں دوستوں کے قتل کا سانحہ دیکھا ہے، میرا یہاں سے دل اچاٹ ہوگیا ہے۔"

قاضی کمال الدین نے کہا۔"اگر آپ واقعی یہاں سے چلے جانے کا ارادہ کرہی چکے ہیں تو اس کا کسی اور کو علم نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ بات بادشاہ کے کانوں تک پہنچے گی اور بادشاہ آپ کا بھی دشمن ہوجائے گا۔"

عبداللہ نے کہا۔"مگر میرا تو یہ ارادہ تھا کہ میں بادشاہ سے اجازت لے کر جاؤں گا۔"

قاضی نے کہا۔"کہیں ایسا غضب بھی نہ کیجیے گا کیونکہ آپ سے پہلے یہاں فرغانہ کے رئیس طوغون اور اس کا بھائی، دونوں بادشاہ کے مہمان بن کر رہے تھے۔ بادشاہ نے ان کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا تھا لیکن جب ان لوگوں نے یہاں سے بھاگ جانے کا منصوبہ بنایا تو بادشاہ نے ان دونوں کو قتل کروا دیا اور عفیف الدین کی طرح ان دونوں کے بھی دو دو ٹکڑے کروا دیے گئے۔"

عبداللہ نے سہم کر پوچھا۔"پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

قاضی کمال الدین نے جواب دیا۔"آپ کو معلوم ہوگا کہ بادشاہ دارالخلافے کو دولت آباد منتقل کررہا ہے۔ جب بادشاہ دولت آباد جائے تو آپ چوری سے ایران چلے جائیں اور پھر وہاں سے جہاں جی میں آئے جاکر مقیم ہوجائیں۔"

عبداللہ نے کہا۔"قاضی کمال الدین! میں تیرا شکر گزار ہوں جو اتنا صائب مشورہ دیا۔"

قاضی نے کہا۔"شکریہ کس بات کا، میں تو آپ کا ہمدرد ہوں۔"

عبداللہ نے نہایت جذباتی لہجے میں کہا۔"اللہ نے چاہا تو میں تیری اس ہمدردی کا وہ صلہ دوں گا کہ تیری طبیعت باغ باغ ہوجائے گی۔"

قاضی نے انکسار سے کہا۔"میں آپ سے کوئی صلہ نہیں چاہتا۔ بس یہ ضرور یاد دلاؤں گا کہ آپ نے خیزران کے سلسلے میں مجھ سے جو وعدہ کر رکھا ہے، اسے ضرور پورا کیجیے گا۔"

عبداللہ نے کسی قدر تذبذب سے جواب دیا۔"میں خیزران کا تو کوئی وعدہ کرنہیں سکتا، ہاں اور کوئی بھی بات ممکن ہوسکتی ہے۔"

قاضی کمال الدین نے بے چینی سے کہا۔"حالانکہ خیزران کے سلسلے میں آپ مجھ سے کوئی وعدہ کرچکے ہیں، ذرا اسے یاد تو کیجیے۔"

عبداللہ نے جواب دیا۔"معلوم نہیں میں نے وہ وعدہ کیوں کرلیا تھا۔ بہرحال اب میں اس وعدے سے منحرف ہوتا ہوں۔ تو مجھ سے کوئی اور وعدہ لے سکتا ہے۔"

قاضی کمال الدین کو بہت افسوس ہوا۔ اس نے آزردگی سے کہا۔"جب آپ اپنے وعدے سے منحرف ہورہے ہیں تو کسی اور وعدے سے بھی منحرف ہوسکتے ہیں۔"

عبداللہ کو شبہ گزرا کہ قاضی کمال الدین حسد و رقابت میں کہیں بادشاہ سے یہ شکایت نہ کردے کہ عبداللہ دہلی سے فرار ہونے کے منصوبے بنارہا ہے۔ اس نے ذرا زمانہ سازی سے کام لیا۔

"قاضی کمال الدین! میں تجھ سے مذاق کررہا تھا، ورنہ میں نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کررکھا ہے کہ جس دن میں دہلی سے جاؤں گا خیزران کو تیرے حوالے کرجاؤں گا۔"

قاضی کمال الدین نے کہا۔"نہیں، اس قسم کے وعدے کی کوئی ضرورت نہیں۔ شاید آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ کہیں میں آپ کے ارادے سے بادشاہ کو مطلع نہ کردوں۔ میں ایسا نہیں کرسکتا، کبھی بھی نہیں۔ آپ مطمئن رہیں۔" عبداللہ خاموش ہوگیا اور قاضی کمال الدین تھوڑی دیر چپ چاپ بیٹھ کر چلا گیا۔

عبداللہ نے اندر جاکر خیزران سے کہا۔"خیزران! میں تجھے کیسا لگتا ہوں؟"

خیزران نے جواب دیا۔"یوں تو آپ بہت اچھے لگتے ہیں لیکن آپ کی بخالت بہت بری لگتی ہے۔"

عبداللہ نے کہا۔"لیکن میں نے تیرے ساتھ تو کبھی بخل نہیں برتا۔"

خیزران نے جواب دیا۔"اس لیے کہ آپ نے جبر سے کام لے رکھا ہے لیکن جس روز بھی آپ کی دلچسپی میں کمی آئی، آپ میرے سلسلے میں بھی بخل اختیار کرلیں گے۔"

عبداللہ نے کہا۔"لیکن میں نے تیرے سلسلے میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ شادی کرلوں، کیا تو میرے اس فیصلے سے اتفاق کرے گی؟"

خیزران نے جواب دیا۔"مجھے کبھی بھی اس سے اختلاف نہیں رہا۔"

عبداللہ نے کہا۔"تب پھر کل ہی یہ کام انجام پاجائے گا کیونکہ قاضی کمال الدین کو شبہ ہے کہ میں یہاں سے فرار ہونے کا ارادہ رکھتا ہوں لیکن میں تجھ سے شادی کرکے اس کے اس وہم کو دور کردوں گا۔"

خیزران کیا کہہ سکتی تھی۔ دوسرے دن نہایت سادہ سی

تقریب میں عبداللہ نے خیزران سے شادی کرلی، بولا۔"خیزران! تو یقین کر، تیری شکل بالکل زبیدہ جیسی ہے، میری بیوی کی طرح۔"

خیزران ہنس کر چپ ہورہی۔ عبداللہ اس نئی ذمے داری سے فکرمند ہوگیا لیکن اس کے سوا دوسری کوئی تدبیر بھی نہ تھی جس سے وہ قاضی کمال الدین کو یہ یقین دلاسکتا کہ وہ ہندوستان سے جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔

☆☆☆

عبداللہ اور خیزران کی شادی کی خبر نے کسی اور کو تو نہیں چونکایا لیکن قاضی کمال الدین ضرور چونک گیا۔ اس نے عبداللہ سے شکایتاً کہا۔"یہ آپ نے کیا کیا؟ آپ نے مجھ سے وعدہ کررکھا تھا کہ جب آپ دہلی سے جائیں گے تو خیزران کو میرے حوالے کرجائیں گے لیکن اس وعدے کے دوسرے ہی دن آپ نے خیزران سے شادی کرلی...... آخر یہ چکر کیا ہے؟"

عبداللہ نے جواب دیا۔"پہلے میرا یہی ارادہ تھا کہ جب میں ہندوستان سے جاؤں گا تو خیزران کو تیرے حوالے کرجاؤں گا لیکن پھر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور ہندوستان ہی میں مستقلاً رہ بس جانے کا ارادہ کرلیا۔"

قاضی کمال الدین نے کہا۔"خدا آپ کو اس ارادے پر قائم رہنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔"

اس کے بعد ان دونوں کے دلوں میں کچھ فرق آگیا۔ میل ملاقات بھی کم ہوگئی۔ اگر کبھی آمنا سامنا ہو بھی جاتا تو بات علیک سلیک سے آگے نہ بڑھتی۔

دن گزرتے رہے، بادشاہ دہلی میں مقیم رہا۔ دولت آباد کی تعمیر ہوتی رہی۔ اس دوران خیزران سے ایک لڑکا بھی پیدا ہوا۔ اب عبداللہ کی خیزران سے تو تو میں میں بھی ہونے لگی تھی۔ وہ کپڑوں اور زیورات پر بہت خرچ کرتی تھی اور عبداللہ اس پر اعتراض ضرور کرتا تھا۔ اس دوران عبداللہ کی بیوی زبیدہ کی طرف سے کوئی خط یا پیغام نہیں آیا۔ وہ ایران جانے کے لیے بے چین تھا لیکن اس کا کسی پر اظہار نہیں کرسکتا تھا۔ وہ بڑی بے چینی سے بادشاہ کی دولت آباد روانگی کا منتظر تھا۔

آخر ایک دن بادشاہ نے عام حکم دیا۔"تین دن کے اندر دہلی کو خالی کردیا جائے اور لوگ دولت آباد روانہ ہوجائیں۔"

اس حکم نے پورے شہر میں ایک کھلبلی مچادی اور خواس باختہ، خوف زدہ لوگ اپنا اپنا سامان سمیٹ کر دولت آباد روانہ ہونے لگے۔

عبداللہ نے بادشاہ سے ملاقات کی اور کہا۔"بادشاہ! میں تیرا احسان مند ہوں کہ تو نے مجھے میری توقع سے کہیں زیادہ نواز دیا۔ اب مجھ پر ایک اور مہربانی کر۔"

بادشاہ نے کہا۔"وہ کیا؟"

عبداللہ نے جواب دیا۔"یہ کہ میں دہلی میں ہی رہنا چاہتا ہوں۔"

بادشاہ نے کہا۔"آقا زادے! جب دہلی کا ایک ایک گھر اجڑ چکا ہوگا تو آپ یہاں کس طرح رہیں گے؟"

عبداللہ نے جواب دیا۔"میں ہفتہ عشرہ رہ کر یہ دیکھوں گا کہ یہاں کس طرح رہ سکتا ہوں اور بس۔"

بادشاہ نے سرد مہری سے کہا۔"اگر آپ کی خوشی اسی میں ہے تو آپ چند دن اور رہ سکتے ہیں یہاں لیکن یہ یاد رکھیے کہ آخر کار آپ کو بھی دولت آباد ہجرت کرنی ہوگی۔"

عبداللہ نے جواب دیا۔"میں بادشاہ کے حکم کا تابع ہوں۔ میں کبھی بھی اس کے خلاف نہیں جاسکتا۔"

تیسرے دن شہر اجڑ گیا۔ اس دن ہر طرف ویرانی ہی ویرانی مسلط تھی۔ قافلوں پر قافلے دولت آباد جارہے تھے۔ عبداللہ اپنے محل کا دروازہ بند کیے اس ہولناک تماشے کے انجام کا انتظار کرتا رہا۔

عبداللہ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ وہ اتنے زیادہ ساز و سامان کے ساتھ دہلی سے نکلے گا کس طرح؟ اور اس ویرانے میں تو اس کی ایک ایک حرکت بادشاہ کے علم میں آتی رہے گی۔ اسے شبہ گزرا کہ قاضی کمال الدین کا مشورہ بربنائے خلوص ہرگز نہ تھا بلکہ یہ انتقام تھا جو اس نے خیزران کے سلسلے میں اس سے لیا تھا۔

بادشاہ، قاضی کمال الدین اور چند دوسرے امراء اب بھی دہلی میں ہی تھے اور یہ لوگ بادشاہ کے ساتھ سفر کرنے والے تھے۔ عبداللہ نے فیصلہ کرلیا کہ وہ خود بھی بادشاہ کے ساتھ دولت آباد جائے گا۔ اپنے اس فیصلے کی اطلاع دینے وہ بادشاہ کے پاس روانہ ہوگیا۔ بادشاہ نے خوش اخلاقی سے عبداللہ کا استقبال کیا۔ اس وقت بادشاہ کے پاس قاضی کمال الدین کے علاوہ کچھ اور امراء بھی موجود تھے۔ اس وقت بادشاہ بہت خوش تھا۔ اس نے حاجبوں کے سردار ملک فیروز سے دریافت کیا۔

"کیا دہلی کے تمام آدمی دولت آباد روانہ ہوچکے؟"

ملک فیروز نے جواب دیا۔"اخوند عالم! بظاہر تو یہی نظر آتا ہے۔"

بادشاہ نے شیخ زادہ نہاوندی (جلاد) کو حکم دیا۔ ”نہاوندی! تو چند غلاموں کے ساتھ خالی مکانوں میں گھس گھس کر جائزہ لے کہ کہیں کوئی چھپ کر تو نہیں بیٹھ رہا۔“

شیخ زادہ نہاوندی بادشاہ کے حکم کی تعمیل کی خاطر غلاموں کی ٹولی کے ساتھ خالی گھروں کی تلاشی لینے روانہ ہوگیا۔

اس دن بادشاہ کے مزاج میں بڑی خوشگواری تھی۔ اسے اس احساس نے خوش کر رکھا تھا کہ اس کے ایک حکم پر دہلی کی آبادی ویرانے میں بدل گئی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے عبداللہ سے دریافت کیا۔

”آقازادے! آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اب یہاں رہنا ممکن نہیں رہا؟“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”اسی لیے میں یہ فیصلہ آپ کے گوش گزار کرنے آیا ہوں کہ میں بھی بادشاہ کے ساتھ دولت آباد چلوں گا۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”ہاں، دولت آباد چلنا آپ کے لیے یوں بھی مفید رہے گا کہ وہاں سے سورت کی بندرگاہ بہت قریب ہے۔ آپ سورت سے بہ آسانی ایران روانہ ہوسکیں گے۔“

عبداللہ چکرا گیا، ہوش وحواس جواب دے گئے۔ بادشاہ نے کن انکھیوں سے عبداللہ کی طرف دیکھا، کہا۔ ”کیا یہ غلط ہے کہ آپ اپنے وطن واپس جانا چاہتے ہیں؟“

اس وقت عبداللہ کی وہی کیفیت تھی جو مرنے سے تھوڑی دیر پہلے فقیہہ عفیف الدین کی رہی ہوگی۔ عبداللہ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ بادشاہ نے قاضی کمال الدین سے کہا۔ ”کیوں قاضی کمال الدین! کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟ کیا تو بھی اس مشورے میں ان کا شریک نہیں تھا؟“

قاضی کمال الدین کو بھی اپنی موت آنکھوں کے سامنے رقص کرتی نظر آئی۔

بادشاہ نے عبداللہ سے کہا۔ ”آقا زادے! کیا میں نے آپ کی سب سے زیادہ عزت نہیں کی؟ کیا میں نے آپ کو کبھی بھی کوئی تکلیف دی؟ نہ صرف یہ کہ میں نے آپ کی عزت کی بلکہ دوسرے امراء کو بھی آپ کے آگے جھکا دیا۔ اس عزت واحترام اور الطاف وعنایات کے بعد بھی اگر آپ چوری سے فرار ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں تو میں کیا کرسکتا ہوں۔ آپ جاسکتے ہیں، میں آپ کو روکوں گا نہیں بلکہ میرے آدمی آپ کو سورت کی بندرگاہ تک پہنچا دیں گے۔ آپ مال ودولت کے انبار اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں تاکہ زندگی بھر عزت وآسائش سے رہ سکیں۔“ پھر قاضی کمال الدین کو مخاطب کیا۔

”اور قاضی کمال الدین تُو! تُو نے ایک ایسے جرم کا ارتکاب کیا ہے کہ تجھے قتل کروا سکتا ہوں۔ تو نے یہ خبر مجھے نہیں پہنچائی یہی تیرا جرم ہے لیکن میں تجھے اس لیے معاف کررہا ہوں کہ میں خود آقا زادے کی عزت کرتا ہوں۔ جب میں آقازادے کو کچھ نہیں کررہا ہوں تو تجھ کو کیا سزا دوں گا۔“

عبداللہ کے جی میں آئی کہ بادشاہ کے قدموں میں گر جائے لیکن اسے فوراً ہی اپنے خاندان کی بزرگی اور برتری کا خیال آگیا جو ہمیشہ عالم اسلام کے بادشاہوں کو بادشاہت کی سند دیا کرتے تھے اور ان بادشاہوں میں خود محمد تغلق بھی شامل تھا۔ قاضی کمال الدین دوزانو ہوکر بادشاہ کے قدموں میں جھک گیا۔ فرط خوف اور شدتِ جذبہ شکر گزاری میں اس کی آواز حلق میں پھنس گئی تھی۔ بادشاہ نے اسے اٹھالیا، بولا۔ ”اب تم ان باتوں کو بھول جاؤ اور میرے ساتھ محل کی چھت پر چلو، میں تمہیں ایک خوشگوار منظر دکھاؤں۔“

بادشاہ ان سب کو لے کر محل کی چھت پر چلا گیا۔ یہ شام کا وقت تھا۔ بادشاہ نے سب کے ساتھ وہیں مغرب کی نماز ادا کی اور بعد میں شہر کی ویرانیت کا نظارہ کرنے لگا۔ چاروں طرف ایک ہو کا عالم تھا۔ کسی بھی گھر سے نہ تو دھواں اٹھ رہا تھا اور نہ ہی کہیں چراغ جل رہا تھا۔ بادشاہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ”کتنا خوشگوار نظارہ ہے۔“

لوگ خاموش رہے، بادشاہ نے متانت سے کہا۔ ”کیا تم لوگوں کو مزہ نہیں آرہا؟ کیا تم لوگ خوش نہیں ہوئے؟“

ہر ایک نے گھبرا کر اور زبردستی مسکرا کر جواب دیا۔ ”اخوند عالم! شہر کا پُرسکون اور خاموش ماحول ہم پر یہ لطیف انکشاف کررہا ہے کہ اللہ کے برگزیدہ بندے ایسے پُرسکون اور خاموش ماحول کے کیوں متلاشی رہتے ہیں۔ اب اس شہر میں اللہ اللہ کرنے میں بڑا مزہ آسکتا ہے۔“

☆☆☆

عبداللہ اپنے محل میں جیسے ہی داخل ہوا، لذیذ کھانوں کی خوشبو نے اس کے دل ودماغ کو فرحت بخشی۔ اسے حیرت تھی کہ اس محل میں آج تک ایسے کھانے نہیں پکے تھے۔ وہ خیزران کو تلاش کرتا ہوا اس حصے میں چلا گیا جہاں خدمت گار اور غلام رہتے تھے۔ وہاں اس نے ایک عجیب ہی منظر دیکھا۔ سارے خدمت گار اور غلام لطیف ولذیذ کھانوں پر ہاتھ صاف کررہے تھے۔ خیزران ان کے

سامنے کھڑی کھلا رہی تھی اور لطف لے رہی تھی۔

غلاموں اور خدمت گاروں نے عبداللہ کو سامنے کھڑا دیکھا تو ان کے چہرے مرجھا گئے۔ وہاں چراغاں جیسا منظر تھا اور اس تیز روشنی میں ان کی پریشانی اور بے چینی صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔

خیزران نے پلٹ کر عبداللہ کی طرف دیکھا اور پھر مرجھائے چہروں کو حکم دیا۔ ”تم لوگ پریشان کیوں ہو؟ گھبرا کیوں گئے؟ آزادی سے کھاؤ، ڈرو مت۔ سمجھ لو یہ آخری کھانا ہے۔ اس کے بعد کیا ہوگا، کسی کو نہیں معلوم۔“

عبداللہ نے نہایت کرب سے کہا۔ ”یہ کیا ہورہا ہے؟ ہائے ہائے، ہر چیز کا زیاں، ہر شے کی فضول خرچی۔ میں تو لٹ گیا، تباہ ہوگیا۔ یہ اتنے بہت سارے چراغ کس نے جلائے ہیں اور یہ اتنا بہت سارا کھانا کس نے اور کس کے حکم سے تیار کیا ہے؟ اور یہ حرام خور قحط زدوں کی طرح کس کے حکم یا اجازت سے کھا رہے ہیں؟“

خیزران نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”یہ سب کچھ میرے حکم اور میری مرضی سے ہوا ہے کیونکہ دہلی چھوڑنے کی خوشی میں ہم پر یہ دعوت فرض تھی۔“

عبداللہ نے جلدی جلدی چراغ بجھانے شروع کردیے، بولا۔ ”خیزران! میں تجھے طلاق دے دوں گا۔ میں ایسی فضول خرچ عورت کو اپنی بیوی نہیں بنا سکتا۔“

خدمت گار اور غلام ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ خیزران نے عبداللہ کو روکنے کی کوشش کی مگر اس کے ایک دھکے میں دور جاگری۔ عبداللہ نے کھانوں کی قابیں الٹ دیں اور دسترخوان ہوا میں اچھال دیے۔

خیزران، عبداللہ کو قہر کی نظروں سے دیکھنے لگی۔ نہایت غصے اور حسرت سے پوچھا۔ ”یہ جو کچھ تم کررہے ہو، اس کا فائدہ؟“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”یہ سب کچھ میری مرضی اور اجازت سے نہیں ہوا تھا اس لیے میں بھی اس سے کسی کو لطف اندوز نہیں ہونے دوں گا۔“

خیزران بہت کھسیا گئی تھی۔ عبداللہ کے سامنے سے ہٹتے ہوئے بولی۔ ”اب میں خود بھی تمہارے ساتھ نہیں رہوں گی، مجھے طلاق دے دو۔“

عبداللہ کو اتنا صدمہ پہنچا تھا کہ وہ ساری رات سو نہیں سکا اور خوب سوچنے اور غور کرنے کے بعد بھی وہ اپنے اسی فیصلے پر قائم رہا کہ خیزران کو طلاق دے دی جائے۔ اس نے سوچا اگر خیزران اور زبیدہ مل گئیں تو دونوں اپنی شاہ خرچیوں سے اسے تباہ وبرباد کردیں گی۔ اس لیے ایک وقت میں ایک ہی بیوی رہنا چاہیے۔

بادشاہ اپنے امرا، قاضی کمال الدین اور عبداللہ کے ساتھ دولت آباد روانہ ہورہا تھا۔ شیخ زادہ نہاوندی نے شہر کے ایک ایک گھر کی چھان بین کے بعد دو ایسے آدمی پکڑ لیے جو دولت آباد نہیں گئے تھے۔ ان میں ایک اندھا تھا، دوسرا لنگڑا تھا۔ بادشاہ نے نہاوندی کو حکم دیا۔

”اندھے کے دو ٹکڑے کردیے جائیں اور لنگڑے کو دولت آباد تک گھسیٹ کر لے جایا جائے۔“

دہلی کا یہ آخری قافلہ بھی دولت آباد روانہ ہوگیا۔ لنگڑے کو چالیس دن تک گھسیٹا گیا۔ وہ چند گھنٹوں بعد ہی مرگیا تھا لیکن بادشاہ کے حکم کی تعمیل ضروری تھی۔ اس کے سارے اعضا کٹ کٹ کر راستے ہی میں گرتے رہے یہاں تک کہ جب وہ لوگ دولت آباد میں داخل ہوئے تو شیخ زادہ نہاوندی کے ہاتھ میں لنگڑے کی ایک ٹانگ ہی باقی رہ گئی تھی۔ بادشاہ کے دوسرے حکم سے اسے دولت آباد کے دروازے پر پھینک دیا گیا۔

عبداللہ نے روانگی کی تیاریاں کرلیں اور اپنے دوستوں سے الوداعی ملاقاتیں کرنے لگا۔ بادشاہ کا تعاون عبداللہ کا شاملِ حال رہا۔ قاضی کمال الدین اس سے ملنے آیا تو عبداللہ نے کہا۔ ”قاضی کمال الدین! میں نے خیزران کے سلسلے میں تجھ سے جو وعدہ کیا تھا، آج اسے پورا کردینا چاہتا ہوں۔“

قاضی کمال الدین نے جواب دیا۔ ”وہ میرے لیے قابلِ قبول نہیں رہی۔“

عبداللہ نے حیرت سے پوچھا۔ ”وہ کیوں؟“

قاضی کمال الدین نے جواب دیا۔ ”یہ میں اس وقت بتاؤں گا جب آپ سورت روانہ ہورہے ہوں گے۔“

عبداللہ نے کہا۔ ”لیکن میں خیزران کو طلاق دے چکا ہوں اور اسے اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتا۔“

قاضی کمال الدین نے کہا۔ ”اسے بادشاہ کے سپرد کردیجیے۔ وہ جسے مستحق یا مناسب سمجھے گا، بخش دے گا۔“

عبداللہ نے یہی کیا اور خیزران کو بادشاہ کے حوالے کردیا۔ بادشاہ نے پوچھا۔ ”آپ اسے اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتے؟“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”جنابِ والا! میری ایک بیوی وطن میں موجود ہے اس لیے اگر میں خیزران کو بھی اپنے ساتھ لے گیا تو دونوں آپس میں لڑمریں گی اور میری زندگی

اجیرن ہوجائے گی۔"

بادشاہ نے قاضی کمال الدین کو حکم دیا۔ "خیزران اور اس کے بچے کو تو رکھ لے، یہ میرا حکم ہے۔"

عبداللہ مسکرا دیا مگر قاضی کمال الدین کا چہرہ اتر گیا۔ اسی دن خیزران اور اس کے بچے کو قاضی کمال الدین کے حوالے کردیا گیا۔

بادشاہ کے آدمیوں نے عبداللہ کو اس کے مال و دولت کے ساتھ سورت تک پہنچا دیا۔ وہاں اسے خوش قسمتی سے جہاز تیار مل گیا جو بحیرۂ عرب سے خلیج فارس جانے والا تھا۔

قاضی کمال الدین اسے سورت تک چھوڑنے گیا تھا۔ وہاں اس نے عبداللہ کے کان میں کہا۔ "کیا آپ جانتے ہیں کہ میں نے خیزران کو قبول کرنے سے کیوں انکار کردیا تھا؟"

عبداللہ نے جواب دیا۔ "نہیں، میں نہیں جانتا۔"

قاضی کمال الدین نے کہا۔ "مجھے ایک معتبر ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ خیزران بادشاہ کی مخبر تھی اور وہ اب تک جس کسی کے پاس بھی رہی ہے، بادشاہ کے لیے اس کی سراغ رسانی کرتی رہی ہے۔"

عبداللہ سناٹے میں آگیا، پوچھا۔ "اب کیا ہوگا؟ اب تو وہ تیری سراغ رسی کرے گی۔"

قاضی کمال الدین نے جواب دیا۔ "ہاں، میرے لیے وہ موت کا پھندا ہے۔ معلوم نہیں کب اس کی گرفت سخت ہوجائے اور میرا دم نکل جائے۔"

عبداللہ نے کہا۔ "میں کہیں بھی رہوں، تیرے لیے دعا گو رہوں گا۔ خدا تجھے خیزران کے شر سے محفوظ رکھے۔"

عبداللہ کا جہاز ہندوستان کے ساحلی شہروں سے گزرتا ہوا خلیج فارس روانہ ہوگیا۔ کئی ہفتوں بعد وہ خلیج فارس میں داخل ہوگیا پھر وہ اباذان کے سامنے جنوبی ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ یہاں سے بصرہ بہت قریب تھا۔ عبداللہ یہاں سے بصرہ چلا گیا۔ بصرہ سے بغداد پہنچا اور بغداد میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ مال و دولت پاس تھی، ایک شاندار مکان خرید کر رہنے لگا۔ یہاں سے اس کے دادا مستنصر باللہ کی بنوائی ہوئی مسجد بہت قریب تھی۔ مسجد سے ملحق مدرسۂ مستنصریہ تھا۔ اسے بھی اس کے دادا ہی نے بنوایا تھا۔

کچھ دنوں بعد یہ بیوی اور لڑکے کی تلاش میں کرمان چلا گیا۔ وہاں اسے پتا چلا کہ بیوی تو مرچکی ہے اور لڑکا بری صحبتوں میں پڑ کے معلوم نہیں کہاں چلا گیا۔ اب وہ بالکل تنہا تھا۔ وہ بغداد واپس گیا۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ خیزران اور اپنے بچے کو ساتھ لیتا آتا تو زندگی خوشگوار ہوجاتی۔

ایک دن اس نے مدرسۂ مستنصریہ سے ایک نوجوان طالب علم کو نکلتے دیکھا۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کا کمسن ملازم کتابیں لیے چلا جارہا تھا۔ کسی راہ گیر نے اپنے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میرے دوست! کیا تم اس کمسن ملازم کو پہچانتے ہو؟"

اس نے جواب دیا۔ "نہیں تو، یہ کون ہے؟"

راہ گیر نے جواب دیا۔ "یہ عبداللہ کا بیٹا ہے، سنتے ہیں عبداللہ ہندوستان میں مزے کررہا ہے اور یہ اس کا بیٹا ناداری میں غلط کاروں کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔ اب اس کی عادتیں اتنی بگڑ چکی ہیں کہ اسے جو کچھ ملتا ہے فوراً خرچ کردیتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اب یہ نہیں سدھر سکتا۔"

عبداللہ کا دل بھر آیا۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ اس لاوارث کا وارث بن جائے لیکن اس کی بری عادتوں اور فضول خرچی کے پیش نظر وہ ہاتھ کھینچے رہا۔ ہاں اس نے یہ ضرور کیا کہ اپنے مکان کا وہ دروازہ جو مدرسۂ مستنصریہ کی طرف کھلتا تھا، چنوا دیا اور اپنی آمد و رفت دوسری طرف سے کردی۔

لیکن اس عمل کے بعد بھی اس کا اس عذاب سے پیچھا نہیں چھوٹا۔ اب اس کے خیالات کی نظریں بغداد اور دولت آباد کے درمیان حائل امکانی فاصلے کو طے کرتی ہوئی ایک ایسا ہی دوسرا منظر دیکھنے لگی تھیں جہاں خیزران کا بیٹا کسی دوسرے امیر کے بیٹے کی کتابیں اٹھائے اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا اور لاوارثی کی زندگی نے اسے بھی غلط کاروں کے حوالے کرکے بری عادتوں کا عادی اور فضول خرچ بنا دیا تھا...... اور یہ ایک ایسا منظر تھا کہ اسے کسی دروازے کو بند کرا کے نظروں سے اوجھل نہیں کیا جاسکتا تھا۔

کہانی کے تاریخی مآخذ

تاریخ بغداد	تمدن عرب	تاریخ ایران	المامون	معجم البلدان	تاریخ اسلام	طبقات ناصری
خطیب بغدادی	ڈاکٹر گستاؤلی بان	مقبول بیگ بدخشانی	شبلی نعمانی	یاقوت حموی	معین الدین احمد ندوی	منہاج سراج

سادہ منصوبہ

امجد رئیس

انسان منصوبہ چاہے جو بھی بنالے اس کا پورا ہونا یا نہ ہونا اس کے مقدر پر منحصر ہوتا ہے۔ بالخصوص ایسے منصوبے جن سے کسی کو نقصان بھی ہو... ہمیشہ مکافات کو دعوت دینے کے مرحلے سے گزر کر تکمیل پاتے ہیں۔ کچھ یہی حال اس کا بھی ہوا یہ اور بات کہ منصوبہ سادہ تھا مگر تھا جاندار۔

قتل اور دو قتل کے درمیان خونی رسہ کشی کا عبرت اثر منظر

"تمہیں تلاش کرنے میں مجھے کافی وقت لگا۔" اس نے کہا۔ پھر کرسی کھسکا کر اس کی میز پر ہی ٹک گئی۔

بیئر کی چسکی لے کر اس نے عورت کو دیکھا۔ وہ ایک جوان عورت تھی لیکن اتنی بھی نہیں۔ آنکھوں کے نیچے عمر کی علامت کو اس نے میک اپ کے ذریعے نمایاں ہونے سے روکا ہوا تھا۔

"تمہیں یقین ہے کہ میں وہی ہوں، جس کی تمہیں تلاش ہے؟"

"اگر تمہارا نام "جو" ہے تو پھر یقیناً تم وہی ہو۔"
اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "جو۔"
"مجھے ایک کام کرانا ہے۔" عورت نے مدعا بیان کیا۔
"جاب؟"
"ہاں، ایک جاب ہے۔"
"میرے بارے میں تمہیں کس نے بتایا؟"
"ایک شناسا نے۔ وہ ایک فر اسٹوریج کا مالک تھا۔"
"آں...... ہاں...... ابراہام، اس نے اسٹوریج کو آگ لگا دی تھی۔"
"اس نے نہیں، اس کی بیوی نے۔" عورت نے تردید کی۔
"خیر، کس نوعیت کا کام ہے؟" جو نے سوال کیا۔
عورت نے ادھر ادھر دیکھا۔ "کیا ہم یہاں بات کر سکتے ہیں؟"
"کیوں یہاں تمہیں پولیس نظر آ رہی ہے کیا؟" جو مسکرایا۔ وہ جواب دینے والی تھی کہ اسے اندازہ ہو گیا کہ جو مذاق کر رہا ہے۔
"نروس ہونے کی ضرورت نہیں۔" جو نے کہا۔
"تم...... نہیں......" اس نے گلاس کی طرف نظر کی پھر نگاہ اٹھائی۔ "تم کسی کو میرے ذریعے......؟"
"او نو۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔" عورت نے جواب دیا۔
"پھر کیسی جاب ہے؟"
"نقب زنی، چوری......" عورت کو مناسب الفاظ تلاش کرنے میں مشکل ہو رہی تھی۔ جو نے بیئر کی طرف اشارہ کیا لیکن عورت نے نفی میں سر ہلا کر انکار کر دیا۔ "میں چاہتی ہوں کہ تم میرے گھر میں گھس کر میرے زیورات چرا لو۔"
"تمہارے اپنے زیورات چرا لوں؟ یعنی انشورنس کا معاملہ ہے؟"
"ہاں، مجھے رقم کی ضرورت ہے۔"
"پھر میں تمہیں وہ جواہرات واپس کر دوں؟"
"ویل، یس۔" عورت نے اقرار کیا۔
"اور اس خدمت کے عوض تم مجھے ادائیگی کرو گی؟"
"بالکل۔"
"کتنی؟"
"ایک ہزار ڈالرز۔" عورت نے جواب دیا۔
"کم نہیں ہیں؟"
"میرے خیال میں زیادہ ہیں۔" عورت نے کہا۔
"ہزار ڈالرز کے لیے، کیا یہ رسکی جاب نہیں ہے؟"

"تمہیں شاید پیسوں کی ضرورت نہیں ہے؟"
"ضرورت تو ہے۔" جو نے دانت نکالے۔
"تو پھر رسک کو ذہن سے نکال دو۔"
"تم کہاں رہتی ہو؟"
"1636 میرین کورٹ۔"
اس نے تر ہونٹوں پر زبان پھیری اور گویا ہوا۔ "شہر سے میرین کورٹ ایک اپر کلاس سوسائٹی ہے، مکانات بڑے اور ان کے درمیان فاصلہ ہے۔" جو نے معلومات کا مظاہرہ کیا۔
"ٹھیک کہہ رہے ہو۔"
"وہاں، تمہارے ساتھ اور کون کون رہتا ہے؟"
"صرف، میرا شوہر۔"
"کیا وہ بھی ملوث ہے، اس معاملے میں؟"
"نہیں، وہ لاعلم ہے۔"
"ہوں...... ں...... ں......" جو نے مسکرا کر تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔
"کسی وجہ سے میں نہیں چاہتی کہ وہ اس بارے میں باخبر رہے۔"
"یعنی تمہارا کوئی ذاتی مسئلہ ہے؟"
"ہاں، کچھ ایسا ہی ہے۔"
جو نے مزید بیئر انڈیلی اور گھونٹ بھرا۔ "ایک بار میں زیورات چرا لیتا ہوں تو تم کو کیسے یقین آئے گا کہ میں واپس کر دوں گا؟"
"مجھے اعتبار کرنا پڑے گا۔" وہ بولی۔
جو نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں ایک چور ہوں۔"
عورت نے تیوریاں چڑھائیں۔ "اگر تم زیورات واپس نہیں کرو گے تو میں پولیس کو بتا دوں گی۔"
جو نے پھر سر کو نفی میں جنبش دی۔ "میں کہہ دوں گا کہ تم نے خود مجھے ہائر کیا تھا......"
"تم ثابت نہیں کر سکو گے۔" وہ بولی۔
"اگر میں کہوں کہ میں ثابت کر دوں گا...... پھر؟"
"پھر بھی، کیا تم خود بھی نہیں پھنس جاؤ گے؟" عورت الجھن میں پڑ گئی۔
"انشورنس کا مطلب زیورات بیش قیمت ہیں۔ تو میں زیورات کے ساتھ فرار کیوں نہ ہو جاؤں؟"
عورت کے چہرے پر ایک سایہ آ کے گزر گیا۔ وہ خاموش تھی، جیسے سوچ رہی ہو کہ بیٹھی رہے یا اٹھ جائے۔
جو نے اس کی مشکل آسان کر دی۔ "پریشان مت ہو۔" اس نے کہا۔ "میں واپس کر دوں گا۔ میری اپنی ایک

ساکھ ہے۔ میں اپنے گاہکوں کو ڈبل کراس نہیں کرتا۔ صرف دو باتیں ہیں کہ اگر تم نے اپنا ذہن تبدیل کر لیا تو میں تمہیں ساتھ لے جاؤں گا اور دوسری بات......"
"میں اپنا ذہن کیوں تبدیل کروں گی، مجھے یہ کام کروانا ہے۔" عورت نے اس کی بات کاٹ دی، وہ مطمئن دکھائی دے رہی تھی۔
"تم نے دوسری بات نہیں سنی۔" جو نے اسے ٹوکا۔
"ہاں، دوسری بات کیا ہے؟"
"پندرہ سو ڈالرز لوں گا۔" جو نے غور سے عورت کو دیکھا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی، جیسے فیصلہ کر رہی ہو۔ "ٹھیک ہے۔" عورت نے ہامی بھر لی۔
"تمہارا نام؟"
"ٹیری...... ٹیری ولسن۔"
"ٹھیک۔ کام کب کرنا ہے؟" جو نے سوال کیا۔
"کل رات۔"
"اتنی جلدی؟" جو نے معمولی حیرت کا اظہار کیا۔ وہ خاموش رہی۔ "اوکے، وقت بتاؤ؟" جو نے استفسار کیا۔
"2A.M." وہ بولی۔ "تم کچن ڈور سے آؤ گے جو تمہیں ان لاک ملے گا۔ جیولری تمہیں کچن سے ملحقہ کرائے استراحت میں میز پر ملے گی۔" ٹیری ولسن نے وضاحت کی۔
"تمہارے شوہر کو یہ عجیب نہیں لگے گا؟"
"نہیں۔ وہ ڈنر کے بعد اس طرف نہیں آتا...... جب تم روانہ ہونے لگو تو جاتے جاتے کھڑکی کا شیشہ توڑ دینا۔"
"کیوں؟"
ٹیری کا چہرہ چمک اٹھا۔ جیسے اس نے کوئی بہترین آئیڈیا پیش کیا ہے۔ "اس طرح پولیس کو پتا نہیں چلے گا کہ تمہیں کچن کا دروازہ ان لاک ملا تھا۔"
"خوب، کیا شیشہ ٹوٹنے کی آواز تمہارے شوہر کے کانوں تک نہیں پہنچے گی؟"
"وہ گہری نیند سوتا ہے...... ویسے بھی ہمارا کمرا اسٹیئرز کے اوپر مکان کے دوسری جانب ہے۔"
"اس کے پاس گن وغیرہ ہے؟"
"گن؟ ہاں...... لیکن کیوں؟" ٹیری نے پوچھا۔
"اس کے بیدار ہونے کا امکان بہرحال موجود رہے گا، جسے میں نظرانداز نہیں کر سکتا۔ اس لیے مجھے اپنی گن ساتھ رکھنی پڑے گی۔"
"نہیں...... نہیں...... اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔" ٹیری نے تیزی سے انکار میں سر ہلایا۔

عزت

بیوی۔ "میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں۔"
شوہر۔ "کتنی عزت؟"
بیوی۔ "اتنی کہ اگر آپ بیڈ پہ بیٹھے ہوں تو میں صوفے پہ بیٹھوں گی۔"
شوہر۔ "اگر میں صوفے پہ بیٹھ گیا تو؟"
بیوی۔ "تو میں موڑھے پہ بیٹھوں گی۔"
شوہر۔ "اگر میں موڑھے پہ بیٹھ گیا تو؟"
بیوی۔ "تو میں پیڑھی پہ بیٹھوں گی۔"
شوہر۔ "اگر میں پیڑھی پہ بیٹھ گیا تو؟"
بیوی۔ "تو میں زمین پہ بیٹھوں گی۔"
شوہر۔ "اگر میں زمین پہ بیٹھ گیا تو؟"
بیوی۔ "میں گڑھا کھود کے اس میں بیٹھوں گی۔"
شوہر۔ "اگر میں گڑھے میں بیٹھ گیا تو؟"
بیوی غصے سے۔ "تو میں گڑھے کو مٹی سے بھر دوں گی، کمبخت تیرے کو عزت راس نہیں آتی۔"

مرسلہ: رضوان تنولی کریڈوی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

"آئی ایم سوری...... لیکن......"
"پلیز، میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں گن کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں...... ں...... میں وہ گن خالی کر دوں گی۔" ٹیری نے جو کو یقین دلانے کی کوشش کی۔
"گن ساتھ لانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اسے ضرور ہی استعمال کروں گا۔" جو نے اسے سمجھایا۔ کچھ دیر کی بحث کے بعد ٹیری رضامند ہو گئی۔
"گھر میں کوئی پالتو جانور ہے؟ کتا، بلی وغیرہ؟"
"نہیں...... کچھ نہیں۔"
"ایک سوال۔" ٹیری نے کہا۔ "بعد میں رابطہ کیسے ہو گا؟"
جو نے کاغذ کے ٹکڑے پر ایک نمبر گھسیٹا اور ٹیری کے حوالے کر دیا۔ "اسے ازبر کر لو اور پھاڑ کر پھینک دو۔ میں اس نمبر پر ملوں گا۔ اگر نہیں ملا تو نمبر پر جو بھی ہو گا وہ تمہیں میرے بارے میں بتا دے گا۔"

ٹیری نمبر یاد کرنے لگی۔ ’’تم بھولو گے تو نہیں، کل رات دو بجے؟‘‘ اچانک اس نے سوال کیا۔

جو مسکرایا۔ ’’میرا پیشہ ہے یہ!‘‘

☆☆☆

اگلی رات جو کی گہرے نیلے رنگ کی کار میرین 1636 سے چار بلاک کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ وہاں سے وہ پیدل ٹیری کے گھر تک پہنچا۔ بہ آسانی دیوار پھاند کے احاطے میں داخل ہو گیا۔ ہاتھوں پر دستانے چڑھا کر اس نے عقبی حصے میں کچن کی ڈورناب پر ہاتھ رکھ دیا۔ کچن کا دروازہ لاک نہیں تھا۔ اس نے دھیرے سے دروازہ کھولا اور خاموشی سے کچن میں داخل ہو گیا۔ عقب میں دروازہ بند کر کے اس نے جیب سے پین لائٹ نکالی، پین لائٹ کی لکیر نما روشنی کچن میں گردش کر رہی تھی۔ مدھم روشنی میں جو نے ملحقہ کمرائے استراحت کے دروازے کو دیکھ لیا۔ چند ساعت بعد وہ کمرے میں تھا۔ یہ دروازہ بھی اسے کھلا ملا تھا۔ میز پر چمڑے کا باکس رکھا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے باکس کھولا۔

جواہرات کی رنگ برنگ کرنوں نے اس کی آنکھوں کو چندھیا دیا۔ زیورات اس کے اندازے سے زیادہ بیش قیمت تھے۔ اس کی نیت ڈانوا ڈول ہو گئی۔ جو نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی...... لیکن یہ ایک دشوار کام تھا۔ سخت دشوار، تاہم اس نے جبڑے بھینچ کر ڈبا بند کر دیا۔ اسے اپنی ساکھ اور وعدہ عزیز تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔

معاً چوبی فرش پر مدھم سی آہٹ ہوئی۔ وہ پھرتی سے گھوم گیا۔ گھومتے گھومتے نہ صرف اس نے مدھم روشنی گل کر دی تھی بلکہ بغل کے نیچے موجود اعشاریہ 38 اسپیشل بھی اس کے ہاتھ میں منتقل ہو چکا تھا۔ اس کی تجربہ کار سماعت نے بتا دیا تھا کہ یہ چوبی فرش پر قدم کا دباؤ تھا جس نے معمولی آواز پیدا کی تھی۔

’’ہیلو۔‘‘ نسوانی آواز مدھم اور قریب تھی۔ ’’جو، تم ہو؟‘‘ آواز پہچان کر اس نے لائٹ آن کر دی۔ وہ خالی ہاتھ دروازے میں کھڑی تھی۔ ’’تم یہاں کیا کر رہی ہو؟‘‘ جو نے اس کے چہرے پر روشنی ڈالی۔

’’میں نروس تھی، مجھ سے رہا نہیں گیا، میں تمہیں دیکھنے آ گئی۔‘‘

’’تمہیں اپنے شوہر کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔‘‘

’’بے فکر رہو، وہ بے خبر سویا ہوا ہے۔‘‘ ٹیری نے کہا۔ ’’کام ہو گیا؟‘‘

’’سمجھو ہو گیا۔‘‘ جو نے بند ڈبے کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

’’ایک منٹ رکو۔‘‘ ٹیری نے اشارہ کیا۔ ’’میں ایک زیور تو رکھنا بھول ہی گئی تھی۔ اسے بھی ساتھ رکھ لو۔‘‘ اس نے اپنے گاؤن کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ٹیری کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں ایک چھوٹا سا پستول تھا، پستول سے دو گولیاں نکل کر جو کے سینے میں داخل ہو گئیں، وہ لڑکھڑا کر پیچھے گیا اور دیوار سے ٹکرایا۔ ٹیری کی موجودگی نے اسے بے پروا کر دیا تھا، بے دھیانی سے پکڑا ہوا اس کا اپنا پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ دیوار کے ساتھ پھسلتا ہوا زمیں بوس ہو گیا۔

ٹیری قطعی ایک مختلف عورت نظر آ رہی تھی۔ اس نے جس پھرتی اور صفائی سے اچانک وار کیا تھا، اسی سرعت کے ساتھ وہ آگے بڑھ کر جھکی اور جو کا پستول اٹھا لیا۔ جو نے پستول پکڑنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ شدید زخمی ہو چکا تھا، خون تیزی سے اس کے زخموں سے بہہ رہا تھا۔ تاہم ابھی اس میں جان باقی تھی۔ ’’کیوں؟‘‘ اس نے نقاہت زدہ آواز میں سوال کیا۔ اس کی آنکھوں میں غیر یقینی کا عنصر نمایاں تھا۔

’’تم دیکھ لو گے۔‘‘ ٹیری کے چہرے پر قاتلانہ رنگ گہرا تھا۔ اس نے دروازے کے قریب پہنچ کر کمرے کی لائٹ آن کر دی۔ ’’ٹام!‘‘ وہ زور سے چلائی۔ جواب میں خاموشی تھی۔ ’’ٹام!‘‘ وہ پھر چیخی۔ اس کے ہاتھ میں جو کا پستول تھا، ہاتھ پر اس نے رومال ڈال دیا تھا۔

’’کیا مصیبت ہے؟‘‘ مکان میں کسی جانب سے جھلائی ہوئی آواز آئی۔

’’یہاں آؤ۔ میں کچن کے ساتھ والے کمرے میں ہوں۔‘‘

’’لعنت ہے، اس وقت تم وہاں کیا کر رہی ہو؟‘‘

’’آ کر دیکھ لو، بڑی گڑبڑ ہے......‘‘ پھر اس نے مڑتے ہوئے جو کی طرف دیکھا۔ ’’کچھ سمجھ میں آیا؟‘‘

وہ جواب دینے کی حالت میں نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد ٹام دروازے میں نظر آیا۔ اس کے کچھ بولنے سے پہلے 38. پستول کی گولی نے اس کی پیشانی پر سرخ ٹیکا لگا دیا۔

ٹیری نے دوسرا پستول صاف کر کے مردہ شوہر کے ہاتھ میں دے دیا۔ ’’تمہارا ہتھیار تمہیں ابھی مل جائے گا۔‘‘ اس نے نیم مردہ جو کو مخاطب کیا۔ ’’پہلے میں چند اور کام نمٹا لوں۔‘‘ وہ اس وقت ایک نیم پاگل اور خطرناک قاتلہ کے روپ میں ڈھل چکی تھی۔ جو کی ڈوبتی سماعت نے سنا کہ وہ کچن سے پولیس کو فون کر رہی تھی۔ جو نے آخری آواز جو سنی وہ کچن کی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹنے کی تھی...... ظاہر ہے کہ شیشے کو باہر سے توڑا گیا تھا۔

وحشی

کاشف زبیر

انسان خود کو چاہے کتنا ہی مہذب ظاہر کرے مگر جب ثابت کرنے کا وقت آتا ہے تو مشکل میں پڑجاتا ہے کیونکہ... اندر سے ہر انسان وحشی ہوتا ہے یہ اور بات کہ حالات و واقعات کبھی کبھی اس درندے کو اندر ہی اندر سلا دیتے ہیں اور کبھی وحشی بنا کر دلدوز داستانیں رقم کر دیتے ہیں۔ وہ لوگ بھی زمین کے اس حصے مین جا پہنچے تھے جہاں انسان اور انسانیت کے درمیان بہت فاصلہ تھا۔

قوموں کی منفرد شناخت کے نام پر خونیں وحشتوں کی روداد

کارل اولیور...... کرسی پر دراز تھا اور اس کے منہ پر تنکوں کا ہیٹ تھا مگر اسے سوراخوں سے اندازہ ہو گیا کہ کوئی اس کے سامنے آیا تھا اور پھر ایک پرکشش نسوانی آواز آئی۔ ’’کارل اولیور......؟‘‘

’’یس......‘‘ اس نے منہ سے ہیٹ ہٹائے بغیر کہا۔

’’میں تم سے بات کرنے آئی ہوں۔‘‘

’’کس سلسلے میں؟‘‘

’’اگر تم اپنے منہ سے ہیٹ ہٹاؤ تو میں یو ایس اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کا کارڈ دکھا سکتی ہوں۔‘‘

عورت کی آواز میں ایک نوع کی سنسنی اور کشش تھی۔ اس کے سامنے سیاہ اسکرٹ اور سفید بلاؤز میں...... کسی قدر طویل قامت، متناسب الاعضا اور حسین نقوش کی حامل ایک عورت موجود تھی۔ اس کی سرمئی مائل شفاف نیلگوں آنکھوں میں سحر سا تھا اور سنہری بال سلیقے سے جوڑے کی صورت میں بندھے ہوئے تھے۔ کارل کے مکان کے آگے ایک شاندار سیاہ گاڑی کے ساتھ دو سیاہ سوٹ پوش کھڑے تھے اور ایسا

لگ رہا تھا کہ وہ اس عورت کے گارڈز تھے۔ عورت نے اپنا کارڈ سامنے کیا ہوا تھا اور اس پر اس کا نام ریناولسن اور عہدہ لکھا ہوا تھا۔ وہ آفیسر فار پرسنل تھی۔ کارل نے بھرپور نظروں سے اس کا جائزہ لیا اور سر ہلایا۔ ”ویلکم مس ولسن ان مناؤس، برازیل۔“

”شکریہ کیا میں بیٹھ سکتی ہوں؟“

”کیوں نہیں۔“ کارل اٹھ بیٹھا۔ ”بائی دی وے برازیل کی سرزمین پر میں نے تم سے زیادہ حسین امریکی عورت آج تک نہیں دیکھی۔“

”تعریف کا شکریہ ڈاکٹر پروفیسر کارل اولیور۔“ رینا کا لہجہ سرد ہو گیا۔

”اوہ تو تم جانتی ہو مجھے۔“ کارل مسکرایا۔

”اسی لیے تو تمہارے پاس آئی ہوں۔“ ریناولسن....

.... اس کے سامنے کرسی پر ٹک گئی۔ اس کے بیٹھنے کا انداز بھی بہت دل کش تھا۔ ”تم نے جنوبی امریکا کی قدیم ثقافتوں پر تحقیقی کام کیا اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ تم جنوبی امریکا میں پائے جانے والے بہترین امریکی آرکیالوجسٹ ہو۔“

”میں امریکی تھا اب میں برازیلین ہوں۔“ کارل نے تصحیح کی۔ ”میرے پاس برازیل کا پاسپورٹ ہے۔“

”اوکے اب تم برازیلین ہو۔“ رینا نے تسلیم کر لیا۔ ”مگر تمہارا امریکا سے تعلق تو ہے؟“

”تھا۔“ کارل کا لہجہ کسی قدر تلخ ہو گیا۔ ”پانچ سال پہلے جب میں وہاں سے نکلا تو سارے تعلق توڑ کر آیا تھا اب میں ڈاکٹر نہیں ہوں آرکیالوجسٹ بھی نہیں ہوں صرف ایک گائیڈ ہوں جو سیاحوں کو امیزون کی سیر کراتا ہے اور یہی میری روزی کا ذریعہ ہے۔“

”میں جانتی ہوں اور اسی لیے تمہارے پاس آئی ہوں۔“

کارل نے اٹھ کر آئس بکس سے ایک عدد بیئر کی بوتل نکالی اس کا ڈھکن کھولا اور ایک ہی سانس میں اسے آدھا کر کے بولا۔ ”سوری مس ولسن میں ابھی کام کے موڈ میں نہیں ہوں۔“

”میں تمہیں معاوضہ دوں گی۔“ رینا نے آفر کی۔ ”اس سے زیادہ جو تم عام طور پر لیتے ہو۔“

”میں صرف چند گھنٹے پہلے ایک طویل سفر سے آیا ہوں اور گزشتہ دو ہفتوں سے ایک رات بھی ڈھنگ سے نہیں سو سکا ہوں اس لیے میری طرف سے معذرت قبول کرو، ویسے تمہیں انکار کرتے ہوئے میرا دل دکھ رہا ہے۔“

رینا نے اس کے انکار کو جیسے سنا ہی نہیں اور اس نے اپنے پرس سے درمیانے سائز کا ٹیپ نکالا اور بولی۔ ”کیا بہتر نہیں ہوگا کہ تم انکار سے پہلے ایک بار میری بات سن لو اور میری آفر......“

”میں انکار کر چکا ہوں۔“ کارل نے بوتل خالی کر کے کہا۔ ”اس لیے اصرار مت کرو میں نے کہا نا مجھے دکھ ہو رہا ہے۔“

”اوکے مسٹر اولیور۔“ رینا نے گہری سانس لی اور ٹیپ واپس رکھ لیا۔ ”تمہاری مرضی۔“

”بائے۔“ کارل نے دوبارہ ہیٹ منہ پر رکھ لیا مگر اس طرح کہ اسے جھری سے رینا کا سراپا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھی اور پھر رک گئی۔

”مسٹر اولیور میں ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔“

”میں سن رہا ہوں۔“

”چار مہینے پہلے سان فرانسسکو سے نوجوانوں کی ایک تحقیقی ٹیم امیزون کی طرف گئی تھی۔ اس کا لیڈر جان چارلز تھا۔ تقریباً ستائیس برس کا جان چارلز بہترین ایکسپلورر اور مہم جو ہے۔ اسے انٹارکٹیکا کی مہم سے شہرت ملی۔ میرن اس کی ساتھی اور محبوبہ ہے۔ وہ بھی اس کے ساتھ مہمات پر جاتی رہتی ہے۔“ رینا نے بات جاری رکھی۔ ”کرس کلیئر جان کا نائب اور بہترین فوٹوگرافر ہے جب کہ روجر فروسٹ اس کا نائب اور وہ بھی فوٹوگرافر ہے۔ اس کے ذمے ویڈیو بنانا تھا۔“

”میں اس کے بارے میں جانتا ہوں۔“ کارل نے کہا۔ ”وہ گائیڈ کے لیے پہلے میرے پاس آئے تھے۔“

”اور تم نے انکار کر دیا؟“

”کیونکہ وہ کینی بال قبائل کے علاقے کی طرف جانا چاہتے تھے۔“

”انکار کی وجہ؟“

”کینی بال قبائل اپنے علاقے میں اجنبیوں کی آمد پسند نہیں کرتے ہیں اور وہاں جانے والے عام طور سے واپس نہیں آتے۔“

”وہ چاروں بھی واپس نہیں آئے اور میں انہیں ہی تلاش کرنے آئی ہوں۔“ رینا نے کہا اور نیچے اتر گئی۔ اس کے ایک ساتھی نے اس کے لیے گاڑی کا عقبی دروازہ کھولا اور اس کے اندر بیٹھنے کے بعد وہ بھی گاڑی میں سوار ہوئے اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ کارل انہیں جاتا دیکھ رہا تھا کہ اندر سے اس کا ساتھی اور ماتحت شان نکلا۔ وہ مقامی نسل کا نوجوان تھا اور کئی سال سے کارل کے ساتھ تھا۔ اس نے پوچھا۔

”یہ کون تھی؟“

”ایک بے وقوف امریکی۔“ کارل نے دوبارہ ہیٹ منہ پر رکھ لیا۔

”ایک خوب صورت امریکی۔“ شان نے شرارت سے کہا۔ ”میں نے سنا ہے یہ جان چارلز کی ٹیم کی تلاش میں آئی ہے۔“

”ہاں۔“ کارل نے بے پروائی سے کہا۔ ”یہ امیزون ہے یہاں لوگ غائب ہوتے رہتے ہیں۔“

”مجھے لگ رہا ہے یہ بھی واپس نہیں آئے گی۔“ شان سنجیدہ ہو گیا۔ ”کینی بال خطرناک قبائل ہیں وہ اپنے علاقے میں باہر کے لوگوں کی آمد پسند نہیں کرتے ہیں۔“

کارل کا خیال تھا کہ اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن رینا کے بارے میں خدشہ سن کر وہ بے چین ہو گیا۔ اس نے اپنی کیفیت نظرانداز کرنا چاہی مگر ناکام رہا۔ شام کو جب سورج غروب ہوا تو وہ گھر سے نکلا۔ اس کی پرانی جیپ کا رخ مناؤس کے اس حصے کی طرف تھا جہاں بہترین ہوٹل تھے اور غیر ملکی سیاح وہیں ٹھہرتے تھے۔ اسے رینا کے بارے میں پوچھنا نہیں پڑا۔ اس کی سیاہ گاڑی اسے ایک ہوٹل کی پارکنگ میں نظر آ گئی اور اس نے اندر کاؤنٹر پر رینا کے بارے میں پوچھا۔ رینا نے کسی ملاقاتی کے لیے منع کیا تھا اس لیے کاؤنٹر گرل بہ مشکل ہی اسے کال کرنے پر آمادہ ہوئی۔ اس نے رینا کو کارل کے بارے میں بتایا اور پھر فون اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”یس مسٹر کارل؟“ رینا مخصوص ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔

”میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”کس سلسلے میں؟“

”اسی سلسلے میں جس کے لیے تم مجھ سے ملنے آئی تھیں۔“

رینا کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے کہا۔ ”اوپر آ جاؤ، فون کاؤنٹر گرل کو دو۔“

ایک منٹ بعد کارل اس کے خوب صورت کمرے میں رینا کے سامنے تھا۔ وہ شاید ابھی نہا کر آئی تھی کیونکہ باتھ روب میں تھی اور خاصی نکھری ہوئی لگ رہی تھی۔ باتھ روب کا گریبان کسی قدر کھلا ہوا تھا اور کارل کی نظریں محسوس کر کے رینا نے اسے ٹھیک کیا۔ ”بولو اب کیا کہنا چاہتے ہو کیا تم جانے کے لیے تیار ہو؟“

”نہیں اور میں چاہتا ہوں کہ تم بھی وہاں مت جاؤ۔“

رینا کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ”تمہارے خیال میں میں اس ذمے داری کی اہل نہیں ہوں؟“

کارل نے پوچھا۔ ”تمہارے پاس ان لوگوں کے بارے میں کیا معلومات ہیں؟“

”جان کی ٹیم برازیل اور پیرو کی سرحد کے پاس گئی تھی۔ روانگی کے ایک ہفتے بعد ان کو آخری بار ایک جرمن سیاح نے دیکھا اور اس کے بعد ان کا کچھ پتا نہیں چلا کہ وہ کہاں گئے؟“

”اس سلسلے میں برازیلی حکام کا کیا کہنا ہے؟“

”ان کا کہنا ہے کہ وہ ممنوعہ علاقے میں داخل ہو گئے ہوں گے اور وہاں جانے والے زندہ سلامت واپس نہیں آتے ہیں۔“

”ممنوعہ علاقہ؟“

”کینی بال ریجن۔“ رینا آہستہ سے بولی۔ ”آدم خور قبائل جو اپنے علاقے میں کسی اجنبی کو برداشت نہیں کرتے ہیں۔“

”کینی بال آدم خور ہیں لیکن خطرناک نہیں ہیں۔“ کارل نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ اپنے مردے کھاتے ہیں اور ایسا وہ برکت کے لیے کرتے ہیں اور اپنے دشمنوں کو جو جنگوں میں مارے گئے ہوں کھا جاتے ہیں تاکہ ان کی بہادری ان میں شامل ہو جائے۔“

رینا نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔ ”وہ آدم خور ہیں اور اس سے زیادہ خطرناک کیا ہو گی؟“

کارل نے اس سے پوچھے بغیر سگریٹ نکال کر سلگایا اور گہرا کش لے کر بولا۔ ”یہ ان کا کلچر ہے۔ وہ کسی کو صرف کھانے کے لیے نہیں مارتے۔“

رینا شاید بحث کرنا چاہتی تھی مگر اس نے موضوع بدل دیا۔ ”کارل تم جنوبی امریکا کی قدیم تہذیبوں پر اتھارٹی ہو۔“

”یہ درست ہے۔“

”وہ چاروں بہت اچھے اور مہذب نوجوان ہیں۔ پتا نہیں اس وحشی علاقے میں ان پر کیا گزری ہوگی؟ میں چاہتی ہوں کہ تم یہ جاننے میں میری مدد کرو کہ ان پر کیا گزری ہے؟“

”یہ حکومتوں کا کام ہے۔“

”تم نے ٹھیک کہا لیکن بدقسمتی سے برازیلی حکام ایک حد سے زیادہ مدد پر آمادہ نہیں ہیں کیونکہ یہ علاقہ پیرو کے ساتھ لگتا ہے اور یہاں سرحد بھی متنازعہ ہے۔“

کارل سوچ میں پڑ گیا۔ شاید رینا کی جگہ کسی اور نے اس سے کہا ہوتا تو وہ صاف انکار کر دیتا مگر اسے انکار کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ بالآخر اس نے سر ہلایا۔ ”اوکے لیکن میرے کچھ سوالات ہیں۔“

”میرے پاس ہر سوال کا جواب ہے۔“ رینا خوش

ہوگئی۔

”پہلا سوال، اس اضافی مہم کے اخراجات کون برداشت کرے گا؟“

”امریکی حکومت برداشت کرے گی اور تمہیں مزید ادائیگی بھی کی جاسکتی ہے۔“

”دوسرے اگر ان لوگوں کے ساتھ وہاں کچھ ہوا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ دوسرے بھی خطرے میں ہوں گے، اس کے سدباب کے لیے کیا کیا جائے گا؟“

”برازیلی فوج کا ایک دستہ ہمارے ساتھ جائے گا۔“ ریتا نے کہا۔ ”تم بھی مسلح ہوسکتے ہو۔“

کارل نے سر ہلایا۔ ”امریکیوں کو رازداری کا بڑا خبط ہوتا ہے۔ میں اس قسم کی رازداری کا پابند نہیں ہوں گا۔“

ریتا ہچکچائی۔ ”دیکھو بعض اوقات کچھ باتیں سب کے سامنے نہیں لائی جاسکتی ہیں۔ اس لیے تم گنجائش رکھو۔“

کارل نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تم میرے بارے میں سب جانتی ہوگی میں گنجائش والا آدمی ہوتا تو اس وقت کسی امریکی یونیورسٹی میں پروفیسر ہوتا۔“

کارل بڑا منتظم... امریکا کی قدیم نسلوں کے حقوق کا شدید حامی تھا اور اس نے ریڈ انڈین قبائل کے تحفظ اور انہیں برابر کا امریکی شہری قرار دلوانے کے لیے جدوجہد کی تھی اور ناکامی کے بعد دل برداشتہ ہوکر وہ ہمیشہ کے لیے امریکا چھوڑ کر یہاں آبسا تھا۔

”میں جانتی ہوں۔“ ریتا نے کہا۔ ”لیکن تم ایک نظر یہ دیکھ لو۔“ اس نے ٹیب کارل کے سامنے کیا اور ایک ویڈیو چلائی۔ ”یہ آخری ویڈیو ہے جو ان کی طرف سے ملی تھی۔“

چار نوجوان جن میں ایک لڑکی بھی تھی، میامی... ائرپورٹ پر تھے اور اپنے سامان سمیت ڈیپارچر کی طرف جا رہے تھے۔ جان اور میرن سامان سنبھال رہے تھے جب کہ کرس اور روجر ویڈیو بنا رہے تھے اور تصویریں لے رہے تھے۔ پھر جہاز ساؤ پاؤلو کے ائرپورٹ پر اترا۔ اس کے بعد وہ مختلف طریقوں سے سفر کرتے ہوئے امیزون کے آخری اہم شہر ٹی فے تک جا پہنچے تھے جہاں سے ایک بڑی بوٹ میں وہ مزید مغرب کی طرف روانہ ہوئے اور ٹی فے سے کوئی سو میل دور ایک جرمن سیاح نے انہیں آخری بار دیکھا جب وہ کینی بال قبائل کے علاقے کی طرف جا رہے تھے۔ ریتا نے ویڈیو دکھاتے ہوئے جذباتی لہجے میں کہا۔

”ان کے چہرے دیکھو اور ان کی عمریں دیکھو، یہ سب بہت اچھے انسان اور امریکی تھے کیا ان کے گھر والوں کو جاننے کا حق نہیں ہے کہ ان پر کیا گزری؟“

کارل ایک بار پھر خود کو بے بس محسوس کرنے لگا۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہ عورت اس سے اپنی بات منوا کر رہے گی۔ اس نے سرد آہ بھری۔ ”ٹھیک ہے لیکن ہمیں یہ سوچ کر جانا ہوگا کہ واپسی کا امکان پچاس فیصد بھی نہیں ہے۔“

”مگر تمہارا کہنا ہے کہ وہ خطرناک نہیں ہیں۔“

”میں نے آدم خوری کے سلسلے میں تردید کی تھی ورنہ کینی بال جنگجو قبائل ہیں اور یہ بہت مہارت سے زہریلے تیر اپنے دشمن کے جسم میں اتار دیتے ہیں جن پر کسی زہریلے ترین سانپ کا مہلک زہر ہوتا ہے۔ اگر وہ کسی وجہ سے آمادۂ جنگ ہیں تو ان سے زیادہ خطرناک دشمن کوئی نہیں ہوگا۔ اس لیے تمہیں پوری تیاری کے ساتھ جانا ہوگا۔“

☆☆☆

”میں کیپٹن مولیرو ہوں۔“ فوج کی وردی میں ملبوس سیاہ فام کیپٹن نے ریتا سے کہا۔ ”میں تمہاری، تمہارے ساتھیوں اور سامان کی حفاظت کا ذمے دار ہوں۔“

”تم سے مل کر خوشی ہوئی۔“ ریتا بولی۔ گرمی بے پناہ تھی اور اس کی سفید شرٹ بھیگ کر جسم سے چپک گئی تھی۔ ٹی فے کی دریائی بندرگاہ پر ان کا سامان ایک پانی میں اترنے والے طیارے سے نکال کر جیٹی پر جمع کیا جا رہا تھا اور یہ سامان کچھ دیر بعد ایک بڑی سی کشتی میں منتقل کر دیا گیا جس میں انہیں آگے سفر کرنا تھا۔ ان کے ساتھ ایک مقامی افسر بینون الفانسے بھی تھا۔ بینون کی رگوں میں اسپین اور پرتگال کا ملا جلا خون تھا۔ برازیل میں پرتگالی نسل کی اکثریت ہے اس لیے یہاں کی زبان اور رسم ورواج پرتگالی ہیں، البتہ ان میں اسپین کی جھلک بھی آتی ہے۔ کیپٹن مولیرو کے ساتھ بارہ مسلح فوجیوں پر مشتمل ایک دستہ تھا۔ کارل، بینون اور شان امیزون میں بولی جانے والی مقامی زبانوں سے واقف تھے اور وہ راستے بھی جانتے تھے۔

ریتا نے بینون سے پوچھا۔ ”حکومت نے اب تک یہاں کوئی سسٹم قائم کرنے کی کوشش نہیں کی؟“

”سسٹم قائم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ بینون نے جواب دیا۔ ”یہ لوگ ذرا سی مداخلت پر مرنے مارنے پہ آمادہ ہو جاتے ہیں اور اگر زیادہ خطرہ محسوس کریں تو اپنی عورتوں بچوں کو خود قتل کر کے ان کے مزید گھنے جنگلوں میں چلے جاتے ہیں جہاں وہ مرتے دم تک دشمن سے لڑتے ہیں۔ ایسے لوگ کسی سسٹم کے تحت کہاں رہ سکتے ہیں؟“

ریتا دنگ رہ گئی۔ ”یہ اتنے وحشی ہوتے ہیں؟“

”یہ تمہاری سوچ ہے۔“ کارل نے کہا۔ ”ورنہ اپنے طور پر یہ بالکل درست کرتے ہیں۔“

دوپہر کے وقت ان کی بوٹ روانہ ہوگئی۔ کارل کیپٹن مولیرو کے ہمراہ اوپری عرشے پر چھپر تلے تھا کیونکہ دھوپ شدید تھی۔ وہ اور کیپٹن برف لگی بیئر پی رہے تھے۔ یہ لوکل بیئر تھی جس سے خاصی تیز بو آرہی تھی۔ کارل اسے پسند کرتا تھا۔ اس نے کیپٹن مولیرو سے پوچھا۔ ”تم اس علاقے سے واقف ہو؟“

”میرا بچپن امیزون میں گزرا ہے اور یہاں سب علاقے ایک جیسے ہیں، صرف لوگوں کا فرق ہے۔“

بینون بھی وہیں آگیا۔ اسٹیمر تقریباً دس ناٹ کی رفتار سے دریا کے مخالف سمت میں جا رہا تھا۔ دن بھر تیز دھوپ کے بعد شام کو بادل آئے اور بارش ہوئی اس کے بعد موسم کسی قدر خوشگوار ہوگیا تھا۔ ریتا کے دونوں ساتھی ایف بی آئی ایجنٹ تھے اور وہ اس کے محافظ اور معاون تھے۔ دریا کے ساتھ موجود گھنے درخت اتنے بڑے تھے کہ ان کی شاخیں کشتی کے اوپر تک آرہی تھیں اور ان درختوں پر مقامی نسل کے بندر اور دوسرے جانور انہیں دیکھ کر شور مچا رہے تھے۔ ریتا اپنے آئی فون میں ان کی تصویریں اور ویڈیو بنا رہی تھی کہ کارل اوپر آگیا۔ وہ ریلنگ سے ٹک گیا۔ ریتا نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”تم اس زندگی اور اس پیشے سے خوش ہو؟“

”تمہارا مطلب ہے کہ میں اس سے زیادہ خوش ہوں جتنا کہ امریکا میں پروفیسر بن کر اور وائٹ کالر جاب میں خوش تھا؟“ کارل کا لہجہ استہزائیہ ہوگیا۔ ”تو میرا جواب ہے ہاں میں بہت خوش ہوں۔“

”تم ہر بات میں امریکا کا حوالہ کیوں دیتے ہو؟“ ریتا کو غصہ آگیا۔ ”جب کہ تم اس ملک کو چھوڑ چکے ہو۔“

”ہاں لیکن اس نے مجھے نہیں چھوڑا ہے۔“ کارل ہنسا تو ریتا منہ پھیر کر نیچے چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی بینون اوپر آگیا۔

”میڈم غصے میں ہے۔“

”تم جانتے ہو امریکی جذباتی قوم ہے، جلد غصے میں آجاتی ہے۔“ کارل نے بے پروائی سے کہا۔ ”ہمیں کب تک سفر کرنا ہوگا؟“

”کل شام تک ہم اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔“

مگر بعض مقامات پر دریا میں کچرا آگیا تھا اس کی وجہ سے انہیں ذیلی شاخوں سے گزر کر جانا پڑا اور اسی وجہ سے وہ اگلے دن رات گئے مذکورہ مقام پر پہنچے تھے۔ صبح تک کے لیے دریا کے وسط میں ہی لنگر ڈال دیا گیا کیونکہ کیپٹن مولیرو کے خیال میں رات کے وقت کنارے پر جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کارل نے اس کے فیصلے کی تائید کی تھی۔ بوٹ کی روشنیاں بھی جل رہی تھیں کہ کوئی بے خبری میں بوٹ تک نہ آجائے۔ اگلی صبح روشنی ہوتے ہی انہوں نے نیچے اترنے کی تیاری شروع کر دی۔ وہ ہوا سے بھرنے والی کشتی کی مدد سے کنارے پہنچے۔ کیپٹن نے کنارے پہنچتے ہی اپنے آدمیوں کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا، ان کے چار چار کے دو گروپ بنائے۔ ایک گروپ دائیں طرف سے اور دوسرا بائیں طرف روانہ کر دیا۔ باقی دو سپاہی کیپٹن نے اپنے ساتھ رکھے۔ کیپٹن کا اپنے سب آدمیوں سے ریڈیو پر رابطہ تھا۔

بینون رہنمائی کر رہا تھا، کارل اور باقی اس کے پیچھے تھے۔ سورج نکلتے ہی گرمی بہت زیادہ ہوگئی تھی مگر کیڑے مکوڑوں اور سانپوں سے بچنے کے لیے وہ پورے لباس میں تھے اور ان کے پیروں میں گھٹنوں تک مضبوط واٹر پروف جوتے تھے۔ وہ جھاڑیوں اور گھنے پودوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ دائیں طرف سے فائرنگ کا شور سنائی دیا۔ مولیرو ریڈیو پر چیخ چیخ کر اپنے آدمیوں سے پوچھ رہا تھا کہ کیا بات ہے اور وہ کیوں فائرنگ کر رہے ہیں مگر دوسری طرف سے شور حاوی تھا۔ کیپٹن کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اس نے بائیں طرف موجود گروپ کو اپنی طرف آنے کا حکم دیا اور جب وہ گروپ آیا تو کیپٹن اپنے دو آدمیوں کے ہمراہ دائیں طرف روانہ ہوا۔ کارل آگے آیا۔ ”میں بھی ساتھ چلوں گا، میں اپنی حفاظت کرسکتا ہوں۔“

”تم پستول چلانا جانتے ہو؟“ کیپٹن نے پوچھا۔

کارل نے سر ہلایا تو اس نے اپنا پستول اسے تھما دیا۔ ”میرے ساتھ رہنا۔“

وہ تیزی سے اس طرف بڑھے۔ فائرنگ رک گئی تھی اور اب کیپٹن ریڈیو پر بات کرسکتا تھا۔ دوسری طرف سے بتایا گیا کہ فوجیوں نے آدم خوروں کا ایک گروہ دیکھا جو انسانی اعضا کھا رہا تھا۔ انہوں نے ان پر فائر کھول دیا چھ میں سے چار وہیں مارے گئے اور دو بھاگ گئے۔ بعد میں انہوں نے چھپ کر زہریلے تیر مارے اور ایک سپاہی نشانہ بنا تھا مگر انہوں نے باقی دو میں سے ایک کو مار دیا اور ایک کو زندہ پکڑ لیا۔ وہ چند منٹ میں اس جگہ پہنچ گئے جہاں یہ معرکہ ہوا تھا۔ مارے جانے والے قبائلیوں کی لاشیں پڑی تھیں اور زندہ پکڑا جانے والا رسیوں میں جکڑا ہوا نیچے پڑا تھا۔ زہریلے تیر کا شکار ہونے والے سپاہی کو اس کے ساتھی

طبی امداد دے رہے تھے۔ اسے زہر کے تریاق کا انجکشن لگا دیا تھا مگر اسے مزید علاج کی ضرورت تھی اس لیے کیپٹن مولیرو نے اسے کشتی پر بھجوا دیا۔ پھر وہ قیدی کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ جوان اور مضبوط آدمی تھا۔ اس کے بال مخصوص ساخت میں بڑھے ہوئے تھے۔ کارل آگے آیا اور اس نے قیدی کی گردن پکڑ کر اسے جھکایا اور بال اوپر کر کے اس کی گدی کا معائنہ کیا جس پر ٹیٹو بنا ہوا تھا۔ کرنل نے پوچھا۔

”یہ کیا ہے؟“

”کینی بال قبائل اس طرح کے ٹیٹوز بنواتے ہیں جو ان کے قبیلے کی نشانی ہوتا ہے۔ اس کا تعلق مناؤز قبیلے سے ہے، یہ وسطی حصے میں پایا جاتا ہے جہاں دریا کی ایک ذیلی شاخ نکلتی ہے۔“

”او، تم ان لوگوں کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو۔“

”میں اسی لیے ساتھ ہوں۔“ کارل نے کہا اور فوراً اس کے ذہن میں خیال آیا کہ وہ صرف رینا کی وجہ سے یہاں آیا تھا۔

کیپٹن کے نائب نے بتایا۔ ”یہ اجنبی زبان بول رہا ہے۔“

”شان ان کی زبان جانتا ہے۔“ کارل نے کہا۔ ”اس کی رگوں میں کینی بال خون ہے۔“

کچھ دیر میں باقی سب بھی وہیں آگئے تھے۔ شان نے قیدی سے اس کی زبان میں بات کی تو اس نے تسلیم کیا کہ وہ مناؤز قبیلے سے تعلق رکھتا ہے اور انہوں نے درختوں پر بسنے والے چاؤش قبیلے پر حملہ کیا تھا۔ چاؤش قبیلہ درختوں پر چڑھ کر اپنا دفاع کر رہا تھا اور انہوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔ البتہ اس نے اس سوال کا جواب نہیں دیا کہ انہوں نے اپنے علاقے سے نکل کر اتنی دور چاؤش پر حملہ کیوں کیا تھا؟ وہ اسے لے کر آگے روانہ ہوئے اور اس جگہ پہنچے جہاں وہ آگ پر انسانی اعضا بھون کر کھا رہے تھے۔ یہاں مارے جانے والے چار آدم خوروں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ کچھ ہی دور ایک درخت پر اٹکا ہوا بیگ دیکھ کر وہ چونکے۔ رینا نے تیزی سے آگے بڑھ کر بیگ اٹھا لیا۔ اس نے کارل سے کہا۔ ”میرا خیال ہے یہ جان چارلز کا ہے یہ دیکھو اس پر جے سی لکھا ہوا ہے۔“

بیگ خالی تھا۔ ”ممکن ہے۔“

وہ آگے بڑھے۔ قیدی ان کے ساتھ تھا، اس کے پاؤں کھول دیے گئے تھے۔ گھنے جنگل میں سفر کرتے ہوئے وہ محتاط اور خاموش تھے کیونکہ اگر وہ آواز نکالتے تو آگے موجود کینی بال ہوشیار ہو سکتے تھے۔ پہلی جھڑپ نے سب پر ان کی دہشت طاری کر دی تھی۔ خاص طور سے رینا کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ کارل اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ ”تمہیں ڈر لگ رہا ہے؟“

رینا بولی۔ ”کیا نہیں لگنا چاہیے......؟ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ انسان اس قدر درندہ بھی ہو سکتا ہے۔“

”انسان بنیادی طور پر درندہ ہی ہے۔“ کارل نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ بیتون جو آگے تھا اس نے کارل سے کہا۔

”ہم چاؤش قبیلے کی حد میں ہیں، وہ دریا کے سب سے نزدیک آباد ہے۔“

کارل نے کیپٹن کو خبردار کیا اور اس نے اپنے سپاہیوں کو آگے کر دیا مگر اس نے حکم دیا کہ براہ راست فائر سے گریز کریں اور صرف ڈرانے کے لیے فائرنگ کریں۔ کچھ دیر بعد وہ ایک ایسے علاقے میں پہنچے جہاں برگد جیسے بہت پرانے اور قدیم درخت تھے۔ مناؤز قبیلے کے جنگجوؤں نے چاؤش قبیلے کو ان درختوں پر محصور کر رکھا تھا اور انہیں نیچے آنے پر مجبور کرنے کے لیے آگ جلا کر دھواں پیدا کر رہے تھے۔ سپاہیوں نے ہوائی فائرنگ کی تو وہ بھاگے اور ذرا سی دیر میں میدان صاف ہو گیا۔ سپاہیوں نے آگ بجھائی اور ایک طرف موجود رسیوں سے جکڑی درجن بھر سے زیادہ عورتوں کو آزاد کیا۔ چاؤش قبیلہ بھی درختوں سے اتر آیا تھا اور شان کی مدد سے انہوں نے بتایا کہ مناؤز والے ان سے عورتوں کا مطالبہ کر رہے تھے۔ چاؤش کمزور تھے، اس لیے وہ درختوں پر محصور ہو گئے۔ انہوں نے درختوں کے اوپری حصے کاٹ کر اور ان میں مزید لکڑیاں جوڑ کر رہائش کے قابل کمرے بنائے ہوئے تھے۔ اوپر آنے جانے کے لیے سیڑھیاں تھیں جنہیں بوقتِ ضرورت الگ بھی کیا جا سکتا تھا۔ مناؤز نے ایک درخت پر موجود افراد کو دھواں کر کے نیچے آنے پر مجبور کر دیا تھا، انہوں نے مردوں کو قتل کر دیا اور عورتوں کو قیدی بنا لیا۔ اب وہ باقی درختوں کے نیچے دھواں کر رہے تھے مگر غیر متوقع مداخلت نے انہیں بھاگ نکلنے پر مجبور کر دیا۔

انہوں نے سفر کا پہلا پڑاؤ وہیں ڈالا۔ اس دوران میں چاؤش قبیلہ اپنے مردوں کی آخری رسومات کی تیاری کر رہا تھا، وہ مردے دفناتے تھے۔ رات تک ماتم برپا رہا اور اس کے بعد جان بچ جانے پر جشن ہوا۔ رینا حیران تھی۔ ”کچھ دیر قبل تو یہ لوگ رو پیٹ رہے تھے اور اب ناچ گا رہے ہیں۔“

”ان کی زندگی اور ردعمل بہت سادہ ہے۔“ کارل نے کہا۔ وہ ایک طرف بیٹھے رقص دیکھ رہے تھے۔ ”یہ خوشی

اورغم کو بہت دیر تک محسوس نہیں کرتے۔ کل تک یہ نارمل ہو جائیں گے۔“

جب رقص کرنے والے تھک گئے، عورتیں اپنے بچے سمیت کر اوپر درختوں پر چلی گئیں اور مرد پہرا دینے لگے تو کارل نے شان کی مدد سے قبیلے کے روحانی پیشوا اور سردار سے جان اور اس کی پارٹی کے بارے میں پوچھا۔ سردار نے بتایا کہ یہ پارٹی ان کے قبیلے سے گزر کر آگے گئی تھی۔ وہ ایک دن یہاں رکے تھے۔ ان کا رخ کینی بال ریجن کے وسط کی طرف تھا جہاں مناؤز اور دوسرے خطرناک جنگجو قبائل آباد تھے۔ انہوں نے چاؤش قبیلے والوں کو کچھ تحفے بھی دیے تھے جن میں وہ بیگ بھی شامل تھا جس پر جے سی لکھا ہوا تھا۔ کارل فکر مند ہو گیا اور اس نے رینا کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ ”اب ہمیں آگے جانا ہوگا یہ کوئی اچھی اطلاع نہیں ہے۔“

”تم ڈر رہے ہو؟“

”تمہارے لیے۔“ کارل نے کہا۔ ”میرا مشورہ ہے تم یہیں رکو میں اور دوسرے لوگ آگے جاتے ہیں۔“

رینا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اصل ذمے داری میری ہی ہے لہٰذا میں یہاں نہیں بیٹھ سکتی۔“

کارل اس کا جواب جانتا تھا، اس لیے اس نے پھر نہیں کہا۔ اگلے دن وہ آگے روانہ ہوئے تو چاؤش قبیلے کے افراد انہیں اپنی سرحد تک چھوڑنے آئے تھے۔ ان کا قیدی ان کے ساتھ تھا۔ اگر وہ ان کا قیدی نہ ہوتا تو چاؤش قبیلے والے انہیں زندہ نہ چھوڑتے۔ اسلحے کے ساتھ وہ دوپہر تک دلدلی جھاڑیوں کے درمیان سفر کرتے رہے۔ یہ نشیبی علاقہ تھا۔ وہ سرکنڈوں، سانپ وغیرہ سے بچ کر گزر رہے تھے۔ کارل نے رینا سے کہا۔

”اس پہلے تجربے سے تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ان چاروں کے زندہ بچنے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔“

”ہاں لیکن مجھے ان کے بارے میں معلوم تو کرنا ہے۔ میرا اصل مشن یہی ہے۔ وہ زندہ ہیں یا نہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

”دنیا بھر میں ہر سال ہزاروں امریکی غائب ہو جاتے ہیں لیکن میری معلومات کے مطابق امریکی حکومت ان کے لیے ایسے مشن نہیں بھیجتی پھر ان چاروں میں ایسی خاص بات کیا ہے؟“

رینا جواب دینے سے پہلے ذرا ہچکچائی تھی۔ ”یہ چاروں اصل میں میڈیا سے متعلق ہیں اور میڈیا نے ان کے لیے بہت لمبی چوڑی مہم چلائی ہوئی ہے۔ اسی لیے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے ان کے لیے مجھے بھیجا ہے۔“

”تم اس مہم کی خطرناکی سے باخبر تھیں؟“

”میں نے یہاں آنے سے پہلے مکمل معلومات حاصل کی تھیں۔“

”تب تمہیں اپنے گھر والوں کا خیال نہیں آیا؟“

”میرا سوائے ایک بوڑھی ماں کے دنیا میں اور کوئی نہیں ہے اور وہ ایک اسپتال میں ہوش و حواس سے بیگانہ پڑی ہے۔“ رینا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”اوہ آئی ایم سوری، کوئی اور بھی نہیں ہے؟“

”ماما اور پھر کیریئر سے فرصت نہیں ملی جو کسی اور طرف توجہ دیتی۔“

نہ جانے کیوں کارل کو یہ سن کر خوشی ہوئی تھی۔ وہ بیئون، رینا، شان اور قیدی آگے تھے جب کہ کیپٹن اور اس کے آدمی کسی قدر پیچھے پھیل کر چل رہے تھے۔ اس لیے جب اچانک ان پر تیروں کی بارش ہوئی تو وہ چاروں محفوظ رہے تھے۔ سرکنڈوں کے کئی جھنڈ تھے جہاں سے تیر آ رہے تھے اور سپاہیوں کو لگ رہے تھے۔ ان کی چیخوں اور پھر فائرنگ کی تڑتڑاہٹ سے یہ میدان گونجنے لگا۔ کارل نے رینا کا بازو پکڑا اور تیزی سے درختوں کی طرف دوڑا۔ وہ وہیں محفوظ رہ سکتے تھے۔ کم سے کم چار سپاہی ان کے سامنے گرے تھے۔ بیئون اور شان عقب میں فائرنگ کرتے ان کے پیچھے آ رہے تھے۔ جب تک وہ درختوں میں نہیں گھس گئے انہیں اطمینان نہیں ہوا تھا۔ رینا نے ہانپتے ہوئے کہا۔

”میرے خدا یہ کیا تھا؟“

”وہی جس کی توقع تھی۔“ کارل نے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔ ”کیپٹن اور اس کے آدمی نظر نہیں آ رہے ہیں۔“

”وہ مارے گئے ہیں یا پھر کہیں چھپے ہوئے ہیں۔“ بیئون نے کہا۔ ”میرے خدا! تیروں کی بارش تھی، ہم نہ جانے کیسے بچ گئے؟“

”ہم اس لیے بچ گئے کہ انہوں نے ہمیں نشانہ نہیں بنایا۔“ کارل نے اپنی رائفل کا جائزہ لیا۔ ”وہ جانتے ہیں کہ پہلے کس پر حملہ کرنا ہے۔ انہوں نے سپاہیوں کو نشانہ بنایا اور ان سے نمٹ کر وہ ہمارے پیچھے آئیں گے۔ اس سے پہلے ہمیں یہاں سے نکل جانا ہوگا۔“

رینا اور بیئون کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں البتہ شان بے تاثر تھا۔ قیدی کی رسی اس کے ہاتھ میں تھی۔ رینا نے پوچھا۔ ”اب کیا کرنا چاہیے؟“

”ہمیں آگے بڑھنا چاہیے۔“ کارل نے سوچ کر کہا۔ ”ان سے چھٹکارے کی ایک ہی صورت ہے کہ ہم ان کی حد سے نکل جائیں۔“

”اس سے پوچھو کہ ہم کس کی حد میں ہیں۔“ بیئون نے قیدی کی طرف اشارہ کیا تو کارل بولا۔

”میں جانتا ہوں یہ کینی بال کین قبیلہ ہے، یہ بانس سے تیر بناتے ہیں اور اس شعبے میں ان سے زیادہ ماہر کوئی نہیں ہے۔“

ان لوگوں کی مہارت وہ دیکھ چکے تھے۔ اس لیے اس بار سب نے تیزی سے قدم اٹھائے۔ وہ تقریباً دوڑنے کے انداز میں چل رہے تھے۔ کارل نے انہیں خبردار کیا۔ ”ہر ممکن تیزی سے قدم اٹھاؤ کیونکہ یہ لوگ بہت تیزی سے پیچھا کرتے ہیں۔ ہمیں جلد از جلد ان کی حدود سے نکل جانا ہے۔“

رینا کو یوں بھاگنے کی عادت نہیں تھی مگر اس نے ان کا ساتھ دیا لیکن دس منٹ بعد اس کی حالت خراب ہونے لگی۔ کارل نے اس کے لڑکھڑاتے قدم دیکھے تو اسے سہارا دینے لگا۔ اس کے باوجود رینا کی ہمت کچھ دیر بعد جواب دے گئی اس نے ٹوٹتی سانسوں کے درمیان کہا۔ ”اب میں...... اور نہیں...... بھاگ...... سکتی۔“

رینا لڑکھڑائی اور گرنے لگی تو کارل نے اسے سنبھالا اور پھر اٹھا کر اپنے شانے پر ڈال لیا۔ کارل نے اپنا بیگ اور رائفل شان کو دے دی تاکہ وہ رینا کو آسانی سے اٹھا سکے۔ کچھ دیر بعد فائرنگ رک گئی اور عقب سے ایسی آوازیں آئیں جیسے پرندے بول رہے ہوں۔ بیئون جو آگے تھا رک گیا اور دہشت زدہ ہو کر بولا۔

”وہ آ رہے ہیں، یہ آوازیں وہی نکال رہے ہیں۔ جب کینی بال دشمن کا پیچھا کرتے ہیں تو ایسی ہی آوازیں نکالتے ہیں۔“

”تیز چلو۔“ کارل نے کہا۔ ”اب کوئی نہ رکے۔ جو بھاگ سکتا ہے تیزی سے بھاگے۔“

انہوں نے کارل کی بات پر عمل کیا۔ قیدی کے لیے بندھے ہاتھ کے ساتھ بھاگنا مشکل تھا اس لیے شان نے اس کے ہاتھ کھول دیے البتہ اس کے گلے میں بندھی رسی اپنے ہاتھ میں رکھی تھی۔ ذرا سی دیر میں وہ تینوں کارل سے آگے نکل گئے تھے۔ وہ رینا کو اٹھائے ہوئے تھا اس لیے پیچھے رہ گیا۔ رینا نے اس بات کو محسوس کیا اس نے کہا۔ ”اب میں ٹھیک ہوں، مجھے اتار دو۔ میں بھاگ سکتی ہوں۔“

کارل نے اسے نیچے اتار دیا۔ ”تم چل سکو گی؟“

”ہاں۔“ وہ بولی۔ ”یہ تینوں کہاں ہیں؟“

کارل نے آگے دیکھا تو تینوں غائب تھے۔ ”شاید آگے درختوں میں ہیں۔“

وہ دونوں بھاگے کیونکہ پرندوں کی آوازیں نزدیک آ رہی تھیں مگر جب وہ آگے نکلے تو انہیں وہ تینوں نظر نہیں آئے، کارل فکر مند ہو گیا۔ ”ایسا لگ رہا ہے ہم غلط سمت نکل گئے ہیں۔“

”تمہاری رائفل کہاں ہے؟“

”وہ میں نے شان کو دے دی تھی۔“

”اب ہمارے پاس بس یہی ایک پستول ہے۔“ رینا نے پستول نکال کر دکھایا تو کارل نے لے لیا۔ وہ رینا کا بازو تھام کر تیزی سے آگے بڑھا۔ ایک چھوٹے سے میدان سے گزر کر وہ درختوں میں داخل ہو رہے تھے کہ عقب سے ایک تیر آ کر درخت کے تنے پر لگا۔ کارل نے مڑ کر دیکھا۔ کینی بال ان کے عقب میں آ چکے تھے۔ اس نے رینا کو آڑ میں کیا اور پستول سے آگے آنے والے کا نشانہ لیا۔ فائر کی آواز کے ساتھ وہ اچھل کر پیچھے گرا اور اس کے پیچھے آنے والے پلٹ کر بھاگے۔ کارل نے موقع غنیمت جانا اور رینا کے ساتھ آگے بھاگا۔ وہ درختوں کے جھنڈ سے نکلے تو سامنے گھاس کے ایک بڑے میدان کے بعد پانی بہہ رہا تھا۔ کارل نے کہا۔

”جلدی، ہمیں اس کے پار جانا ہوگا۔“

وہ دوڑنے لگے مگر نصف میدان ہی عبور کیا تھا کہ عقب سے پھر کینی بال آ گئے۔ وہ ان پر تیر پھینک رہے تھے مگر دوری کی وجہ سے تیر نشانے پر نہیں لگ رہے تھے۔ البتہ ان کے آس پاس ضرور گر رہے تھے۔ کارل بھاگتے بھاگتے اچانک رخ بدل لیتا تھا اور وہی رینا کو بھی کھینچ رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر لڑکھڑانے لگی تھی۔ دریا کے پاس پہنچ کر کارل نے مڑ کر مزید دو فائر کیے تو نزدیک آ جانے والے قبائلی پلٹ کر بھاگے...... وہ آتشیں اسلحے کی تباہ کاری سے اچھی طرح واقف تھے۔ کارل نے رینا کو پانی کی طرف دھکیلا۔

”چلو ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

رینا پانی میں گھس گئی کارل اس کے پیچھے تھا، جب وہ تیرنے کے قابل پانی تک پہنچے تو اس نے پستول بیلٹ میں اڑس لیا۔ ”ہمیں زیر آب تیر کر جانا ہوگا ورنہ سطح پر یہ آسانی سے نشانہ بنا لیں گے۔“

رینا نے سر ہلایا۔ انہوں نے گہرے سانس لیے اور پانی میں چلے گئے۔ وہ اس وقت تک اندر تیرتے رہے جب تک سانس اکھڑنے نہیں لگا۔ پھر وہ سطح پر آئے اور سانس

لے کر دوبارہ پانی میں چلے گئے۔ دریا یہاں سست روی سے بہہ رہا تھا اور اس کا پاٹ سو گز سے زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ قبائلی کنارے تک آ گئے تھے مگر انہوں نے دریا میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی بس وہیں سے تیر پھینکتے رہے۔ کارل کی حکمت عملی کام آئی۔ اگر وہ سطح پر تیرتے تو لازمی تیروں کا شکار ہو جاتے مگر زیرِ آب ہونے کی وجہ سے وہ تعاقب کرنے والوں کی نظروں سے اوجھل رہے۔ کارل نے خود کو دریا کے ساتھ جانے دیا تھا۔ اس طرح وہ زیادہ دور نکلتے۔ پندرہ بیس منٹ بعد وہ دوسری طرف نکلے اور ہانپتے ہوئے دریا کے کنارے ریت پر گر گئے۔ دشمن پیچھے رہ گئے تھے اور اب وہ اس طرف سے نظر نہیں آ رہے تھے۔ ریتا نے کہا۔

''وہ پیچھے رہ گئے ہیں۔''

''لیکن ہم پتا نہیں کہاں آ نکلے ہیں؟'' کارل نے تشویش سے کہا اور اٹھ کر چاروں طرف دیکھا۔ ''ایسا لگ رہا ہے ان کی حدود یہاں تک تھی اس لیے انہوں نے پیچھے آنے کی کوشش نہیں کی۔''

''وہ دونوں بھی پتا نہیں کہاں ہیں؟''

کارل نے پستول کا معائنہ کیا، اس میں پانی چلا گیا تھا مگر اسے امید تھی کہ وہ کام کرے گا۔ اس نے ریتا کی طرف دیکھا۔ اس ذرا سے ایڈونچر نے اسے نچوڑ دیا تھا۔ واشنگٹن کے پُرسکون ماحول میں کام کرنا الگ بات تھی اور ایمیزون میں ہر لمحے موت کا سامنا کرنا بالکل الگ تجربہ تھا۔ ''اٹھو ہمیں آگے جانا ہوگا۔''

''آگے کہاں؟''

''شاید ہم مناؤز قبیلے کی حدود میں ہیں اور یہ کینی بال ریجن کے وسط میں ہے۔ ممکنہ طور پر جان اور اس کی پارٹی یہیں آئے تھے۔''

ریتا کا چہرہ سفید پڑ گیا... ''یہ تو بہت خطرناک لوگ ہیں۔''

''دیکھو کینی بال شاذ ہی دوسرے کے علاقے پر حملہ کرتے ہیں۔ مناؤز نے چاؤش قبیلے سے عورتیں حاصل کرنے کی کوشش کی تھی اس کے پیچھے کوئی وجہ ہے۔ درمیان میں کین قبیلہ ہے لیکن انہوں نے دور کے چاؤش قبیلے پر حملہ کیا۔ اس کا مطلب ہے وہ اپنے اندر اتنی طاقت نہیں پاتے کہ کین قبیلے پر حملہ کر سکیں۔ انہوں نے درختوں پر بسنے والے چاؤش کا انتخاب کیا کیونکہ وہ کمزور ہیں۔''

ریتا اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ''ان سب باتوں کا جان اور اس کے ساتھیوں کی تلاش سے کیا تعلق ہے؟''

''مجھے لگ رہا ہے کوئی تعلق ہے اور ہمیں وہی تعلق تلاش کرنا ہوگا۔'' کارل نے کہا اور آگے بڑھا۔ اس نے پستول بیلٹ میں لگا کر اپنی پنڈلی سے بندھا بڑا سا خنجر نکال لیا۔ اس نے ایک جگہ سے دو عدد بانس کاٹے اور خنجر سے چھیل کر ان کے سرے نیزے کی طرح نوک دار کر لیے اس نے ایک بانس ریتا کو تھما دیا۔ ''اس سے ہم اپنا دفاع کر سکتے ہیں۔''

ریتا سوچ رہی تھی کہ اگر ان جنگلیوں نے حملہ کیا تو وہ اس ایک بانس کی مدد سے کیا کر سکے گی۔ اس نے کارل سے مطالبہ کیا۔ ''پستول مجھے دو میں اس سے کام لے سکتی ہوں۔''

کارل نے پستول اس کے حوالے کر دیا۔ ''لیکن فائر سوچ سمجھ کر کرنا، اس میں کل سات گولیاں رہ گئی ہیں۔''

ریتا نے پستول شرٹ تلے پتلون کی بیلٹ میں لگا لیا۔ ''میں نے ان کے بارے میں سنا تھا لیکن انہیں اس سے کہیں زیادہ وحشی پایا ہے۔''

کارل نے نرمی سے کہا۔ ''یہ اپنی فطرت کے مطابق زندگی گزار رہے ہیں جب کہ ہم نے اپنی فطرت کو تہذیب اور ثقافت کے خوشنما لبادوں تلے چھپا لیا ہے۔ ذرا غور کرو ہم مہذب کہلانے والے انسان ایک دوسرے کے ساتھ کیا کرتے ہیں؟''

''مجھے لیکچر مت دو۔'' ریتا چڑ کر بولی۔ ''ابھی ان سے سامنا ہو تو ان کو بتانا کہ وہ انسانیت کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہیں اور ان کو دنیا پر حکمرانی کرنی چاہیے۔''

کارل ہنسا۔ ''تم برا مان گئیں، او کے میں ان کی زیادہ تعریف نہیں کرتا کیونکہ یہ دشمن ہیں۔''

دریا کے دوسری طرف سرکنڈوں سے بھرے میدان تھے جہاں پانی نہیں تھا وہاں نرم گھاس اگ آئی تھی۔ کارل نے چاروں طرف دیکھا اور ایک طرف اشارہ کیا۔ ''شاید اس طرف آبادی ہو کیونکہ وہ جگہ بلند ہے یہاں بارش میں سیلاب آتا ہوگا۔''

وہ ذرا آگے بڑھے تھے کہ انہیں بستی نظر آ گئی۔ یہ زیادہ بڑی بستی نہیں تھی۔ شاید اس میں چار پانچ سو افراد رہتے ہوں گے۔ ریتا نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ ''مجھے ڈر لگ رہا ہے یہ ہمیں دیکھتے ہی حملہ نہ کر دیں۔''

''نہیں اگر ہم نے کوئی مشکوک حرکت نہ کی تو یہ حملہ نہیں کریں گے۔''

ریتا اس سے متفق نہیں تھی لیکن مجبوراً آگے بڑھی۔ قریب آنے پر انہیں گڑبڑ کا احساس ہوا۔ سامنے والے جھونپڑے سلامت تھے لیکن ان کے عقب میں واقع دو

بڑے جھونپڑے جل چکے تھے اور ان کی جلی ہوئی بلیاں باقی رہ گئی تھیں۔ یہی نہیں ان جلے ہوئے جھونپڑے میں درجنوں جل جانے والی لاشیں تھیں جو اب ہڈیوں میں بدل چکی تھیں۔ انہیں وہاں اکا دکا قبائلی نظر آ رہے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ جھونپڑوں سے لوگ نکلنے لگے۔ مگر ان کی تعداد بہت زیادہ نہیں تھی۔ ریتا سہم کر کارل کے نزدیک ہو گئی اور کارل نے نوٹ کیا کہ ان میں مردوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی جب کہ عورتیں اور بچے بہت کم تھے۔ جل جانے والے ڈھانچوں کی ساخت عورتوں والی تھی۔ کارل نے آہستہ سے کہا۔ ''میرے خدا یہاں کیا ہوا ہے؟''

یہ وہی مناؤز کینی بال تھے جو ایک دن پہلے چاؤش قبیلے پر حملہ آور تھے اور ان کے مردوں کو مار کر کھا رہے تھے۔ ان کی عورتوں کو قیدی بنا لیا تھا لیکن یہاں ان کا رویّہ بالکل مختلف تھا۔ وہ افسردہ اور شکست خوردہ لگ رہے تھے۔ ایک طرف میدان میں لکڑی کے ساتھ ایک درجن کے قریب ڈھانچے بندھے تھے۔ ان کے ہتھیار اور لکڑی سے بندھی ان کی ذاتی اشیا بتا رہی تھیں کہ وہ جنگجو تھے۔ کارل ان کی طرف بڑھا تو ایک معمر قبائلی آگے آیا اور ڈھانچوں کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہنے لگا۔ ریتا نے پوچھا۔ ''یہ کیا کہہ رہا ہے؟''

کارل غور سے سن رہا تھا۔ ''یہ کہہ رہا ہے کہ مناؤز کے عظیم جنگجو تھے جواب نہیں رہے تھے۔ ان کا قبیلہ مر رہا ہے۔''

''کیا ان پر کسی دوسرے قبیلے نے حملہ کیا تھا؟''

''شاید۔'' کارل نے کہا اور پھر چونکا کیونکہ ایک طرف سے جینون، شان اور ان کا قیدی نمودار ہوئے تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر تیزی سے ان کی طرف آئے۔ شان کارل سے لپٹ گیا اور جینون نے گرم جوشی سے ریتا سے ہاتھ ملایا۔

''شکر ہے تم زندہ ہو ورنہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم بھی ماری گئی ہو۔''

کارل نے پوچھا۔ ''تم لوگ کہاں چلے گئے تھے؟''

''ہم تیزی سے آگے بڑھے تھے۔'' شان نے بتایا۔ ''مجھے بہت دیر بعد خیال آیا کہ تم پیچھے نہیں ہو۔''

''ہم راستہ بھٹک گئے تھے۔ کین ہمارے پاس آ گئے تھے مگر دریا نے ہمیں بچا لیا وہ اس کے پار نہیں آئے۔''

''دریا سے مناؤز کی حد شروع ہو جاتی ہے۔'' جینون نے کہا۔ ''ہم بہت پہلے آ گئے تھے مگر چھپے ہوئے تھے تمہیں دیکھا تو سامنے آ گئے۔''

مرید

ایک مسجد میں دو آدمی بیٹھے تھے۔

پہلا۔ ''تم کس کے مرید ہو؟''

دوسرا۔ ''میں اپنے مرشد کا نام ایسے نہیں بتاؤں گا پہلے وضو کر آؤں۔'' اس نے وضو کیا، دو رکعت نماز پڑھی۔

سب انتظار کر رہے تھے کہ لوگوں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے اور اس نے انتہائی عقیدت اور احترام سے گردن جھکائی اور بولا۔

''میں ''زن مرید'' ہوں کستوری لگا کے......''

مرسلہ۔ رضوان تنولی کریڑوی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

اپنے آدمی کو قید میں دیکھ کر مناؤز چاروں طرف سے جمع ہونے لگے تھے مگر ان کا رویّہ جارحانہ نہیں تھا۔ کارل نے آہستہ سے کہا۔ ''ان کے ساتھ کچھ برا ہوا ہے۔ یہ جلی ہوئی جھونپڑیاں اور یہ ڈھانچے دیکھ رہے ہو۔''

''ان کی عورتیں ماری گئی ہیں۔'' شان بولا۔

جینون نے سر ہلایا۔ ''شاید اسی لیے انہوں نے چاؤش پر حملہ کیا تھا کہ ان سے عورتیں حاصل کرنا چاہتے تھے تاکہ اپنی نسل برقرار رکھ سکیں۔ مگر وہاں بھی انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔''

''میرا خیال ہے اس قیدی کو آزاد کر دینا چاہیے۔'' کارل نے کہا۔ ''اس سے ان پر اچھا اثر پڑے گا۔''

''میرا خیال ہے اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' ریتا بولی۔ ''اب ہم مسلح ہیں۔''

''صرف مسلح ہونا کافی نہیں ہے۔ اگر یہ ہمارے خلاف ہو گئے تو ہم ایک گھنٹا بھی اپنا دفاع نہیں کر سکیں گے۔ فی الحال یہ جارحانہ موڈ میں نہیں ہیں۔'' کارل نے کہا۔ ''شان اس کی رسی کھول دو۔''

شان نے قیدی کی رسی کھول دی اور اس سے کہا۔ ''اب تم آزاد ہو۔''

قیدی نے بے یقینی سے شان کی طرف دیکھا اور پھر بھاگتا ہوا اپنے ساتھیوں کی طرف چلا گیا۔ انہوں نے اسے گھیر لیا تھا۔ اس بھاگ دوڑ نے انہیں تھکا دیا تھا اور وہ بھوکے بھی تھے۔ ان کے پاس کھانے پینے کا سامان تھا۔ ریتا نے کہا۔ ''پلیز یہاں سے چلو مجھے یہ سب دیکھ کر وحشت

ہو رہی ہے۔"

"وہ جگہ مناسب رہے گی۔" بینون نے ایک تالاب کے کنارے بنے چھپر کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اس تک آئے اور اس کے نیچے ڈیرا جمالیا۔ رات قریب تھی۔ بینون فکرمند تھا اس نے کہا۔ "کہیں یہ رات کو خاموشی سے ہم پر حملہ نہ کریں۔"

"نہیں، یہ دھوکے بازی سے ناآشنا ہیں۔ اگر انہوں نے دشمنی کرنا ہوتی تو دن میں کر لیتے۔" کارل نے کہا۔ وہ سب چھپر تلے بچھی گھاس پر ڈھیر ہو گئے تھے۔ سب سے برا حال رینا کا تھا۔ اس نے تھوڑا بہت کھایا اور پھر بےسدھ ہو کر سو گئی۔ وہ سب باری باری جاگتے اور سوتے رہے۔ رات سکون سے گزری اور بینون کے خدشے کے خلاف قبیلے والوں نے ان پر حملہ نہیں کیا۔ صبح کی روشنی نمودار ہوئی تو کارل جاگ رہا تھا۔ اس نے بینون کو جگایا اور خود تالاب تک آگیا۔ لباس اتار کر صرف نیکر میں وہ پانی میں گھس گیا۔ کچھ دیر بعد نصف درجن مقامی لڑکیوں کا ایک گروہ آیا اور پانی میں گھس گیا۔ وہ مکمل طور پر بےلباس تھیں اور بہت شوخ ہو رہی تھیں، انہوں نے کارل کو گھیر لیا اور اسے چھیڑنے لگیں۔ کارل ان کا رویہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ وہ شوخ ضرور ہو رہی تھیں مگر ان کے انداز میں جنسیت کے بجائے معصومیت تھی۔ پھر وہ کارل کو کھینچ کر پانی سے باہر لائیں اور ایک طرف لے جانے لگیں۔ بینون اور شان بھی ان کے پیچھے آئے ... بڑے سرکنڈوں کے پیچھے ایک بڑے درخت کے باقی رہ جانے والے تنے پر چار عدد ڈھانچے لکڑی کی کیلوں سے ٹھکے ہوئے تھے اور ان کے ساتھ بےشمار سامان بھی لٹک رہا تھا۔ کارل کو اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے کیونکہ سامان میں کیمرے، سفری بیگ، جوتے اور لباس نمایاں تھے۔

"یہ سب کیا ہے؟" بینون بولا۔ لڑکیاں اب درخت کے سامنے زمین پر گر کر بین کرنے والے انداز میں رو رہی تھیں اور اپنے سروں پر خاک ڈال رہی تھیں۔ کارل نے ٹھنڈی سانس لی۔

"میرا خیال ہے ہم جان اور اس کے ساتھیوں کا انجام دیکھ رہے ہیں۔"

رینا بھی پیچھے سے آ گئی تھی۔ وہ اسی وقت جاگ گئی تھی، جب لڑکیاں تالاب میں کارل کے ساتھ شوخیاں کر رہی تھیں۔ اسے یہ اچھا نہیں لگا تھا، اس لیے وہ سوتی بن گئی مگر جب وہ کارل کو اس طرف لانے لگیں تو وہ بےچین ہو کر ان کے پیچھے چلی آئی۔ چاروں ڈھانچے اپنی اصل حالت میں تھے اور ان کی کھال سکڑ کر ہڈیوں سے چپک گئی تھی مگر کہیں سے غائب نہیں تھی۔ گویا انہیں کھایا نہیں گیا تھا جب کہ میدان میں لکڑی سے بندھے ڈھانچوں سے گوشت غائب تھا۔ رینا نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا پھر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "ان وحشیوں نے انہیں مار دیا۔"

لڑکیاں جو سروں پر خاک ڈال رہی تھیں، اچانک اٹھ کر وہاں سے چلی گئیں۔ کارل آگے آیا اور اس نے مختلف جگہوں پر اٹکے کیمرے اور ان کی استعمال شدہ کیسٹس نکالیں۔ اس نے رینا سے کہا۔ "شاید ان سے پتا چلے کہ ان کو کس نے اور کیوں مارا؟"

کیمرے اور کیسٹس ٹھیک حالت میں تھے اور قبائلیوں نے انہیں توڑنے یا نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ مرنے والے دشمن کی چیز لینا بھی جائز نہیں سمجھتے تھے اور آدمی کی ہر چیز اس کی لاش کے ساتھ رکھ دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جان چارلس اور اس کے تینوں ساتھیوں کی تمام چیزیں صحیح سلامت حالت میں درخت پر ٹنگی ہوئی تھیں۔ وہ واپس چھپر تک آئے اور رینا نے اپنے ویڈیو کیمرے میں کیسٹ ڈال کر اسے چلایا۔ سب اسکرین کے آگے جھک گئے۔ یہ اولین کیسٹ تھی جس میں امریکا سے روانگی کی ویڈیو بھی موجود تھی اور اس کے آخری حصے میں وہ نی نے سے کینی بال کے علاقے کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔ اس کیسٹ کے کچھ حصے کارل رینا کے ٹیپ پر دیکھ چکا تھا کیونکہ یہ جان نے امریکا بھیجی تھی۔ یہ کیسٹ ختم ہوئی تو رینا نے کیمرے میں دوسری کیسٹ ڈالی۔

☆☆☆

"8 اکتوبر، کینی بال کا علاقہ۔" کرس کہہ رہا تھا۔ اسکرین پر جان اور میرن ساتھ ساتھ چل رہے تھے جب کہ ان سے آگے روجر لمبے تلوار نما چاقو سے راستے میں آنے والی شاخیں اور جڑیں کاٹتا ہوا چل رہا تھا۔ مگر اس کے انداز میں تفریح اور شوخی تھی۔ کرس نے ڈراؤنی آواز بنا کر کہا۔ "ہم خطرناک کینی بال کے علاقے میں داخل ہو گئے ہیں جو انسانوں کو کھا جاتے ہیں۔ مگر وہ ہمیں نہیں کھا سکیں گے ہمارے پاس ان کے لیے کچھ خاص ہے۔"

ویڈیو وقفے وقفے سے جاری تھی۔ دوپہر کے قریب وہ ایک نہر کے پاس پہنچے اور کپڑے اتار کر اس میں نہانے کے لیے گھس گئے۔ اب روجر ویڈیو بنا رہا تھا اور وہ خاص طور سے میرن کو نمایاں کر کے دکھا رہا تھا جس نے نہ ہونے کے برابر لباس پہنا ہوا تھا اور وہ اس فوٹوگرافی پر روجر کو برا

بھلا کہہ رہی تھی۔ جان ہنس رہا تھا۔ اچانک وہ چلایا اور پانی میں گھس گیا۔ ذرا دیر بعد وہ ایک درمیانے سائز کے کچھوے کو پکڑے برآمد ہوا جو خود کو آزاد کرانے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ جان نے چلا کر کرس سے کہا۔ "میری مدد کرو ورنہ یہ بھاگ جائے گا۔"

"اسے چھوڑ دو۔" میرن بولی۔

"نہیں آج ہم تازہ گوشت کھائیں گے۔" جان نے جواب دیا۔ وہ کرس کی مدد سے کچھوے کو پانی سے باہر لانے میں کامیاب رہا۔ اسے الٹا لٹا کر بےبس کر دیا اور پھر جان نے اپنا چاقو کچھوے کے سر میں اتار دیا۔ اس نے سر اندر کر لیا تھا مگر سر سوراخ سے نظر آ رہا تھا۔ کچھوا کچھ دیر پاؤں چلاتا رہا پھر اس نے دم توڑ دیا۔ انہوں نے آری کی مدد سے اس کے خول کو کاٹا اور اندر کا نرم گوشت اور اعضا کاٹ کاٹ کر الگ کرنے لگے ..... روجر بہت واضح انداز میں ویڈیو بنا رہا تھا۔ میرن سے یہ سب دیکھا نہیں جا رہا تھا، اس لیے وہ منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی مگر جب اگلی ویڈیو میں کچھوے کے حصے بھون کر کھاتے ہوئے دکھایا تو وہ بھی کھانے میں شامل تھی۔ وہ چاروں بہت خوش تھے۔ کارل نے کہا۔

"میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ انہوں نے مختلف کینی بال قبائل کے علاقے کیسے پار کیے۔ یہ نہر کینی بال کے وسطی علاقے کے پاس ہے جہاں انہوں نے کچھوا پکڑا۔"

دوسرے کلپس سے انہیں پتا چل گیا کہ انہوں نے مختلف قبائل کے علاقے کس طرح پار کیے۔ جب وہ کینن قبیلے کی حد میں داخل ہوئے تو انہوں نے کھانے پینے کی چیزیں اٹھا رکھی تھیں اور یہ چیزیں انہوں نے ایک کھلی جگہ پر رکھ دیں اور خود پیچھے ہو گئے۔ شام کے قریب جھاڑیوں سے کینن جنگجو برآمد ہوئے انہوں نے کھانے پینے کی چیزیں اٹھائیں اور واپس چلے گئے۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ انہوں نے راہداری کا نذرانہ وصول کر لیا تھا اور اس کے بعد ان چاروں نے سکون سے یہ علاقہ پار کر لیا۔ اس سے پہلے چاؤتش قبیلے کی حد میں بھی انہیں کوئی پریشانی پیش نہیں آئی بلکہ وہاں ان کی مہمان نوازی بھی کی گئی تھی۔ دوسرے انسانوں سے قربت کی وجہ سے چاؤتش اتنے وحشی نہیں رہے تھے۔ انہوں نے آدم خوری ترک کر دی تھی۔ مگر کینن، مناؤز اور دوسرے قبائل آدم خوری کرتے تھے۔ جان اور اس کی پارٹی نے کینن قبائل کا سامنا کیا ہی نہیں تھا اس لیے وہ ان سے ناواقف تھے۔

تیسری کیسٹ میں وہ مناؤز قبیلے کی حد میں داخل ہوئے اور تب انہوں نے خوفناک مناظر ریکارڈ کیے۔ پہلا منظر صبح سویرے کا تھا جب ایک جھیل میں ایک مقامی شخص اکیلا کشتی چلاتا ہوا اس کنارے تک آیا جہاں انہوں نے پڑاؤ ڈالا ہوا تھا۔ اس نے کشتی سے کھینچ کر ایک بندھی ہوئی عورت کو نیچے اتارا اور اسے بےدردی سے بالوں سے کھینچتا ہوا کنارے پر لایا۔ اس نے عورت کے چلانے اور کراہنے کی پروا کیے بغیر اسے نیچے گرایا اور زبردستی پچھاڑ کر اس کے پاؤں کھولے اور ایک نکیلے پتھر سے اس کے پیٹ پر وار کرنے لگا۔ عورت دردناک آوازیں نکال رہی تھی۔ ویڈیو کرس بنا رہا تھا اور میرن کی آواز آ رہی تھی۔ "اسے روکو یہ اسے مار دے گا۔"

"میرن شٹ اپ۔" جان کی آواز آئی۔ "یہ نہایت نایاب منظر ہے جو ہم ریکارڈ کر رہے ہیں۔"

"اس کی تو دھوم مچ جائے گی۔" روجر جوش سے بولا۔

"تم لوگوں کو اس عورت کی پروا نہیں ہے جسے یہ وحشی قتل کر رہا ہے۔"

"ممکن ہے یہ اس کی بےوفا بیوی ہو۔" جان نے بےپروائی سے کہا۔ "اس صورت میں اسے حق ہے۔"

عورت اب شدید زخمی حالت میں نیم بےہوش تھی۔ مرد کشتی کی طرف گیا اور وہاں سے ایک تھیلی لے کر آیا اور اس میں سے ریت جیسی کوئی چیز نکال کر عورت کے چاروں طرف ڈالنے اور اپنی زبان میں کچھ کہنے لگا۔ پھر اس نے ایک دھار والا پتھر اٹھایا اور عورت کے سر کے پاس بیٹھ کر اسے بار بار اس کے سر پر مارنے لگا۔ یہ بہت خوفناک اور حقیقی منظر تھا۔ ذرا سی دیر میں عورت ختم ہو گئی اور مرد کشتی میں بیٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ کلپ ختم ہوا تو کارل نے کہا۔ "مرد اور عورت دونوں مناؤز تھے اور جان نے ٹھیک کہا، یہ اس کی بےوفا بیوی تھی کیونکہ وہ دیوتاؤں سے اس کے گناہ کو معاف کرنے کا کہہ رہا تھا۔"

"پھر بھی اسے اتنی بےدردی سے قتل کر دیا۔" رینا نے کہا۔

"ان چاروں کے بارے میں کیا خیال ہے جو اس منظر کی ویڈیو بنا رہے تھے اور انہوں نے عورت کو بچانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔" کارل نے کہا۔ اس نے رکی ہوئی ویڈیو دوبارہ چلائی۔

اگلے کلپ میں ایک جگہ چار افراد بانس میں پروئے انسان کو بھوننے کی تیاری کر رہے تھے۔ اس کا سر، ہاتھ اور ٹانگیں الگ کر لی گئی تھیں۔ منظر اتنا خوفناک تھا کہ ان لوگوں

نے بمشکل اسے برداشت کیا۔ اس بار جان، کرس اور روجر جوش کے بجائے غصے میں تھے اور ان لوگوں کو گالیاں دے رہے تھے مگر انہوں نے سین کو شوٹ کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی تھی۔ آدم خوری کرنے والے مناؤز قبائل تھے جو کیمن قبیلے کے جنگجو کی لاش کھا رہے تھے۔ سین شوٹ کرنے کے بعد وہ چاروں ان سے کترا کر آگے بڑھے.... پھر وہ مناؤز کی بستی کے پاس پہنچ گئے۔ یہ صبح کا وقت تھا اور گیارہ اکتوبر کا دن تھا۔ گویا انہیں یہاں آئے ہوئے تیسرا دن تھا۔ ویڈیو روجر بنا رہا تھا اور جان اپنا بیگ کھول رہا تھا اس نے کہا۔ ”وقت آ گیا ہے کہ ہم ان آدم خوروں کے لیے ہتھیار نکالیں۔“

اس نے بیگ سے تین عدد جدید ایم سولہ رائفلیں نکالیں اور مہارت سے ان کے حصے جوڑے۔ اس نے میرن کو ایک چھوٹا پستول دیا تھا۔ ان کے پاس ایمونیشن بھی وافر مقدار میں تھا۔ جان اور کرس اپنی رائفلیں تانے ہوئے بستی میں داخل ہوئے تو وہاں کھلبلی سی مچ گئی۔ عورتیں اور بچے بھاگ کر جھونپڑیوں میں گھس گئے۔ وہاں مرد نظر نہیں آ رہے تھے۔ میرن نے بھی اپنا پستول نکالا ہوا تھا۔ روجر کمنٹری کر رہا تھا۔ ”یہ آدم خوروں کی بستی ہے اور ایسا لگ رہا ہے کہ یہاں کے مرد ہمیں دیکھ کر کہیں چھپ گئے ہیں۔“

”سب اس سے ڈرتے ہیں۔“ جان نے رائفل لہرا کر کہا۔

اچانک تالاب کے پاس والے جھونپڑے سے چند مسلح مرد نمودار ہوئے۔ ایک معمر جنگجو ان کی قیادت کر رہا تھا اور ان کے تیور جارحانہ تھے۔ انہوں نے اپنے نیزے آگے کر رکھے تھے۔ جان اور کرس ان کی طرف بڑھے۔ وہ چیخ چیخ کر ان سے کہہ رہے تھے۔ ”اپنے ہتھیار پھینک دو۔ ورنہ ہم سب کو قتل کر دیں گے۔“

کارل نے معمر شخص کو پہچان لیا۔ یہ وہی شخص تھا جو لکڑی سے بندھے ڈھانچوں کے آگے ماتم کر رہا تھا۔ وہ اس وقت بھی اپنے آدمیوں سے کچھ کہہ رہا تھا اور جوش میں بار بار زمین پر پاؤں مار رہا تھا۔ اچانک ایک لڑکا ان کی طرف لپکا اور جان نے فائر کھول دیا۔ لڑکے کا سینہ چھلنی ہو گیا اور گولیاں اس کے وجود سے گزر کر پیچھے موجود دو اور افراد کو لگی تھیں۔ میرن چیخ چیخ کر فائرنگ روکنے کو کہہ رہی تھی مگر جان اور کرس پر جیسے جنون طاری ہو گیا تھا۔ جان کے بعد کرس نے بھی فائرنگ شروع کر دی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے درجن کے قریب افراد خاک و خون میں لوٹنے لگے۔ معمر شخص غائب تھا۔ جان اور کرس نے فائرنگ روک دی اور پھر وہ اس جھونپڑے کی طرف بڑھے تو اس سے کئی مرد نکل کر بھاگے۔ مگر ان کی تعداد نصف درجن سے زیادہ نہیں تھی۔ جان اور کرس نے انہیں جانے دیا۔ وہ جھونپڑوں میں دیکھ رہے تھے مگر تمام جھونپڑوں میں عورتیں اور بچے تھے۔ ان میں نوجوان لڑکیاں نہیں تھیں۔ جان پلٹ کر آیا اور اس نے تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ کیمرے کی طرف رخ کر کے کہا۔

”اب ان لوگوں کے ساتھ وہ کریں گے کہ یہ آدم خوری بھول جائیں گے۔“

جان اور کرس دوسری جھونپڑیوں سے عورتوں اور بچوں کو ہانک کر دو بڑی جھونپڑیوں میں جمع کرنے لگے۔ وہ انہیں رائفلوں سے دھمکا رہے تھے اور ان کی ڈری ڈری آوازوں سے محظوظ ہو رہے تھے۔ میرن ان سے بار بار پوچھ رہی تھی کہ وہ کیا کرنے جا رہے ہیں؟ مگر جان اور کرس اپنے کام میں لگے رہے.... انہوں نے کوئی دو سو عورتوں اور بچوں کو ان دو جھونپڑوں میں دھکیل دیا اور پھر نزدیک جلنے والے الاؤ سے لکڑیاں لا کر ان کو آگ دکھانے لگے۔ جھونپڑے مکمل طور پر لکڑی اور گھاس سے بنے تھے اور انہیں آگ پکڑنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ چند منٹ میں دونوں جھونپڑے مکمل طور پر آگ کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ کرس، جان اور روجر ان کے گرد گھوم رہے تھے کہ کوئی ان سے نکلنے نہ پائے۔ ساتھ ہی روجر ویڈیو بھی بنا رہا تھا۔ ان کی کوشش تھی کہ کوئی جھونپڑوں سے نہ نکل سکے اس کے باوجود کچھ عورتیں اور بچے نکل بھاگے تھے۔ جو عورتیں اور بچے دوسرے جھونپڑوں میں تھے وہ پہلے ہی بھاگ نکلے تھے۔ کیمرا کرس نے سنبھال لیا۔ جان نے کہا۔

”اب ہم شکار کریں گے۔“

”ان جانوروں کا پیچھا کر کے۔“ کرس نے رائفل لہرائی۔ انہوں نے فتح کا جشن منانے کے لیے وہسکی کی بوتل کھول لی تھی۔ پھر وہ ایک طرف موجود گھاس کے میدان میں آئے اور یہاں انہوں نے ایک نوجوان لڑکی کو تلاش کر لیا۔ اس کے بعد جو منظر دیکھنے میں آیا اس نے رینا اور ان سب کو اسکرین سے آنکھیں چرانے پر مجبور کر دیا۔ وہ دیکھ نہیں رہے تھے مگر اس مظلوم لڑکی کی چیخیں سن رہے تھے۔ میرن انہیں روک رہی تھی مگر وہ تینوں ہی جانور بن چکے تھے۔ انہوں نے میرن کو بھی مارا اور اسے دھمکی دی کہ وہ خاموش ہو کر نہیں بیٹھی تو اس کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوگا۔

وہ انہیں برا بھلا کہہ رہی تھی۔ لڑکی کے ساتھ زیادتی کے بعد وہ اسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے بستی میں لائے اور اسے ایک درخت سے باندھ دیا۔ جھونپڑوں میں لگی آگ تقریباً بجھ گئی تھی اور روجر اندر جل جانے والی لاشوں کی ویڈیو بنا رہا تھا۔ جان نے رائفل لہرا کر کہا۔

”ہم نے وحشیوں کا ایک قبیلہ ختم کر دیا ہے۔“

”تم ان لوگوں کو اچھے اور مہذب انسان قرار دے رہی تھیں۔“ کارل نے تلخی سے کہا۔

”میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ ایسے نکلیں گے۔“ رینا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ آگے ویڈیو دیکھنے لگے۔ اگلے کلپ میں وہ تاریکی میں کسی گھنے جنگل میں تھے اور ان کے انداز میں خوف اور گھبراہٹ تھی۔ جان انہیں تسلی دے رہا تھا۔ ”فکر مت کرو اگر وہ ہمارا پیچھا کر رہے ہیں تو ہم ان سے نمٹ سکتے ہیں۔“

”وہ کہیں سے بھی آ سکتے ہیں۔“ روجر کہہ رہا تھا۔ ”میں نے خود کم سے کم تین افراد کو دیکھا ہے۔“

”ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“ میرن رو دینے والے انداز میں کہہ رہی تھی۔ ”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ تم لوگوں نے بہت برا کیا ہے۔“

”ہم نے ان آدم خوروں کے ساتھ بالکل ٹھیک کیا ہے۔“ کرس نے اسے جھڑک دیا۔

جان اور روجر کسی طرف چلے گئے تھے۔ کرس ویڈیو بنا رہا تھا۔ اچانک انہیں جان اور روجر کے چلّانے کی آواز آئی۔ ایسا لگ رہا تھا وہ کئی افراد سے لڑ رہے ہیں۔ میرن اور کرس اس طرف بھاگے اور جب وہ وہاں پہنچے جہاں جان اور کرس تھے تو زمین پر جگہ جگہ خون پڑا تھا اور وہ غائب تھے۔ میرن اور کرس خوف زدہ ہو گئے۔ میرن نے پھر بھاگ چلنے کو کہا مگر کرس نے صبح کی روشنی کا انتظار کرنے کو کہا۔ ”رات میں ہم راستہ بھٹک سکتے ہیں۔“

صبح ہوئی تو کرس کیمرا سرہانے رکھے رکھے شاید سو گیا تھا۔ اچانک اسے کسی نے پکڑ کر کھینچا تو کیمرا وہیں رہ گیا اور اس سے سامنے کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ درجن بھر مناؤز جنگجوؤں نے کرس کو نیچے گرا رکھا تھا اور اسے نیزوں سے چوکے لگا رہے تھے۔ وہ اسے اذیت دے رہے تھے ورنہ اسے ختم کرنا کون سا مشکل کام تھا۔ وہ بہت دیر تک اسے اسی طرح اذیت دیتے رہے۔ عقب میں میرن ایک درخت سے بندھی ہوئی تھی۔ جب انہوں نے کرس کو ختم کر لیا تو مرد پیچھے ہٹ گئے اور پھر عورتیں آئیں، انہوں نے میرن کو درخت سے کھول کر چاروں طرف سے جکڑ لیا اور اس کا لباس نوچنے لگیں، وہ جان کر اسے ناخن مار رہی تھیں۔ میرن چلا رہی تھی اور خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ انہوں نے اسے زمین پر لٹا دیا۔ کچھ دیر بعد اس کے ساتھ وہی سلوک ہونے لگا جو جان، کرس اور روجر نے ان کے قبیلے کی لڑکی کے ساتھ کیا تھا۔ یہ منظر ان سے دیکھا نہیں گیا اور کارل نے کیمرا آف کر دیا۔ اس نے گہری سانس لی۔ اس نے رینا کی طرف دیکھا۔

”تو تمہیں پتا چل گیا کہ ان لوگوں نے کیا کیا اور پھر ان کے ساتھ کیا ہوا؟“

رینا نے سر ہلایا، وہ اس سے نظریں ملانے سے گریز کر رہی تھی۔ اس نے تینوں کیسٹس اپنے بیگ میں رکھ لیں۔ ان چاروں کا سامان اور لاشیں لے جانا آسان کام نہیں تھا مگر بیٹون نے اسے آسان کر دیا۔ اس نے رینا کے سیٹلائٹ فون سے کال کی اور ایک گھنٹے بعد برازیلی فوج کا ایک ٹرانسپورٹر ہیلی کاپٹر وہاں آ گیا۔ اس کے ساتھ آنے والے پیرامیڈک نے جان، کرس، روجر اور میرن کی ڈھانچا ہو جانے والی لاشیں مخصوص پلاسٹک بیگز میں بند کیں اور ان کا سامان بھی ساتھ لے لیا پھر وہ سب اسی ہیلی کاپٹر میں وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ہیلی کاپٹر نے انہیں براہ راست ٹی فے پہنچا دیا تھا۔ راستے میں انہیں علم ہوا کہ کیپٹن مولیرو کے پانچ آدمی حملے میں مارے گئے تھے اور وہ خود زخمی ہوا تھا مگر اس کی جان بچ گئی تھی۔ کشتی واپس ٹی فے کی طرف روانہ ہو گئی تھی۔ دو دن بعد وہ مناؤس میں تھے جہاں ایک امریکی جیٹ رینا اس کے آدمیوں اور لاشوں کو لے جانے کے لیے آیا تھا۔ رینا کے دونوں ساتھی رچرڈ اور مائل جو سپاہیوں کے ہمراہ تھے وہ بھی بچ گئے تھے۔ کارل ائرپورٹ تک آیا تھا اس نے رینا سے کہا۔

”ان ویڈیوز کو عوام کے سامنے پیش کیا جائے گا؟“

”اس کا فیصلہ حکام کریں گے۔“ رینا نے آہستہ سے کہا تو کارل مسکرایا۔

”شرط لگا لو یہ کبھی منظر عام پر نہیں آئیں گی۔“

”میں شرط نہیں لگاؤں گی اس لیے کہ ہار جاؤں گی۔“ رینا نے کہا پھر آہستہ سے بولی۔ ”کیا تم واپس نہیں آ سکتے؟“

”میں فیصلہ کر کے واپس نہیں لیتا۔“

رینا نے ٹھنڈی سانس لی اور سر ہلا کر طیارے کی طرف بڑھ گئی۔

ستاروں پر کمند

آخری قسط

طاہر جاوید مغل

اصول اور انقلاب... ہمیشہ دو مختلف طبقات کے درمیان عمل اور ردِّعمل کی ایسی کُھلی جنگ کا نام جو طاقتور اور کمزور کے درمیان ازل سے جاری ہے۔ چاہتوں کو در و بام میں قید کرنے والے بھول جاتے ہیں کہ انہونیاں بھی کبھی کبھی ہو جاتی ہیں... کیونکہ روزن کو کریدنے والے اپنے حوصلے سے اسے دہانہ بنا دیتے ہیں... وہ بھی عجیب ذہنی نظام اور مزاج کا شکار تھا جیسے کیکر اور ٹاہلی کے گھنے درختوں کے جُھنڈ میں کئی جگہ اونچے سرکنڈے بھی ہوتے ہیں ایسے ہی وہ بھی سر اٹھا کر جینے کی خواہش میں اپنی جڑیں زمین میں اتارنے کی کوشش میں مصروف تھا کہ اچانک اس کے بچپن کی دیوار سے ایک کھلونا گر کر ٹوٹ گیا لیکن... اس کی امیدوں کے دیے تیز ہواؤں کے سرکش جھونکے بھی نہ بجھا سکے... دوسری جانب اس کی چاہت تھی جو سود و زیاں کی حد کھینچے بیٹھی فاصلوں کو سمٹنے ہی نہیں دے رہی تھی لیکن وہ جو ایک پل کی رفاقت میں قید تھا... ان گنت اندیشوں کے باوجود اسے انہونیوں کی امید تھی اگرچہ برسوں سے اس کے آنگن میں دشت کی ویرانی تھی لیکن دل کی گلیوں میں وہی جل تھل موسم کی کسک لیے وہ ایسی مسافت کے لیے رختِ سفر باندھ بیٹھا تھا جس میں اس کے پاس حوصلوں اور عزمِ مصممّ کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ جو خوش گمانیوں میں آکر ستاروں پر کمند ڈال چکا تھا... جس کے پیر تو زمین میں دھنسے تھے مگر... آنکھیں آسمانوں کی بلندیوں میں گم تھیں ایسے میں لگنے والی ہر ٹھوکر اسے ایک نئے رمز... اور ہر دکھ اسے ایک نئی لذت سے آشنا کر رہے تھے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ستارے فلک سے زمین کی طرف نہیں آتے مگر... کمند تو زمین سے فلک کی جانب جاسکتی ہے۔ لہٰذا دور بہت دور اس کے مقدر کا ستارہ بھی اسے روشنی دکھا رہا تھا۔

رقیبوں کی زہریلی چالوں...... پیار کی مدھر تانوں اور بدلتی رُتوں کا

رومان انگیز طویل سلسلہ

عادل کی برتری اب تین فٹ سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی۔ لیو پڈ یہ برتری کسی بھی وقت ختم کر سکتا تھا۔ بیس پچیس فٹ کی چڑھائی اب بھی باقی تھی۔ عادل نے اپنی رہی سہی طاقت جمع کی اور یہ آخری بیس پچیس فٹ طے کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا...... اور پھر وہ سنہری موقع آیا جب اس نے اپنے ہاتھوں سے نوبل راک کے بالائی کنارے کو چھوا۔ اوپر کھڑے ”ریفریز“ نے سرخ جھنڈی بلند کر کے اور سیٹی بجا کر عادل کی فتح کا اعلان کیا...... عادل بہ مشکل دو فٹ کے مارجن سے یہ مقابلہ جیت چکا تھا۔

وہ راک کے اوپر پہنچا اور قریباً چکرا کر اوندھے منہ گر گیا۔ چٹان پر موجود افراد اس کی طرف لپکے۔ ان کے پاس چھوٹے آکسیجن سلینڈر اور ماسک وغیرہ موجود تھے۔ انہوں نے ایک ماسک عادل کے منہ پر چڑھا دیا۔

☆☆☆

یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔ اس کامیابی نے جہاں برطانیہ کے گوروں کو ہلا کر رکھ دیا، وہاں عادل اور اس کے ساتھیوں کا جوش و خروش بھی دیکھنے کے قابل کر دیا۔ قریباً ایک گھنٹے بعد جب عادل نیچے پہنچا تو ہمایوں اور چند مقامی پورٹرز نے اسے کندھوں پر اٹھا لیا۔ تالیوں کی گونج اور نعروں کے شور سے قرب و جوار گونج اٹھے۔ سنا ترا برادری کے بہت سے افراد بھی چار و ناچار عادل کی کامیابی پر خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ سرمد صاحب کے چہرے پر فتح کی چمک دیکھ کر عادل کا خون سیروں بڑھ گیا۔ یہ بات بھی عادل کے لیے بہت حوصلہ افزا تھی کہ تایا فراست کے ساتھ آئے ہوئے کئی افراد بھی اس موقع پر خوش دکھائی دے رہے تھے۔ یہ سب عادل کے جانے پہچانے چہرے تھے...... اس کے ہم وطن...... اس کے گاؤں کے لوگ، جن کے ساتھ وہ کھیلا کودا تھا اور جن کے درمیان وہ پروان چڑھا تھا۔

ہمایوں نے اسے کندھوں سے اتارا تو کرسٹل دوڑ کر آئی اور اس کے گلے سے لگ گئی۔ اس کا چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔ اس کے عقب میں عادل کو کرسٹل کے والد اور سوتیلی والدہ کی جھلک نظر آئی۔ ان کے منہ پھولے ہوئے تھے اور کدورت چھپائے نہیں چھپتی تھی۔ کسی نے عادل کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور اس کے سینے میں جیسے ان گنت شگوفے کھل اٹھے۔ تایا فراست اس کے سامنے تھے۔

”مبارک عادے پتر۔“ انہوں نے لرزتی آواز میں کہا اور عادل کو گلے سے لگا لیا۔

”آپ کو بھی مبارک تایا جی۔“ عادل نے کہا اور اس کی آنکھوں میں نمی آگئی۔

بہت سے کیمرے دھڑا دھڑ عادل کی تصویریں کھینچ رہے تھے۔ اس کے گرد مقامی اور غیر مقامی لوگوں کا ہجوم تھا۔ برٹش لڑکیاں عادل کو قریب سے دیکھنے کے لیے امڈی پڑ رہی تھیں لیکن جسے وہ دیکھنا چاہ رہا تھا، وہ کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ وہ یقیناً یہاں موجود تھی۔ شاید اپنے ٹینٹ کے روزن میں سے اسے دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی شہزادی...... اس کی منزل...... اس کی زندگی۔

لارڈ اوٹس لوگوں میں سے راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھے۔ لوگ انہیں راستہ دینے کے لیے دائیں بائیں چھٹ گئے۔ انہوں نے عادل کی پیٹھ تھپکی اور مسٹر سرمد سے انگلش میں بولے۔ ”ویل ڈن مسٹر سرمد! آپ کے کھلاڑی نے کمال کر دیا۔ یقیناً اس میں عادل کی خداداد صلاحیت کے ساتھ آپ کی محنت اور لگن کا بھی حصہ ہے۔ میں آپ دونوں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔“

”آپ کی عزت افزائی کا بے حد شکریہ۔“ مسٹر سرمد نے کہا۔

وہ مسکرائے۔ ”اب اس خراجِ تحسین کو ایک عملی شکل دینے کا وقت بھی آگیا ہے۔ آپ لوگ اپنے استقبال سے فارغ ہو کر میرے ٹینٹ میں تشریف لے آئیے۔ وہاں پرائز سیرمنی کا انتظام ہے۔“

وہ بڑی دلنواز شام تھی۔ خوشگوار...... حوصلہ بخش اور فتح مندی کے احساس میں ڈوبی ہوئی۔ سرسرمد کا کہا سچ ثابت ہوا تھا۔ آج عادل کو وہ دفینہ مل گیا تھا جس کا وعدہ انہوں نے اس سے کیا تھا۔ وہ سب تکلیفیں اور مشقتیں آج بار آور ثابت ہوئی تھیں جن کا سامنا عادل نے پچھلے چند مہینوں میں کیا تھا۔ بے شک اس کے جسم میں اذیتوں کے بے شمار کانٹے ٹوٹے تھے لیکن آج وہ کانٹے نکال لیے گئے تھے اور اس کے جسم کو محبت کے گلابوں کا مرہم مل رہا تھا اور محبت کے ان گلابوں میں اہم ترین گلاب شہزادی کی محبت کا تھا...... ہاں یہ ”کایا کلپ“ شام تھی۔ بہت سرد ہونے کے باوجود روح کو گرما رہی تھی، سرشار کر رہی تھی۔

دو تین گھنٹوں کے اندر اندر عادل ایک کروڑ پتی شخص بن گیا تھا۔ ہاں...... آج ان برف پوش چوٹیوں نے اپنے اندر چھپا ہوا دفینہ اس کے حوالے کر دیا تھا۔ جب خوشیوں کی یلغار ہو تو جسمانی تکلیفیں اس کے اندر دب جاتی ہیں۔ عادل بھی تقریباً بھول چکا تھا کہ مقابلہ شروع ہونے سے پہلے اور

مقابلے کے دوران میں اس کی حالت کس قدر خراب ہوئی ہے۔ اب وہ خود کو بالکل بھلا چنگا محسوس کرنے لگا تھا۔ اس سب کے باوجود اس نے کھانے پینے میں بہت احتیاط سے کام لیا۔ وہ جانتا تھا کہ فوڈ پوائزننگ کی حقیقت کیا تھی؟ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا، لیو پڈ اور اس کے ساتھیوں کا کیا دھرا تھا پھر بھی وہ اب سارے گلے شکوے بھلا کر لیو پڈ کو گلے سے لگانا چاہتا تھا لیکن لیو پڈ اسے اپنے آس پاس کہیں نظر نہیں آیا۔ شاید کہیں غم غلط کر رہا تھا۔

کھانے کے بعد عادل نے سرمد صاحب سے اجازت لی اور تایا فراست کے ٹینٹ کی طرف چل دیا۔ وہ تایا فراست سے اکیلے میں ملنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے ہمایوں سے کہا تھا کہ وہ قاسم کو کچھ دیر کے لیے دوسرے ٹینٹ میں بھیج دے۔ قاسم کے ہاتھ اب کھولے جا چکے تھے...... اور وہ کسی طرح کی مزاحمت یا ناراضگی ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ پھر بھی ہمایوں نے احتیاطاً ایک گن مین اس کے ارد گرد رکھا ہوا تھا۔ ایک ایسا ہی گن مین دراز قد ناصر کے آس پاس بھی موجود رہتا تھا۔

عادل تایا فراست والے ٹینٹ میں پہنچا تو وہ نماز پڑھ کر جائے نماز تہ کر رہے تھے۔ دو چار دن میں ہی وہ بہت بدلے ہوئے نظر آنے لگے تھے۔ عادل کو دیکھ کر وہ آگے بڑھے اور عادل کو گلے لگا لیا۔

عادل نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ”تایا جی...... آپ کی دعاؤں سے، میں نے آپ سے کیا ہوا وعدہ پورا کر دیا ہے۔“

وہ سسک پڑے۔ ”مجھے یقین تھا عادے پتر! تو جو کچھ بھی ہے لیکن تیرے اندر ہمت ہے...... تو لڑنا جانتا ہے۔ تو بچہ نہ کچھ ضرور کرے گا۔ میں قاسو اور عاصم سے بھی یہی گل کہتا تھا......“

”میں تو کچھ بھی نہیں ہوں تایا جی! بس قدرت نے میری مدد کی ہے۔“

تایا فراست نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسے ایک بار پھر گلے سے لگا کر رونے لگے لیکن اس بار وہ سسکیوں کے بجائے ہچکیوں سے رو رہے تھے۔ عادل بھی اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا۔ وہ کتنی ہی دیر اسی طرح کھڑے رہے۔ پھر عادل نے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے اپنی جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ڈھائی ڈھائی لاکھ پاؤنڈ کے وہ دو ”پے آرڈرز“ تایا فراست کی طرف بڑھا دیے جو اسے پرائز سیرمنی میں پیش کیے گئے تھے۔

”یہ کیا عادے پتر؟“ تایا فراست نے کہا۔

”یہ انعام کی رقم ہے تایا جی! آپ میرے بڑے ہیں، اسے اپنے پاس رکھیں۔ آپ جس طرح چاہیں گے، میں اسے خرچ کروں گا۔“

”نہیں عادے...... یہ...... تمہاری کمائی ہے۔ تم اسے اپنے پاس رکھو۔“

”تایا جی! آپ جانتے ہی ہیں، میں روپے پیسے کے معاملے میں بالکل نکما ہوں۔ یہ آپ کے پاس ہوں گے تو مجھے تسلی رہے گی۔“

”نہیں عادے پتر......“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ”جو بندہ پیسے کما سکتا ہے، وہ انہیں سنبھال بھی سکتا ہے۔ یہ تمہارے پاس رہیں گے اور مجھے یقین ہے کہ تم انہیں خرچ بھی چنگے طریقے سے کرو گے۔“

اسی دوران میں انور بھی خیمے میں آگیا۔ وہاں عادل کو دیکھ کر اس نے جلدی سے واپس جانا چاہا لیکن پھر تایا فراست کے اشارے پر رک گیا۔ تایا فراست نے کہا۔ ”انورے! تمہاری طرف سے عادل کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے۔ تم کو عادل سے معافی مانگنی چاہیے۔“

انور نے اپنا زخمی بازو گلے سے لٹکا رکھا تھا۔ بازو پر کندھے سے کلائی تک پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔ انور اندر آیا اور گلوگیر آواز میں بولا۔ ”عادل بھائی! میں نے واقعی تمہارے ساتھ چنگا نہیں کیا۔ میں نے پنڈ میں جھوٹ بولا کہ تم مجھے زبردستی احاطے کے دروازے پر لے کر گئے تھے۔ یہ سب...... یہ سب......“ وہ کہتے کہتے اٹک گیا۔ پھر ہمت کر کے بولا۔ ”یہ سب ناصر چودھری نے مجھ سے کہا تھا۔ وہ بہت تگڑا بندہ ہے۔ اگر میں اس کی گل نہ مانتا تو وہ میرے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ مجھ کو معافی دے دو عادے بھائی۔“ وہ ایک دم آگے بڑھ کر عادل کے قدموں میں گر پڑا۔

عادل نے فوراً اسے اٹھایا...... اور تسلی دی۔

سب کچھ تبدیل ہو رہا تھا۔ جو لوگ دو دن پہلے تک اسے نفرت اور کدورت کی نظروں سے دیکھ رہے تھے، وہ اب اسے کندھوں پر اٹھانے کے لیے تیار تھے۔ وہ برطانوی شہریوں کو فخر سے بتا رہے تھے کہ وہ عادل کے گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ برطانوی تماشائیوں میں کچھ صحافی بھی موجود تھے۔ وہ عادل کا انٹرویو لینے کے لیے بے تاب تھے۔ ان میں ایک لڑکی بھی تھی۔ وہ عادل کو لے کر اپنے ٹینٹ میں جانا چاہتی تھی اور وہاں اس کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کرنے کی خواہش مند تھی۔ سرمد صاحب نے بھی اس کی

سفارش کی اور عادل، سرمد صاحب کی بات رد نہ کرسکا لیکن جب وہ اس خاتون صحافی کے خیمے میں پہنچا تو ششدر رہ گیا۔ وہاں شہزادی پہلے سے موجود تھی۔ شہزادی تھوڑی گھبرائی ہوئی تھی۔ بہرحال اس نے عادل کو دیکھ کر سلام کیا اور ہولے سے مسکرائی۔

عادل نے پلٹ کر دیکھا۔ نوجوان خاتون صحافی بھی مسکرا رہی تھی۔ ”یہ کیا ہے؟“ عادل نے خاتون صحافی سے پوچھا۔

اس نے انگلش میں جو جواب دیا، اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے انٹرویو کے دوران میں شہزادی کی موجودگی اچھی لگے گی اور وہ یہ بات اچھی طرح جانتی ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور عادل کی اس عظیم کامیابی کے بعد ان دونوں کی شادی کے قوی امکان بھی موجود ہیں۔

”یہ کیا کہہ رہی ہے؟“ شہزادی نے عادل سے پوچھا۔

عادل بھی ہولے سے مسکرایا۔ ”بڑی اچھی اچھی باتیں کررہی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ شاید ہم دونوں بہت جلد ایک ہونے والے ہیں۔“

شہزادی کے چہرے پر شفق کے رنگ بکھر گئے۔ اسی دوران میں نوجوان صحافی خاتون بولی۔ ”او گاڈ! مائی آڈیو سسٹم۔“

وہ آڈیو سسٹم کا بہانہ کرکے جلدی سے باہر نکل گئی۔ یقیناً وہ عادل اور شہزادی کو موقع دینا چاہتی تھی کہ وہ دو چار منٹ اکیلے میں بات کرلیں۔

شہزادی کے دلکش چہرے پر گھبراہٹ نظر آنے لگی۔ پھر وہ تیزی سے اٹھی۔ ”عادل! مجھے اپنے خیمے میں جانا چاہیے۔“

وہ دروازے کی طرف بڑھی تو عادل نے ہمت کرکے اس کی کلائی تھام لی۔ کلائی کی چوڑیاں چھنکیں، وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ ”مجھے مبارک باد نہیں دوگی؟“ عادل نے جذباتی لہجے میں پوچھا۔

اس نے سر جھکایا اور سادگی سے بولی۔ ”نہیں۔“

”کیوں؟“ عادل نے پوچھا۔ شہزادی کی نازک کلائی ابھی تک اس کی گرفت میں تھی۔

”مبارک ہو لیکن......“

”لیکن کیا؟“ عادل نے پوچھا۔

”میرا دل بڑا بوجھل ہے عادل! بھائی عاصم اسپتال میں زخمی پڑا ہے اور پھر...... تمہارے ماموں طفیل۔ ان کا بہت دکھ ہے مجھے۔ کاش یہ سب نہ ہوا ہوتا۔“

”غم اور خوشی تو دھوپ چھاؤں کی طرح ہوتے ہیں۔“ عادل کا لہجہ بھی کچھ بوجھل ہوگیا۔

”لیکن...... لیکن پتا نہیں کیوں عادل...... مجھے لگتا ہے کہ ابھی ہمارے دکھ ختم نہیں ہوئے۔ بس وہم سا دل میں بیٹھا ہوا ہے۔ کہیں کچھ ہو نہ جائے۔“

”تم اتنا زیادہ سوچتی ہو کہ تمہارا دل ہر وقت غم کے گھیرے میں رہتا ہے۔ خوشی کے جو موقع آتے ہیں وہ بھی تمہارے غم کے بوجھ کے نیچے دب جاتے ہیں۔“

وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ ”ماموں طفیل کو کس نے مارا عادل؟ کیا اسی بدمعاش نے جو مجھے بھی گاؤں سے یہاں لے کر آیا؟“

عادل نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”حالات تو یہی بتا رہے ہیں۔“

”وہ اب کہاں ہے عادل؟“ شہزادی نے روہانسی آواز میں کہا۔

”مجھے کچھ کچھ پتا ہے کہ وہ کہاں ہے اور اللہ نے چاہا تو وہ اپنے انجام کو بھی ضرور پہنچے گا۔“

دونوں کچھ دیر خاموش رہے پھر شہزادی موضوع بدل کر بولی۔ ”عادل! میں تمہاری جیت سے بہت خوش ہوں...... اور...... اور مجھے لگتا ہے کہ ابا جی بھی خوش ہیں۔“ اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ یقیناً ان آنسوؤں کا تعلق خوشی سے ہی تھا۔

اس نے عادل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں زور سے دبایا۔ یہ اس کی گرم جوشی کا اظہار تھا۔ عادل کو لگا جیسے شہزادی کا ہاتھ ہی نہیں اس کا پورا جسم اس کے جسم سے پیوست ہے۔ وہ عادل کو کھینچ رہی ہے۔ اپنے اندر جذب کررہی ہے۔ اپنے تمام تر حسین احساسات کے ساتھ۔

عادل نے بھی اس کے ہاتھ کو دبایا۔ اپنی انگلیوں کو اس کی انگلیوں میں پیوست کردیا۔ شہزادی نے پلکیں جھکالیں جیسے وہ عادل کی آنکھوں میں دیکھنے کی تاب نہ رکھتی ہو۔ شاید ایسا ہی تھا۔ اس کے خوب صورت ہونٹ بے ساختہ لرز رہے تھے...... وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی تھی۔ تمہاری طرح میں بھی کچھ بھی بھولی نہیں۔ ہاں عادل! لالی کے سارے روز و شب مجھے یاد ہیں۔ وہ ساری گرم سنسان دوپہریں جن میں ہماری سرگوشیاں گونجیں اور وہ ساری خوب صورت شامیں جن میں دلنشین وعدوں کی مٹھاس تھی۔

اچانک وہ دونوں بری طرح چونک گئے۔ خیمے سے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ شاید صحافی خاتون واپس آرہی تھی لیکن نہیں، یہ تو مردانہ قدموں کی آواز تھی۔ پھر یکایک جیسے ایک طوفان آگیا۔ خیمے کا پردہ زور سے پھڑپھڑایا۔ کسی نے عادل کا گریبان پکڑا اور ایک تند و تیز

جھٹکا دے کر اسے باہر کھینچ لیا۔ وہ اوندھے منہ گرتے گرتے بچا۔ اس کے کانوں میں شہزادی کے چلّانے کی آواز آئی۔ اسے اپنے سامنے ایک ریسلر نما انگریز نظر آیا۔ اس کے پہلو میں ٹیو پڈ تھا۔ ٹیو پڈ کو ایک نظر دیکھ کر ہی عادل جان گیا کہ وہ شراب کے نشے میں دھت ہے۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ اس نے منہ سے جھاگ اڑاتے ہوئے انگلش میں کچھ کہا۔ پھر ہاتھ میں پکڑے چاقو کو نہایت وحشت سے عادل پر چلایا۔ یہ وار عادل کی گردن پر تھا۔ عادل نے تیزی سے جھک کر یہ مہلک وار بچایا لیکن وہ اگلا وار نہیں بچا سکا۔ یہ وار پیچھے سے کیا گیا تھا اور اسی پہلوان نما شخص نے کیا تھا جس نے اسے خیمے سے گھسیٹا تھا۔ اس نے کسی نہایت وزنی شے سے عادل کے سر پر ضرب لگائی۔ عادل کی آنکھوں میں ان گنت ستارے ناچ گئے۔ وہ پہلو کے بل سخت برف پر گرا اور ہوش و حواس سے بیگانہ ہوگیا۔

☆☆☆

وہ عجیب کیفیت تھی۔ وہ ایک ناقابلِ بیان صورتِ حال تھی۔ عادل خود کو جیسے ہواؤں میں معلق محسوس کررہا تھا۔ اس کے نیچے جیسے پگھلی ہوئی برف کا دریا تھا جو بڑے شور کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ وہ شاید بے ہوش تھا لیکن وہ ایسی...... بے ہوشی تھی جس میں گاہے بگاہے نیم بے ہوشی جیسے وقفے بھی آتے تھے۔ کبھی یہ نیم بے ہوشی واضح ہوتی تھی اور اس میں اسے اردگرد کی آوازوں کا احساس ہوتا تھا اور کبھی یہ نیم...... بے ہوشی...... بے ہوشی کا حصہ ہوجاتی تھی۔ اسے پگھلی ہوئی برف کے شور کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔

جب وہ نیم بے ہوشی میں ہوتا تھا، وہ اپنے آپ کو حرکت دینے کی کوشش کرتا تھا لیکن کامیابی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اپنی پلکوں تک کو اٹھانے میں ناکام رہتا تھا۔ پگھلی ہوئی برف کے دریا کا رنگ سنہری ہوجاتا تھا۔ اس کے اندر سے کوئی پکار کر کہتا تھا...... تمہارا ذہن مفلوج ہوچکا ہے۔ تم خود بھی فالج زدہ ہوچکے ہو۔ یہ ادھوری موت ہے اب تمہیں واپس نہیں آنا۔ ادھوری موت سے پوری موت کی طرف جانا ہے۔ پوری موت، جس میں سفید کفن ہوتا ہے، کافور کی بو ہوتی ہے اور اندھیری قبر۔ پھر سب کچھ نگاہوں سے اوجھل ہوجاتا، ہر احساس ناپید ہوجاتا۔ یہ وقفہ معلوم نہیں کتنا لمبا ہوتا۔ شاید ایک دو گھنٹے، شاید ایک دو دن، یا پھر اس سے بھی زیادہ۔

آہستہ آہستہ نیم بے ہوشی والے وقفے بڑھنے لگے۔ وہ گہری بے ہوشی جو اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کردیتی تھی، کم ہونے لگی۔ وہ اپنے اردگرد کے ماحول کو محسوس کرنے لگا۔ آوازیں زیادہ وضاحت کے ساتھ اس کی سماعت سے ٹکرانے لگیں۔ وہ کسی کسی آواز کا مفہوم بھی سمجھنے لگا لیکن وہ اپنے وجود کو حرکت دینے کے قابل اب بھی نہیں تھا۔ اپنی پلکوں تک کو ہلا نہیں سکتا تھا۔

اس کا دھندلایا ہوا ذہن اسے بتا رہا تھا کہ اس کے اردگرد کچھ انوکھا ہوچکا ہے۔ کچھ بہت خاص...... اور غیر متوقع...... شاید کوئی آفت ٹوٹ پڑی ہے۔ کسی قدرتی ابتلا نے اسے اور اس کے قریب موجود سب افراد کو گھیر لیا ہے۔ شاید کوئی برف کا طوفان...... یا پھر کچھ نہایت بے رحم لوگ...... جن کی آنکھوں سے آگ نکل رہی ہے اور جن کے ہونٹوں سے خون ٹپک رہا ہے۔ یہ سب کچھ کہاں پر ہو رہا ہے؟ کون لوگ ہیں یہ...... کیا چاہتے ہیں؟ کیا حقیقت میں ایسا ہے...... یا پھر یہ سب اس کا وہم ہے؟ اس کے بیمار، مفلوج ذہن کا کوئی من گھڑت احساس ہے؟ اس کا ذہن واقعات کو آپس میں مربوط کرنے میں قطعی ناکام تھا۔

کبھی کبھی اسے اپنے بازو یا پھر کندھے پر ہلکی سی چبھن محسوس ہوتی۔ اسے لگتا کہ اسے انجکشن لگایا گیا ہے۔ گاہے بگاہے کسی دوا کی نہایت تیز بو بھی وہ اپنے نتھنوں میں محسوس کرنے لگا۔

ایک دن جب وہ نیم بے ہوشی والی حالت میں تھا، کسی نے انگلش میں کہا۔ ”اس کی حالت میں کچھ بہتری تو نظر آرہی ہے لیکن ابھی کچھ کہا نہیں جاسکتا۔“

پھر دو افراد اردو میں باتیں کرنے لگے۔ کبھی عادل کو لگتا کہ یہ اس کا تصور ہے۔ کبھی محسوس ہوتا کہ نہیں وہ لوگ حقیقت میں بول رہے ہیں۔ وہ سن رہا تھا لیکن خود کو حرکت دینے کے قابل نہیں تھا۔ ایک آواز نے کچھ اس قسم کی بات کہی۔ ”قسمت کی بات ہے، جو کچھ ہوا اس طوفان کی وجہ سے ہوا۔ اگر ہم پندرہ بیس گھنٹے پہلے یہاں سے نکل جاتے تو بھی یہ سب نہ ہوتا۔“

”قدرت کے کاموں میں کس کو دخل ہے۔ یہ مصیبت ہمارے مقدر میں لکھی تھی۔“

پہلی آواز دوبارہ سنائی دی۔ ”میں تو اب بھی یہی کہتا ہوں۔ ان لوگوں سے بات کی جائے۔ کچھ لو، کچھ دو کی بنیاد پر معاملہ طے کیا جائے۔ روپے میں بڑی طاقت ہوتی ہے اور دینے کے لیے روپیا ان غیر ملکیوں کے پاس کم نہیں ہے۔“

”لیکن بات تو نقد کی ہے نا۔ یہ بڑے خبیث لوگ ہیں۔ کسی وعدے پر اعتبار نہیں کریں گے۔ یہ یہی سوچیں

گے کہ جو مل رہا ہے وہ لے لیں اور جو کچھ ان کو مل رہا ہے، وہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ لاکھوں پاؤنڈز کا بہترین سامان ہے۔ خوب صورت لڑکیاں ہیں، ہتھیار ہیں...... اور کیش کی شکل میں بھی لاکھوں پاؤنڈ تو ہوں گے۔''

دفعتاً عادل کی سماعت سے کچھ آوازیں ٹکرائیں۔ اسے لگا کہ وہ برف کے دریا سے نکل چکا ہے اور اب ایک بہت بڑے اور گہرے، برفیلے کنوئیں میں ہے۔ اس کنوئیں میں گولیاں چل رہی ہیں۔ کبھی سنگل فائر ہوتے ہیں، کبھی برسٹ چلنے لگتے ہیں۔ لوگ چلا رہے ہیں، زخمی ہو رہے ہیں۔

اس کے قریب گفتگو کرنے والے بھی باہر چلے گئے۔

عادل کے دل کی گہرائیوں سے ایک آواز ابھری۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وحشی پاؤندوں نے انہیں گھیر لیا ہو۔ پاؤندوں کا خیال ذہن میں آتے ہی عادل کے ذہن میں ایک کرخت چہرے کی شبیہ ابھری۔ سوچی سوچی آنکھیں، تمتمایا ہوا گندمی رنگ، منڈا ہوا سر۔ یہ کون تھا؟ اس نے دماغ پر زور دیا لیکن کچھ یاد نہیں آیا۔ خیالات بکھرے بکھرے تھے...... پھر اس کے تصور میں شہر لاہور کا نقشہ ابھرا۔ ایک معروف چوک، ٹریفک، ہارنوں کا شور، ہجوم...... اس ہجوم میں اس نے کچھ دیکھا تھا۔ شاید یہی چہرہ...... شرابی چہرہ...... کیا نام تھا اس کا؟ کیا نام تھا، اس نہایت ناپسندیدہ شخص کا؟ ذہن میں جھماکا سا ہوا...... مالکانے زادہ...... تو کیا مالکانے زادہ یہاں موجود تھا؟ وہ یہاں کیوں موجود تھا؟ اس سے اس کی کیا دشمنی تھی، کیا معاملہ تھا؟ اسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ لیکن یہ یاد آ رہا تھا کہ کچھ ہے۔ کچھ بہت برا ہے۔ ایک بار پھر نیم بے ہوشی کا دورانیہ ختم ہو گیا۔ وہ اپنے اردگرد سے...... بے خبر ہو گیا۔ کتنی دیر کے لیے...... ایک دو گھنٹے کے لیے...... ایک دو دن کے لیے؟ وہ یقین سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔

☆☆☆

کوئی اس پر جھکا ہوا تھا۔ ہولے ہولے اس کے بالوں میں انگلیاں چلا رہا تھا۔ بڑی نازک انگلیاں تھیں۔ یہ کس کی انگلیاں تھیں؟ جسم سے اٹھنے والی یہ بھینی بھینی خوشبو کس کی تھی؟ کوئی بہت پسندیدہ ہستی تھی۔ مگر کون تھی؟ وہ ٹھیک سے یاد نہیں کر پا رہا تھا۔ یہ عجیب کیفیت تھی، آگاہی تھی مگر ادھوری۔

پھر اس نازک انگلیوں والی ہستی نے اسے دوا پلائی۔ دوا کی ناگوار بو، کومل جسم کی جانی پہچانی خوشبو پر غالب آ گئی۔ تب ایک بار پھر وسیع برفیلے کنوئیں کے اندر گولیاں چلنے لگیں۔ ریٹ ٹیٹ...... ریٹ ٹیٹ۔ کچھ لوگ چلائے، کسی آواز نے بین کیا۔

بھینی بھینی خوشبو ایک دم اوجھل ہو گئی۔ دوا کی ناگوار بو بھی پس منظر میں چلی گئی۔ کچھ وقت گزرا پھر اس نے دو افراد کو اپنے قریب باتیں کرتے ہوئے پایا۔ ایک آواز کو اس نے فوراً پہچان لیا۔ یہ اس کے تایا فراست کی آواز تھی۔ وہ غصے میں کسی سے کچھ کہہ رہے تھے۔ یہ آواز کانوں سے ٹکرائی تو عادل کو کچھ اور بھی یاد آنے لگا لیکن جو یاد آ رہا تھا، وہ بہت دھندلا تھا۔ ایک صورت سی نگاہوں کے سامنے بن بن کر بگڑ رہی تھی۔ یہ کس کی صورت تھی؟

تایا فراست کی آواز پہچاننے کے بعد عادل نے اٹھنا چاہا، تایا کو پکارنا چاہا مگر اس کی آواز نے ساتھ دیا، نہ وہ اپنے جسم کے کسی حصے کو حرکت دے سکا۔ بس پتھر کا پتھر لیٹا رہا۔ تایا کسی سے بول رہے تھے۔ دوسری آواز کس کی تھی؟ کس کی تھی؟ یکایک اس کے ذہن میں برق سی لہرائی۔ یہ آواز تایا کے بیٹے کی تھی۔ تایا کا بیٹا...... تایا کا بیٹا...... کیا نام تھا اس کا...... قاسم...... یہ قاسم کی آواز تھی...... وہ کہہ رہا تھا...... ''ابا! اس میں میرا کیا قصور ہے؟''

تایا کی آواز ابھری۔ ''تیرا قصور ہے...... قصور ہے، تو نے یار بنایا ہوا تھا اسے۔ اس کی ہر چھتی بری گل کی حمایت کرتا تھا۔ میری آنکھوں پر بھی پردہ ڈالا ہوا تھا تو نے۔ اب دیکھ لیا نا انجام۔ وہ ہمارا لہو پینا چاہ رہا ہے۔ غیروں کے ساتھ مل کر ہمیں گولیوں سے چھلنی کر رہا ہے وہ کمینہ۔''

''ابا! وہ کہتا ہے کہ ہم شہزادی کے معاملے میں اس سے دھوکا کریں گے۔ اسے دغا دیں گے...... اس نے اپنے دل میں پتا نہیں کیا کیا سوچ لیا تھا۔''

اچانک عادل کے دل و دماغ میں برق سی لہرا گئی۔ اسے یاد آیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے جو وجود اس کے بالوں میں اپنی نازک انگلیاں چلا رہا تھا اور اسے دوا پلا رہا تھا...... وہ کوئی اور نہیں تھا، شہزادی کا وجود تھا۔ اس کی جان، اس کی روح...... وہ اس کے لیے آگ اور برف کے سات سمندروں کے اوپر سے گزرا تھا...... اور ابھی ایسے مزید کئی سمندر پار کر سکتا تھا...... لیکن کیسے؟ وہ تو اب اپنے اندر جلنے جلنے کی طاقت بھی نہیں رکھتا تھا۔ اس نے ایک بار پھر بھرپور کوشش کی۔ اپنے ذہن پر چھائی ہوئی دھند کو صاف کرنا چاہا۔ اپنے پاؤں کو اور ہاتھوں کی انگلیوں کو حرکت دینا چاہی لیکن کچھ نہ کر سکا۔ ذہن پر چھائی دھند کچھ اور گہری ہو گئی۔ آوازیں فاصلے پر چلی گئیں مگر سنائی دیتی رہیں۔ چہرے یاد آ رہے تھے لیکن واقعات کی بہت سی درمیانی کڑیاں

غائب تھیں۔

تایا کہہ رہے تھے۔ ''بکواس بند کر قاسو...... تو بے وقوف ہی نہیں، بے غیرت بھی ہے۔ ابھی ایک آدھ دن میں جب وہ کتے کا پتر ہم سب کو گھیر لے گا اور تیری بہن کو تیری آنکھوں کے سامنے خوار کرے گا...... اور باقی ساری زنانیاں بھی خوار ہوں گی تو پھر بھی یہی کہنا کہ اس میں ہمارا قصور ہی تھا۔''

قاسو چنگھاڑا۔ ''میری بہن کو کوئی ہتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ میں اس کے ٹوٹے کر دوں گا ابا...... میں خون پی جاؤں گا اس کا۔''

کہرام سا مچ گیا۔ پتا نہیں کیا ہو رہا تھا۔ بس عادل اپنے دھندلائے ہوئے مفلوج ذہن کے ساتھ اندازے ہی لگا سکتا تھا۔ قاسو شاید رائفل پکڑ کر باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تایا فراست اسے سنبھالنا چاہ رہے تھے۔ ان کا کوئی کوئی فقرہ عادل کی سماعت تک بھی پہنچ رہا تھا۔ ''وہ وحشی ہو رہے ہیں، چھلنی کر دیں گے تجھے...... اگر مرنا ہی ہے تو پھر اپنے ہاتھوں سے گولی مار لے خود کو......''

''چھوڑ دے ابا...... چھوڑ دے مجھے۔ تو نے مجھے بے غیرت کہا ہے، میں بتاؤں گا کہ غیرت کیا ہوتی ہے۔''

یکایک شور و غل کی یہ ساری آوازیں، عادل سے دور چلی گئیں...... اور جب یہ آوازیں دور جا رہی تھیں، عادل کے کانوں میں کسی عورت کے چلانے کی آواز آئی۔ اس مرتبہ وہ پہچان گیا۔ یہ اس کی شہزادی کی آواز تھی۔ وہ کیوں چلائی تھی؟ وہ ابھی اس سوال کا جواب ہی ڈھونڈ رہا تھا کہ ایک بار پھر برف کے وسیع اور گہرے کنوئیں کے اندر گولیاں چلنے لگیں۔ ریٹ ٹیٹ...... ریٹ ٹیٹ۔ آواز شدید تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ایک دم درجنوں لوگ ایک دوسرے پر فائر کر رہے ہیں۔ واقعی فائرنگ ہو رہی تھی یا صرف اس کی سماعت اسے واہموں میں مبتلا کر رہی تھی؟ نہیں یہ فائرنگ تھی، چھوٹے بڑے ہتھیار چل رہے تھے۔ کیوں ہو رہی تھی یہ فائرنگ؟ اس نے اپنے کمزور ذہن پر زور دیا۔

جواب نہیں ملا۔ دھند مزید گہری ہو گئی۔ ایسا ہی ہوتا تھا۔ جب وہ کچھ سوچنے کے لیے زیادہ کوشش کرتا تھا، ذہن تاریکیوں میں ڈوبنے لگتا تھا۔

کچھ وقت گزرا پھر اسے اپنے آس پاس تایا کی روتی بلکتی آواز سنائی دی۔ ''قاسو...... قاسو! میں نے تجھے کہا تھا نا...... اوئے نامراد۔ میں نے تجھے کہا تھا نا۔ اوئے تو نے میری کمر توڑ کر رکھ دی۔''

پھر اس نے شہزادی کی دلدوز آوازیں سنیں۔ وہ قاسو کو پکار رہی تھی۔ بین کر رہی تھی...... ہاں وہ بین کر رہی تھی۔ وہ تو اس کا ایک آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کہاں یہ کہ وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہی تھی، چلا رہی تھی۔

عادل کا سینہ پھٹنے لگا۔ وہ سب کچھ جھیل سکتا تھا، اپنی شہزادی کی گریہ و زاری نہیں جھیل سکتا تھا۔ اس نے اپنی ساری جسمانی اور دماغی توانائیاں جمع کیں، اٹھ کر بیٹھنا چاہا۔ اسے لگا کہ وہ اپنے پاؤں کے انگوٹھوں کو حرکت دینے میں کامیاب ہوا ہے۔ اس نے اس حرکت کو بڑھانا چاہا۔ اپنے بالائی دھڑ کو اٹھانا چاہا۔ یہ بڑا جاں گسل عمل تھا۔ اسے محسوس ہوا، اس کے جسم کی ہڈیوں میں اذیت کا دریا بہہ نکلا ہے۔ اس نے آنکھیں کھولنا چاہیں، اس نے ہونٹوں کو وا کرنا چاہا۔ ایک دم کوئی کنکشن سا کٹ گیا۔ ذہن پھر تاریکیوں میں ڈوبنے لگا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ اس کا آخری احساس یہی تھا کہ یہاں اس جگہ...... اس کے اردگرد کچھ بہت خوفناک ہو رہا ہے۔ کوئی ایسا مہلک حصار ہے جو لوگوں کو ایک ایک کر کے کھا رہا ہے، ان کا خون پی رہا ہے۔

☆☆☆

اس کے مفلوج ذہن نے اردگرد کے ماحول کو دوبارہ محسوس کرنا شروع کیا تو اسے لگا کہ اس کے قریب کسی لیمپ کی مصنوعی روشنی ہے۔ اسے اپنے بازو میں سوئی چبھنے کی ہلکی سی تکلیف محسوس ہوئی۔ پھر ایک دم اسے شہزادی کی دلدوز آہ و بکا یاد آئی۔ تو کیا قاسم مر چکا تھا؟ یقیناً اس کے ساتھ کچھ ہو چکا تھا۔ شہزادی تو بڑے حوصلے والی تھی، وہ یونہی بلک بلک کر نہیں روئی تھی۔

شہزادی...... عادل کے دل کی گہرائیوں سے ایک پکار اٹھی۔

اس نے پھر اٹھنا چاہا...... مگر وہ صرف اپنے پاؤں کے انگوٹھوں کو ہی حرکت دے پایا۔ باقی جسم اسی طرح پتھر رہا۔ اسے ان باتوں کی گونج سنائی دینے لگی جو شہزادی کی آہ و بکا سے پہلے تایا فراست اور قاسو میں ہوئی تھی۔ اسے اندازہ ہوا کہ ان باتوں میں بار بار جس بندے کا ذکر کیا گیا...... وہ ناصر تھا۔ لمبے قد اور سرد آنکھوں والا بدنیت ناصر۔ تو کیا ناصر پاؤندوں کے ساتھ مل چکا تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہی پاؤندوں کو اور مالکانے زادہ کو یہاں لے کر آیا ہو؟

عادل کو محسوس ہوا کہ اب اس کا ذہن پہلے سے کچھ بہتر کام کر رہا ہے۔ اسے نہ صرف چہرے اور نام یاد آ رہے تھے

بلکہ ان کا باہمی تعلق بھی کچھ کچھ سمجھ میں آرہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس کے سر پر کوئی شدید ضرب لگی تھی لیکن یہ کس موقع پر لگی اور کس نے لگائی، اس کے بارے میں تصورات دھندلے تھے۔ اس نے اپنے ہاتھ سے اپنے سر کو چھونا چاہا لیکن وہ ہاتھ کو حرکت دے سکا، نہ سر کو۔ اس کی بے بسی برقرار تھی۔ اس کی ناتوانیوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔

وہ شاید ایک خیمے میں تھا۔ خیمے سے باہر کوئی زخمی عورت جسمانی اذیت کے سبب رو رہی تھی اور انگلش میں کچھ کہہ رہی تھی۔ الفاظ عادل کی سمجھ میں نہیں آئے۔ پھر کوئی عادل کے بالکل پاس سے بولا۔ غالباً یہ برٹش ڈاکٹر تھا۔ اس ڈاکٹر کا نام عادل کو یاد نہیں آیا لیکن اس کا چہرہ اس کے تصور میں گھوم گیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ یہ حالت ہفتوں اور مہینوں تک رہ سکتی ہے اور......“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔

”اور کیا ڈاکٹر؟“ ایک دوسری آواز نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے بالکل سرگوشی میں کچھ کہا۔ الفاظ عادل کی سمجھ میں نہیں آئے۔

دوسری آواز نے کہا۔ ”آپ کا کیا خیال ہے ڈاکٹر...... یہ آوازیں سن سکتا ہے؟“

”یہ ممکن ہے...... لیکن یہ جتنا زیادہ سکون میں رہے گا اور اس کے برین کی حرکت جتنی کم ہوگی، اتنا ہی اس کے لیے بہتر ہے۔ ہم ڈاکٹری زبان میں اس کیفیت کو Temporary paralysis کہتے ہیں لیکن اگر احتیاط نہ کی جائے تو پھر یہ حالت مستقل شکل بھی اختیار کرسکتی ہے۔“

”پلیز، ڈاکٹر! کچھ کریں، اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔“ آواز نے پھر کہا۔

اور ایکا ایکی عادل کے سینے میں جیسے سیکڑوں چراغ روشن ہوگئے۔ اس نے پچھلے چند دنوں میں کئی بار یہ آواز سنی تھی لیکن پہچان نہیں پایا تھا مگر آج اس نے پہچان لیا۔ یہ اس کے مہربان استاد...... اس کے روحانی باپ کی آواز تھی۔ اس کے راہنما اس کے مربی، سرسرمد۔ ہاں، وہ سرسرمد تھے اور وہ اس کے پاس موجود تھے اور یہ وہ تھے جنہوں نے اسے جینا سکھایا تھا۔ زندگی کو زندگی کرنے کے گُر بتائے تھے۔ انہوں نے اسے بتایا تھا کہ چٹانوں سے کیسے ٹکرایا جاتا ہے۔ سنگلاخ دیواروں میں راستے کیسے بنائے جاتے ہیں۔ انہوں نے اسے بتایا تھا کہ تقدیر اپنے ہاتھوں میں کیسے لی جاتی ہے۔ کیسے خود کو مصیبتوں، مشقتوں اور تکلیفوں سے نبرد آزما کیا جاتا ہے اور اس بات کی پروا نہیں کی جاتی کہ صلہ کب ملے گا اور ملے گا بھی یا نہیں۔ بس اپنا کام اس غیر متزلزل یقین کے ساتھ جاری رکھا جاتا ہے کہ خوشیوں اور راحتوں کو آنا ہی آنا ہے۔ جیسے کالی رات کے بطن میں دن چھپا رہتا ہے، اسی طرح تکلیف کے اندر ہی کہیں ”ہم وزن“ راحت کا وعدہ بھی ہوتا ہے۔ وہ ”ہم وزن“ کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ یعنی جتنی تکلیف اتنی ہی خوشی اور راحت۔ تقدیر کو ہاتھ میں لینے کا گر وہ یہ بتاتے تھے کہ انسانی زندگی میں تکلیفوں اور راحتوں کی مقدار برابر ہوتی ہے۔ اس لیے اگر ہم تکلیفوں کے کھاتے میں بہت سی تکلیفیں سہہ لیتے ہیں اور جمع کرلیتے ہیں تو پھر ہم وزن راحتوں کو بھی زندگی میں آنا ہوتا ہے۔ اب اگر ایک بندہ خود پر دیگر راحتوں اور خوشیوں کے دروازے بند کرلیتا ہے اور اپنا من چاہا دروازہ کھلا رہنے دیتا ہے...... مثلاً اپنے محبوب سے وصال کا دروازہ...... تو پھر اس بات کا قوی امکان پیدا ہوجاتا ہے کہ اس کے حصے کی خوشیاں اسے اپنے من چاہے دروازے کے راستے ہی سے ملیں...... یعنی محبوب سے وصال کی صورت میں...... عادل کو بہت سی باتیں یاد آرہی تھیں۔

ہاں، یہ وہی استادِ محترم تھے۔ عادل نے چاہا کہ وہ اٹھے اور ان کے سینے سے لگ جائے۔ اس نے انہیں پکارنا چاہا، اٹھنا چاہا لیکن یہ دونوں کوششیں ناکام ہوگئیں۔ اس کا ذہن یہ مشقت برداشت نہیں کرپایا۔ تاریکی گہری ہونے لگی۔ ہاں! اسے لگا کہ وہ اپنے پاؤں کے انگوٹھوں کے ساتھ ساتھ دیگر انگلیوں کو بھی حرکت دینے میں کامیاب رہا ہے۔ کچھ ہی دیر بعد بے خبری و بے ہوشی کے اندھیرے اسے ڈھانپ چکے تھے۔

☆☆☆

تابڑتوڑ گولیاں چل رہی تھیں۔ اب یہ آوازیں نسبتاً قریب سے آرہی تھیں۔ عادل کو لگ رہا تھا کہ برف کا وسیع کنواں تنگ ہوتا جارہا ہے۔ اس کی دیواریں قریب قریب آرہی ہیں۔ اس کے دھندآلود دل و دماغ کی گہرائیوں میں کہیں یہ احساس موجود تھا کہ اردگرد جو کچھ ہو رہا ہے، بہت برا ہو رہا ہے۔ زخمی چلا رہے ہیں، لاشیں گر رہی ہیں۔ دفعتاً ایک بار پھر اس کی روح لرز اٹھی۔ اس نے اپنے بالکل پاس سے شہزادی کی دل فگار آواز سنی۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی۔ اس کے مخاطب یقیناً تایا فراست ہی تھے۔ الفاظ پگھلے سیسے کی طرح عادل کی سماعت میں اترے۔ ”اباجی...... میں ایسی موت...... مرنا نہیں چاہتی۔ آپ کو رب کا واسطہ اباجی!

مجھے اپنے ہاتھوں سے ماردیں، مجھے گولی ماردیں۔"

"نہ کر میری وھی رانی...... نہ کر...... رب سے آس رکھ......" تایا فراست کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔

"اب کیا آس ہے اباجی...... آپ نے دیکھ ہی لیا ہے' وہ کیا کررہے ہیں عورتوں کے ساتھ۔ مجھے اس طرح نہیں مرنا اباجی۔" وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔

عادل کے سینے میں شعلے پھنکارنے لگے۔ اس کا جی چاہا، اس کی جان، اس کے جسم کے پنجرے سے آزاد ہوجائے۔ وہ اپنے جسم کے پنجرے سے باہر نکلنے کے لیے زور لگانے لگا۔ اندر ہی اندر تڑپنے لگا۔ اسے لگا کہ ایسی صورتِ حال اس نے کہیں پہلے بھی دیکھی تھی یا شاید سنی تھی، کسی کہانی میں...... کسی روداد میں۔ جب عورت کو مرنا آسان لگتا ہے، اپنی پیاری زندگی کو اپنے ہاتھوں سے ختم کرنا بالکل سہل ہوجاتا ہے۔ کہاں سنی تھی یہ کہانی؟ کیا تھی یہ روداد؟

وہ کیوں سوچ نہیں پاتا؟ کیوں اٹھ نہیں پاتا؟ اب اور کیا ہونا باقی ہے؟ اس کی شہزادی جارہی ہے، وہ مررہی ہے، وہ منوں مٹی کے نیچے چلی جائے گی...... پھر وہ زندہ رہ کر کیا کرے گا۔ اس نے پوری قوت صرف کرکے اپنے پاؤں کو حرکت دی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے دونوں پاؤں کا اگلا حصہ حرکت کررہا ہے۔ جو لوگ اس کے پاس موجود تھے، وہ اس کے پاؤں کی حرکت کیوں نہیں دیکھ پارہے تھے؟ کیا اس کے پاؤں کے اوپر کوئی لحاف وغیرہ پڑا تھا؟ وہ اپنے اندر ہی اندر چلایا۔ اس نے اپنی منوں وزنی پلکوں کو اٹھانا چاہا۔ مفلوج ذہن برداشت نہیں کرپایا۔ ہر آواز غیر حقیقی محسوس ہونے لگی۔ خیالات گڈمڈ ہوتے چلے گئے۔ ایک بار پھر بے خبری کی تاریک لہر نے اسے ڈھانپ لیا۔

اس مرتبہ بے ہوشی کا یہ وقفہ کافی طویل تھا۔ کم از کم عادل کو یہی محسوس ہوا کہ کافی طویل ہے۔ وہ اس وقفے سے نکلا تو غنودگی کی کیفیت محسوس ہوئی۔ اس غنودگی میں اس نے دیکھا، وہ ایک تنگ اور گہرے کنوئیں میں ہے۔ اس کنوئیں کے اوپر کنارے پر دو عورتیں بیٹھی ہیں۔ ایک اس کی ماں ہے...... ایک اس کی شہزادی ہے۔ دونوں اشک بار ہیں۔ اسے پکار رہی ہیں۔ ماں کہہ رہی ہے۔ "آجا عادے پتر! اب بھی نہ آیا تو کب آئے گا۔ دیکھ تیری ووہٹی نے خون کی مہندی لگالی ہے۔ وہ ڈولی میں بیٹھنے کے لیے تیار ہے۔"

پھر شہزادی بلک کر بولی۔ "ہاں...... آجا عادے! آکہ میں ایک بار تجھے جی بھر کر دیکھ لوں...... اور تو بھی مجھے دیکھ لے۔ پتا نہیں پھر کبھی دیکھنا نصیب ہو کہ نہ ہو۔"

عادل پکار کر بولا۔ "ایسی باتیں نہ کر شہزادی! میں نے ماں کے لیے اور تیرے لیے اپنا خون پسینا ایک کیا ہے۔ میں کمائی لے کر آیا ہوں اور تو جانے کی باتیں کررہی ہے۔"

کچھ لمحے خاموشی میں گزر گئے۔ پھر عادل نے دیکھا۔ شہزادی نے کہانیوں کی شہزادی کی طرح اپنے لمبے بال تنگ کنوئیں میں پھینکے۔ سیاہ ریشمی بال۔ عادل نے ان بالوں کو تھاما۔ وہ ہوا کی طرح ہلکا پھلکا تھا۔ معمولی سی کوشش کے ساتھ وہ اوپر چڑھنے لگا۔ بلندیوں کی طرف جانے کا ہنر اسے خدا کی طرف سے عطا ہوا تھا۔ اگر یہ کنواں ہزاروں فٹ گہرا ہوتا تو بھی وہ یہ فاصلہ طے کرلیتا لیکن...... لیکن یہ کیا؟ ابھی وہ آدھے راستے میں تھا کہ اس کے بازوؤں میں سے جان ختم ہوگئی۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑی اور پھر ریشمی بال اس کے ہاتھوں میں سے نکل گئے۔ وہ پشت کے بل کنوئیں کی گہرائی میں گرا اور اس کی کمر ٹوٹ گئی۔ اس کا سر دو ٹکڑوں میں بٹ گیا۔

وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اس غنودہ کیفیت میں سے نکل آیا۔

اردگرد کی آوازیں پھر اس کی سماعت سے ٹکرانے لگیں۔ کہیں بالکل پاس ہی ادھیڑ عمر انگریز عورت اپنے زخموں کی وجہ سے تڑپ رہی تھی اور ڈاکٹر کو پکار رہی تھی۔ ہاں، عادل کو یاد آگیا۔ ڈاکٹر کا نام رابرٹ تھا۔ رابرٹ فورڈ۔ اردگرد سے گولیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ ریٹ ٹیٹ...... ریٹ ٹیٹ۔

کہاں سے آرہی تھیں یہ آوازیں؟ اس نے اپنے سر کو تھوڑا سا اونچا کیا۔ دائیں طرف ٹینٹ کے روزن کی جالی تھی۔ اس نے باہر دیکھنے کی کوشش کی۔ یہ چاندنی رات تھی، سفید برف چمک رہی تھی۔ برف پوش چٹانیں یہاں وہاں بکھری ہوئی تھیں۔ اس نے ایک چٹان کی اوٹ سے شعلہ نکلتے دیکھا۔ پھر یکے بعد دیگرے کئی شعلے نکلے۔ ریٹ ٹیٹ...... ریٹ ٹیٹ۔

اچانک عادل سرتاپا ہل گیا۔ اسے اپنی حالت پر یقین نہیں آیا۔ اس نے کہنیوں پر زور دے کر اپنا سر اٹھا رکھا تھا اور روزن سے باہر جھانک رہا تھا۔ کیا یہ کوئی جاگتی آنکھوں کا خواب تھا؟ کوئی ناقابلِ یقین بھری واہمہ تھا؟ وہ ایک بچھونے پر نیم دراز تھا۔ اس نے اضطراری طور پر اپنے پاؤں کے اگلے حصے کو حرکت دی۔ پاؤں کا اگلا حصہ ہی نہیں پورا پاؤں ہلایا جاسکتا تھا۔ اس نے بے ساختہ اپنا دایاں ہاتھ اٹھایا اور اپنے چہرے کو چھوا۔

دائیں طرف ایک تپائی پر کئی دوائیں اور انجکشن

وغیرہ رکھے تھے۔ وہ زور لگا کر اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہوگیا۔ لیکن ابھی رکوع کی حالت میں ہی تھا کہ اس کا سر خیمے کی چھت سے جھولتے لیمپ سے ٹکرایا۔ سر کے پچھلے حصے سے شدید ٹیسیں اٹھیں۔ اس نے اپنے ہاتھ سے سر کو چھوا۔ وہ پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ ایکا ایکی سارے مناظر پوری وضاحت کے ساتھ اس کی نگاہوں میں گھومنے لگے۔ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ کب ہوا تھا؟ وہ نوبل راک کا چیمپئن بن چکا تھا۔ اس نے لیوپڈ کو شہ مات دی تھی۔ فتح کی خوشی میں سرشار وہ شہزادی سے ملنے گیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی بے پناہ قربت محسوس کی تھی اور پھر لیوپڈ...... وہ خنزیر لیوپڈ......

عادل کے تن بدن میں شعلے لپک گئے۔ اس کا جی چاہا، وہ خیمے سے نکلے اور لیوپڈ کو پکارے۔ اس کی کمینگی و کم ظرفی کو للکارے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ مزید سوچتا یا کرتا...... اس کی سماعت کو چند آوازوں نے جکڑ لیا۔ یہ آوازیں صرف ڈیڑھ دو سو فٹ کے فاصلے سے چٹانوں کے عقب سے بلند ہورہی تھیں۔ یہ نسوانی آوازیں لڑکیوں کے چلانے کی تھیں۔ غالباً یہ انگریز لڑکیاں تھیں...... وہ مدد کے لیے پکار رہی تھیں...... دہائی دے رہی تھیں۔ کسی شرابی مرد نے خوشی سے بھرپور بلند قہقہہ لگایا۔ کسی دوسرے بدمست شخص کی آواز ہوا پر تیر کر عادل کے کانوں سے ٹکرائی۔ اس نے پشتو سے ملتی جلتی زبان میں کچھ کہا تھا۔

یقیناً یہ پاؤندے ہی تھے جو نشے میں دھت ہوکر لڑکیوں کے ساتھ بدسلوکی کررہے تھے۔ عادل کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ تب عادل کی نظر ایک اور لرزہ خیز منظر پر پڑی۔ چٹانوں کے پاس چار پانچ لاشیں نظر آرہی تھیں۔ ان میں سے ایک لاش کو عادل نے اس کے بازو کی وجہ سے پہچانا۔ یہ پلاسٹر شدہ بازو یقیناً تایا فراست کے ملازم انور کا تھا...... وہ اکڑی ہوئی حالت میں برف پر اوندھا پڑا تھا۔ غالباً کسی میں ہمت نہیں تھی کہ آگے بڑھ کر انور یا دیگر افراد کی لاشوں کو اٹھا سکتا۔

عادل کو اپنے سارے بدن میں عجب سی ناتوانی محسوس ہورہی تھی جیسے جسم اور دماغ کا رشتہ کمزور پڑا ہوا ہو لیکن خوش آئند...... بلکہ بہت خوش آئند بات یہی تھی کہ وہ اپنے ہاتھ پاؤں کو حرکت دے سکتا تھا۔ اس کا پورا جسم اب قابلِ حرکت تھا۔ یہ کرشمہ یقیناً آناً فاناً ہی ہوا تھا اور جب یہ ہوا، اس کے اردگرد کوئی ڈاکٹر نہیں تھا۔ کوئی ٹریٹمنٹ نہیں ہورہی تھی۔ اسے یاد آیا کہ اس نے حالتِ غنودگی میں خود کو بلندی سے گرتے

محسوس کیا تھا۔ اس کا جسم پختہ زمین سے ٹکرایا تھا اور اس کی ہڈیاں ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں۔ شاید یہی وہ شدید ذہنی شاک تھا جس نے اس کے paralysis کو ختم کیا تھا۔ ڈاکٹر رابرٹ کی آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔ ایک موقع پر ڈاکٹر نے اس کے سرہانے کھڑے ہوکر کہا تھا...... یہ سب کچھ کئی ہفتے، مہینے یا غیر معینہ مدت کے لیے چل سکتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آناً فاناً ختم ہوجائے۔

کھڑے ہونے سے عادل کا سر بری طرح گھومنے لگا۔ اسے لگا کہ وہ پھر چکرا کر گر جائے گا اور وہی منحوس...... بے حسی و ناتوانی اسے ڈھانپ لے گی جس نے اسے نامعلوم عرصے کے لیے پتھر بنائے رکھا ہے۔ سر اور جبڑے سے شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے اپنے جبڑے پر ہاتھ پھیرا اور چونک گیا۔ شیو کافی بڑھی ہوئی تھی۔ اس نے اندازہ لگایا...... یہ کم از کم دس دن کی شیو تھی۔

"او گاڈ! اس کا مطلب ہے، میں آٹھ دس دن یہاں پڑا رہا ہوں۔" اس نے سوچا اور اپنے چکراتے ذہن کو سنبھال کر بستر پر لیٹ گیا۔

اور تب ہی اسے یہ احساس ہوا کہ اسے پیشاب کی نالی لگی ہوئی ہے۔ ایک طرف موجود تھیلی میں کوئی چوتھائی لیٹر یورین موجود تھا اور پھر اسے اپنے بائیں ہاتھ کی پشت بھی دکھائی دی۔ یہاں ڈرپس وغیرہ کے لیے "برانولا" لگا ہوا تھا۔ اس نے پیشاب والی نالی اور برانولا، دونوں اپنے جسم سے علیحدہ کیں۔

سر مسلسل چکرا رہا تھا۔ اسے خدشہ محسوس ہونے لگا کہ وہ کہیں پھر بے ہوش نہ ہوجائے۔ کچھ بھی مزید ہونے سے پہلے وہ ایک بار شہزادی کو دیکھنا چاہتا تھا اور سرمد صاحب کو بھی۔ وہ کہاں تھے؟ کہیں...... کہیں ان کے ساتھ......

اس سے آگے وہ سوچ ہی نہیں سکا۔

اچانک ایک بار پھر فائرنگ شروع ہوگئی۔ یہ دو طرفہ فائرنگ تھی۔ عادل والا خیمہ ایک تکونی چٹان کے پیچھے تھا، اس لیے براہِ راست فائرنگ کی زد میں نہیں تھا۔ پھر بھی وہ بستر پر چت لیٹ گیا۔ اگلے قریباً تین منٹ تک دونوں طرف سے اندھا دھند فائرنگ ہوئی۔ اس فائرنگ کے دوران میں چٹانوں کے پیچھے سے للکارے سنائی دیتے رہے اور نشے میں ڈوبی ہوئی گالیوں کی بوچھاڑ بھی سنائی دیتی رہی۔

ان تین چار منٹ میں عادل اس صورتِ حال کو کافی حد تک سمجھ گیا۔ چٹانوں کے پیچھے یقیناً پاؤندے تھے۔ وہ

اس کیمپ کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ یہ گھیرا یقیناً آٹھ دس روز سے برقرار تھا اور دھیرے دھیرے تنگ ہوتا چلا گیا تھا۔ اب تو کیمپ کے خیموں اور پاؤندوں کے درمیان بہ مشکل سو ڈیڑھ سو فٹ کی دوری رہ گئی تھی بلکہ دھیان سے دیکھا جاتا تو پتا چلتا تھا کہ کیمپ کا وہ حصہ جہاں ملازموں کے خیمے تھے اور خچروں، ٹٹوؤں وغیرہ کے لیے سائبان تھے، مکمل طور پر پاؤندوں کے قبضے میں جا چکا تھا۔ اس حصے کے ساتھ ہی برٹش شہریوں کے جو جدید خیمے تھے، ان میں سے پندرہ بیس بھی پاؤندوں کے قبضے میں تھے۔ یقیناً ان خیموں میں موجود ہر چیز کو لوٹا جا چکا تھا۔ لگتا یہی تھا کہ لوٹ کے اس مال میں کچھ خواتین بھی شامل ہیں۔

فائرنگ کے تھمتے تھمتے پاؤندے کچھ اور نزدیک آ گئے۔ نظر آ رہا تھا کہ انہوں نے اپنی پوزیشن کچھ اور بہتر بنالی ہے۔ نہ جانے کیوں ہمایوں کے کہے ہوئے الفاظ ایک بازگشت کی طرح عادل کے کانوں میں گونجنے لگے۔ اس نے کہا تھا، یہ پاؤندے انہی لوگوں کی نسل میں سے ہیں جنہوں نے گئے وقتوں میں سالار دشوا ناتھ کی زیرکمان، راجپوتوں پر حملہ کیا اور اپنی تعداد کے بل بوتے پر انہیں روند کر رکھ دیا۔ یہ انہی قبیل کے لوگ تھے، جنگ وجدل جن کا پیشہ ہوتا ہے اور خون ریزی وآبروریزی جن کے پسندیدہ ترین مشاغل ہوتے ہیں۔ آج یہ بات ثابت ہو رہی تھی۔

پھر بستر پر لیٹے لیٹے عادل نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ پاؤندوں کی جانب سے ایک خچر کیمپ کی طرف ہانکا گیا۔ وہ پہلے بھاگا پھر دھیرے دھیرے کیمپ کی طرف بڑھا۔ اس پر کچھ لدا ہوا تھا۔ وہ کیمپ کے نزدیک پہنچا تو برٹش گارڈز میں سے کسی نے اس پر سرچ لائٹ ڈالی۔ چند سیکنڈ کے لیے خچر تیز روشنی میں نہا گیا۔ عادل کی دھڑکن تھم گئی۔ خچر اس کے خیمے سے صرف دس پندرہ قدم کے فاصلے پر تھا۔ اس پر ایک برہنہ لاش اوندھی پڑی تھی۔ لاش کو کوہ پیمائی والے رسے سے خچر کی پشت پر باندھا گیا تھا۔ یہ ایک لڑکی کی لاش تھی اور یہ لڑکی عادل کے لیے اجنبی نہیں تھی...... ہاں، وہ اجنبی نہیں تھی۔ یہ مسکراتے چہرے والی وہی نوجوان صحافی تھی جو عادل اور شہزادی کا انٹرویو کرنے کے لیے انہیں خیمے میں لائی تھی۔ وہ ان دونوں کو تنہائی میں بات کرنے کا موقع دے کر باہر نکلی تھی اور اسی دوران میں بدبخت لیوپڈ نے وہاں پہنچ کر عادل کے سر پر قیامت توڑ دی تھی۔

عادل لاش کا منظر دیکھ کر آنکھیں بند کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اسی دوران میں چٹانوں کی دوسری جانب سے ایک بلند آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ کسی مخمور پاؤندے نے اطلاع دینے والے انداز میں کچھ کہا۔

پھر ایک اور آواز آئی۔ ہوا کے دوش پر تیر کر آنے والی یہ منحوس آواز وہ ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ یہ اسی بدخصلت چھوٹے چودھری ناصر کی آواز تھی۔ اس نے غالباً پاؤندے کی ''اطلاع'' کا ترجمہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لے ہمایوں پتر! یہ نیا تحفہ قبول کر ہماری طرف سے۔ لیکن ساتھ یہ بھی یاد رکھ۔ اسے ہم نے نہیں تم نے مارا ہے۔ ہم تو بس ''کھیل'' رہے تھے اس کے ساتھ۔ یہ تمہاری چلائی ہوئی گولیوں سے مری ہے۔''

خیمے کے بالکل قریب سے ہمایوں کی للکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''حرامزادے...... کتے!''

اس کے ساتھ ہی ایک طویل برسٹ چلا۔ یقیناً یہ ہمایوں یا اس کے بچے کھچے ساتھیوں میں سے کسی نے چلایا تھا۔

اس ایک برسٹ کے جواب میں دوسری طرف سے کم وبیش دس برسٹ چلے اور برف پوش چٹانوں پر ہر طرف چنگاریاں بکھرتی نظر آئیں۔ خچر ڈر کر بھاگا اور لاش سمیت گولیوں کی زد میں آ گیا۔ عادل نے اسے گر کر تڑپتے اور پھر ساکت ہوتے دیکھا۔ برہنہ لاش ابھی تک اس کی پشت پر بندھی تھی۔

یہ کیا ہو رہا تھا؟ یہ کیا قیامت برپا تھی؟ سردی کے باوجود عادل کے ہر مسام سے پسینا پھوٹ نکلا۔ شہزادی کہاں تھی؟ سرمد صاحب کہاں تھے؟ اور تایا فراست اور کرسٹل؟...... خدانخواستہ...... خدانخواستہ...... اس سے آگے وہ کچھ سوچ نہ سکا۔ نقاہت کے سبب اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اس کے کانوں میں وہی الفاظ گونجے جو اس نے نیم بے ہوشی کی حالت میں سنے تھے۔ شہزادی نے روتی سسکتی آواز میں کچھ اس طرح کی بات کہی تھی۔ ''اباجی...... مجھے اپنے ہاتھوں سے گولی مار دیں۔ میں بے عزتی کی موت مرنا نہیں چاہتی۔'' وہ تڑپ اٹھا۔ اس نے سوچا وہ ہمایوں کو پکارے لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے پکارتا یا بچھونے سے اٹھنے کی کوشش کرتا، کوئی تیزی سے خیمے کی طرف آیا...... عادل نے ساکت ہو کر اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ جس ہاتھ سے اس نے برانولا اتارا تھا، وہ کمبل کے نیچے تھا۔ آوازوں اور آہٹوں سے اندازہ ہوا کہ کچھ لوگ کسی زخمی کو اٹھا کر اندر لائے ہیں اور خیمے کے فرش پر لٹا دیا ہے پھر ایک اور شخص کو لایا گیا اور اسے بھی لٹا دیا گیا۔ جو لوگ بول رہے تھے، ان میں ہمایوں کے علاوہ ڈاکٹر

رابرٹ کی آواز بھی شامل تھی۔ وہ سب بے حد گھبرائے ہوئے لگتے تھے۔

چار پانچ منٹ بعد یہ وسیع خیمہ پھر خالی ہو گیا۔ عادل کو اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ رات کا آخری پہر ہے۔ چاند مغرب کی طرف جھکا ہوا تھا اور اس کی ترچھی کرنیں برف کی چادر کو چمکا رہی تھیں۔ ایک زاویے سے بلند وبالا نوبل راک کا ایک پہلو بھی نظر آیا۔ وہ جیسے ستاروں کو چھو رہی تھی۔ چاندنی نے اسے بھی جھلملاہٹ عطا کر دی تھی۔ یقیناً یہ سارا منظر خوب صورت ہوتا اگر سامنے برف پر کئی لاشیں پڑی نہ ہوتیں...... اور چٹانوں کے پیچھے سے گاہے بگاہے غیرملکی لڑکیوں کی آہ وبکا سنائی نہ دے رہی ہوتی۔

عادل کا ذہن اب مختلف کڑیوں کو جوڑنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اسے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ گئی تھی کہ پاؤندے اور ان کے ساتھی درندہ صفت ڈاکوؤں کا روپ اختیار کر گئے ہیں۔ کیمپ کے ایک حصے پر قبضے کے دوران میں انہوں نے کچھ مقامی اور غیرملکی عورتوں کو اٹھالیا ہے اور اب ان سے برا سلوک کر رہے ہیں۔ خچر کی پشت سے بندھی ہوئی لاش اس کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ ایک دم اس کا ذہن شہزادی کے حوالے سے دوبارہ تفکرات سے بھر گیا۔

وہ ہوش میں تو آ گیا تھا لیکن ابھی جسمانی طور پر پوری طرح درست نہیں تھا۔ خاص طور سے اپنی ٹانگیں اسے...... بے جان محسوس ہوتی تھیں۔ اسے لگتا تھا کہ اس نے چلنے کی کوشش کی تو وہ گر پڑے گا۔ وہ کئی منٹ تک اسی طرح چت لیٹا رہا اور اپنی ٹانگوں کو ہلا جلا کر ان کی قوتِ کار جانچنے کی کوشش کرتا رہا۔ خیمے میں اب گھپ اندھیرا تھا۔ لیمپ بجھا دیا گیا تھا۔ اچانک عادل کو خرخراہٹ سنائی دی جیسے کسی کے گلے میں سانس پھنس رہی ہو۔ یہ کون تھا؟ ابھی وہ اس سوال کا جواب جاننے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ ایک یا دو افراد اندر داخل ہوئے۔ ان کی آوازوں سے پتا چلا کہ ان میں سے ایک ڈاکٹر رابرٹ ہے اور دوسری کرسٹل۔ وہ کسی زخمی شخص کے سرہانے کھڑے تھے۔ دونوں نے انگلش میں بات کی۔ ڈاکٹر رابرٹ نے کہا۔ ''یہ بڑی تیزی سے کمزور ہو رہا ہے۔ اسے گلوکوز کی ضرورت ہے لیکن گلوکوز کے بیگ اب ختم ہو چکے ہیں۔''

کسی مقامی شخص نے انگلش میں ڈاکٹر سے پوچھا۔ ''اسے منہ کے ذریعے کوئی چیز نہیں دی جا سکتی؟ مثلاً دودھ وغیرہ۔''

''دودھ بھی اب کہاں ہے؟ شاید ہی ایک دو پیکٹ ہوں۔ راشن اب بالکل ختم ہو رہا ہے۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

کرسٹل نے بھی مدھم...... نقاہت بھری آواز میں کچھ کہا جو عادل کی سمجھ میں نہیں آسکا۔ باہر سے وقتاً فوقتاً فائرنگ کی آواز بھی آ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد یہ افراد خیمے سے باہر نکل گئے۔ اب تک عادل نے اپنے اردگرد جو گفتگو سنی تھی اور مختلف لوگوں کی باتوں سے جو نتیجہ اخذ کیا تھا، اس سے اس کے ذہن میں صورت حال کا ایک نقشہ سا بن گیا تھا۔ یہ نقشہ کچھ یوں تھا۔ نوبل راک پر کلائمبنگ کا مقابلہ ختم ہونے کے فوراً بعد ہی کیمپ کو ختم ہو جانا تھا اور تمام ملکی اور غیرملکی مہمانوں کو یہاں سے نکل جانا تھا۔ اس جلدی کے پیچھے یہ اندیشہ موجود تھا کہ کہیں پاؤندے یہاں پہنچ کر مشکلات پیدا نہ کریں لیکن اس دوران میں قراقرم کے رنگ بدلتے شدید موسم نے دغا دی۔ ایک تند طوفان نے انہیں آلیا اور روانگی میں کچھ تاخیر ہو گئی۔ دوسری دغابازی کیمپ کے اندر سے ہی سامنے آئی۔ چھوٹے چودھری ناصر نے جب یہ دیکھا کہ شہزادی کے حوالے سے پانسا پلٹ گیا ہے اور تایا فراست نے عادل کو گلے سے لگالیا ہے تو وہ سمجھ گیا کہ اب کھیل اس کے ہاتھ میں نہیں رہا۔ عین ممکن تھا کہ تایا فراست اور ناصر میں کوئی جھڑپ وغیرہ بھی ہوئی ہو۔ جب پاؤندوں نے یہاں پہنچ کر کیمپ کو گھیرا تو ناصر فوراً اپنے ساتھیوں سمیت پاؤندوں سے جاملا۔ اب وہ لوگ پوری طرح حاوی تھے اور دم بدم کیمپ کے گرد گھیرا تنگ کرتے جا رہے تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اب کیمپ والوں کی جدوجہد زیادہ دیر چلنے والی نہیں۔ ہر طرف مقامی اور غیرمقامی گارڈز کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں اور ایمونیشن بھی ختم ہونے والا تھا۔ لگتا تھا کہ جلد ہی پاؤندے ان پر چڑھ دوڑیں گے اور سب کچھ تہس نہس کر دیں گے۔

اچانک عادل کو نیم تاریکی میں ایک بار پھر خرخراہٹ سنائی دی۔ کسی کی سانس اس کے گلے میں الجھ رہی تھی۔ شاید وہ قریب المرگ تھا۔ عادل نے اپنی نیم جان ٹانگوں کو سمیٹا اور ہمت کر کے اٹھ بیٹھا۔ اس نے سر موڑ کر آواز کی سمت دیکھا۔ کوئی کمبل کے نیچے چت لیٹا تھا۔ اس کے قریب کوہ پیمائی میں استعمال ہونے والا چھوٹا آکسیجن سلینڈر رکھا تھا اور آکسیجن ماسک اس کے چہرے پر تھا۔ عادل نے اس کے قریب جھک کر غور سے دیکھا اور سناٹے میں رہ گیا۔ یہ اس کا وہی بدخصلت حریف تھا جس نے قدم قدم پر اسے نقصان پہنچایا تھا۔ یہ لیوپڈ تھا، اس کی آنکھیں بند تھیں اور اس کے رخسار کا پرانا زخم نمایاں دکھائی دے رہا تھا۔ آکسیجن ماسک اس کے منہ سے کھسک کر اس کی ٹھوڑی پر چلا گیا تھا۔

شاید یہی وجہ تھی کہ اس کی سانس سینے میں اٹک رہی تھی۔ خرخراہٹ کی آواز بھی اسی کا نتیجہ تھی۔

عادل نے اس کے سینے پر سے کمبل ہٹایا۔ بدبو کا ایک جھونکا آیا۔ وہی بدبو جو گہرے خراب زخموں سے اٹھتی ہے۔ لیوپڈ کے سینے پر بہت سی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ چند دن پہلے اس کے سینے پر ایک یا ایک سے زائد گولیاں لگی ہیں...... اور اس زخم نے بتدریج خراب ہو کر اسے قریب المرگ کر دیا ہے۔ اس نے اس کا آکسیجن ماسک درست کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن پھر رک گیا۔ نفرت کی ایک بلند لہر اس کے اندر سے اٹھی...... اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد آیا کہ اس کی فتح کی خوشی کو لیوپڈ نے کس طرح برباد کیا تھا۔ سر پر لگنے والی جس شدید ضرب کے سبب وہ کئی دن کومے کی سی کیفیت میں رہا تھا، وہ اسی بدبخت کے پہلوان نما ساتھی نے لگائی تھی۔ اب وہ مر رہا تھا، اسے مرنا چاہیے تھا۔ عادل نے اس کی طرف سے نگاہیں پھیر لیں۔ یکا یک پاؤندوں کی طرف سے آٹومیٹک رائفل کا ایک برسٹ آیا...... اس چٹان پر چنگاریاں سی بکھر گئیں جس کے پیچھے یہ کشادہ خیمہ لگایا گیا تھا۔ چٹان کے کئی سنگریزے فضا میں اچھلے اور ان میں سے کچھ خیمے کی دیواروں سے ٹکرائے۔ یوں لگتا تھا کہ اب گھیرا ڈالنے والوں کی فائرنگ کے زاویے خطرناک ہوتے جا رہے ہیں۔

عادل نے ایک بار پھر لیوپڈ کی طرف توجہ کی۔ وہ بُرا دشمن تھا...... لیکن عادل خود کو اس کی مدد کرنے سے باز نہیں رکھ سکا۔ اپنے اندرونی جذبات کو دباتے ہوئے اس نے آکسیجن ماسک پھر اس کے منہ پر چڑھا دیا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا۔ لگتا تھا کہ وہ زیادہ دیر سانس کی ڈور سے بندھا نہیں رہے گا۔ اس کے پہلو میں ایک اور جسم کمبل تلے بے حرکت پڑا تھا۔ عادل نے اس جسم پر سے کمبل ہٹایا لیکن پھر جلدی سے واپس ڈال دیا۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ یہ بھی ایک لڑکی کی لاش تھی اور وہ اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ لارڈ اوتس کی شوخ و چنچل بیٹی ڈورتھی تھی۔ اس کا بالائی لباس بری طرح پھٹا ہوا تھا اور کومل جسم پر تشدد کے نشان تھے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ بھی پاؤندوں کی وحشت کا شکار ہوئی ہے۔ عادل کو اپنی آنکھوں میں نمی محسوس ہوئی۔ آخر "آبرو کا لٹیرا" کیا حاصل کرتا ہے آبرو لوٹنے سے۔ بس خوشی حاصل کرنے کی ایک سعی لاحاصل...... اور اس سعی لاحاصل کے آخر میں...... پچھتاوا، ندامت، کراہت...... اور اپنے ہی اوپر لعنت ملامت کرتا ہوا اپنا جسم۔

لیوپڈ کی طرح یہ ڈورتھی بھی عادل اور سرمد کے بدخواہوں میں سے تھی لیکن یہاں اسے اس حالت میں دیکھ کر عادل کو تکلیف ہوئی۔ اس کی نیم جان ٹانگوں میں لرزش بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر اپنے بچھونے پر گر پڑا۔ خیمے کے بالکل پاس سے ایک ہانپتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "میرے خیال میں کوئی زہریلی چیز ہے۔ شاید کوئی ایسڈ وغیرہ۔" یہ ہمایوں کی آواز تھی۔

"اب کیا ہوئیں گا۔ تو م کچھ کرو ہمایوں۔" یہ ڈری ڈری آواز کرسٹل کی تھی۔

"شاید ان کا معدہ صاف کرنا پڑے گا۔ سامان تو موجود ہے، میں ڈاکٹر سے بات کرتا ہوں۔" ہمایوں نے کہا۔

"ہام کو بہت ڈر لگتا۔" کرسٹل لرزتی کانپتی آواز میں بولی۔

عادل کے دماغ میں اب آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اس کے اردگرد بہت کچھ ہو رہا تھا اور خوف ناک تیزی سے ہو رہا تھا۔ اسے شہزادی، تاپا فراست اور سرمد کی خیر خبر ابھی تک نہیں ملی تھی اور یہی بات اسے سب سے زیادہ پریشان کر رہی تھی۔ وہ باہر نکلنا چاہتا تھا۔ شہزادی اور ہمایوں کو پکارنا چاہتا تھا لیکن اسے لگ رہا تھا کہ اس کا نچلا دھڑ ابھی بھی پوری طرح کام نہیں کر رہا۔ شاید ابھی فالج کے اثرات باقی تھے۔ گاہے بگاہے دماغ میں دھندی بھی بھر جاتی تھی۔ سر اور گردن کے پچھلے حصے کا درد تو پچھلے سفر سے ہی موجود تھا۔ کچھ دن پہلے لیوپڈ کے ساتھی نے کندا لے سے جو ضرب لگائی تھی، اس نے عادل کی اس تکلیف کو زبردست بڑھاوا دیا تھا۔ وہ ہمت کر کے اٹھا۔ سر میں ٹیس اٹھی۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ اسے چھوٹی نال والی ایک چینی رائفل کونے میں پڑی نظر آئی۔ رائفل کے دستے پر خون جما تھا اور حالات کی بدترین سنگینی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ عادل اپنے جسم کو سنبھالتا ہوا رائفل تک پہنچا۔ یہ چھوٹی سی رائفل اسے غیر معمولی طور پر وزنی محسوس ہوئی۔ اسے اندازہ ہوا کہ یہ رائفل کا بوجھ نہیں، یہ اس کے ہاتھوں کی ناتوانی ہے۔ وہ اپنے قویٰ کو ابھی مکمل طور پر استعمال کرنے کے قابل نہیں ہوا تھا۔ اسلحے کی جو تھوڑی بہت سمجھ اسے تھی، اس کے مطابق اسے پتا چلا کہ رائفل کا میگزین بالکل خالی ہے۔

اس نے رائفل ایک طرف رکھ دی۔ اتنی سی مشقت نے ٹانگوں پر لرزہ طاری کر دیا اور دماغ میں دھند بھر دی تھی۔ وہ لیٹ گیا...... اچانک ہمایوں کسی شخص کو گھسیٹا ہوا اندر داخل ہوا۔ وہ شخص رو رہا تھا۔ "وہ نہیں بچے گی، وہ ختم ہو جائے گی۔"

عادل نے آواز پہچان لی۔ یہ اسی جواں سال گائڈ مدثر کی آواز تھی جو قاسم وغیرہ کے ساتھ کیمپ تک پہنچا تھا۔ بعدازاں اس نے حالات کو کنٹرول کرنے میں سرمد اور عادل وغیرہ کی بہت مدد کی تھی۔ اس سفر میں اس کی نوجوان بیوی بھی شریک تھی۔ وہ قافلے کے لیے کھانے پکانے کا کام کر رہی تھی۔ شہزادی نے عادل کو اس کا نام فیروزہ بتایا تھا۔

مدثر ایک بار پھر دلدوز آواز میں پکارا۔ "وہ پہلے ہی کہتی تھی، میں نہیں بچوں گی...... نہیں بچوں گی۔"

ہمایوں گلوگیر آواز میں بولا۔ "بدفال منہ سے نہ نکالو۔ اللہ سے دعا کرو۔ اس کے لیے کچھ مشکل نہیں۔"

"مم...... میرا دل پھٹ جائے گا بابو جی...... میں اس سے بڑی محبت کرتا ہوں، میں نہیں جی سکتا اس کے بغیر۔"

"اسی لیے تو کہتا ہوں کہ دعا کرو۔ جن لوگوں سے پیار کیا جاتا ہے ان کے لیے دعائیں قبول ہوتی ہیں۔"

ہمایوں اسے دلاسا دینے لگا۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے کسی کے زہریلی چیز کھانے کی جو بات ہوئی تھی، وہ فیروزہ کے بارے میں ہی تھی۔ حالات کی سنگینی سے دل برداشتہ ہو کر اس نے کچھ کھا لیا تھا اور اب اس کی حالت خطرے میں تھی۔

باہر فائرنگ ایک بار پھر تیز ہو گئی تھی۔ عادل اسی طرح آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ ہمایوں...... مدثر کو دلاسا دیتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔

مدثر غالباً گھٹنوں میں سر دیے سسکیوں سے رو رہا تھا اور دعائیہ انداز میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ وہ چوڑے سینے والا ایک باہمت اور سخت جان پہاڑیا تھا لیکن...... فی الوقت ایک بچے کی طرح بلک رہا تھا۔ یہ سنگین ترین حالات کی ستم ظریفی ہی تھی کہ ایک کڑیل جوان یوں بے چارگی سے آنسو بہا رہا تھا۔

عادل کی سوچیں ایک بار پھر شہزادی اور سرمد کے گرد گھومنے لگیں۔ ان سنگین حالات میں اس طرح لاتعلق پڑے رہنا اسے کسی طرح گوارا نہیں تھا۔ اسے اپنے جسم کی ناتوانی پر جھنجلاہٹ محسوس ہونے لگی۔ اپنی ہانپتی ہوئی سانسوں پر اسے طیش آنے لگا۔

چند منٹ اسی طرح گزرے۔ عادل آنکھیں بند کیے پڑا رہا اور مدثر کی دعائیہ بڑبڑاہٹ سنتا رہا۔ پھر اسے محسوس ہوا کہ کوئی خیمے میں داخل ہوا ہے۔ یہ ہمایوں ہی تھا۔ مدثر نے لرزاں آواز میں پوچھا۔ "کیا ہوا بابو جی۔"

جواب میں ہمایوں کی آواز سنائی دی۔ مدثر غالباً اٹھ

بے چارگی

ٹرین کے ایک پورے ڈبے میں برات بیٹھی تھی ایک آدمی کو جب کہیں جگہ نہ ملی تو وہ بھی ٹرین کے اس ڈبے میں آ کے بیٹھ گیا ٹرین چل پڑی کچھ دیر بعد براتیوں نے ایک ڈبا کھولا اور اس میں سے میٹھے چاول نکالے اور ساری برات کو دیے لیکن اس آدمی کو نہ دیے۔ وہ چپ کر کے بیٹھا رہا کہ کوئی بات نہیں شاید انہوں نے مجھے دیکھا نہیں۔ تھوڑی دیر بعد براتیوں نے ایک اور ڈبا کھولا اور اس میں سے برفی نکالی اور ساری برات میں تقسیم کی لیکن اس آدمی کو نہ دی۔ اسے بہت غصہ آیا کہ ایک میں ہی باہر کا آدمی ہوں مجھے بھی دے دیتے تو کیا تھا۔ لیکن وہ ضبط کر کے بیٹھا رہا۔ تیسری دفعہ براتیوں نے لڈو نکالے اور سب کو ایک ایک لڈو دیا لیکن اس آدمی کو نظر انداز کر دیا۔ اب تو اس آدمی کو بہت غصہ آیا وہ کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔ اللہ کرے اس ڈبے پر بجلی گرے اور تم سب مر جاؤ۔ براتیوں میں سے ایک سیانا آدمی کھڑا ہوا اور بولا۔ "اگر اس ڈبے پر بجلی گری تو تم کیسے بچو گے؟" اس آدمی نے جواب دیا۔

"جیسے چاول، برفی اور لڈوؤں کی دفعہ بچ گیا تھا۔"

تلاش

میاں بیوی کی بول چال بند تھی۔ میاں کو سخت زحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ بیوی غصے میں کوئی کام نہیں کر رہی تھی۔ سب ترکیبیں منانے کی بیکار ہو گئیں۔ ایک روز دن کی روشنی میں چراغ جلایا اور کچھ ڈھونڈنے لگا۔ بیوی کو اس جستجو پر صبر نہ ہو سکا اور میاں سے پوچھا "کیا ڈھونڈ رہے ہو۔"

میاں چراغ پھینک کر بولا "تمہاری زبان ڈھونڈ رہا تھا شکر ہے بڑی تلاش کے بعد مل گئی۔"

مرسلہ: بابر عباس، گلیانہ روڈ کھاریاں

کھڑا ہوا تھا، وہ دلدوز انداز میں چلّایا۔ ”آپ چپ کیوں ہو بابو جی؟ کیا ہوا؟“

”اللہ کو یہی منظور تھا۔“ ہمایوں کی کراہتی ہوئی آواز ابھری۔

مدثر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ وہ پکار رہا تھا۔ ”فیروزہ..... فیروزہ!“ اس کے ساتھ ساتھ شاید وہ خیمے سے نکلنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ ہمایوں نے اسے سنبھال لیا تھا۔ اسے بازوؤں کے شکنجے میں کس لیا تھا۔ وہ خود بھی آبدیدہ تھا۔ اس نے روتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”وہ تینوں مر گئیں مدثر..... تینوں مر گئیں۔“

عادل پر انکشاف ہوا کہ زہریلی چیز کھانے والی ایک لڑکی نہیں تھی..... تین لڑکیاں تھیں۔ باقی دو کون تھیں؟

اگلا لمحہ بھی انکشاف انگیز تھا اور یہ ایسا انکشاف تھا جس نے عادل کو سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کے ناخنوں تک پتھر کر دیا۔ اسے لگا کہ کائنات کی گردش تھم گئی ہے اور وہ خود سیکڑوں ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر فضائے بسیط میں بکھر گیا ہے۔ ہمایوں نے روتے ہوئے دل فگار لہجے میں مدثر کو بتایا۔ ”ہاں، شہزادی، فیروزہ، نسرین..... تینوں ختم ہو گئیں.....“

یہ چھ سات الفاظ نہیں تھے، چھ سات قیامتیں تھیں جو چند ساعتوں میں عادل پر ٹوٹیں۔ کئی لمحے تک جیسے اس کے ذہن نے کام ہی نہیں کیا..... پھر اس کے حواس نے اسے بتایا کہ اس کے جینے کا جواز ختم ہو چکا ہے۔ وہ ہستی اب نہیں رہی جس کے لیے وہ زندگی کا زہر پی سکتا تھا۔ وہ مر گئی ہے، چلی گئی ہے۔ کچھ وحشی درندوں کے خوف سے اس نے اپنی زندگی کو اپنے ہاتھوں سے ختم کر لیا ہے۔ آنے والے دنوں کے سارے حسین سپنے وہ اپنے ساتھ لے کر موت کے اندھیروں میں اتر گئی ہے۔ اب وہ کبھی نہیں ہنسے گی، اب وہ کبھی اس کی چوڑیوں کی چھن چھن نہیں سنے گا۔ اب وہ کبھی اس کا ریشمی لمس محسوس نہیں کرے گا۔ زندگی سو برس بھی ہوئی تو یہ آگ کے سو سمندروں میں سے گزرنے جیسی ہوگی۔ تو پھر وہ بھی کیوں جیے گا؟ لیکن کیا وہ واقعی مر گئی؟ کہیں اس کے تخیل نے اسے کوئی بھیانک منظر تو نہیں دکھایا؟ کہیں وہ ابھی تک بے ہوشی کے اندھیروں میں تو نہیں ہے؟

وہ چلّا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ ہمایوں پر جھپٹا۔ اس نے ہمایوں کا گریبان پکڑ لیا۔ اپنے سینے کی پوری طاقت سے گرجا۔ ”ہمایوں! کیا بکواس کر رہے ہو، شہزادی کا نام کیوں لے رہے ہو؟ کیا ہوا ہے اسے؟ مجھے سچ بتاؤ کیا ہوا ہے اسے؟“ اس نے ہمایوں کو جھنجھوڑ ڈالا۔ اس کی قمیص پھاڑ دی۔

ہمایوں کا چہرہ غم و الم کی بے مثل تصویر تھا۔ اس نے کچھ کہا نہیں لیکن اس کی اشک بار آنکھوں میں عادل کو اپنی زندگی کی سب سے بھیانک خبر نظر آ گئی۔ عادل مچھلی کی طرح تڑپا اور باہر کی طرف لپکا۔ ہمایوں نے اس کی کمر میں دونوں ہاتھ ڈالے اور پوری طاقت سے اسے روکا۔ ”نہیں عادل! گولی چل رہی ہے، رک جاؤ۔“

وہ رکنے والا کہاں تھا۔ اس کے سینے میں تو ہزاروں ٹن بارود کے دھماکے ہو رہے تھے۔ وہ ہمایوں کو گھسیٹتا ہوا خیمے سے باہر آ گیا۔ ”شہزادی..... شہزادی۔“ وہ پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے چلّا رہا تھا۔

اب دن کا اجالا پھیل چکا تھا۔ برف پر لاشیں بکھری تھیں اور خون جما ہوا تھا۔ ہر طرف فائرنگ کی سماعت شکن تڑتڑاہٹ تھی اور گولیوں کے خول بکھرے ہوئے تھے۔ چٹانوں کی دوسری طرف پاؤندوں نے اور نشیب کی طرف کیمپ کے بچے کھچے گارڈز نے پوزیشنیں لے رکھی تھیں۔ عادل کو صاف محسوس ہوا، سنسناتی گولیاں اس کے سر اور کندھوں کے قریب سے گزر رہی ہیں۔ وہ موت کی سرگوشیاں سا رہی تھیں لیکن..... موت کی پروا اب کسے تھی؟ وہ شہزادی کو دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ ہمایوں کو اپنے ساتھ گھسیٹتا چلا جا رہا تھا..... اور پھر ایک بڑی چٹان کے پیچھے ایک سائبان کے نیچے اسے کچھ جسم نظر آئے۔ وہ برف پر بچھے Mats پر ساکت پڑے تھے۔ پہلا جسم کس کا تھا؟ پہلا جسم سرمد کا تھا۔ ان کے سینے پر..... عین دل کے مقام پر دو سرخ پھول کھلے ہوئے تھے۔ گولیاں انہیں چیر کر گزر گئی تھیں۔ ان کا جبڑا ایک سفید پٹی سے باندھ دیا گیا تھا۔ اس سے اگلی لاش مدثر کی جواں سال بیوی فیروزہ کی تھی..... اور اس سے اگلی شہزادی کی۔ اس کا رنگ ہلدی اور زعفران سے زیادہ زرد تھا۔ وہ جیسے ادھ کھلی آنکھوں سے سائبان کو دیکھ رہی تھی۔ گلوکوز کی ڈرپ کی سوئی اس کے بازو سے نکال کر اس کے سینے پر رکھ دی گئی تھی۔

”شہزادی!“ عادل درد و کرب میں ڈوب کر چلّایا۔ ایک گولی اس کے بازو کو چھیدتی ہوئی گزر گئی۔ اب ہمایوں کے علاوہ مشتاق اور ایک تیسرے شخص نے بھی عادل کو جکڑ لیا تھا۔ وہ اسے گولیوں کی براہِ راست زد سے نکالنا چاہ رہے تھے۔ وہ اسے طاقت سے کھینچتے ہوئے کچھ پیچھے لے آئے۔ عادل گر گیا۔ ہمایوں اور مشتاق بھی گر گئے۔

”مجھے چھوڑ دو..... مجھے مرنے دو۔“ عادل کی آواز فرطِ الم سے پھٹ کر ناقابلِ شناخت ہو گئی تھی۔

ہمایوں بھی اب طیش میں تھا۔ اس نے ایک جھٹکا دے کر اپنا گریبان عادل کے ہاتھ سے چھڑایا اور بولا۔ ”اگر مرنا ہی ہے تو پھر ان کو مار کر مرو جنہوں نے شہزادی کو مارا..... سرکو مارا۔“

گولیوں کی ایک بوچھاڑ ان کے سروں پر سے گزر گئی۔ وہ گرے پڑے تھے۔ اگر کھڑے ہوتے تو شاید چھلنی ہو جاتے۔ پھر عادل نے دیکھا، بلندی سے کریہہ شکلوں والے کچھ پاؤندے، رائفلیں اور چھوٹی کلہاڑیاں سونتے خیموں کی طرف لپک رہے ہیں۔ عادل نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا..... ہاں یہی تھے جنہوں نے سرمد کو مارا..... شہزادی کو مارا..... یہی درندے تھے۔ اور ان کا سرغنہ وہ کمینہ مالکانے زادہ تھا..... عادل نے انور کی لاش کے پاس سے ایک رائفل اٹھائی اور اندھا دھند پاؤندوں کی ٹولی کی طرف بھاگا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا، وہ کیا کر رہا ہے..... اور اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ اسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے تک اس کی ٹانگیں نیم جان تھیں اور وہ اپنے بازوؤں کو ٹھیک سے حرکت نہیں دے پا رہا تھا۔ اسے وہ گولی بھی یاد نہیں تھی جو کچھ دیر پہلے اس کے بازو میں اتری تھی اور شاید یہ بھی یاد نہیں تھا کہ زندگی نام کی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ پاؤندے اس کی طرف لپک رہے تھے اور وہ ان کی طرف لپک رہا تھا۔ پھر اس نے ٹریگر دبایا۔ دونوں طرف سے اندھا دھند گولیاں چلیں۔ وہ چنگھاڑتا گیا اور بھاگتا گیا۔ اس نے پاؤندوں کو زخمی ہو ہو کر گرتے دیکھا۔ اس کے اپنے بازو میں بھی ایک اور انگارا اترا لیکن وہ رکا نہیں۔ کم و بیش پانچ پاؤندوں کو ڈھیر کرتے ہوئے وہ ایک قدِ آدم چٹان کی اوٹ میں گرا۔

اس کی رائفل خالی ہو چکی تھی۔ اس نے دیکھا، ہمایوں بھی سرپٹ ہانپتا اس کے پیچھے آ رہا ہے۔ اس نے آٹومیٹک رائفل کے دو بھرے ہوئے میگزین عادل کی طرف پھینکے اور خود عادل سے بھی چند قدم آگے جا کر ایک پتھر کے پیچھے پوزیشن لے لی۔ کسی نے عادل کے شانے کے ساتھ شانہ ملایا۔ عادل نے دیکھا یہ فیروزہ کا شوہر مدثر تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی شعلے رقصاں تھے۔ چارج کرنے کے دوران میں کارتوس کے دو تین چھرے مدثر کی کلائی میں لگے تھے۔ خون بہہ رہا تھا لیکن اسے کوئی احساس نہیں تھا۔

ہمایوں نے عادل کو مخاطب کرتے ہوئے پکارا۔ ”عادل! اس سامنے والی چوٹی پر ان کی گن ہے۔ وہی سب سے زیادہ مار رہی ہے۔ اس کو نہیں چھوڑنا۔“

اس کے ساتھ ہی ہمایوں اٹھ کر بھاگا۔ اس کا یہ اقدام نہایت پُرخطر تھا لیکن خطرے کی پروا شاید اب ان تینوں کو نہیں تھی..... اور عادل کو تو بالکل بھی نہیں۔ ایک لحظہ ضائع کیے بغیر وہ بھی ہمایوں کے پیچھے لپکا۔ عقب سے مدثر نے انہیں Cover فائر دیا۔ عادل اور ہمایوں دوڑتے..... گرتے اور اٹھتے، برفیلے ٹیلے کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ وہ زخمی شیروں کی طرح پاؤندوں کے اس مورچے پر جھپٹے۔ یہاں ایک ایم جی 42 مشین گن تھی اور چھ کے قریب افراد تھے۔ یہ سب نہایت سخت دل، لٹیرے اور قاتل تھے لیکن عادل اور ہمایوں کی دیوانی جھپٹ نے انہیں چند سیکنڈ کے لیے مسمرائز کر دیا تھا۔ غالباً اسی کیفیت میں وہ اپنی خطرناک جرمن مشین گن کا بھرپور استعمال بھی نہیں کر پائے تھے۔ عادل اور ہمایوں نے تین چار سیکنڈ کے اندر چالیس کے قریب گولیاں برسائیں اور انہیں بھون کر رکھ دیا۔ ان میں سے فقط ایک شخص جان بچا کر بھاگا، وہ پاؤندہ نہیں لگتا تھا۔ عادل نے اسے پہچان لیا۔ وہ دراز قد ناصر تھا۔ وہ حواس باختہ ہو کر مخالف سمت میں دوڑا۔ عادل نے ایک لحظہ ضائع کیے بغیر اس کی پشت پر گولی چلائی۔ رائفل میں سے ”ٹھک“ کی آواز نکل کر رہ گئی۔ میگزین خالی ہو چکا تھا۔ دوسرا میگزین لگانے کی مہلت نہیں تھی۔ عادل رائفل کو نال کی طرف سے پکڑ کر ناصر کے پیچھے بھاگا۔ صرف پندرہ بیس قدم بھاگ کر اس نے اسے جا لیا۔ وہ عادل کے نیچے اوندھا گرا اور ڈھلوان برف پر دونوں دور تک پھسل کر ایک برفاب گڑھے میں گرے۔ یہاں گولیوں کی بوچھاڑیں بے اثر تھیں۔ ناصر نے پلٹ کر دیکھا تو اسے عادل کی آنکھوں میں اپنی موت نظر آئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، عادل نے جنونی انداز میں رائفل کو لاٹھی کی طرح ناصر کے سر پر رسید کیا۔ آہنی دستے نے اس کی پیشانی پھاڑ دی..... وہ گھگیایا۔ ”عادے! میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں..... میں تو لڑائی رکوانے کی.....“

”بکواس بند کر۔“ عادل چنگھاڑا۔ ”میں نے سب کچھ سنا ہے۔ تو قاتل ہے، غدار ہے۔ کتے کی موت ماروں گا تجھے۔“ (یہ وہی نوری نت تھا جو اس کے دل و دماغ میں بسا ہوا تھا) اس نے پے در پے رائفل کے دستے کی تین ضربیں اس کے سر پر لگائیں۔ وہ لہو میں نہا گیا اور گھٹنوں پر گر گیا۔ ”تو نے مارا ہے میری شہزادی کو۔ تو نے۔“ عادل دیوانی آواز میں بولا۔ ناصر کی آنکھوں میں ہراس اور دہشت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس نے ایک بار پھر اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن اب وہ اس قابل نہیں رہا تھا۔ عادل کی دو

اور ضربوں نے اس کی کھوپڑی توڑ ڈالی۔ سرخ خون میں سفید مغز کی جھلک نظر آئی۔ لالی گاؤں کا بدد ماغ چھوٹا چودھری زندگی کی رمق سے خالی ہو چکا تھا۔

چند سیکنڈ بعد ہمایوں اور مدثر بھی بھاگتے ہوئے عادل کے پاس پہنچ گئے۔ ان تینوں کی ٹانگیں پنڈلیوں تک برفیلے پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ درحقیقت ایم جی 42 مشین گن والے مورچے پر قبضہ کرکے انہوں نے ایک بڑی کامیابی حاصل کرلی تھی۔ یہ جگہ کافی بلندی پر تھی۔ پاؤندوں کی باقی پوزیشنیں یہاں سے صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ اب اگر ایک بھرپور حملہ اور کیا جاتا تو نہ صرف پاؤندوں کا گھیرا ٹوٹ جاتا بلکہ وہ تہس نہس بھی ہوتے۔

عادل، ہمایوں اور مدثر کی غیر معمولی دلیری و جانبازی نے کیمپ کے بچے کھچے افراد کے حوصلے بھی بڑھا دیے تھے۔ قریباً دس مقامی و غیر مقامی افراد اب عادل اور ہمایوں کے ساتھ تھے اور مرنے یا مارنے کے لیے بالکل تیار تھے۔ ان کا لیڈر ورزشی جسم اور تمتماتے چہرے والا ایک نوجوان تھا۔ اس کی آنکھوں میں آگ تھی اور پیشانی پر سرخ پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ہمایوں کی خاموش آنکھوں میں ایک نیلی آگ تھی۔ شاید وہی آگ جو پچھلے ساڑھے تین سو برس سے اس کے خون میں سفر کر رہی تھی۔ راجپوتوں کی عورتیں مرگئی تھیں اور وہ خود بھی مر گئے تھے۔ عورتیں تو آج بھی مرگئی تھیں لیکن انتقام لینے والے ابھی زندہ تھے۔ کیا آج وہ ادھورا کام مکمل ہوسکے گا؟ کیا آج وہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ سکے گا؟ یقیناً ہمایوں کی آنکھوں جیسی آگ عادل کی آنکھوں میں بھی روشن تھی لیکن اسے اپنی آنکھیں نظر نہیں آرہی تھیں۔ ہاں اپنے رخساروں پر رینگنے والے آتشیں آنسوؤں کی حدت وہ ضرور محسوس کر رہا تھا۔ سر سرمد اور شہزادی کی لاشوں کو دیکھنے کے بعد زندگی اور موت میں اس کے لیے ایک ذرّے کا فرق بھی نہیں رہا تھا۔

”وہ بوکھلائے ہوئے ہیں، ہمیں ان کو سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہیے۔“ ہمایوں مہیب آواز میں بولا۔

ایک پٹھان پورٹر نے کہا۔ ”اگر ام دو ٹولیوں میں بٹ جائے تو زیادہ اچھا ہے۔ ایک ٹولی چکر کاٹ کر دائیں طرف چلی جائے۔ وہ وہاں سے فائرنگ شروع کرے تو ام سامنے سے ہلّا بول دے۔“

ایک دوسرے شخص نے کہا۔ ”یا تھوڑا انتظار کیا جائے۔ ان کو آگے آنے کا موقع دیا جائے۔“

تیسرے شخص نے کوئی اور بات کی۔ یہ باتیں جیسے کسی دور دراز گونج کی طرح عادل کے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ وہ ہر حکمتِ عملی اور مصلحت کے مرحلے سے گزر چکا تھا۔ اس کے کانوں میں بس شہزادی کی آخری ہنسی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بس اس کی آخری جھلک تھی۔ وہ اپنی رائفل سے نیا میگزین اٹیچ کر چکا تھا۔ اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھے بغیر، ایک لفظ بھی کہے بغیر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور پاؤندوں کی پوزیشنوں کی طرف دوڑا۔ ایک لمحہ ساکت رہنے کے بعد ہمایوں اور مدثر بھی اس کے پیچھے دوڑے۔ اب باقیوں کے لیے بھی کوئی آپشن نہیں رہ گیا تھا۔ ان سب نے بھی ان تینوں کو فالو کیا...... للکارتے، نعرے مارتے اور گولیاں برساتے وہ پاؤندوں کی پوزیشنوں کی طرف دوڑے۔ سچ ہی کہتے ہیں کہ لڑائی کے میدانوں میں قسمت ہمیشہ دلیروں کا ساتھ دیتی ہے اور یہ تو دلیری سے بھی آگے کی بات تھی۔ ایک جنون...... ایک وحشت...... سامنے سے گولیوں کی باڑیں آئیں۔ قرب و جوار اندھادھند دھماکوں سے گونجے۔ عادل، ہمایوں کے ساتھیوں میں سے دو تین افراد زخمی ہوکر گرے، باقی للکارتے ہوئے پاؤندوں کی پوزیشنوں پر جا پڑے۔ پہلے گولیاں چلیں پھر دست بدست لڑائی ہوئی۔ رائفلوں کی سنگینیں چمکیں، کلہاڑیاں لہرائیں۔ تیز دھار چاقو متحرک ہوئے۔ گوشت سے لوہا ٹکرایا۔ جسموں سے خون اچھلا...... جنون غالب آگیا...... ہراس پسپا ہوتا چلا گیا۔ ہمیشہ سے ایسا ہوتا آیا ہے، ہمیشہ ایسا ہوتا رہے گا۔ جن کی زندگیاں لٹ جاتی ہیں، جن کی کشتیاں جل جاتی ہیں، جنہیں اپنے پیاروں کو اپنے ہاتھوں سے مار کر اذیت ناک موت سے بچانا پڑتا ہے...... وہ پھر خود بھی زندگی سے دور چلے جاتے ہیں، ان کو مرنے کا ڈر نہیں رہتا...... اور تاریخ گواہ ہے جن کو موت کا ڈر نہیں رہتا، وہ اپنے دشمنوں کی زندگیوں کے مالک بن جاتے ہیں۔

پاؤندے تعداد میں کثیر تھے۔ ان کے پاس وقتاً فوقتاً سیاحوں سے لوٹا ہوا اور بارڈر سے خریدا ہوا جدید اسلحہ تھا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا شاید کہ ان پر ایسا مہلک ہلّا بولا جائے گا۔ ان میں سے بہت سے زخمی ہوئے۔ بہت سے موقع پر ہی مارے گئے اور باقی محاصرہ چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ موت کا سندیسہ لے کر سرسراتی ہوئی گولیوں نے ان کا تعاقب کیا اور وہ زخم کھا کھا کر برف پر گرے۔ ان میں سے کم ہی تھے جو بچ کر نکلے۔ عادل دیوانوں کی طرح کسی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ ان کے سرغنہ مالکانے زادہ...... کو ڈھونڈ رہا تھا۔ وہی بدخصلت شرابی جس نے لاہور کے گلی کوچوں تک

اس کا تعاقب کیا تھا۔ وہ عادل کے ماموں کا قاتل تھا اور عاصم کو شدید زخمی کرنے والا بھی وہی تھا۔ اس کے علاوہ شہزادی کو اس برفستان تک پہنچانے اور پھر زندگی سے دور کر دینے کی ذمے داری بھی اسی شیطان صفت شخص پر آتی تھی...... اور پھر وہ عادل کو مل گیا۔ وہ گولیوں سے چھلنی ہوجانے والی چند لاشوں کے پیچھے پڑا تھا اور خود بھی لاش میں تبدیل ہونے والا تھا۔ اس کی ناف اور پیٹ میں پورا ایک برسٹ لگا ہوا تھا۔

عادل نے مزید دیکھا، مالکانے زادہ کے شرابی چہرے اور اس کی گردن پر کھرونچوں کے دو تین دن پرانے نشان تھے۔ اس کے قریب ہی برف پر ایک جھمکا اور ایک زنانہ سینڈل بھی نظر آیا۔ یقیناً یہ سرکردہ پاؤندہ مقامی اور غیر مقامی عورتوں کی عصمت دری میں بھی ملوث رہا تھا۔ جھمکا تو کسی مقامی لڑکی کا تھا (ایسی کئی لڑکیاں ستارا برادری کے مقامی ”دوست خاندانوں“ میں شامل تھیں) سینڈل دیکھ کر عادل کو شک ہوا کہ یہ صحافی خاتون یا پھر اولس کی بیٹی ڈورتھی کا ہے۔

مالکانے زادہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ ایک حریص دنیادار کی طرح وہ اب بھی جینا چاہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی بچ جانے اور جینے کی خواہش تھی۔ عادل کی آنکھوں میں شعلے تھے، اس نے رائفل اٹھائی اور مالکانے زادہ کی اس خواہش کے درجنوں ٹکڑے کر دیے۔ اس نے اس بے رحم پاؤندے کے چہرے پر سیون ایم ایم کے دو برسٹ مارے اور اس کے نقوش اڑا کر رکھ دیے۔ اس کے بعد بھی وہ رکا نہیں، اس نے قریب پڑا ہوا ایک شکاری چاقو اٹھایا اور مالکانے زادہ پر پل پڑا۔ وہ اس کی چھاتی پر پے درپے وار کرتا رہا اور پکارتا رہا۔ ”تو نے میری شہزادی کی جان لی۔ تو نے سر سرمد کی جان لی......“

پھر ایک دم اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ اس کے بازو پر دو گولیاں لگ چکی ہیں اور زخموں سے لگاتار خون بہتا رہا ہے۔ وہ تو پہلے ہی شدید نقاہت اور ناتوانی کے گھیرے میں تھا۔ خون کا مسلسل اخراج اسے بالکل نیم جان کر چکا تھا۔ وہ تیورا کر مالکانے زادہ کی لاش کے اوپر ہی گرا۔ بے ہوشی نے پھر اسے ڈھانپنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اس حالت میں بھی بڑبڑا رہا تھا۔ ”شہزادی...... شہزادی!“ کچھ دیر بعد اس کی بڑبڑاہٹ ختم ہوگئی۔

اس کے قریب ہی ہمایوں کسی مجسمے کی طرح ساکت و جامد کھڑا تھا۔ اس کی سرخ انگارہ آنکھوں میں اب نمی تھی۔ وہ یک ٹک مالکانے زادہ کی لاش کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے دل نے ہمیشہ یہ گواہی دی تھی کہ اس بدمعاش عامل کی رگوں میں انہی بے رحم قاتلوں کا خون ہے جنہوں نے زن اور زمین کے لالچ میں اس کے قبیلے کو تاراج کیا تھا۔ مالکا قاتلوں کا وارث تھا اور ہمایوں مقتولوں کا...... اور آج کئی صدیوں بعد وہ ایک نئے روپ میں ایک دوسرے کے سامنے موجود تھے۔

☆☆☆

عادل ایک بار پھر بے ہوشی کے حصار میں تھا۔ اس حصار میں پھر نیم بے ہوشی کے چھوٹے چھوٹے وقفے بھی آرہے تھے۔ ایسے ہی ایک وقفے کے دوران میں اس نے ہیلی کاپٹر کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ محسوس کی...... اور اسے یوں لگا کہ اس کے زخمی بازو پر کوئی تیز دھار آلہ کٹ...... لگ رہا ہے۔ اس نے خود کو کسی ہنڈولے میں جھولتے ہوئے محسوس کیا۔

پھر نیم بے ہوشی کا ایک وقفہ ایسا آیا جب اسے لگا کہ رات ہے اور وہ کسی تیز رفتار گاڑی میں سفر کر رہا ہے۔ ملی جلی آوازیں تھیں جو گانے لگا ہے اس کی سماعت سے ٹکراتی تھیں۔ سر سرمد اور شہزادی کی لاشوں کا منظر اس کے ذہن میں نہیں تھا لیکن یہ احساس ضرور موجود تھا کہ اس کے ساتھ کچھ بہت خوفناک ہو چکا ہے۔ کوئی بہت گمبھیر حادثہ۔ وہ عالمِ بے ہوشی میں بھی اس حادثے کا بوجھ اپنے سینے پر محسوس کر رہا تھا۔

ایک بار جب اس کی بے ہوشی کی شدت کم ہوئی، اس کے نتھنوں سے اسپرٹ کی تیز بو ٹکرائی، وہ کسی نرم بستر پر تھا...... اسے سر سرمد اور شہزادی کی لاشیں یاد آگئیں...... اسے سر سے پاؤں تک ایک آتشیں غم نے ڈھانپ لیا۔ کہیں وہ اس کا تصور تو نہیں تھا؟ جاگتی آنکھوں کا خواب تو نہیں تھا؟ وہ بری طرح تڑپا۔ اس نے نیم بے ہوشی کے حصار سے نکلنے کی کوشش کی...... اور نکل آیا۔

اس کی دھندلائی ہوئی نگاہوں کے سامنے ایک سفید چھت تھی۔ دو تین افراد اس پر جھکے ہوئے تھے اور ان کے چہرے عادل کو اپنے سامنے نظر آرہے تھے۔ ان میں سے ایک چہرہ کسی نرس کا تھا۔ سفید کوٹ والے ایک ادھیڑ عمر شخص نے اپنا ہاتھ نرمی سے اس کے سینے پر رکھا اور بولا۔ ”نہیں...... لیٹے رہو...... ابھی اٹھنا تمہارے لیے ٹھیک نہیں۔“

وہ زور لگا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے زخمی بازو اور سر میں شدید ٹیسیں اٹھیں۔ اسے پہلا احساس یہی ہوا کہ اس کا جسم اب پہلے کی طرح مفلوج نہیں ہے۔ اس کا گلا آنسوؤں سے

بھر گیا۔ وہ زور لگا کر بولا۔ ”میں کہاں ہوں...... ہمایوں کہاں ہے؟ تایا جی کہاں ہیں؟“

ادھیڑ عمر ڈاکٹر بولا۔ ”وہ بھی یہیں ہیں۔ وہ ابھی تم سے ملنے آتے ہیں لیکن ابھی تم لیٹے رہو۔“

”مجھے بتاؤ میں کہاں ہوں؟ باقی سب کہاں ہیں؟“ وہ چنگھاڑا۔

”تم اس وقت راولپنڈی کے اسپتال میں ہو۔ ہمایوں اور تمہارے تایا بھی یہیں ہیں......“

عادل کے ذہن میں سر سرمد اور شہزادی کی لاشوں کا منظر آسمانی بجلی کی طرح چمکا اور اس کی ہمت اور برداشت کو خاکستر کر گیا۔ وہ دلدوز لہجے میں پکارا۔ ”کہاں ہیں میرے سر؟ کہاں ہے شہزادی؟ میں ان کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ ہمایوں کو بلاؤ...... ہمایوں بھائی...... ہمایوں بھائی۔“ وہ چلانے لگا۔ دس پندرہ سیکنڈ پہلے اسے اپنی کلائی میں چبھن محسوس ہوئی تھی۔ شاید کلائی میں لگے ہوئے ”برانولا“ میں کوئی دوا انجیکٹ کی گئی تھی۔ اس دوا کا اثر تیزی سے اس کے خون میں شامل ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی پلکوں پر بوجھ محسوس کیا۔ ذہن میں دھندی بھرنے لگی۔ اس نے بے قرار ہو کر بستر سے اٹھنے کی کوشش کی مگر بس ٹانگوں کو حرکت دے کر رہ گیا۔ کسی نے اس کی پشت پر مضبوطی سے ہاتھ رکھا اور اس کے گرتے ہوئے جسم کو سہارا دے کر بستر پر لٹا دیا۔

وہ عجیب سے شب و روز تھے۔ عالم بے خبری میں بھی اس کے ذہن میں یہ احساس موجود تھا کہ اسے گاہے بگاہے انجکشن لگائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے اس کا ذہن ایک سکون بخش تاریکی میں ڈوب جاتا ہے۔ ایک دو بار اسے یوں بھی محسوس ہوا کہ وہ سفر میں ہے پھر ایک بار اسے اپنے بالکل قریب ہی ہمایوں کی آواز بھی سنائی دی۔ اس نے اپنے حواس پر چھائی ہوئی دبیز دھند میں سے نکلنے کی کوشش کی اور جزوی طور پر کامیاب ہوا۔ اسے لگا کہ شاید وہ سر سرمد کے گھر میں ہے۔ اگر وہ سر سرمد کے گھر میں تھا تو پھر یقیناً لاہور پہنچ چکا تھا۔ کھڑکی سے باہر اسے ایک چھوٹا ٹریکٹر نظر آیا اور وہ سرسبز کھیت بھی نظر آیا جس میں سر سرمد اپنے ہاتھوں سے کام کیا کرتے تھے۔ اس کے گلے میں ایک بار پھر آنسوؤں کا آبشار گرنے لگا۔ ”ہمایوں بھائی...... کہاں ہو تم...... ہمایوں بھائی۔“

چند لمحے بعد اسے دروازے میں ہمایوں کی غمزدہ صورت نظر آئی۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے دس پندرہ روز سے شیو نہیں کی۔ اس کے ایک ہاتھ پر ابھی تک پٹی بندھی ہوئی تھی۔ یہ پٹی یقیناً اسی خون ریز لڑائی کا نتیجہ تھی جو نوبل راک کی قریبی ڈھلوانوں پر ان کے اور پاؤندوں کے درمیان ہوئی تھی۔ دروازے کی دوسری جانب سر سرمد کا ایک ملازم نظر آیا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے فرش پر بیٹھا تھا اور غم واندوہ کی تصویر نظر آتا تھا۔

ہمایوں بستر پر بیٹھ گیا اور عادل کو گلے سے لگا لیا۔ دونوں سسک اٹھے۔ پندرہ بیس سیکنڈ اسی طرح بیٹھے رہے پھر عادل نے دلدوز آواز میں پوچھا۔ ”ہمایوں بھائی! کہاں چھپا دیا ہے میرے سر کو؟“

وہ آنسو پونچھ کر بولا۔ ”وہ جہاں بھی ہیں، بہت خوش ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ ہماری نسبت، بہت اچھی جگہ پر ہیں۔ اللہ اپنے ایسے بندوں کو شاید ساری تکلیفیں دنیا میں ہی دے دیتا ہے۔“

عادل زار و قطار روتے ہوئے بولا۔ ”اور شہزادی......؟“

ہمایوں نے دلاسا دینے والے انداز میں اس کی پشت تھپکی اور اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ اسی دوران میں ادھیڑ عمر ڈاکٹر اور جواں سال نرس کی شکل دوبارہ نظر آئی۔ ڈاکٹر نے ذرا تحکم سے کہا۔ ”ہمایوں! آپ باہر جاؤ۔ میں نے کہا بھی ہے کہ ابھی اس کے لیے کوئی جذباتی ہلچل ٹھیک نہیں۔“

ہمایوں آنسو پونچھتا ہوا باہر نکل گیا۔ عادل کو اندازہ ہوا کہ نرس اسے پھر انجکشن لگانا چاہ رہی ہے۔ اس نے انجکشن لگوانے سے انکار کر دیا۔ تاہم ڈاکٹر نے اسے سمجھایا بجھایا اور اصرار کر کے انجکشن لگا دیا۔ عادل خود بھی محسوس کرنے لگا تھا کہ اس کا سر درد سے پھٹنے لگا ہے۔ شاید ابھی یہ انجکشن اس کے لیے ضروری تھے۔

☆☆☆

وہ ستمبر کی آخری تاریخوں کی ایک نیم خنک رات تھی۔ آج شاید عادل کو انجکشن نہیں لگایا گیا تھا۔ اس کے حواس پر چھائی ہوئی دبیز دھند آج کچھ چھٹی ہوئی تھی۔ وہ بستر پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کا ہاتھ ہمایوں کے ہاتھوں میں تھا۔ ہمایوں نے اسے بتا دیا تھا کہ سر سرمد نے کن حالات میں اور کیسے جان دی۔ اس نے بتایا تھا کہ آخری لڑائی سے دو دن پہلے، صبح کے وقت اس نے دیکھا تو سر سرمد اپنے خیمے میں موجود نہیں تھے۔ ان کی بیساکھیاں بھی کہیں نظر نہیں آئیں۔ وہ سر کو ادھر ادھر تلاش کرتا رہا پھر اسے سر کے بیگ کے نیچے ایک کاغذ دبا ہوا نظر آیا۔ یہ سر کا لکھا ہوا تھا۔ یہ خط کچھ اس طرح تھا۔ ”ہمایوں اور کرسٹل! تم لوگ دیکھ ہی رہے ہو کہ حالات کیا سے کیا ہو گئے ہیں۔ اس میں

کسی کا کوئی قصور نہیں، بس قدرت کی طرف سے ایک سخت آزمائش ہے جو ہم پر آئی ہے۔ تم لوگوں نے دیکھ ہی لیا ہے، مالکا اور اس کے ساتھی کچھ بھی سننے کو تیار نہیں۔ وہ بے دریغ مار رہے ہیں اور گھیرا تنگ کر رہے ہیں۔ ان کا پہلا مطالبہ یہی ہے کہ خناب گل کے قاتل کو ان کے حوالے کیا جائے...... وہ عادل کو مانگ رہے ہیں۔ شاید یہ بات تمہارے اور کرسٹل کے لیے انکشاف کی حیثیت رکھتی ہو کہ پچھلے تین روز سے میں مالکا کے ساتھ رابطے میں ہوں۔ یہ رابطہ ایک وائی ٹاکی کے ذریعے ہو رہا ہے۔ میں نے مالکا سے کہا تھا کہ دونوں طرف سے جانیں ضائع ہو رہی ہیں۔ میں نے اسے آفر کی تھی کہ اگر وہ خون کا بدلہ خون چاہتا ہے تو میں خود کو اس کے حوالے کرنے کو تیار ہوں لیکن شرط یہی ہے کہ وہ اس کے بعد محاصرہ اٹھا لے گا اور پکڑے جانے والوں کو بھی رہا کر دے گا۔ ہاں قیمتی سامان اور کیش وغیرہ کی صورت میں اس نے جو کچھ لوٹا ہے، وہ اس کے پاس ہی رہے گا۔

”آج رات مالکا نے زادہ نے ایک دو مزید شرطوں کے ساتھ یہ آفر قبول کر لی ہے۔ تم لوگ مجھے معاف کرنا۔ میں مزید جانی نقصان سے بچنے کے لیے اور آبرو ریزی کے اس گھناؤنے سلسلے کو ختم کرنے کے لیے خود کو مالکا کے حوالے کر رہا ہوں۔ مجھے پتا ہے کہ مقتول خناب گل کا باپ رواج کے مطابق مجھے اپنے ہاتھ سے گولی مارنا چاہتا ہے۔ میں اس کے لیے بالکل تیار ہوں۔ میری عمر اس وقت ساٹھ سال ہے اور شکر الحمدللہ میں نے ایک بھرپور زندگی گزاری ہے۔ اگر اپنے بچے بچیوں کے لیے مجھے اپنی جان دینا پڑتی ہے تو میرے لیے اس سے اچھا سودا اور کوئی نہیں ہے۔ اندیشہ صرف ایک بات کا ہے اور وہ یہ کہ مالکا اپنے وعدے سے پھرنے کی کوشش نہ کرے۔ یہ بات ممکن ہے کہ مجھے مارنے کے باوجود وہ کیمپ کا محاصرہ ختم نہ کرے۔ اگر ایسا ہوا تو پھر تم لوگ اپنا فیصلہ کرنے کے لیے آزاد ہو لیکن میرے بچو! یہ میرے دل کی گواہی ہے کہ اگر پاؤندوں نے اور مالکا نے یہ بدعہدی کی تو ان پر ضرور اللہ کی مار آئے گی۔ وہ بدترین شکست کا شکار ہوں گے اور تم دیکھ لینا ایسا ہی ہوگا۔ میں نے ایک خط علیحدہ سے اپنی شریک حیات فائزہ کے لیے بھی لکھ دیا ہے اور اس میں اسے ضروری ہدایات بھی دے دی ہیں۔ تم جانتے ہو، میں اس کی طرف سے بھی بالکل مطمئن ہوں۔

”اب میں جا رہا ہوں، اس خواہش اور دعا کے ساتھ کہ میری اس چھوٹی سی حقیر قربانی کے بدلے اللہ تعالیٰ تم بچوں کی زندگیوں کو محفوظ بنائے اور انہیں خوشیوں اور راحتوں سے بھر دے۔ خدا حافظ۔“

یہ خط پانے کے بعد ہمایوں دیوانہ سا ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ سرمد صاحب نے اپنی تحریر میں صاف لکھا تھا کہ وہ حجت پوری کر رہے ہیں ورنہ انہیں اس بات کا شدید اندیشہ ہے کہ مالکا کی طرف سے بدعہدی سامنے آ سکتی ہے اور پھر یہی ہوا۔ دن کا اجالا پھیلنے کے کچھ ہی دیر بعد اوپر چٹانوں کے پیچھے گرانڈیل مالکا نے زادہ نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ ایک اور مسلح شخص بھی تھا۔ مالکا نے زادہ نے سرمد صاحب کو ایک ڈھال کی صورت میں اپنے سامنے رکھا ہوا تھا۔ مالکا نے زادہ کی آٹومیٹک ایم 16 رائفل سر سرمد کی کنپٹی سے چھو رہی تھی۔ سر سرمد کا دوسرا بازو مالکا نے زادہ کے ساتھی کی گرفت میں تھا۔

مالکا نے زادہ نے مقامی زبان میں پکار کر کہا۔ ”یہ چاچا اکیلا خناب گل کا قاتل نہیں ہے۔ ہمایوں اور عادل بھی اس قتل میں برابر کے حصے دار ہیں۔ وہ بھی خود کو ہمارے حوالے کریں۔ اس کے بعد ہی ہم کوئی رعایت دے سکتے ہیں۔“

ہمایوں نے پکار کر کہا تھا۔ ”تم اپنی بات سے پھر رہے ہو۔ تم اس قابل ہی نہیں ہو کہ تم سے کسی طرح کا سمجھوتا کیا جائے۔“

مالکا بولا۔ ”اور تم بھی اس قابل نہیں ہو۔ تمہارے پاس ہے کیا، ہمیں دینے کے لیے؟ جو کچھ بھی ہے، وہ ہم اپنے زور پر حاصل کر سکتے ہیں۔ سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر تھوڑی بہت بچت چاہتے ہو تو اپنے ہتھیار پھینک کر اور اپنے کمینے دوست کو لے کر اوپر آ جاؤ۔“ یہ مکالمہ دو چار منٹ جاری رہا۔ مالکا اور اس کا تنومند ساتھی مسلسل اپنا دباؤ بڑھا رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ہمایوں اور عادل خود کو ان کے حوالے کر دیں ورنہ وہ سرمد صاحب کو شوٹ کر دیں گے۔ سرمد صاحب کی زندگی ہمایوں کے لیے ہر شے سے زیادہ عزیز تھی۔ اس وقت عادل بے ہوشی کی حالت میں تھا لیکن ہمایوں تو ہوش میں تھا اور اپنی آنکھوں کے سامنے جیتے جاگتے سرمد صاحب کو شدید خطرے میں دیکھ رہا تھا۔ وہ تذبذب میں تھا کہ کیا کرے۔ دوسری طرف شاید سرمد صاحب بھی جان گئے تھے کہ ان کی وجہ سے ہمایوں اور عادل کی زندگیاں داؤ پر لگ سکتی ہیں۔ انہوں نے اس ”بدلی ہوئی صورت حال“ میں وہی کیا جو ان جیسے بے خوف اور باہمت شخص کو کرنا چاہیے تھا۔ ہمایوں اور اس کے ساتھیوں نے دیکھا کہ اچانک سرمد صاحب کی ایک بیساکھی ہوا میں لہرائی اور تنومند شخص کے پستول والے ہاتھ پر لگی۔

اس جچی تلی ضرب نے پستول اس پاؤندے کے ہاتھ سے چھڑا دیا۔ سرمد صاحب اپنی بیساکھیوں سمیت پستول کے اوپر گرے۔ انہوں نے پلٹ کر دو فائر کیے اور خود پر جھپٹتے ہوئے پاؤندے کو ڈھیر کر دیا۔ مالکا نے زادہ نے چنگھاڑ کر سرمد صاحب پر گولی چلائی۔ ایک فائر ان کے سینے پر لگا لیکن وہ کمال ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مالکا نے زادہ پر جا پڑے۔ دونوں اوپر نیچے گرے اور گتھم گتھا ہو گئے۔

ہمایوں اور اس کے ساتھیوں نے آگے بڑھنا چاہا مگر پاؤندوں کی طرف سے اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی۔ ہمایوں اور اس کے دیگر ساتھیوں میں سے دو افراد شدید زخمی ہو کر گرے۔ اس کے بعد انہوں نے بھی پوزیشنیں لے کر فائرنگ شروع کر دی۔ درمیان میں مالکا اور سرمد صاحب کے بیچ زندگی موت کی لڑائی جاری تھی۔ سرمد صاحب ادھیڑ عمر تھے، مالکا درمیانی عمر کا تھا اور نسبتاً جاندار بھی تھا۔ پھر بھی سرمد صاحب نے اس کی حیران کن مزاحمت کی۔ وہ پستول دوبارہ استعمال نہیں کر سکے تھے۔ شاید اس میں گولی پھنس گئی تھی یا پھر وہ ویسے ہی ان کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ وہ اپنی پوری طاقت سے مالکا کی رائفل کا رخ موڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر رائفل سے ایک اور گولی چلی۔ یہ گولی بھی سرمد صاحب کو چھاتی پر ہی لگی۔ ان لمحوں میں یوں محسوس ہوا جیسے سرمد صاحب مکمل طور پر زیر ہو گئے ہیں لیکن نہیں...... ابھی ان کی غیر معمولی سخت جانی و سخت کوشی انہیں سہارا دے رہی تھی۔ وہ شاید مرتے مرتے مالکا نے زادہ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے اور پھر سب نے دیکھا کہ وہ کامیاب ہوئے۔ رائفل کا ایک پورا برسٹ چلا۔ اس میں سے چند گولیاں ہوا میں گئیں، زیادہ تر مالکا کے پیٹ میں پیوست ہو گئیں۔ وہ پشت کے بل برف پر گرا۔ سرمد صاحب بھی اپنی اکلوتی صحت مند ٹانگ پر کھڑے نہ رہ سکے اور ڈھلوان پر لڑھکے اور پھسلتے ہوئے نیچے آ گئے۔ فائرنگ کے دوران میں ہی انہیں اٹھا کر مورچے میں لایا گیا۔ وہ سانس لے رہے تھے۔ ان کے چہرے پر سکون ہی سکون تھا۔ اس وقت انہوں نے چند باتیں بھی کی تھیں۔ ان کی نگاہیں دور کہیں جیسے مستقبل کے پردوں کے پیچھے جھانک رہی تھیں۔ پیشانی پر انوکھی چمک تھی۔ انہوں نے ہمایوں کا ہاتھ دباتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا تھا۔ ”فکر نہ کرنا، یہ آزمائش اب زیادہ دیر نہیں چلے گی۔ میں دیکھ رہا ہوں، تم کامیاب رہو گے...... لیکن۔“ وہ کہتے کہتے رک گئے تھے۔ پھر سانس درست کر کے انہوں نے بات مکمل کی۔ ”میں اس میں عادل کا بھی کردار دیکھ رہا ہوں۔“

ہمایوں نے کہا تھا۔ ”مگر سر! وہ تو بے ہوش پڑا ہے۔“

انہوں نے دور کہیں دیکھتے ہوئے عجیب انداز میں کہا تھا۔ ”شاید وہ زیادہ دیر بے ہوش نہ رہے۔ اس کا بہت خیال رکھو...... وہ...... ضرور تمہارا ساتھ دے گا بلکہ تم سب سے قدم آگے چلے گا۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔“

کچھ دیر بعد انہوں نے گہرے سانس لینے شروع کر دیے تھے۔ ان کے پاس موجود لوگوں نے انہیں زمین سے اٹھا کر نرم بچھونے پر لٹانے کی کوشش کی تھی اور انجکشن وغیرہ دینا چاہا تھا مگر انہوں نے ہمیشہ کی طرح یہ سہولتیں لینے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کے زخم کاری تھے اور جسم کا زیادہ تر خون ضائع ہو چکا تھا۔ انہوں نے دو گھونٹ سادہ پانی پیا تھا اور آنکھیں بند کر لی تھیں۔ چند منٹ کے اندر ان کی سانس کی ڈور ٹوٹ گئی تھی۔

عادل نے یہ ساری روداد ہمایوں کی زبانی سنی۔ ہمایوں کی آنکھیں نم رہیں اور اس دوران میں لگا ہے کہ عادل کے رخساروں پر بھی آنسو رینگتے رہے۔

روداد ختم ہوئی تو عادل اور ہمایوں کتنی ہی دیر تک سر جھکائے خاموش بیٹھے رہے...... کھڑکیوں سے باہر رات کی رانی کے پھول مہک رہے تھے۔ یہ سرمد صاحب کے اپنے ہاتھوں سے پالے ہوئے باغیچے تھے...... آخر ہمایوں کی گمبھیر آواز ابھری۔ ”سرمد صاحب کے جانے کے بعد شام تک حالات اور خراب ہو گئے تھے۔ پاؤندے، شدید زخمی مالکا نے زادہ کو اٹھا کر لے گئے تھے اور اس کے بعد انہوں نے مسلسل فائرنگ کرتے ہوئے گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہماری کئی عورتیں جن میں چار پانچ انگریز لڑکیاں بھی شامل تھیں، پاؤندوں کے قبضے میں چلی گئی تھیں۔ انہوں نے ان کے ساتھ بہیمانہ سلوک کیا۔ کیمپ میں دہشت کی فضا پہلے ہی تھی...... اور بڑھتی چلی گئی...... اور پھر وہ سب کچھ ہوا عادل جو ہرگز نہیں ہونا چاہیے تھا۔“ ہمایوں کی آواز بھرا گئی۔ وہ دل فگار انداز میں بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ”شہزادی، فیروزہ اور ایک نسرین نامی لڑکی نے ایک زہریلا کیمیکل پی لیا۔ یہ کیمیکل ڈاکٹر رابرٹ کے سامان میں تھا، معلوم نہیں وہ ان کو کیسے ملا۔ نسرین کیمپ میں نرسنگ کا کام بھی کرتی رہی ہے۔ خیال ہے کہ یہ کیمیکل وہی ڈاکٹر کے سامان میں سے نکال کر لائی تھی......“

عادل کے دل و دماغ میں جیسے انگاروں کی بارش ہو رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ بہت جلد ان انگاروں کے

انبار کے نیچے دب کر ختم ہونے والا ہے۔ کہیں پڑھے یا سنے ہوئے یہ الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ ”مشرقی اور مغربی عورت میں فرق ہے۔ مشرقی عورت کو اپنی آن آبرو اپنی جان سے زیادہ عزیز ہوتی ہے اور اس کا ثبوت لاشوں سے اٹے ہوئے وہ کنوئیں ہیں جو 1947ء میں سکھ مسلم فسادات کے وقت جگہ جگہ دیکھنے میں آئے تھے۔“

انگاروں کی بارش بڑھتی جا رہی تھی، اسے لگا کہ وہ بے پناہ حدت کے نیچے دب رہا ہے۔ اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ کہاں تھی شہزادی جس کی ہتھیلی پر اس نے اپنی کمائی لا کر رکھنی تھی؟ کہاں تھے وہ دلنشین ہونٹ جنہوں نے بے ساختہ مسکرانا تھا؟ وہ دل ہی دل میں پکارنے لگا۔ اب جینا کیسے ہو سکے گا؟ اب کیسے ہو سکے گا؟

یکایک اس نے محسوس کیا کہ ہمایوں نے اپنے ہاتھ اور سر اس کے پاؤں پر رکھے ہوئے ہیں۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور اپنے پاؤں کی طرف دیکھا۔ ہمایوں نے واقعی اس کے پاؤں پر اپنا سر رکھا ہوا تھا۔ وہ سسکیوں سے رو رہا تھا۔ عادل بستر پر بیٹھے بیٹھے تھوڑا سا پیچھے ہٹا۔ اس نے اپنے پاؤں ہمایوں کی گرفت سے چھڑانا چاہے مگر ناکام ہوا۔

”ہمایوں۔“ وہ قدرے حیرت سے بولا۔

ہمایوں نے جیسے اس کی آواز سنی ہی نہیں۔ وہ سسک کر بولا۔ ”عادل! میں تمہارا گناہ گار ہوں...... مجھے معاف کر دو...... میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ میں نے بہت سنگ دلی دکھائی ہے...... بہت زیادہ سنگ دلی دکھائی ہے۔“

”ہمایوں بھائی! کیا کہہ رہے ہو؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔“ عادل کراہا۔

”پہلے مجھے معاف کرو عادل! میری سنگ دلی پر...... میری بے رحمی پر مجھے معاف کرو۔ مجھے بخش دو عادل۔“ اس کے آنسوؤں سے عادل کے پاؤں نم ہونے لگے۔

”تم نے ایسا کچھ نہیں کیا ہمایوں بھائی۔ تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟“

”میں نے کیا ہے عادل...... تم اپنے منہ سے کہہ دو۔ تم نے میری زیادتی پر مجھے خدا کے واسطے معاف کر دیا۔“

عادل نے خشک لبوں پر زبان پھیری اور کراہتے ہوئے کہا۔ ”ہمایوں بھائی! مجھے نہیں معلوم، تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو لیکن...... میں نے تمہیں معاف کیا۔ مجھے تم سے کسی طرح کا کوئی گلہ نہیں......“

اس نے اپنے لرزتے ہاتھوں سے ہمایوں کا سر اپنے پاؤں سے اٹھانے کی کوشش کی...... لیکن وہ اسی طرح جھکا رہا...... جھکے جھکے ہی بولا۔ ”عادل...... میں نے بڑی بے رحمی کے ساتھ جھوٹ بولا۔ میں نے شہزادی کے بارے میں تم سے جھوٹ بولا۔“

عادل کے سینے میں دھڑکن کے گولے پھٹنے لگے۔ اس کے کانوں کے پردے جیسے لرز اٹھے۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ وہ کوئی بہت بڑی خبر سننے والا ہے۔ ہمایوں کے کہے ہوئے الفاظ اس کی سماعت سے ٹکرائے۔ ”شہزادی زندہ ہے عادل...... وہ بچ گئی ہے عادل۔“

عادل ایک بار پھر پتھرا گیا۔ کائنات کی گردش ایک بار پھر تھم گئی۔ اس کا جسم جو سیکڑوں ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر فضائے بسیط میں بکھر گیا تھا، روشنی کی رفتار سے ایک بار پھر ”مجسم“ ہو گیا۔ وہ کئی سیکنڈ تک کچھ بول نہ سکا۔ پھر جیسے اس کے پتھرائے ہوئے جسم میں جان واپس آئی۔ ایک پُرجوش ریلے کی طرح، ایک نورانی لہر کی طرح۔ اس کے سینے میں جیسے ہزاروں قمقمے یکبارگی روشن ہو گئے۔

اس نے ہمایوں کو دونوں شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔ ”ہمایوں بھائی! یہ کیا کہہ رہے ہو؟ میرے ساتھ مذاق نہ کرنا...... میری دھڑکن رک جائے گی۔“

اس نے آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ اٹھایا۔ ”نہیں عادل! میں بہت سنگ دل ہوں لیکن اتنا بھی نہیں ہوں۔ تمہاری شہزادی زندہ ہے۔ فیروزہ بھی زندہ ہے، وہ تینوں زندہ ہیں۔“

اس کے ساتھ ہی وہ بیٹھے بیٹھے عادل سے لپٹ گیا۔ عادل نے بس شادیِ مرگ کے الفاظ ہی سنے تھے۔ اس نے کبھی غور نہیں کیا تھا کہ شادیِ مرگ کیا ہوتی ہے۔ خوشی کی یلغار سے دل کیسے رک جاتا ہے، روح کیسے پرواز کر جاتی ہے لیکن آج وہ محسوس کر رہا تھا، بے پناہ شدت اور وضاحت کے ساتھ۔ اسے لگا اس کی حرکتِ قلب تھم جائے گی۔

”ہمایوں بھائی! کہاں ہے شہزادی؟“ وہ خود کو سنبھال کر بہ مشکل یہ پانچ الفاظ کہہ پایا۔

پھر اس نے آنسوؤں کی جھلملاہٹ کی دوسری جانب دیکھا۔ دروازے میں شہزادی نمودار ہو رہی تھی۔ وہ ہلکے گلابی پھولوں والی سفید شلوار قمیص میں تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ابھی تک وہی چوڑیاں تھیں جو عادل نے بے ہوش ہونے سے پہلے صحافی لڑکی کے خیمے میں دیکھی تھیں۔ شہزادی کے چہرے کو ایک دلکش زردی نے ڈھانپ رکھا تھا۔ عادل کو کچھ پتا نہیں چلا، وہ کب بستر سے نیچے اترا، کب۔ اس نے

دروازے تک کا فاصلہ طے کیا...... کب شہزادی کی گہری سیاہ آنکھوں میں جھانکا اور کب اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ وہ جیسے اس کے جسم کا حصہ بن گئی۔ اس کے اندر جذب ہوگئی۔ وہ دیدنی ملاپ تھا...... وہ دونوں رو رہے تھے۔ گرد و پیش سے بے خبر ہوگئے تھے۔ شہزادی کے بال عادل کے چہرے پر بکھر رہے تھے۔ وہ اپنے ہونٹوں پر شہزادی کے بھیگے چہرے کی نمی محسوس کر رہا تھا۔ ہمایوں اٹھ کر خاموشی سے باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

عادل کو اس سوال کا جواب قریباً دو گھنٹے بعد ملا جس نے اس کے دل و دماغ کی چولیں ہلا ڈالی تھیں۔

ہمایوں اور عادل کو دوبارہ تنہائی ملی تو ہمایوں نے سرخ متورم آنکھوں کے ساتھ عادل کو بتایا۔ "تمہیں یاد ہے عادل! تم نے خیمے میں اپنے بچھونے سے اٹھ کر لیوپڈ کے منہ پر اس کا گیس ماسک درست کیا تھا؟"

"ہاں ہمایوں بھائی! تھوڑا تھوڑا یاد ہے۔ اس وقت مجھے ٹھیک سے کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔"

"عادل! میں نے اس وقت تمہیں دیکھ لیا تھا اور جان لیا تھا کہ تم ہوش میں آگئے ہو۔ نہ صرف ہوش میں آگئے ہو بلکہ تمہارا "سکتہ یا فالج" بھی بہت حد تک ختم ہوگیا ہے۔"

"تو تم نے مجھے بتایا نہیں کہ تم جان گئے ہو۔"

"تم نے بھی تو نہیں بتایا تھا۔ ہوش میں آنے کے باوجود آنکھیں بند کیے لیٹے رہے تھے۔"

"میں اس وقت خود کو بس تیس چالیس فیصد ہی ٹھیک محسوس کر رہا تھا۔ ہوش میں آکر بھی میرا سر چکرا رہا تھا اور میرے ہاتھ پاؤں بے جان تھے ہمایوں بھائی۔"

ہمایوں نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ "میرے دماغ میں وہی سب کچھ چل رہا تھا عادل. جو سر نے بتایا تھا۔ ہم جانتے ہیں عادل کہ ان کی کہی ہوئی اکثر باتیں درست ثابت ہوتی ہیں...... اور انہوں نے کہا تھا کہ تم اس آزمائش سے نکلنے میں بڑا کردار ادا کرو گے...... لیکن کیسے؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میں نے تمہیں بتایا ہی ہے، کچھ لوگ تو پاؤنڈوں کے "گھیرے" سے پہلے ہی کیمپ سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ باقی جو بچے ان میں سے پچیس کے قریب مر چکے تھے اور کوئی چالیس کے لگ بھگ زخمی پڑے تھے۔ پاؤنڈوں کا گھیرا تنگ ہو رہا تھا۔ کسی بھی لمحے سب کچھ ملیا میٹ ہوسکتا تھا اور پھر میرے ذہن میں وہ بات آئی جس کے لیے میں نے تم سے معافی مانگی ہے اور جسے میں اپنی

سخت بے حسی ہی کہوں گا...... مجھے وہ ساری کہانی یاد آگئی جو تاریخ کی کئی کتابوں میں درج ہے۔ ہندو سالار کا جو راجپوتوں کا اپنی عورتوں کو ختم کرنا اور خود کٹ مرنا۔ وہ کہانی ہمیں بتاتی ہے کہ جب ظالم کا ظلم انتہا سے بڑھ جاتا ہے اور جنگ و جدل کا بازار گرم ہوتا ہے، کمزور گھیرے جاتے ہیں اور طاقتور گھیر لیتے ہیں تو پھر سب سے بڑی آفت بچوں اور عورتوں پر ہی آتی ہے۔ اس کہانی میں بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ وہ میری مائیں بہنیں نہیں تھیں...... لیکن میری ماؤں بہنوں جیسی تو تھیں۔ جب ان کے مردوں نے مجبور ہو کر انہیں اپنے ہاتھوں سے مار ڈالا تو پھر کیا ہوا؟ وہ خود بھی جیتے جی مر گئے اور انہوں نے اپنے سر ہتھیلیوں پر رکھ لیے۔ اپنا سب کچھ لٹانے کے بعد وہ ایسی دیوانگی سے لڑے کہ انہوں نے کشتوں کے پشتے لگا دیے۔ یہ اور بات ہے کہ آخری نتیجہ ان کے حق میں نہ نکلا اور وہ سب کے سب مارے گئے۔ لیکن ان کی جانفشانی نے دشمن کو لرزہ براندام کر دیا۔ وہ مدت تک ان کی دہشت کے اثر سے نہ نکل سکا۔ وہاں مجھے بھی یہی لگا عادل کہ موت کے اس گھیرے کو توڑنے کے لیے مجھے کم از کم دو تین ساتھیوں کی ضرورت ہے۔ ایسے ساتھی جو واقعی اپنے سر ہتھیلیوں پر رکھ چکے ہوں اور موت جن کے لیے بے معنی ہو چکی ہو...... اور پھر میں نے وہ کیا جو اب تمہاری سمجھ میں آچکا ہوگا۔ میں نے دل پر پتھر رکھ کر مدیڑ کو تینوں لڑکیوں کی موت کی اطلاع پہنچائی اور میں اس وقت جانتا تھا کہ تم بھی میری بات سن رہے ہو۔ مجھے پتا تھا کہ تم دونوں پر اور جانی طور سے تم پر شدید ترین ردعمل ہوگا لیکن یہ ردعمل پیدا کرنے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ اس وقت ہمیں ہوش نہیں، دیوانگی درکار تھی عادل! اور یہ دیوانگی ہمیں ملی۔ شاید یہی ایک وجہ ہے جس کے سبب میں خود کو قابل معافی سمجھ سکتا ہوں۔ تم سمجھ رہے ہو نا۔ ہم مر تو ویسے بھی رہے تھے...... اگر ہم سر دھڑ کی بازی لگا دیتے تو شاید کامیاب ہوجاتے اور پھر یہی ہوا عادل...... ہم نتائج سے بے پروا ہو کر بس ٹوٹ پڑے...... اور وہ کر دکھایا جو بہ ظاہر ناممکن تھا۔ جب ہم نے بلندی پر رکھی ہوئی "ایم جی 42" پر قبضہ کر دکھایا تو کیمپ کے بچے کھچے جوان بھی ہمارے پیچھے آئے اور بازی مکمل طور پر پلٹ دی۔"

عادل حیرت سے گنگ سن رہا تھا۔ اسے اپنے کانوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ اسے وہ قیامت خیز لمحے یاد آئے جب موت اسے ایک بے معنی چیز محسوس ہوئی تھی اور اس کے اندر بہنے والے آگ کے دریا نے اس کے سامنے آنے والی

ہر چیز کو راکھ کر ڈالا تھا۔ وہ دونوں کتنی ہی دیر خاموش رہے۔ شاید ہمایوں کے ذہن میں بھی وہی مناظر چل رہے تھے تب ہمایوں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں یاد ہے، میں نے ایک مرتبہ سرمد صاحب کے ایک جیکی نامی شاگرد کا ذکر کیا تھا؟" عادل نے چند لمحے سوچ کر اثبات میں سر ہلایا۔ ہمایوں بولا۔ "جو بچے کھچے لڑکے ہمارے ساتھ شریک ہوئے، ان میں سب سے آگے وہی جیکی تھا...... وہی جس نے ماتھے پر سرخ پٹی باندھ رکھی تھی۔ وہ بڑی بہادری سے لڑا عادل! وہ مارشل آرٹ کا ایک بہترین کھلاڑی بھی ہے۔ وہ اس مقابلے کے تماشائیوں میں بھی شامل تھا جو نوبل راک پہ ہوا اور جسے تم نے جیتا۔"

"وہ اب کہاں ہے؟" عادل نے پوچھا۔

"دو دن پہلے تک وہ یہیں تھا اور دہی نہیں سرمد صاحب کے شاگردوں اور بے شمار چاہنے والوں کا بھی یہاں تانتا بندھا رہا ہے اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ سرمد صاحب کو چاہنے والے اور ان سے زندگی کے لیے راہنمائی حاصل کرنے والے باہر کی دنیا میں بھی موجود ہیں۔" گھڑی کا الارم بجنے لگا۔

عادل کی دوا کا وقت ہوگیا تھا۔ ہمایوں نے اصرار کر کے اسے دوا کھلائی۔ اس کے بعد ان کی گفتگو جاری رہی۔ عادل نے نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ "ہمایوں بھائی! مجھے اور مدیڑ کو تو تمہاری "اطلاع" نے ہر خطرے سے بے نیاز کر دیا لیکن تمہیں کس چیز نے دیوانہ کیا؟"

وہ کئی سیکنڈ تک خاموش رہنے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں نے تمہیں بتایا تھا نا عادل! میری دیوانگی بہت پہلے کی ہے...... شاید بدلے کی یہ آگ کئی نسلوں سے میرے اندر بھڑک رہی تھی۔ مجھے پتا تھا میرے پاس دو ہی راستے ہیں۔ کسی روز میں ان پاؤنڈوں سے ٹکراؤں گا اور اس آگ کو ٹھنڈا کروں گا یا پھر اس آگ میں خود جل مروں گا۔ ماٹا کو سر سرمد نے مارا...... اور تم نے اسے ٹھنڈا کیا لیکن مجھے اس سے اتنا ہی اطمینان ملا ہے، جتنا اپنے ہاتھوں سے اسے قتل کر کے ملتا۔ یقین کرو، مجھے یہی لگتا ہے کہ اسے اپنے ہاتھوں سے جہنم واصل کرنے کی میری خواہش پوری ہوگئی ہے۔"

دونوں کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر عادل نے ہمایوں سے پوچھا۔ "کرسٹل کہاں ہے؟"

"وہ ائرپورٹ گئی ہے۔ اپنے والدین کو سی آف کرنے کے لیے۔ انہوں نے اسے اپنے ساتھ لے جانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہیں مانی۔ مرکی موت نے اسے بہت دکھ پہنچایا ہے...... وہ ہر دوسرے روز ان کی قبر پر جاتی ہے اور دیر تک بیٹھی رہتی ہے۔"

"مدیڑ کہاں ہے؟" عادل نے دریافت کیا۔

"وہ ابھی ایبٹ آباد کے اسپتال میں ہے۔ اس کے پیٹ میں ایک گولی لگی تھی اور بازو بھی شاٹ گن کی فائرنگ سے زخمی ہوا تھا۔ اب وہ بالکل ٹھیک ہے۔ فیروزہ بھی اب صحت یاب ہے بلکہ اس کی تیمارداری بھی کر رہی ہے...... تمہاری طرح میں نے مدیڑ سے بھی ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی ہے۔ میں نے اسے فیروزہ کی موت کی جھوٹی اطلاع دی...... کسی وقت سوچتا ہوں کہ اگر تم دونوں میں سے کسی کو کچھ ہوجاتا تو میں خود کو کبھی معاف نہ کرتا۔ زندگی بھر پچھتاوے کی آگ میں جلتا رہتا۔"

عادل نے کچھ دیر توقف کیا پھر گہری سانس لے کر بولا۔ "نہیں ہمایوں بھائی! میں سمجھتا ہوں کہ تم نے جو کیا ٹھیک ہی کیا۔ وقت نے بھی ثابت کیا ہے کہ وہ ٹھیک ہی تھا۔ اس وقت ہمیں ہوش کی نہیں جوش کی...... بلکہ اندھے جوش کی ضرورت تھی۔ ہم ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر ان سے لڑے...... اور پھر ہمایوں بھائی اس "بے نیازی" میں تم بھی تو ہمارے ساتھ شریک تھے۔ تمہیں بھی تو کچھ ہوسکتا تھا؟ ہاں...... وہ جو ہوا ٹھیک ہی ہوا۔ اگر وہ نہ ہوتا تو یقیناً ہم میں سے کوئی یہاں نہ ہوتا۔"

عادل اور ہمایوں کی گفتگو جاری رہی۔ ہمایوں کی باتوں سے پتا چلا کہ لیوپڈ، ڈورتھی اور صحافی لڑکی سمیت قریباً سولہ غیر ملکی اس مسلح تصادم میں جان سے گئے ہیں۔ پاؤنڈوں کے قبضے میں چلی جانے والی لڑکیوں کو بازیاب کرا لیا گیا ہے۔ لارڈ اونس اور ان کے ساتھی جو یہاں ایک سالانہ ایونٹ میں شرکت کے لیے آئے تھے، اپنے ساتھ سولہ تابوت لے کر واپس جا چکے تھے۔ شکر کا مقام یہ تھا کہ پاؤنڈوں کے گھیرے سے پہلے کچھ لوگ کیمپ سے نکلنے میں کامیاب بھی ہوگئے تھے۔ تاہم یہ لوگ شدید طوفان میں راستہ بھٹک کر راکاپوشی کی چوٹی کی طرف نکل گئے۔ وہ صرف پانچ روز پہلے ڈھونڈے جاسکے تھے۔

اس مسلح تصادم میں اٹھارہ کے قریب مقامی لوگ بھی جان سے گئے تھے۔ ان میں سے کچھ ستارا برادری کی دوست فیملیز میں سے تھے۔ کچھ مقامی پورٹرز اور گارڈز تھے۔ دراز قد چودھری ناصر اور اس کے دو ساتھی بھی مرنے والوں میں شامل تھے۔ زخمی ہونے والوں کی تعداد بھی تیس سے کم نہیں تھی۔ آخری لڑائی کے بعد پاؤنڈوں کی ہلاکتیں

کافی بڑھ گئی تھیں۔ ہمایوں نے بتایا کہ محتاط اندازے کے مطابق پچاس کے قریب پاؤندے موقع پر ہی جان سے گئے تھے کچھ زخمی حالت میں پکڑے گئے تھے۔ ان میں رمزی بھی شامل تھا جو بعدازاں ان دو تین مقدمات میں وعدہ معاف گواہ بنا۔ پولیس نے اس مسلح تصادم کے لیے دونوں طرف کے افراد پر مقدمات قائم کیے تھے۔ اس سنگین صورتِ حال کی زیادہ تر ذمے داری یقیناً پاؤندوں پر ہی آئی تھی۔ ان کے خلاف لوٹ مار کی شکایات پہلے سے موجود تھیں۔ ان لوگوں کی گرفتاری کے لیے کئی جگہ چھاپے مارے جارہے تھے۔ یہ اطلاعات بھی تھیں کہ ان میں سے کچھ لوگ پاک چائنا بارڈر کی طرف فرار ہوگئے ہیں۔

عادل اور ہمایوں، سرمد صاحب کی قبر پر پہنچے...... تادیر وہاں بیٹھے رہے اور انہیں اشکوں کا نذرانہ پیش کرتے رہے۔ سرمد صاحب کی آخری آواز عادل نے وہیں کیمپ میں نیم بے ہوشی کے عالم میں سنی تھی۔ وہ الفاظ ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ سرسرمد نے ڈاکٹر سے مخاطب ہوکر کہا تھا۔ ”پلیز ڈاکٹر! عادل کے لیے کچھ کریں......اسے کچھ نہیں ہونا چاہیے۔“

اسے کچھ نہیں ہوا تھا لیکن وہ خود ہمیشہ کے لیے اس سے روٹھ گئے تھے۔

قبرستان سے واپسی کے بعد عادل اور ہمایوں جب سرمد صاحب کے گھر پہنچے تو وہاں پولیس کی دو گاڑیاں موجود تھیں۔ یہ لوگ ایک ڈی ایس پی کی قیادت میں آئے تھے۔ سرمد صاحب کے چاہنے والوں میں شہر کے ایک نامور ایڈووکیٹ اقبال ملک بھی شامل تھے۔ وہ بھی ہمایوں وغیرہ کی معاونت کے لیے موقع پر موجود تھے۔ انہوں نے عادل کو بتایا کہ پولیس اس کا بیان قلم بند کرنا چاہتی ہے۔ اس کے علاوہ ہمایوں، کرسٹل اور تایا فراست سے بھی کچھ سوال جواب کیے جانے تھے۔

یہ ساری کارروائی مکمل ہونے میں کئی گھنٹے لگے۔ پولیس شام کے بعد واپس گئی۔ ہمایوں نے سب کو بتایا کہ اقبال ملک اور ان کی ٹیم کے ہوتے ہوئے انہیں قانونی معاملات میں کسی طرح بھی پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ قراقرم کے اس برفیلے ویرانے میں ہونے والے مسلح تصادم کو اب کئی روز ہوچکے تھے، اس کے باوجود کئی اخبارات میں اس واقعے کے بارے میں چھوٹی موٹی خبریں آرہی تھیں۔ نوبل راک اور اس پر ہونے والے کلائمبنگ کے مقابلے کو بھی موضوع بنایا جارہا تھا۔ جرنلسٹ ڈھونڈ ڈھونڈ کر خبریں لارہے تھے۔ اس شاندار فائنل مقابلے کا ذکر بھی ہورہا تھا جو لالی گاؤں کے ایک بے نام نوجوان نے جیتا تھا۔ قریباً 1600 فٹ کی وہ خطرناک ترین چڑھائی جس میں اس نے بڑے بڑے نامور ”راک کلائمبرز“ کو چاروں شانے چت کیا تھا۔ وہ غریب اور بے آسرا تھا...... غیر تربیت یافتہ تھا۔ اپنے حریفوں کی طرح اسے دنیا کے بہترین کوچز کی خدمات بھی حاصل نہیں تھیں۔ اسے بس کھجور کے سوکھے تنوں پر چڑھنا آتا تھا، لیکن اس کے اندر خدا کی عطا کردہ بے مثال صلاحیت موجود تھی۔ پھر اسے ایک فن شناس ملا اس نے چند ماہ میں اسے مٹی سے سونا بنایا اور یہ سونا نوبل راک کی بلندیوں پر یوں چمکا کہ سب کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ غربت اور فاقہ کشی کے مارے ہوئے اس بے نام نوجوان کا نام عادل تھا۔ اس مقابلے کے بعد جو کچھ ہوا، وہ بھی زندگی کا حصہ ہی تھا۔ انسان مشکلات کا ایک دریا ہاتھ پاؤں مار کر پار کرتا ہے تو اس کے سامنے ایک دوسرا دریا موجود ہوتا ہے۔ پاؤندوں کا آنا بھی تو ایک دوسرے دریا کی طرح ہی تھا مگر سرسرمد کے مشکل پسند شاگرد اس دوسری آفت سے بھی سرخرو ہوکر نکلے تھے۔ انہوں نے نہ صرف خود کو بچایا بلکہ کئی غیر ملکی خواتین کی عزت آبرو کے سامنے بھی ڈھال بن گئے۔

☆☆☆

موسم بدل گیا...... گرمی اور حبس کے مہینے گزر گئے دھوپ سنہری اور نرم ہوگئی۔ یہ نومبر کی آخری تاریخیں تھیں...... زخموں پر کھرنڈ آرہے تھے لیکن تین اموات ایسی تھیں جنہیں عادل اب بھی نہیں بھولا تھا۔ پہلی موت سرمد کی تھی، دوسری ماموں طفیل اور تیسری شہزادی کے بھائی قاسم کی۔ وہ غیرت کے طوفانی ریلے میں سینہ تان کر نکلا اور پاؤندوں کی گولیوں کا شکار ہوا۔ شہزادی بھی ابھی اس غم سے پوری طرح نہیں نکل پائی تھی۔ کہتے ہیں کہ جو مرجاتے ہیں ان کے لیے آہستہ آہستہ صبر آنا شروع ہوجاتا ہے لیکن جو کھو جاتے ہیں، وہ مستقل درد بن کر دل میں رہتے ہیں۔ عادل کے گمشدہ دوست صادق کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا۔ اس کا ابھی تک کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ اسے بالکا نے زادہ نے پک اپ سمیت لاہور کے مقام شاہدرہ سے اغوا کیا تھا اور پھر وہ لاپتا ہوگیا تھا۔ عادل اب تک اس کی تلاش جاری رکھے ہوئے تھا۔ آج کل عادل لاہور میں تھا۔

گاؤں میں بھی حالات دھیرے دھیرے معمول پر آرہے تھے۔ ناصر کی موت کے بعد اس کے باپ چودھری مختار پر فالج کا حملہ ہوا تھا اور اب وہ بستر پر تھا۔ مختلف کیسوں میں قانونی کارروائی بھی معمول کے مطابق چل رہی تھی۔

بہرحال تایا فراست نے اب گاؤں چھوڑ کر لاہور میں رہنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ وہ حویلی جو عادل نے گاؤں میں بنوانا تھی، اب وہ لاہور میں بنوا رہا تھا...... اس نے سرسرمد کی رہائش گاہ کے بالکل ساتھ ایک بڑا قطعۂ زمین حاصل کرلیا تھا اور اس پر عین سرسرمد کے گھر کی طرز پر ایک گھر بنوا رہا تھا۔ اس میں بہت سی جگہ کھلی چھوڑی گئی تھی جس میں پھلواریاں تھیں، پھل دار پودے تھے اور اناج بونے کے لیے رقبہ تھا۔

ایک شام جب وہ، ہمایوں اور کرسٹل زیرِ تعمیر گھر میں بیٹھے چائے پی رہے تھے، عادل نے کہا۔ ”ہمایوں بھائی! دو سوال اب بھی میرے ذہن میں کھٹکتے رہتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ شروع میں تمہارے بارے میں پتا چلا تھا کہ تم بچپن میں ہی اپنے والدین کے ساتھ انگلینڈ چلے گئے تھے اور وہاں کئی سال رہنے کے بعد پاکستان آئے لیکن بعد میں پتا چلا کہ والدین کی وفات کے بعد تم بلتستان میں ہی رہے۔ محنت مشقت کی اور پہاڑوں پر اپنی روزی ڈھونڈتے رہے۔“

”اس سوال کا جواب کافی لمبا ہے عادل! مختصر یوں سمجھ لو کہ آج سے کوئی دس سال پہلے جب میں سولہ سترہ سال کا لڑکا تھا، مانسہرہ کے قریب ایک پاؤندے کے ساتھ میری لڑائی ہوئی اور وہ بھاگنے کی کوشش میں ایک کھائی میں گر کر مارا گیا۔ اس کے بعد سے مجھے اپنی شناخت چھپانا پڑی۔ میرا اوریجنل نام بھی ہمایوں نہیں آفتاب تھا۔ بہرحال یہ ایک علیحدہ کہانی ہے، تمہیں کبھی آرام سے بتاؤں گا...... اور دوسرا سوال کیا ہے تمہارا؟“

عادل نے ایک گہری سانس لی۔ ”دوسرا سوال سرمد صاحب کے بارے میں ہے ہمایوں بھائی! میں نے ان کا آخری خط دیکھا ہے۔ اس میں ایک جگہ انہوں نے تمہیں مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے...... میں نے ایک خط علیحدہ سے اپنی شریکِ حیات کے لیے بھی لکھ دیا ہے، تم جانتے ہو کہ میں ان کی طرف سے بھی پوری طرح مطمئن ہوں...... ان کی طرف سے مطمئن ہونے کا کیا مطلب ہے؟“

ہمایوں نے اس سوال کا طویل جواب دیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ سرمد صاحب کے خاص طرزِ زندگی اور مشکل پسندی کی وجہ سے ان کی بیوی علیحدہ گھر میں رہنے لگی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ایک دن سرمد صاحب اپنا درویشی ڈیرا چھوڑ کر ان کے پُرآسائش گھر میں آجائیں گے لیکن کئی سال گزرنے کے بعد بھی ایسا نہ ہوا۔ آخر ان کی شریکِ حیات کو اپنا رویہ بدلنا پڑا۔ وہ گاہے بگاہے ان سے ملنے اور ان کے ساتھ رہنے کے لیے آنے لگی۔ اپنی زندگی کے آخری تین چار سال میں سرمد صاحب کو اس سے کوئی شکوہ نہیں رہا تھا۔

ابھی عادل اور ہمایوں وغیرہ کی گفتگو جاری ہی تھی کہ ایڈووکیٹ اقبال ملک ایک ڈی ایس پی کے ساتھ عادل کے زیرِ تعمیر گھر میں داخل ہوئے۔ وہ کمرے کے دروازے پر پہنچے تو عادل بھونچکا ہوکر کھڑا ہوگیا۔ ان کے ساتھ ایک دبلا پتلا نوجوان تھا جس کی چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی تھی۔ اسے پہچان کر عادل ششدر رہ گیا۔ وہ صادق تھا۔ صادق اور عادل کا ملاپ دیدنی تھا۔ دونوں دیر تک ایک دوسرے کے گلے لگے رہے۔ آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

ایڈووکیٹ اقبال ملک کی زبانی معلوم ہوا کہ ایبٹ آباد میں جو چند پاؤندے زیرِ حراست تھے، ان میں سے ایک نے پچھلے ہفتے اپنی زبان کھولی اور اس سے پتا چلا کہ لاہور سے اغوا شدہ صادق، اسکردو کے ایک قریبی دیہہ میں موجود ہے۔ مقامی پولیس نے اس اطلاع پر فوری چھاپا مارا اور صادق کو برآمد کرلیا۔

اداسیوں کے موسم میں یہ عادل کے لیے خوشگوار ہوا کا ایک جھونکا تھا۔ صادق نے جو روداد سنائی، وہ ان اندازوں کے عین مطابق تھی جو عادل اور ہمایوں وغیرہ نے اب تک لگائے تھے۔ بالکا نے زادہ اور اس کے ایک ساتھی نے صادق پر بے رحمی سے تشدد کیا تھا۔ اس کے پاؤں، پنڈلیوں اور کمر پر چھڑیوں سے پیٹے جانے کے پرانے نشان موجود تھے۔ عادل اور صادق رات گئے تک بیٹھے رہے۔ کرسٹل اور ہمایوں بھی ان کے ساتھ تھے۔ بہت سی باتیں ہوئیں اور دل کے بوجھ ہلکے کیے گئے۔

آدھی رات کے بعد ہمایوں نے صادق کو لیا اور چند قدم طے کرکے سرسرمد والے گھر میں چلا گیا۔ نحیف و نزار صادق کو آرام کی ضرورت تھی۔ زیرِ تعمیر گھر کے کمرے میں عادل اور کرسٹل اکیلے رہ گئے۔

کرسٹل نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ ”عاڈل! آج کئی مہینوں کے بعد ہام اپنے دل میں تھوڑا سا Happiness محسوس کررہا ہے۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ تم بھی Happiness محسوس کرتا۔ آج تمہارا کھویا ہوا فرینڈ صاڈق تم سے دوبارہ ملا۔ اٹ از ریئلی ونڈرفل۔ ہام بہت خوش۔“

عادل غور سے کرسٹل کو دیکھتا رہا۔ آج کافی عرصے

بعد اس نے اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر زندگی کے آثار دیکھے تھے۔ وہ کافی بدل چکی تھی۔ اب زیادہ تر مشرقی لباس پہنتی تھی۔ عادل نے اسے انگلش ترجمے والا قرآن مجید پڑھتے بھی دیکھا تھا۔ اب بھی اس کے سر پر ایک شال نظر آرہی تھی۔

عادل گہری سانس لے کر ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ ”کرسٹل! کہتے ہیں کہ جب کوئی بہت خوش ہو تو اس سے کچھ مانگا جاسکتا ہے...... اور وہ اکثر دے دیتا ہے۔“

”ہام نے بھی یہ سنا لیکن...... توم کیا لینا مانگتا؟“ وہ سادگی سے بولی۔

عادل نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ”تمہیں یاد ہے کرسٹل، تم نے بانگڑی چوٹی کی طرف جانے سے پہلے ایک رات مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا...... تم نے کہا تھا...... مجھے بتاؤ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ اور میں نے کہا تھا، وقت آنے پر بتاؤں گا۔ تمہیں یاد ہے؟“

اس کی آنکھوں میں سوچ کی لکیریں ابھریں۔ پھر ہولے سے مسکرائی اور سر ہلا کر بولی۔ ”یس عادل! ہام، توم کا بات سمجھ رہا۔ ہام کو یاد ہے لیکن...... توم...... کیا مانگنا چاہتا؟“

عادل نے اس کی خوب صورت آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کرسٹل! میں تم کو مانگنا چاہتا...... اپنے دوست ہمایوں کے لیے...... ہاں کرسٹل! میں تمہیں اس کی زندگی میں دیکھنے کی شدید خواہش رکھتا ہوں۔ وہ بہت خاموش ہے۔ سمندر کی طرح گہرا اور بھیدوں بھرا۔ وہ تم سے بہت پیار کرتا ہے...... لیکن زندگی بھر تمہیں اس پیار کا پتا نہیں چلنے دے گا۔ کبھی کوئی درخواست، کوئی التجا اپنی زبان پر نہیں لائے گا لیکن میں اس کے دل کا حال اچھی طرح جانتا ہوں۔ سمجھو کہ وہ انسانوں کے ایک خاموش قبیلے کا فرد ہے۔ اس قبیلے کے لوگ اپنی محبتوں کو اپنے سینوں میں دفن رکھتے ہیں...... ساری زندگی خاموشی کی آگ میں جلتے رہتے ہیں اور اکثر راکھ ہوجاتے ہیں۔“

کچھ باتیں کرسٹل کی سمجھ میں آئیں، کچھ نہیں آئیں لیکن عادل کا مدعا وہ سمجھ گئی تھی۔ اس کی نیلگوں آنکھوں میں گہری سوچ نظر آنے لگی تھی۔ عادل التجا آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑے بھاری لمحے تھے۔ عادل کو لگا، شاید اسے کرسٹل کو قائل کرنے کے لیے ابھی طویل کوشش کرنا پڑے گی۔ دلیلوں اور وضاحتوں کا سہارا لینا پڑے گا لیکن جو کچھ ہوا، وہ بالکل اچانک تھا۔ جیسے ایک پیڑ سے پکا ہوا پھل، نسیم سحری کے ہلکے سے جھونکے سے جھولی میں آگرتا ہے۔

کرسٹل نے عادل کا ہاتھ تھاما۔ اس کی نیلگوں آنکھوں میں نمی چمکی...... اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ شاید وہ پہلے سے سب کچھ جانتی تھی۔

”ٹھیک ہے عادل!“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”لیکن اس کے لیے ہام کی بھی ایک کنڈیشن ہے۔“

”بتاؤ کرسٹل!“ اس نے بے تابی سے کہا۔

”توم اور شہزادی کا شادی پہلے ہوئیں گا۔ اسی دسمبر میں۔“ وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔

عادل نے اثبات میں سر ہلانے میں دیر نہیں کی تھی

ہوا کے ایک سرد جھونکے سے کمرے کی کھڑکی کھل گئی۔ رات کی رانی کی مدھر خوشبو سرمد کے گھر کے باغیچوں سے اٹھ کر آئی اور کمرے میں بھر گئی۔ یہ پورے چاندکی سرد رات کا آخری پہر تھا۔ عادل اور کرسٹل نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ تیس چالیس قدم کے فاصلے پر سرسرمد کے گھر کا وسیع وعریض احاطہ نظر آرہا تھا۔ ان دونوں نے خاموش طبع ہمایوں کو دیکھا۔ اس نے اتنی ٹھنڈ میں بھی معمولی سی پتلون قمیص پہن رکھی تھی۔ اس نے کسی دیہاتی محنت کش کی طرح قمیص کی آستینیں چڑھا رکھی تھیں اور ایک گیلن کے ذریعے اس چھوٹے سے ٹریکٹر میں ڈیزل ڈال رہا تھا جو پچھلے کئی ماہ سے بند پڑا تھا۔ ڈیزل ڈالنے کے بعد اس نے ٹریکٹر کی جھاڑ پونچھ کی اور پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا۔ تھوڑی سی کوشش سے انجن اسٹارٹ ہوگیا۔ ہیڈ لائٹس میں ایک کھیت روشن ہوگیا۔ اس کھیت میں گھاس اگ آئی تھی اور یہ کچھ ویران دکھائی دینے لگا تھا۔ ہمایوں یقیناً اس کھیت کو پھر سے آباد کرنا چاہ رہا تھا، ایک نئے عزم اور ارادے کے ساتھ۔

ابھی بہت اندھیرا تھا...... ابھی بہت سردی تھی۔ ابھی تو بستر میں گھسے رہنے کو ہی دل چاہتا تھا لیکن ”دل کی چاہت“ ہی کو تو سرسرمد نے ختم کرنا سکھایا تھا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ دنیا کی عظیم کامیابیاں نفس کی چاہت کے پیچھے چھپی ہوتی ہیں۔ نفس کی چاہت کو ریزہ ریزہ کردو...... کامیابیاں سامنے نظر آئیں گی۔

ہمایوں نے ٹریکٹر آگے بڑھایا اور کھیت میں داخل ہوگیا۔

(ختم شد)

کرائے دار

تنویر ریاض

یہ دنیا بھی کس قدر اضداد کا مجموعہ ہے... کبھی کبھی اچھائی کے ساتھ برائی یوں ہم قدم ہوتی ہے جیسے دونوں میں کوئی بیر نہ ہو... کمال ہے انسان جس قدر ایمانداری سے بدی کی طرف راغب ہوتا ہے اگر نیکی بھی اتنی ہی ایمانداری سے کرے تو کم ازکم انسان ہونے کا حق ہی ادا ہوجائے... وہ بھی ایک ایسا ہی کرائے دار تھا جسے اس کمرے کو استعمال کرنے کا کرایہ ادا کرنا تھا۔

جرائم کی دنیا میں ایک مجرم کے منصفانہ رویے کا اظہار

پرانے زمانے میں کہا جاتا تھا کہ مہمان باعثِ رحمت ہوتے ہیں لیکن اب قدریں بدل گئی ہیں اور اس کے ساتھ ہی پرانے محاورے اور کہاوتیں بھی بے معنی ہوکر رہ گئی ہیں۔ آج کے دور میں اپنا ہی گزارہ مشکل ہے پھر مہمان کی خاطر تواضع کیسے کی جاسکتی ہے اور مہمان بھی وہ جو بن بلایا اور اجنبی ہو۔ میں اس روز لان میں بیٹھی اپنے انگوٹھے سے خون بہتا ہوا دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اگر خون نہ رکا تو مجھے اندر جا کر اس پر پٹی لپیٹنا ہوگی۔ دراصل غلطی میری ہی

تھی۔ مجھے یہ خیال ہی نہیں آیا کہ لان کے گرد لگی ہوئی باڑھ پرانی ہو چکی ہے اور اس پر رنگ کرنے کی ضرورت ہے۔ باڑھ کا دروازہ کھولتے ہوئے اس کا ایک پول گر گیا تھا اور میرا خیال تھا کہ اسے اپنی جگہ دوبارہ کھڑا کرنے میں زیادہ سے زیادہ دس منٹ لگیں گے لیکن یہ کام ایک گھنٹے میں ختم ہوا۔ اس کوشش میں میرا انگوٹھا زخمی ہو گیا اور کندھے بھی دکھنے لگے تھے۔ میں اسی لیے لان میں کرسی پر بیٹھی ستا رہی تھی اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ گھر کے اندر جا کر خون کو روکنے کے لیے پٹی باندھ سکوں۔

"تم ٹھیک تو ہو سوی؟" عقب سے مما کی آواز سنائی دی جو مجھے اس طرح بیٹھا دیکھ کر کچھ فکر مند سی ہو گئی تھیں۔

"ہاں ٹھیک ہوں۔" میں نے چڑ کر کہا۔ "مجھے کچھ نہیں ہوا۔" دراصل مجھے اس نام سے نفرت ہو گئی تھی۔ جب کوئی مجھے سوی کہہ کر بلاتا تو یوں لگتا جیسے میں ابھی تک سات سال کی بچی ہوں حالانکہ میں بالغ ہو گئی تھی اور کالج میں پڑھ رہی تھی۔ مجھے امید تھی کہ قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد نیو ہمپشائر کی پہلی پولیس چیف بن جاؤں گی۔

میں ایک بار پھر اپنے انگوٹھے کو دیکھ رہی تھی جہاں سے ابھی بھی خون رس رہا تھا۔ مما گھر کے باہر چھوٹے سے پورچ میں بائیں ٹانگ ایک مونڈھے پر رکھے ہوئے بیٹھی تھیں جس پر پلاستر چڑھا ہوا تھا۔ دو ہفتے قبل سیڑھیاں اترتے ہوئے ان کا پاؤں ایک گڑھے میں چلا گیا تھا اور ان کی بائیں ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اس کی وجہ سے مجھے ان کی دیکھ بھال کے لیے کالج چھوڑ کر گھر آنا پڑا اور میرا ایک سیمسٹر ضائع ہو گیا۔ گھر آ کر معلوم ہوا کہ ہمارے مالی حالات انتہائی خستہ ہو چکے ہیں اور ٹیلی فون ٹرالی کے نچلے خانے میں غیر ادا شدہ بلوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔

دراصل ڈیڈی اور مما نے جوانی میں ہی شادی کر لی تھی اور ساری زندگی سیاسی سرگرمیوں میں گزار دی، چنانچہ انہیں کبھی اچھا کھانا اور اچھا پہننا نصیب نہ ہوا۔ میری پیدائش کے بعد ڈیڈی بہتر مستقبل کی تلاش میں مغرب کی جانب چلے گئے اور اس کے بعد ہم نے ان کی شکل نہیں دیکھی۔ مما نے ہی میری پرورش کی اور شروع سے ہی مجھے احکامات اور نظم و ضبط کا پابند بنا دیا، لہٰذا میں نے بھی فیصلہ کر لیا کہ تعلیم مکمل کر کے پولیس کی ملازمت اختیار کر لوں گی۔

زندگی جیسے تیسے گزر رہی تھی کہ مما کے ساتھ پیش آنے والے حادثے نے حالات کا رخ یکسر بدل دیا۔ گھر آنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ مما نے بلوں کی ادائیگی کرنے کے بجائے اپنی ساری آمدنی فلاحی ادارے کو عطیہ کر دی تھی جہاں سے انہیں تعریف و توصیف کے چند جملوں کے سوا کچھ نہ ملا۔ یہ سب کچھ جان کر میں بہت چیخی چلائی جس پر بعد میں مجھے افسوس بھی ہوا۔ میں نے جیسے تیسے کر کے بلوں کی ادائیگی کا انتظام کیا جس کے نتیجے میں میری ساری بچت ختم ہو گئی اور مجھے لگا کہ دوبارہ تعلیم شروع کرنے کے لیے ایک سیمسٹر کے بجائے سال یا دو سال انتظار کرنا پڑے گا۔ بلوں کی ادائیگی کے علاوہ مجھے مہینے کا راشن اور گھر کی قسطیں بھی ادا کرنا ہوتی تھیں چنانچہ عارضی طور پر میں نے ایک ملازمت اختیار کر لی۔

اس روز لان میں بیٹھے بیٹھے قرب و جوار پر نگاہ دوڑائی۔ کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ سڑک کے دائیں بائیں ایک جیسے مکانات بنے ہوئے تھے اور ہمارے گھر کے سامنے اینٹوں سے بنی ایک پرانی عمارت تھی جس میں ایک فارمیسی اور اس کے ایک جانب چھوٹا سا پارکنگ لاٹ بنا ہوا تھا۔ جب میں چھوٹی تھی تو اپنے جیب خرچ سے ٹافیاں اور آئس کریم خریدا کرتی تھی۔ فارمیسی اب بھی موجود تھی لیکن اس کا نام مختلف اوقات میں بدلتا رہا۔

میں نے ایک بار پھر اپنے انگوٹھے کی طرف دیکھا۔ خون رک چکا تھا لہٰذا میں دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ عین اسی وقت وہ بوڑھا شخص سائڈ لین پر چلتا ہوا میری طرف آتا دکھائی دیا۔ اس کی عمر ستر برس کے قریب ہو گی۔ اس نے پینٹ شرٹ اور جیکٹ پہن رکھی تھی جبکہ جوتے گرد آلود تھے۔ اس نے بائیں ہاتھ میں ایک بوسیدہ سا سوٹ کیس پکڑا ہوا تھا۔

وہ میرے سامنے آ کر رک گیا۔ اس نے پہلے مجھے دیکھا پھر مما کو اور گھر پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ "گویا یہ اب بھی اپنی جگہ موجود ہے۔"

مجھے اجنبی لوگوں کے ساتھ بیٹھنا پسند نہیں۔ خواہ ان کی کتنی بھی عمر کیوں نہ ہو چنانچہ میں کھڑی ہو گئی اور بولی۔ "معاف کرنا، میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں؟"

وہ میری طرف مڑا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ "سوری، میرا نام روئی بیک ہے۔ میرا بچپن اسی گھر میں گزرا ہے۔ یہ اب بھی ویسا ہی دکھائی دیتا ہے۔ البتہ اس وقت یہاں دوسری باڑھ لگی ہوئی تھی۔"

"واقعی؟" میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں، پہلے یہاں ایک اونچی لکڑی کی باڑھ ہوا کرتی تھی لیکن وہ میری ماں کو پسند نہیں تھی اور وہ ڈیڈی سے اکثر کہا

کرتی تھی کہ اس باڑھ کی وجہ سے ہمارا پورچ بالکل چھپ گیا ہے لیکن ڈیڈی کا کہنا تھا کہ اس اونچی باڑھ کی وجہ سے ہم سڑک کے شور سے محفوظ رہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مجھے یہاں سے گئے ہوئے چالیس برس تو ہو گئے ہوں گے۔"

میں اس سے معذرت کر کے گھر کے اندر جانے ہی والی تھی کہ میری ماں اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے بول پڑی۔ "واقعی تم یہاں رہا کرتے تھے؟ مجھے تو یہ سن کر بہت اچھا لگا۔"

میں نے مما کو گھورا لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ بوڑھا آدمی تھوڑا سا جھکا اور بولا۔ "میں سچ کہہ رہا ہوں لیکن اس بات کو بہت عرصہ ہو گیا۔"

اس سے پہلے کہ میں کوئی مداخلت کرتی، مما بول پڑیں۔ "کیا تم اندر سے یہ مکان دیکھنا چاہو گے؟"

"اوہ! یہ تو میرے لیے خوشی کی بات ہو گی۔" اس نے سوٹ کیس ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔

میرے لیے اس سے زیادہ برداشت کرنا ممکن نہ تھا چنانچہ میں بول پڑی۔ "سوری! یہ ممکن نہیں ہے۔ کچھ دیر بعد کوئی ملنے کے لیے آنے والا ہے۔ اس لیے ہم تمہارے لیے وقت نہیں نکال سکتے۔ بعد میں دیکھا جائے گا۔"

میری ماں نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "میں تمہاری دلچسپی کی قدر کرتی ہوں لیکن فی الحال وقت کی کمی کی وجہ سے یہ ممکن نہیں۔"

روئی نے کہا۔ "میں سمجھ رہا ہوں، تکلیف دینے کے لیے معذرت چاہوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ مڑا اور جس راستے سے آیا تھا، اسی پر ہو لیا۔ میں نے اس کی چال میں ہلکی سی لنگڑاہٹ محسوس کی۔

اس کے جانے کے بعد مما ناراض ہوتے ہوئے بولیں۔ "مجھے نہیں معلوم کہ تم اس کے ساتھ اتنی سختی سے کیوں پیش آئیں۔ دیکھنے میں وہ ایک اچھا آدمی لگ رہا تھا۔ تم نے اسے اتنا حقیر کیوں سمجھا؟"

"میں نے اسے حقیر نہیں سمجھا بلکہ اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔"

"نہیں، میرا خیال ہے کہ تم نے اس کی بے عزتی کی ہے۔ اس نے صرف یہی کہا تھا نا کہ وہ اپنا پرانا گھر دیکھنا چاہتا ہے۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ وہ ایک شریف بوڑھا آدمی تھا؟ کیا آپ اس سے پہلے مل چکی ہیں؟"

"نہیں لیکن......"

"ڈیڈی اور آپ نے جس سے یہ مکان خریدا تھا، کیا یہ وہی شخص ہے؟"

"نہیں۔ وہ ایک عورت تھی، مسز جینی ونٹرز۔ میرا خیال ہے کہ تم اسے جانتی ہو۔" مما نے کہا۔

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "کیا آپ یہ سمجھ رہی ہیں کہ مسز ونٹرز نے اس شخص سے یہ مکان خریدا ہو گا؟"

"سوی!" مما کے لہجے میں ہلکا سا احتجاج تھا۔

میں نے ایک نظر اپنے انگوٹھے پر ڈالی اور کہا۔ "مما! میں اور آپ اس شخص کو نہیں جانتے۔ اس وقت گھر میں ہم دو عورتیں ہیں جبکہ آپ کی ٹانگ بھی ٹوٹی ہوئی ہے پھر میں ایک اجنبی شخص کو گھر میں کس طرح آنے دیتی؟ اگر وہ اپنے سوٹ کیس سے ریوالور یا چاقو نکال لیتا تو......"

مما نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "مجھ میں اور تم میں یہی ایک فرق ہے۔ تم ہمیشہ لوگوں میں برائی تلاش کرتی ہو۔"

"اور آپ ہر شخص کو اچھا سمجھتی ہیں چاہے وہ حقیقت میں ایسا نہ ہو۔" میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

مما کو کھانا کھلانے اور بستر میں لٹانے کے بعد میں اپنی ڈیوٹی پر جانے کی تیاری کرنے لگی۔ کسی زمانے میں کالج کے طالب علموں کو اپنی پڑھائی اور امتحان میں اچھے نمبر لانے کے علاوہ کوئی فکر نہیں ہوتی تھی لیکن اب یہ بھولی بسری کہانیاں لگتی ہیں۔ اب انہیں ایک سیمسٹر مکمل کرنے کے بعد دوسرے سیمسٹر میں داخلہ لینے کی پریشانی لگی رہتی ہے اور اس کے لیے وہ وظیفے یا بینک سے قرض لینے کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں۔ لہٰذا مجھے بھی مما کی دیکھ بھال کرنے اور گھر کے اخراجات کے لیے ملازمت کی ضرورت پیش آئی اور میں گرافٹن کاؤنٹی گارڈ سروسز میں سیکیورٹی آفیسر بھرتی ہو گئی۔ میری ڈیوٹی رات کو ہوتی تھی۔ اس طرح مجھے دن میں مما کو نہلانے دھلانے، کھانا کھلانے اور گھر کے دیگر کام کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔

میں نے ڈیوٹی پر جانے کے لیے وردی پہنی جو نیلی قمیص اور سیاہ پتلون پر مشتمل تھی۔ کمر میں نائن ایم ایم کا سیمی آٹومیٹک پستول لگایا جو میں نے خود اپنی خواہش اور دلچسپی کے پیش نظر اپنی اکیسویں سالگرہ پر خریدا تھا اور کمپنی نے ڈیوٹی کے دوران یہ ریوالور ساتھ رکھنے کی اجازت دے دی تھی۔ ساڑھے نو بجے کے قریب میں اپنے ہاتھ میں رات کا کھانا اور پانی کی بوتل لیے کار کی طرف بڑھی لیکن سڑک کے

پارنظر پڑی تو میرے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔
وہی بوڑھا شخص رونی بیک ایک لیمپ پوسٹ کے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ اس وقت بھی اس کے ہاتھ میں وہی سوٹ کیس تھا اور وہ مسلسل مجھے اور ہمارے مکان کو دیکھے جا رہا تھا۔ مجھے اس کی یہ حرکت بالکل پسند نہیں آئی۔ میں نے پانی کی بوتل اور کھانے کا ڈبا کار میں رکھا اور سڑک پار کرنے کے لیے ٹرک کے گزرنے کا انتظار کرنے لگی جو اچانک ہی وہاں آ گیا تھا لیکن جب میں سڑک پار کر کے وہاں پہنچی تو وہ بوڑھا غائب ہو چکا تھا۔ میں نے ایک دو منٹ رک کر پارکنگ لاٹ کا جائزہ لیا اور دوبارہ اپنے گھر کی طرف چل دی تاکہ ایک بار پھر تسلی کر لوں کہ سارے دروازے بند ہیں یا نہیں۔

☆☆☆

میری ڈیوٹی ایک بڑے سے پارکنگ لاٹ میں تھی جہاں کسی مقامی کمپنی کے درجنوں ٹرک اور ٹریلر کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے احاطے کا ایک چکر لگایا اور کچھ جگہوں پر رک کر وہاں لگے ہوئے تالوں کو چیک کیا۔ میرے بارے میں سبھی جانتے تھے کہ میں ڈیوٹی کے دوران کبھی میں نہیں سوتی بلکہ مستقل گشت کرتی رہتی ہوں۔ کبھی کبھی دفتر چلی جاتی، جہاں ٹیلی ویژن اسکرین پر کیمروں کی مدد سے باہر کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ وہیں بیٹھ کر میں نصف شب کھانا کھاتی جو عموماً ایک سینڈوچ پر مشتمل ہوتا تھا۔ بقیہ وقت میں کتاب پڑھنے یا کوئی معما حل کرنے میں گزار دیتی تاکہ نیند کے جھونکے مجھے پریشان نہ کریں۔

اس ملازمت میں سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ مجھے وہاں تنہا رہنا ہوتا تھا۔ اس طرح سارا وقت سوچنے میں گزار دیتی۔ اس رات بھی میں رونی بیک کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ رات کے وقت پارکنگ لاٹ میں کھڑا کیا کر رہا تھا؟ پہلی بار اس کا آنا مجھے کچھ عجیب سا لگا تھا لیکن دوسری بار اسے دیکھ کر مجھے کچھ شک ہوا۔ میں ڈر رہی تھی کہ تیسری بار وہ گھر میں ہی نہ چلا جائے۔ مجھے اس وقت ڈیوٹی پر آنا اچھا نہیں لگا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میری ماں ٹوٹی ہوئی ٹانگ کے ساتھ گھر میں اکیلی تھی لیکن مجبوری یہ تھی کہ چھٹی کرنے کی صورت میں ایک دن کی تنخواہ کٹ جاتی اور میں اس کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ اگلے ہفتے مجھے مکان کی قسط ادا کرنا تھی۔ گو کہ میں گھر کے تمام دروازے چیک کر کے آئی تھی، اس کے باوجود دھڑکا سا لگا ہوا تھا۔

☆☆☆

دو بجے کے قریب مارک ہوگن مجھ سے ملنے کے لیے آیا۔ وہ عموماً اسی وقت آیا کرتا تھا۔ اس کا تعلق پولیس ڈیپارٹمنٹ سے تھا۔ وہ اپنی گاڑی سے اترا تو اس نے ہاتھ میں کافی کے دو کپ پکڑے ہوئے تھے جس میں سے ایک اس نے باڑھ کے خلا میں سے مجھے پکڑا دیا۔ وہ مجھ سے عمر میں پانچ برس بڑا تھا اور اس کے چہرے کی قاتل مسکراہٹ کسی بھی لڑکی کا دل پگھلانے کے لیے کافی تھی۔ وہ مجھ سے کئی بار ڈیٹ پر چلنے کے لیے کہہ چکا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میں اس کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی دیکھ چکی تھی۔ وہ پہلے ہی مجھے بتا چکا تھا کہ بیوی سے اس کی علیحدگی ہو چکی ہے لیکن میں اس وقت تک اعتبار کرنے کو تیار نہ تھی جب تک وہ انگوٹھی اس کے ہاتھ سے نہ اتر جاتی اور وہ مجھے طلاق کے کاغذات نہ دکھا دیتا۔

”کیسی گزر رہی ہے؟“ اس نے حسب عادت پوچھا۔
”کچھ خاص نہیں۔“ میں نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”وہی جو ہر روز ہوتا ہے۔ تم اپنی سناؤ۔“
”اپنا بھی یہی حال ہے۔ تم جانتی ہو رات کے گشت میں کیا ہوتا ہے۔ ابھی ایک شخص کو پولیس اسٹیشن چھوڑ کر آیا ہوں جو شراب کے نشے میں دھت تھا۔“
ہم دونوں کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر وہ بولا۔ ”میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کچھ الجھی ہوئی ہو۔ کیا کوئی پریشانی ہے؟“
وہ پولیس والا تھا اور دوسروں کی کیفیت کو بہت جلد محسوس کر لیتا تھا۔ اس لیے میں نے اس سے کچھ چھپانا مناسب نہ سمجھا اور اسے رونی بیک اور اس کی دوبارہ آمد کے بعد ابھرنے والے اندیشوں کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ وہ غور سے میری بات سنتا رہا پھر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اس شخص کو اپنے سر پر سوار کرنے سے بہتر ہے کہ اس کے بارے میں حقائق معلوم کیے جائیں۔“
”مثلاً......“
”کل کسی وقت تم رجسٹرار کے دفتر جاؤ، وہاں تمہیں اپنے گھر کا سارا ریکارڈ مل جائے گا اور تم اس کی مدد سے یہ معلوم کر سکتی ہو کہ ماضی میں کتنے لوگ اس مکان کے مالک رہ چکے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ کبھی مسٹر بیک اور ان کا خاندان اس مکان میں رہائش پذیر تھا اور اگر واقعی ایسا ہے تو سمجھ لو کہ وہ ایک معصوم اور بوڑھا شخص ہے جو اپنے بچپن کی یادیں تازہ کرنے کے لیے مکان کو اندر سے دیکھنا چاہتا ہے۔“
”اور اگر اس کا نام مالکوں کی فہرست میں نہ ہوا تو......“

”پھر تم مجھے فون کر دینا۔ میں فوری طور پر اس کے ماضی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا تاکہ یہ جان سکوں کہ کبھی رونی بیک نامی شخص اس قصبے میں رہتا تھا یا نہیں۔“
میں نے اس پر ایک مسکراہٹ نچھاور کی اور بولی۔ ”شکریہ، مجھے تمہاری بات پر یقین ہے۔“
اس نے جواب میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ مت سمجھنا کہ میں یہ سب کچھ تمہاری خاطر کر رہا ہوں۔“ میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا اور صرف مسکرا کر رہ گئی۔

☆☆☆

دوسرے دن سہ پہر کے وقت میں رجسٹرار آفس چلی گئی۔ مما کے پاس ان کی دو پرانی سہیلیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے ان کے لیے کھانے اور چائے کا انتظام کر دیا اور یہ بھی گزارش کی کہ میرے واپس آنے تک وہ مما سے چپکی رہیں۔ ان عورتوں کے پاس وقت کی کوئی کمی نہیں تھی اس لیے وہ بخوشی تیار ہو گئیں۔ رجسٹرار آفس کنکریٹ اور اینٹوں سے بنی ہوئی عمارت میں واقع تھا جس میں کئی کھڑکیاں اور بڑے بڑے ہال تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ میرا مطلوبہ دفتر... تہ خانے میں واقع ہے۔ وہ جگہ الماریوں سے بھری ہوئی تھی اور وہاں میری مما کی ہم عمر ایک قبول صورت عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ جب میں نے اس سے اپنا مدعا بیان کیا تو وہ مجھے ایک الماری تک لے گئی اور اس میں سے ایک فائل نکال کر مجھے تھماتے ہوئے بولی۔
”تم اس میز پر بیٹھ کر اس کا مطالعہ کر سکتی ہو۔“
میں نے فائل کے صفحات پلٹنا شروع کیے۔ سب سے اوپر میری مما اور ڈیڈی کے نام کی رجسٹری لگی تھی۔ اس سے پہلے جینی ونٹرز کا نام تھا۔ میں صفحات پلٹتی گئی اور میں نے گزشتہ چالیس سال کا ریکارڈ دیکھ ڈالا لیکن وہاں بیک کے نام کا کوئی کاغذ نہیں تھا لہٰذا میں نے مارک کو فون کیا اور گھر چلی آئی۔

☆☆☆

گھر پہنچی تو میں نے رونی بیک کو اپنی ماں اور اس کی دو سہیلیوں سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ مجھے کار سے باہر آتا دیکھ کر وہ دونوں عورتیں اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر روانہ ہو گئیں۔ میں مسٹر بیک کی طرف بڑھی تاکہ اس سے معلوم کر سکوں کہ وہ حقیقت میں کون ہے اور یہاں کس مقصد سے آ رہا ہے۔ میری ماں پورچ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ ”سوسی! دیکھو مسٹر بیک ہمارے مہمان ہیں۔

بہ نفس نفیس

ایک اخبار کے ایڈیٹر نے اپنے سامنے بیٹھی ہوئی خاتون سے پوچھا۔
”محترمہ اس سے پہلے بھی آپ نے کچھ لکھا۔“
”کیوں نہیں جناب۔ میں اپنی آپ بیتی لکھ چکی ہوں۔ یہ آپ بیتی میں نے ایک مشہور رسالے والوں کو بھیجی تھی۔“ خاتون نے جواب دیا۔
”میرے خیال میں انہوں نے واپس کر دی ہوگی۔“
”جی نہیں۔ ایڈیٹر صاحب بہ نفس نفیس ہزار کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے مجھ سے ملنے آ گئے تھے۔“
مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

میں انہیں کہنے ہی والی تھی کہ وہ اوپر جا کر وہ کمرا دیکھ سکتے ہیں جسے یہ اپنے بیڈ روم کے طور پر استعمال کیا کرتے تھے۔“
میں رونی بیک اور پورچ کے درمیان راستہ روک کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔ ”اس سے پہلے کہ ہم انہیں اندر جانے دیں، کیا مسٹر بیک یہ بتا سکتے ہیں کہ وہ کس سن میں یہاں رہا کرتے تھے؟“
اس نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا پھر بولا۔ ”یہ انیس سو اٹھتر اور ستر کی بات ہے جب میں یہاں رہائش پذیر تھا۔“
”تمہیں یقین ہے کہ تم سچ کہہ رہے ہو؟“ یہ کہہ کر میں نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور بولی۔ ”رجسٹرار کے ریکارڈ کے مطابق اس وقت اس مکان کا مالک جانسن خاندان تھا۔ اس سے پہلے مسٹر کیلان اس مکان کے مالک تھے۔ یہ مکان کبھی بھی بیک فیملی کی ملکیت نہیں رہا، کبھی نہیں۔“
اس پر بھی میری ماں کچھ نہیں بولی لیکن بیک نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، اس وقت جانسن اس مکان کا مالک تھا اور میں نے اس سے اوپر کا ایک کمرا کرائے پر لیا تھا۔ میں اس زمانے میں ٹرز ملز میں کام کیا کرتا تھا پھر وہ مل بند ہو گئی، یہی سچ ہے۔“
میں نے اسے تیز نظروں سے گھورا اور بولی۔ ”مجھے افسوس ہے مسٹر بیک! میں تمہاری بات پر اعتبار نہیں کر سکتی۔ بہتر ہوگا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔“
اس نے اپنا سوٹ کیس ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا اور بولا۔ ”تم نوجوان نسل کے لوگ یہ سمجھتے ہو کہ تم سب کچھ جانتے ہو کیونکہ تمہیں جدید ترین کمپیوٹر، انٹرنیٹ

اور سیل فون کی سہولت حاصل ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ تمہیں کچھ بھی معلوم نہیں۔ تم اس حقیقت کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔" یہ کہہ کر وہ مڑا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

☆☆☆

رات کو جب میری ماں بستر پر لیٹی تو اس نے مجھ سے کہا۔ "سوی! میں نہیں جانتی کہ وہ شخص یہاں کیوں آتا ہے لیکن مجھے اس کی ایک بات سے اتفاق ہے۔"

"وہ کیا مما؟"

"یہی کہ تم نوجوان لوگ بہت سی باتوں پر توجہ نہیں دیتے۔" مما نے کہا۔ "موجودہ دور کی سہولتوں کے سبب دنیا بھر کی معلومات تمہاری انگلیوں پر ہیں۔ تم منٹوں میں لندن کے موسم کا حال بتا سکتے ہو اور یہ بھی معلوم کر سکتے ہو کہ 1951ء میں ورلڈ سیریز کس نے جیتی تھی۔ تم چین، جاپان اور آسٹریلیا میں کسی کو بھی ای میل کے ذریعے پیغام بھیج سکتے ہو اور منٹوں میں اس کا جواب وصول کر سکتے ہو لیکن حقیقی زندگی میں بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن پر تمہاری نظر نہیں جاتی۔"

میں ڈیوٹی پر جانے سے پہلے تمام انتظامات کا جائزہ لینا چاہتی تھی۔ میں نے مما کے سرہانے رکھی ہوئی میز کو ان کے بستر سے قریب کر دیا تاکہ ان کا ہاتھ بہ آسانی پانی کے جگ اور گلاس تک پہنچ سکے۔ مما نے اپنی بات جاری رکھی۔

"لیکن تمہیں اپنے پڑوسی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ تم اس کا نام بھی نہیں جانتے اور نہ ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہاں کام کرتا ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ تمہیں اس شہر اور اس مکان کی تاریخ بھی نہیں معلوم۔"

میں نے آگے بڑھ کر ان کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور بولی۔ "مما! میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ مکان کی قسط ادا کرنے میں ایک ہفتے سے بھی کم وقت رہ گیا ہے اور اگر میں آج رات یا کل یا پرسوں کام پر نہیں گئی تو مکان کی قسط ادا نہیں ہو سکے گی اور آپ کا نام نادہندگان کی فہرست میں آجائے گا۔"

انہوں نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "کاش تم مجھے اس کے لیے موردِ الزام نہ ٹھہراتیں۔"

"میں آپ کو الزام نہیں دے رہی، صرف حقیقت بیان کر رہی ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اب چلتی ہوں ورنہ دیر ہو جائے گی۔"

☆☆☆

اس رات میرے لیے وقت گزارنا مشکل ہو گیا۔ میں نے احاطے کے کئی چکر لگائے۔ انتظار کی کیفیت میں مجھ سے کچھ کھایا بھی نہیں گیا۔ خدا خدا کر کے دو بجے تو میں مرکزی گیٹ کی طرف بھاگی لیکن وہاں پولیس کی کوئی گاڑی نہیں تھی اور نہ ہی مارک ہوگن کہیں نظر آ رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ صبح ہونے سے پہلے مجھے اپنی فون کال کا جواب نہیں مل سکتا۔

میں نے کچھ دیر وہاں کھڑے ہو کر انتظار کیا اور بوجھل قدموں سے دفتر میں آگئی۔ کچھ دیر مزید انتظار کرنے کے بعد میں نے پولیس ہیڈ آفس فون کر کے مارک ہوگن کے بارے میں پوچھا۔

ڈسپیچر نے بڑی مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "روٹ پچیس پر کار کا ایک بڑا حادثہ ہوا ہے۔ وہ رات بھر وہیں مصروف رہے گا۔"

☆☆☆

شفٹ ختم ہونے کے بعد میں سیدھی ٹرز پولیس اسٹیشن چلی گئی اور یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ مارک کی پک اپ پارکنگ لاٹ میں موجود تھی۔ میں پولیس اسٹیشن کے اندر چلی گئی اور دو منٹ بعد ہی مجھے مارک اپنے دفتر میں مل گیا۔ وہ اس وقت بھی کمپیوٹر پر بیٹھا کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔

"مجھے افسوس ہے کہ تمہارے پاس نہ آسکا۔ پوری رات خوار ہوتا رہا ہوں۔"

"اور میں بھی رات بھر یہ سوچ کر پریشان ہوتی رہی کہ تمہارے پاس مجھ سے بات کرنے کے لیے ایک دو منٹ بھی نہیں تھے۔"

"تم نہیں جانتیں کہ وہ کتنا خوفناک حادثہ تھا جس میں ٹرنر ہائی اسکول کی ذہین ترین طالبہ اپنی جان سے چلی گئی۔ جائے حادثہ کے نقشے بنانا، وہاں کی تصویریں لینا اور سب سے بڑھ کر لڑکی کے والدین کو اس حادثے کی اطلاع دینا میرے لیے بہت ہی تکلیف دہ تھا۔"

میں اپنے ہونٹ چباتے اور دروازے کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔ "ٹھیک ہے، جب تم فارغ ہو جاؤ تو مجھے فون کر لینا۔"

"ایک منٹ۔" وہ اپنی میز سے کچھ کاغذات اٹھاتے ہوئے بولا۔ "رونی بیک، عمر اٹھتر سال...... وہ چارلس ٹاؤن جیسا چینس کا رہنے والا ہے اور ساٹھ کی دہائی کے آخر میں ٹرنر آگیا تھا۔ اس نے تم سے جھوٹ نہیں بولا۔ وہ تمہارے مکان میں ایک سال تک رہتا رہا تھا۔"

"کہتے رہو۔" میں غصے سے بولی۔ "اس کا کہنا ہے کہ وہ ٹرز طرز میں کام کرتا تھا۔"

مارک نے کاغذات پر ایک نظر ڈالی اور بولا۔ "نہیں۔ وہ ایک تعمیراتی کمپنی میں مزدور اور مستری کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔"

میں نے اپنی نیند سے بوجھل آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔ "تمہارا بہت بہت شکریہ مارک۔"

میں جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ وہ بولا۔ "رکو، ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی۔"

"اب مزید کہنے کے لیے کیا باقی رہ گیا ہے؟" میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"کیا تم جانتی ہو کہ یہاں سے جانے کے بعد مسٹر بیک کہاں رہتے رہے؟"

"اس بارے میں اس نے کچھ نہیں بتایا۔"

"وہ وارڈ سے آیا ہے جس کا مطلب ہے کہ وہ ریاست کا مہمان تھا اور اسے اصلاح خانے میں رکھا گیا تھا۔"

"کیا وہ کوئی مجرم ہے؟"

"ہاں۔"

"اور وہ کس جرم کے تحت اندر ہوا تھا؟" اور جب مارک نے مجھے اس کے جرم کی نوعیت بتائی تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور میں فوراً ہی وہاں سے چل دی۔

☆☆☆

میں نے گھر پہنچ کر دیکھا کہ مما پورچ میں بیٹھی میرا انتظار کررہی تھیں۔ جب میں قریب پہنچی تو دیکھا کہ اس دن کی ڈاک ان کے زانو پر رکھی ہوئی تھی۔

"سوسی! اس سے پہلے کہ تم ڈاک دیکھنا شروع کرو، میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ مسٹر بیک آئے تھے اور......"

میں نے وہ ساری ڈاک اٹھائی اور بلوں کو دیکھنے لگی۔ ان میں دو بلوں پر سرخ حاشیہ بنا ہوا تھا۔

"مما! یہ فون اور بجلی کمپنی کے خط ہیں اور ان میں لکھا ہے کہ ہم نے گزشتہ ماہ کے بل ادا نہیں کیے تھے۔ اس لیے وہ ایک ہفتے بعد بجلی اور فون کا کنکشن منقطع کردیں گے۔"

"وہ صرف دھمکی دے رہے ہیں۔ اگر تم انہیں فون کرو تو مجھے یقین ہے کہ وہ مان جائیں گے۔"

"لیکن آپ نے تو ان بلوں کی ادائیگی کا وعدہ کیا تھا پھر کیا ہوا؟"

"اس سے بھی زیادہ ضروری کام نکل آیا تھا۔" وہ آہستہ سے بولیں۔ "اس سے زیادہ میں کچھ نہیں بتا سکتی۔"

میں نے وہ بل ان کے سامنے لہرائے اور بولی۔ "میں اگلے ہفتے مکان کی قسط اور یہ بل ایک ساتھ نہیں دے سکتی۔ آپ میری بات سمجھ رہی ہیں نا؟"

جیسے ہی میری نظر فرش پر پڑے قدموں کے نشان پر گئی، میں نے چلانا بند کردیا۔ وہ مما کے نہیں بلکہ کسی مرد کے جوتوں کے نشان تھے۔ میں نے کہا۔ "مما! آپ کہہ رہی تھیں کہ مسٹر بیک آئے تھے۔ وہ کہاں ہیں؟"

مما نے موضوع تبدیل ہونے پر سکون کا سانس لیا اور بولیں۔ "وہ ایک گھنٹا پہلے جاچکا ہے۔ ہم نے خوب باتیں کیں بلکہ اس نے تو اپنے اور میرے لیے چائے بھی بنائی۔"

"کیا وہ اوپر بھی گئے تھے، اپنے پرانے کمرے میں؟"

"ہاں، کیوں نہیں۔" مما نے کہا۔ "اور وہ جاتے وقت بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ بھلا میں اسے کیسے منع کرسکتی تھی۔"

میں نے وہ دونوں بل ان کی گود میں پھینکے اور بولی۔ "اپنی زبان بند کرلیں۔ کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔" یہ کہہ کر میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر چلی گئی۔

☆☆☆

میرے پرانے کمرے کی حالت خاصی ابتر نظر آرہی تھی۔ بستر اور میز کو گھسیٹ کر ایک طرف کردیا گیا تھا اور دیوار میں ایک سوراخ نظر آرہا تھا۔ میں نے جھک کر اندر کی طرف جھانکا۔ وہ خاصا بڑا سوراخ تھا جسے کسی چیز کو چھپانے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ بیک اسی کمرے میں رہا کرتا تھا اور میرے ذہن میں وہ الزامات گھومنے لگے جن کی وجہ سے وہ سرکاری مہمان خانے میں رہ کر آیا تھا۔ میں گھٹنوں کے بل اٹھی اور ایک نظر کمرے پر ڈالی۔ میرے بستر پر کوئی چیز رکھی ہوئی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ وہ سو ڈالر کے نوٹوں کے پانچ پیکٹ تھے۔ ان کے ساتھ ہی ایک کاغذ بھی رکھا ہوا تھا جس پر لکھا ہوا تھا۔

"گزشتہ چالیس سالوں تک تمہارا کمرا میرے استعمال میں رہا۔ اس کے لیے شکریہ۔ امید ہے کہ اس رقم سے میرا حساب صاف ہوجائے گا۔ رونی بیک۔"

میں نے وہ بنڈل اٹھالیے۔ ان پر 1960ء کی تاریخ پڑی ہوئی تھی۔ ان پر لگا ہوا بینڈ دھندلا گیا تھا لیکن پڑھا جاسکتا تھا۔ ٹرز سیونگس اینڈ لون۔

میں سیڑھیاں اترتے ہوئے نیچے آئی اور ماں کے

پاس کرسی پر بیٹھ گئی۔ میری نظریں سڑک کے پار والی گرین فارمیسی پر جمی ہوئی تھیں۔

"مما!" میں نے کہا۔ "کیا کبھی یہاں بینک بھی ہوا کرتا تھا؟"

"ہاں لیکن وہ ستر کی دہائی کے شروع میں ہی بند ہوگیا تھا۔"

"اوہ۔ میں سمجھی۔" میں نے اپنے بازو سینے پر باندھتے ہوئے کہا اور ماضی کے دنوں کا تصور کرنے لگی۔ رونی بیک اس زمانے میں نوجوان اور صحت مند ہوا کرتا تھا۔ بظاہر وہ مستری کا کام کرتا اور میرے پرانے بیڈروم میں رہا کرتا تھا لیکن اس کا اصل پیشہ بینک اور کاریں لوٹنا تھا۔ ایک دن وہ سڑک کے پار واقع بینک میں گیا جہاں اب فارمیسی ہے اور بینک لوٹ کر رقم اپنے کمرے میں چھپادی۔ اسے انتظار تھا کہ معاملہ ٹھنڈا ہوجائے تو وہ یہ رقم یہاں سے نکال لے گا۔ بدقسمتی سے وہ کسی دوسرے جرم میں پکڑا گیا اور اسے ریاست مِنی کی جیل میں ایک طویل عرصہ قید کاٹنا پڑی اور جب وہ رہا ہوکر واپس آیا تو میں اور مما اس کے راستے کی رکاوٹ بن گئے۔

"سوسی!" مما کی آواز سن کر میں اپنے خیالوں سے باہر آگئی اور بولی۔

"جی مما!"

"بلوں کا کیا ہوگا؟"

میں نے اچانک ہی ان کا ہاتھ تھام لیا۔ میں جانتی تھی کہ ایک قانون پسند شہری ہونے کی حیثیت سے مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں ایف بی آئی سے رابطہ کرتی یا مارک بوگن کو اطلاع دیتی لیکن کس لیے، جس بینک سے وہ رقم لوٹی گئی تھی، اب اس کا کوئی وجود نہیں تھا اور اب اس رقم کا کوئی دعوے دار نہیں تھا۔

"مما!" میں نے کہا۔ "آپ بلوں کی ادائیگی کی فکر نہ کریں۔ میں ایک بات اور بھی کہنا چاہ رہی تھی۔"

"وہ کیا؟"

میں ان کا ہاتھ بھینچتے ہوئے بولی۔ "مجھے لوگوں کے اندر چھپی ہوئی اچھائی پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔" یہ کہہ کر میں نے ان کا ہاتھ آہستہ سے چھوڑ دیا۔ اب میرے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔

رونی بیک اپنی چھپائی ہوئی دولت بریف کیس میں سمیٹ کر چلا گیا لیکن جانے سے پہلے چالیس سال کا کرایہ ادا کر گیا تھا۔

مرزا امجد بیگ

آخری کیل

اللہ نے شریکِ حیات کو لباس فرمایا ہے مگر آج کچھ انسان۔۔۔ اسی لباس کو جلدی جلدی بدلنے کی طرف مائل ہیں بنا یہ سوچے کہ لباسوں کا یوں بدلنا زندگی کا کتنا مہنگا سودا ہوتا ہے۔ بہرحال اسے بھی یہ مہنگے سودے کرنے کی اتنی عادت تھی کہ ایک دن زندگی ہی سستی پڑ گئی۔۔۔ اور وہ سارے مہنگے سودے بھی بے قیمت ہوگئے جن کے پیچھے بھاگتے بھاگتے اس نے تمام احساسات کو بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا۔۔۔ مگر انہی احساسات کا تعاقب کرتے کرتے مرزا امجد بیگ نے گم شدہ زندگی کا سرا تلاش کرلیا کہ یہی توان کا ہنر تھا جس کے بل پر وہ حقدار کو حق دلاتے آرہے تھے۔

ٹوٹے پھوٹے حصوں کو جوڑ کر آخری کیل ٹھونکنے والے ایک وکیل کی جرح

وہ عورت اپنی وضع قطع اور پہناوے سے خاصی مہذب نظر آتی تھی۔ بعدازاں گفتگو پر پتا چلا کہ وہ تعلیم یافتہ اور شائستہ بھی ہے۔ وہ میرے چیمبر میں داخل ہوکر بیٹھ چکی تو میں اس کی جانب متوجہ ہوگیا اور پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ استفسار کیا۔ ”جی فرمائیں..... میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟“

”میرا نام فوزیہ ہے۔“ وہ اپنا تعارف کراتے ہوئے بولی۔ ”اور میں اپنے ایک جذباتی مسئلے کے لیے آپ کے پاس حاضر ہوئی ہوں۔“

میں نے کاغذ قلم سنبھالتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”جی..... مجھے اپنے مسئلے کے بارے میں بتائیں؟“

”میں اپنے شوہر سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہوں.....“ وہ بے حد مضبوط لہجے میں بولی۔

”ہوں.....!“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”تفصیلات کیا ہیں؟“

میرے سامنے بیٹھی ہوئی فوزیہ نامی وہ عورت خوش شکل اور جاذبِ نظر تھی تاہم اس وقت پریشانی اور تفکر نے پوری طرح اسے اپنے نرغے میں لے رکھا تھا۔ وہ ایک پڑھی لکھی اور باشعور عورت تھی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق وہ پینتیس کے آس پاس رہی ہوگی۔ بعد میں میرے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ اس کی عمر چھتیس سال تھی۔ میرے استفسار کے جواب میں اس نے کہا۔

”وکیل صاحب! تفصیلات بس اتنی سی ہیں کہ میں اب مزید اس شخص کے ساتھ وابستہ نہیں رہ سکتی۔ اس کا رویّہ اور کردار میری برداشت سے باہر ہے۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ رشتہ ختم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آپ عدالت سے مجھے خلع دلوادیں۔“

”خلع.....!“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”فوزیہ صاحبہ! آپ کی زبان سے ”خلع“ کا لفظ سن کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ کا شوہر کسی بھی قیمت پر آپ کو طلاق دینے کے لیے تیار نہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”نہیں وکیل صاحب! آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔“ وہ میرے اندازے کی تائید میں بولی۔ ”سفیان نہایت ہی کمینہ اور شیطانی ذہن کا مالک ہے۔“

”سفیان غالباً آپ کے شوہر کا نام ہے؟“ میں نے رف پیڈ پر قلم گھستے ہوئے کہا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلائی، میں نے پوچھا۔

"آپ کا شوہر کرتا کیا ہے؟"

"سفیان کی ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی ہے۔" اس نے بتایا۔ "مارننگ اسٹار ایڈورٹائزرز اس کمپنی کا نام ہے جو کہ خوب چلتی ہے۔"

میں نے "مارننگ اسٹار ایڈورٹائزرز" کا نام سن رکھا تھا۔ یہ ایک معروف اور کامیاب ایڈورٹائزنگ کمپنی تھی۔ میں نے فوزیہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کے شوہر کی کمپنی تو بہت اچھا بزنس کر رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں، آپ لوگوں کے ساتھ کوئی معاشی مسئلہ نہیں ہوگا۔ میں......"

"وکیل صاحب!" وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑی۔ "پیسا ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا نا...... زندگی میں انسان کو اور بھی بہت سی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے جن میں سرِفہرست محبت، اتفاق، اعتماد و عزتِ نفس ہیں۔"

"آپ نے میری بات مکمل نہیں ہونے دی۔" میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔ "ورنہ میں کچھ اور کہنے والا تھا۔"

وہ ندامت آمیز انداز میں مجھے تکنے لگی۔

"آپ نے انسانی زندگی کی جن بنیادی ضروریات کا ذکر کیا ہے میں ان سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ جب آپ اس شخص کے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتیں بلکہ اس سے شدید نفرت کرتی ہیں تو وہ طلاق دے کر آپ کو فارغ کیوں نہیں کر دیتا۔ آپ کو اس شخص سے نجات پانے کے لیے عدالت سے کیوں رجوع کرنا پڑ رہا ہے۔ کیا وہ مہر کی رقم بچانا چاہتا ہے یا پھر آپ کے برعکس، وہ اس رشتے کو چلانے کے حق میں ہے؟"

"اگر اس کو یہ رشتہ چلانے کا خیال ہوتا تو انسان بن جاتا۔" وہ زہرخند لہجے میں بولی۔ "سفیان کی اس وقت جو مالی حیثیت ہے اس کی روشنی میں مہر کی رقم کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی۔ وہ ایک لاکھ روپے میرے ہاتھ پر رکھ کر بہ آسانی مجھے اپنی زندگی سے نکال باہر کرسکتا ہے۔"

"پھر...... پھر مسئلہ کیا ہے؟" میں نے سوالیہ نظر سے فوزیہ کی طرف دیکھا۔ "جب آپ دونوں کو ایک دوسرے کی شکل سے نفرت ہے تو پھر سفیان کو طلاق دینے میں کون سی دقت محسوس ہو رہی ہے۔ کیا وہ جانتا ہے، آپ اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں؟"

"جی ہاں، یہ بات میں بڑے واضح انداز میں اسے بتا چکی ہوں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "میں نے کئی مرتبہ اس سے طلاق کا مطالبہ بھی کیا ہے مگر وہ اس معاملے کو لٹکائے چلا آرہا ہے۔ دراصل......"

وہ بولتے بولتے رکی تو میں نے فوراً پوچھ لیا۔

"دراصل کیا؟"

"سفیان نے اس معاملے کو اپنی ضد اور انا کا مسئلہ بنا لیا ہے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "وہ اس میں اپنی شکست محسوس کر رہا ہے۔ سفیان ایک ضدی، خودغرض اور انا پرست شخص ہے۔ وہ واضح الفاظ میں مجھے باور کرا چکا ہے کہ موت ہی مجھے اس کے چنگل سے نکال سکتی ہے۔ جیتے جی میں اس سے نجات حاصل نہیں کرسکتی اسی لیے......" لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

"اسی لیے میں سفیان جیسے عیاش اور بدقماش شخص کی قید سے نکلنے کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبور ہوئی ہوں۔"

میں نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔ "فوزیہ صاحبہ! آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

"لگ بھگ دس سال۔" اس نے جواب دیا۔

"دس سال کا عرصہ ایک ساتھ گزارنے کے بعد آپ کو الگ ہونے کا خیال آیا ہے۔" میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "میرا خیال ہے، ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے شادی کے بعد کا پہلا سال کافی ہوتا ہے۔"

"وکیل صاحب!" اس نے براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہوگیا ہے؟"

میں ایک لمحے کے لیے گڑبڑایا پھر سنبھل کر زیرِلب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "ابھی تک میں اس نعمت سے محروم ہوں......"

یہ واقعہ جس زمانے کا ہے اس وقت میں غیرشادی شدہ تھا۔

"تو پھر آپ اس رشتے کے نشیب و فراز کا اندازہ لگا سکتے ہیں اور نہ ہی اس کے پیچ و خم کو سمجھ سکتے ہیں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "ازدواجی زندگی بہت ہی عجیب اور پیچیدہ ہوتی ہے وکیل صاحب......" اس نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ "سفیان کی شخصیت پیاز کے مانند پرت در پرت کھلی ہے مجھ پر۔ وہ اتنا مکروہ اور بدذات شخص ہے کہ میں آپ کو

بتا نہیں سکتی۔ میں ہر قیمت پر اس کے نکاح سے نکلنا چاہتی ہوں۔ میرے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔"

"آپ کے بچے......" میں نے ایک نہایت ہی نازک سوال کیا۔ "آپ کے بچے کتنے ہیں......؟"

"صرف ایک......" اس نے بتایا۔ "میرا آٹھ سال کا ایک بیٹا ہے۔ اس کا نام نوید ہے......"

"ایک بات ذہن میں رکھیے گا۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "خلع کا مقدمہ دائر کرنے کے بعد آپ اپنے شوہر کے ساتھ اس کے گھر میں نہیں رہ سکیں گی۔ اگرچہ یہ کوئی قانونی شرط نہیں ہے لیکن میرے خیال میں یہ قطعی نامناسب ہوگا۔"

"میں آپ کی بات کو سمجھ سکتی ہوں۔" وہ تفہیمی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "لیکن میری رہائش کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں جہاں ابھی رہ رہی ہوں، وہیں رہتی رہوں گی۔"

"کیا مطلب......!" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "کیا آپ اس وقت سفیان کے ساتھ نہیں رہ رہیں؟"

"سفیان کے ساتھ تو میں کبھی بھی نہیں رہی۔" وہ کرب ناک لہجے میں بولی۔ "بلکہ وہ مہینے میں دو تین بار میرے ساتھ رہنے آجاتا ہے۔"

فوزیہ کے جواب نے مجھے بہت دور تک، بہت گہرائی تک سوچنے پر مجبور کردیا۔ میرے پیہم اصرار نما استفسار پر اس نے بڑے دکھ بھرے انداز میں مجھے ایک حیرت انگیز کہانی سنائی۔

مارننگ اسٹار ایڈورٹائزنگ کمپنی کے مالک سفیان کی فوزیہ کے ساتھ سیکنڈ میرج تھی۔ سفیان اپنی پہلی بیوی اور بچوں کے ساتھ ایک عالیشان بنگلے میں رہتا تھا جبکہ فوزیہ طارق روڈ کے کمرشل ایریا میں واقع دو کمروں کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتی تھی۔ اس کے والد کا برسوں پہلے انتقال ہوچکا تھا اور بوڑھی بیمار والدہ سلمٰی بیگم بھی اس کے ساتھ ہی رہائش پذیر تھیں۔ سلمٰی کو دمہ اور ٹی بی کا مرض تھا۔ دمہ تو دم کے ساتھ ہی جاتا ہے اور اس زمانے میں ٹی بی (تپ دق) بھی ایک لاعلاج مرض ہی تھا۔ سلمٰی بیگم کا زیادہ وقت بیڈ پر کھانستے اور سانسوں سے جنگ کرتے ہوئے گزرتا تھا۔ ایک لحاظ سے اسے عضوِ معطل کہا جاسکتا تھا۔ شکر کی بات یہ تھی کہ وہ چھوٹا سا فلیٹ ان کی ذاتی ملکیت تھا لہٰذا گھر سے بے گھر ہوجانے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔

فوزیہ اور سفیان کی شادی کیسے اور کن حالات میں ہوئی اس تفصیل میں جانے کی میں ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ آپ نے بھی اپنے قرب وجوار میں ایسی شادیاں ہوتے دیکھی ہوں گی۔ وہ لڑکیاں جو اپنے گھر سے معاشی اور معاشرتی طور پر مضبوط نہیں ہوتیں اور خود کو بہت زیادہ غیرمحفوظ محسوس کرتی ہیں وہ سفیان جیسے لوگوں کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر بغیر کسی تحقیق اور تفتیش کے ان سے شادی کے لیے تیار ہوجاتی ہیں اور بعد میں فوزیہ کی طرح اپنے نصیب کو روتی رہتی ہیں۔

خیر، فوزیہ اور سفیان کی شادی ہوگئی۔ فوزیہ رخصت ہوکر سفیان کے گھر نہیں گئی بلکہ وہ اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے گاہے بہ گاہے اس کے فلیٹ میں آجایا کرتا تھا۔ نوید کی پیدائش کے بعد سفیان کی وہاں آمد و شد کم ہوگئی اور پھر رفتہ رفتہ یہ آمد مہینے میں دو تین بار تک محدود ہوکر رہ گئی۔ فوزیہ کے مطابق سفیان کو نہ تو اس سے محبت تھی اور نہ ہی اپنے بیٹے نوید سے۔ وہ صرف اپنی ہوس کی خاطر ان سے ملنے کے بہانے آجاتا تھا۔ وہ خرچے کے نام پر انہیں تھوڑی بہت رقم بھی دے دیا کرتا تھا تاہم گھر کے اخراجات سے کماحقہ، نمٹنے کے لیے فوزیہ کو چھوٹی موٹی جاب بھی کرنا پڑتی تھی۔ علاوہ ازیں فوزیہ نے سفیان کی ذات کے حوالے سے چند ایسے واقعات بھی سنائے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک عیاش، بدکردار اور ہوس پرست انسان تھا۔ ان تمام تر حالات و واقعات کی روشنی میں فوزیہ اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ اس شخص سے جتنی جلدی جان چھوٹ جائے، اتنا ہی اچھا تھا۔

میں نے پوری توجہ سے اس کی بات سنی اور اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ "ٹھیک ہے فوزیہ صاحبہ! میں آپ کی طرف سے خلع کا کیس دائر کردیتا ہوں لیکن آپ کو چند باتیں اپنے ذہن میں رکھنا ہوں گی۔"

"کون سی باتیں؟" وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

"ہمارے ملک کے عائلی قوانین کے مطابق، اگر کوئی عورت اپنے شوہر کے ساتھ نہ رہنا چاہتی ہو اور عدالت میں کھڑی ہوکر اپنے اس فیصلے کا برملا اعلان کردے تو کسی جرح و بحث میں پڑے بغیر عدالت اس عورت کے حق میں فیصلہ کردیتی ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن اس صورت میں عورت کو اپنے تمام حقوق اور مہر کی رقم وغیرہ سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ آپ ذہنی طور پر اس کے لیے تیار رہیے گا۔"

"مجھے اس کمینے انسان سے ایک پیسا نہیں چاہیے۔" وہ تیکھے لہجے میں بولی۔ "میں اپنے ذہنی سکون اور نوید کے

مستقبل کے لیے مہر کی رقم اور دیگر تمام حقوق چھوڑنے کو تیار ہوں۔ اگر سفیان جیسے شیطان صفت انسان سے ہماری جان چھوٹ جائے تو میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کروں گی۔"

"آپ نے نوید کا ذکر کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ کے بیٹے کی عمر اس وقت آٹھ سال ہے۔ وہ اس عمر سے نکل آیا ہے جب چائلڈ کسٹڈی کے حوالے سے عدالت کا جھکاؤ بچے کی ماں کی طرف زیادہ ہوتا ہے۔ اگر خلع کے کیس کے دوران میں یا فوراً بعد سفیان نے چائلڈ کسٹڈی (بچے کی تحویل) کا مقدمہ دائر کر دیا تو آپ کے لیے پریشانی کھڑی ہو سکتی ہے۔"

ایک دیانت دار اور مخلص وکیل ہونے کے ناتے اپنے کلائنٹ کو کیس کے تمام تر نشیب و فراز سے آگاہ کرنا میرا فرض بنتا تھا۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور بولی۔

"وکیل صاحب! کیسا باپ اور کیسی چائلڈ کسٹڈی!" اس کے انداز میں گہرا طنز پایا جاتا تھا۔ "اگر سفیان نوید کو اپنی اولاد کا درجہ دیتا تو آج وہ بھی اس کی دوسری اولادوں کی طرح کسی عالیشان بنگلے میں آرام و آسائش کی زندگی گزار رہا ہوتا......" وہ چند لمحات کے لیے متوقف ہوئی پھر ایک بوجھل سانس خارج کرنے کے بعد کہا۔

"مجھے ایک فیصد بھی امید نہیں کہ سفیان، نوید کو اپنی تحویل میں لینے کے لیے کسی قسم کی مقدمے بازی میں پڑے گا اور...... اگر اسے ایسا کوئی شوق اٹھا بھی تو میں ذہنی طور پر ہر مصیبت کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میرے لیے اطمینان کی بات یہ ہے کہ نوید، سفیان سے شدید نفرت کرتا ہے اور وہ کسی بھی صورت سفیان کے ساتھ رہنے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔"

"یہ واقعی اطمینان کی بات ہے۔" میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "جب کوئی بچہ سات سال کا ہو جاتا ہے تو "چائلڈ کسٹڈی" کے سلسلے میں عدالت اس کی ذاتی رائے اور فیصلے کو بہت زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ وہ ماں اور باپ دونوں میں سے کسی کے ساتھ بھی رہنا چاہے، عدالت اسے اجازت دے دیتی ہے۔ جو صورت حال آپ بتا رہی ہیں اس کی روشنی میں سفیان، نوید کو حاصل نہیں کر سکتا۔"

"تو آپ نے میرا کیس لینے کا فیصلہ کر لیا ہے؟" وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "یہ بات میں اس لیے پوچھ رہی ہوں تاکہ میں اس سلسلے میں ذہنی طور پر مطمئن ہو جاؤں اور ہاں......" وہ چونک کر رکی پھر لمحاتی توقف کے بعد اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔ "آپ نے ابھی تک اپنی فیس کے بارے میں تو بتایا ہی نہیں......؟"

میں نے اسے اپنی فیس بتائی اور کہا۔ "میں فیس ایڈوانس میں لیتا ہوں۔"

ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر تفکر کی پرچھائیں لہرائی۔ میں یہی سمجھ پایا کہ اسے میری فیس زیادہ محسوس ہوئی تھی تاہم اس نے مجھ سے کسی قسم کی رعایت کی بات نہیں کی اور فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے وکیل صاحب! میں کل اسی وقت آپ کے آفس آ کر فیس ادا کر دوں گی۔ آپ میرا کیس تیار کر لیں۔"

مجھے یہ جاننے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ اس وقت فوزیہ کے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ وہ میری فیس ادا کر سکتی۔ میں نے اس سے تمام کوائف لینے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں آج ہی تمام ضروری کاغذات تیار کروا لوں گا۔ آپ کل ان کاغذات پر دستخط کر دیجیے گا۔ پرسوں میں خلع کا مقدمہ دائر کر دوں گا۔"

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور سلام کر کے رخصت ہو گئی۔

☆☆☆

میں نے مکمل کاغذی تیاری کے بعد اپنی وکالت میں فوزیہ کی جانب سے خلع کا کیس عدالت میں دائر کر دیا۔ اسی روز میں نے اپنے ذرائع استعمال کر کے سفیان کے نام عدالت میں طلبی کا حکم نامہ بھی جاری کروا دیا۔ میری نظر میں یہ ایک حلوا کیس تھا۔ فوزیہ کسی بھی صورت میں سفیان کی زوجیت میں نہیں رہنا چاہتی تھی۔ آٹھ سالہ نوید اپنی ماں کا حمایتی تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ فوزیہ کے پاس سفیان کی بدکاری، عیاشی اور ہوس پرستی کے بھی واقعاتی شواہد موجود تھے۔ ان تمام تر حالات و واقعات کی روشنی میں یہ کیس ازکم ایک اور زیادہ سے زیادہ تین پیشیوں کی مار تھا۔

یہ کیس بارہ فروری کو عدالت میں دائر کیا گیا تھا اور بارہ فروری ہی کو میں نے عدالتی حکم نامہ بہ نام سفیان علی جاری کروا دیا تھا جس میں سفیان کو بائیس فروری کو عدالت میں حاضر ہونے کا حکم دیا گیا تھا۔

اس روز عدالتی بکھیڑوں سے نمٹنے کے بعد میں اپنے آفس پہنچا اور عدالت میں دائر کیس کی ایک نقل متعلقہ یونین کونسل کو بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک ارسال کر دی۔ مجھے یقین تھا کہ عدالتی حکم نامے کے آگے پیچھے ہی یونین کونسل کی جانب سے بھی اس سے رابطہ کر لیا جاتا تھا۔

پندرہ فروری کی رات میں جیسے ہی اپنے گھر میں داخل ہوا، میرے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس وقت رات کے گیارہ کا عمل تھا۔ میں ٹیلی فون سیٹ کی جانب بڑھتے ہوئے سوچنے لگا...... اس وقت کون ہو سکتا ہے؟

تیسری گھنٹی پر میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا اور ماؤتھ پیس میں کہا۔ "ہیلو......!"

"ہیلو بیگ صاحب! یہ میں ہوں۔" ایئر پیس میں ایک نسوانی آواز ابھری۔ "فوزیہ!"

"جی فوزیہ صاحبہ...... خیریت؟" میں نے پوچھا۔

فوزیہ کو میں نے اپنے وزیٹنگ کارڈ کے پیچھے گھر کا نمبر بھی لکھ کر دیا ہوا تھا تاکہ کسی ایمرجنسی کی صورت میں وہ کسی بھی وقت مجھ سے رابطہ کر سکے۔ آج تک اس نے میرے آفس کے نمبر پر ہی فون کیا تھا۔ گھر پر...... اور وہ بھی آدھی رات کو فون کرنے کا مطلب کسی نوعیت کی گڑبڑ ہی کو ظاہر کرتا تھا۔

اس نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا۔ "بیگ صاحب! سفیان کو خلع کرنے والے کیس کے بارے میں پتا چل گیا ہے۔"

"تو اس میں ایسی حیرت یا پریشانی والی کون سی بات ہے۔" میں نے نارمل انداز میں کہا۔ "عدالتی حکم نامے کو جاری ہوئے تین دن گزر چکے ہیں۔ اسے اب تک وہ نوٹس مل گیا ہوگا اور عین ممکن ہے، متعلقہ یونین کونسل نے بھی اسے کوئی بلاوا بھیج دیا ہو۔"

"جی ہاں...... جی ہاں۔" وہ اضطراری لہجے میں بولی۔ "اسے دونوں جانب سے پکارا گیا ہے اور وہ سخت پریشان ہے۔ اس نے مجھے فون کیا تھا۔"

"فون کیا تھا۔" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "کب......؟"

"ابھی آدھا گھنٹا پہلے۔" وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں نے پہلے آپ کے آفس کے نمبرز ٹرائی کیے۔ جب وہاں کال اٹینڈ نہیں کی گئی تو آپ کے گھر پر فون کیا ہے......" لمحاتی توقف کے بعد اس نے معذرت خواہانہ انداز میں پوچھا۔

"آپ نے مائنڈ تو نہیں کیا بیگ صاحب؟"

"بالکل نہیں۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے جب آپ کو اپنے گھر کا نمبر دے رکھا ہے تو رابطہ کرنے پر مائنڈ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں ابھی گھر میں داخل ہوا ہوں۔ آفس سے میں ایک گھنٹا پہلے نکل آیا تھا......" لمحاتی توقف کر کے میں نے پوچھا۔

"خیریت تو ہے نا...... کیا کہہ رہا تھا وہ؟"

"وہ کہہ رہا تھا کہ میں مقدمے بازی کے چکر میں نہ پڑوں۔"

"یعنی اگر آپ خلع کا مقدمہ واپس لے لیں تو وہ آپ کو آزاد کر دے گا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں جناب! ایسی کوئی بات نہیں......" وہ جلدی سے بولی۔

"پھر وہ آپ کو مقدمے بازی سے کیوں روک رہا ہے؟"

"وہ مجھے خود سے الگ کرنے کے حق میں نہیں ہے۔" فوزیہ نے بتایا۔ "نہ خلع کے ذریعے اور نہ ہی طلاق دے کر......"

"کیا مطلب......!" میں نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔ "آخر وہ شخص چاہتا کیا ہے؟"

"وہ کہہ رہا تھا، میں مقدمے بازی کا خیال دل سے نکال دوں اور خاموشی سے اپنے گھر میں بیٹھی رہوں...... اس کی منکوحہ کی حیثیت سے۔" فوزیہ نے جواب دیا۔ "وہ میری تمام تر شکایات دور کرنے کی کوشش کرے گا۔"

"پھر آپ نے اس سے کیا کہا؟" میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"کچھ نہیں۔" وہ قطعی لہجے میں بولی۔ "میں ٹس سے مس سے نہ ہوئی۔"

"آپ کی ثابت قدمی کو دیکھتے ہوئے اس نے کیا مؤقف اختیار کیا؟" میں نے فوزیہ کے معاملے میں گہری دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔

"جب اس نے دیکھا کہ میں کسی بھی طور اس کی بات ماننے کو تیار نہیں تو وہ ہوشیاری دکھانے لگا۔" فوزیہ نے بتایا۔

"کیسی ہوشیاری؟" میں نے سوال کیا۔

"اس نے کہا کہ وہ ہر قسم کی آوارہ گردی اور عیاشی سے باز آجائے گا۔" وہ اپنے شوہر کی چال بازی سے مجھے آگاہ کرتے ہوئے بولی۔ "وہ ایک معزز و باکردار انسان بننے کی کوشش کرے گا اور میرا بہت خیال رکھے گا۔"

"تو کیا آپ سفیان کو یہ موقع دینے کا ارادہ رکھتی ہیں؟" میں نے فوزیہ کے دل کا حال جاننے کی خاطر استفسار کیا۔

"وکیل صاحب! اس بات کا تو اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" وہ دوٹوک لہجے میں بولی۔ "میں نے ایک حتمی فیصلے پر پہنچنے کے بعد جو قدم اٹھایا ہے وہ اب واپس نہیں آسکتا۔"

"ویری گڈ!" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "کیا سفیان نے ایک بار بھی آپ سے کوئی ایسی بات کی کہ وہ آپ کو اور آپ کے بیٹے کو بھی وہی عزت و آبرو دے گا جو اپنی پہلی بیوی اور بچوں کو دیتا ہے اور یہ کہ اگر آپ اس کی بات مانتے ہوئے خلع کا مقدمہ واپس لے لیتی ہیں تو وہ آپ لوگوں کو بھی کسی صاف ستھرے بنگلے میں رکھے گا؟"

"جناب! میں سفیان کی عیاری کو اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ "وہ اتنا سیدھا نہیں جیسا کہ خود کو ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن میں کسی بھی قیمت پر اس کی چال میں نہیں آؤں گی۔ اگر اب میں اس کے جال میں پھنس گئی، اس کی ہمدردی بھری میٹھی باتوں میں آگئی تو پھر وہ مکاری سے مجھے ایسا باندھ دے گا کہ میں کہیں کی نہیں رہوں گی۔ اگر اس خبیث انسان کی گرفت سے نکلنے کے لیے قدرت مجھے موقع فراہم کر رہی ہے تو میں اس سے ضرور فائدہ اٹھاؤں گی۔ میں عدالت کی مدد اور آپ کے تعاون سے اسے ایسی ذلت بھری شکست دوں گی کہ وہ اپنی اس عبرت ناک ناکامیابی پر ہر روز جیے گا اور ہر روز مرے گا......"

میں نے ایرپیس کو کان سے چپکائے چپکائے اس کے دل کے غبار کو اپنی سماعت میں انڈیلا اور اس کے خاموش ہونے پر ہمدردی بھرے لہجے میں پوچھا۔

"فوزیہ صاحبہ! موجودہ صورت حال میں آپ پریشان تو نہیں ہیں؟"

وہ چٹانی لہجے میں بولی۔ "ہرگز نہیں بیگ صاحب...... جب اوکھلی میں سر دے دیا تو پھر موسلوں سے کیا ڈرنا۔"

"ٹھیک ہے......" میں نے ایک گہری اور اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "آپ اپنے مؤقف پر ڈٹی رہیں۔ آپ کی یہ ثابت قدمی اس کیس کو مضبوط تر بنا دے گی۔"

"ان شاء اللہ......!" اس نے امید بھرے انداز میں کہا۔

"فوزیہ صاحبہ! میری ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کرلیں۔" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "سفیان اگر کسی بھی بہانے آپ سے ملاقات کرنے کی کوشش کرے تو آپ اس کی کوشش کو ناکامیاب بنا دیں گی۔ یہ بہت ضروری ہے۔ اب کورٹ ہی میں آپ دونوں کی ملاقات ہونا چاہیے۔"

"میں آپ کی ہدایات کا خیال رکھوں گی بیگ صاحب!" وہ فرماں برداری سے بولی۔

الوداعی کلمات کے بعد میں نے رابطہ منقطع کردیا۔

آئندہ روز میں نے اپنے پیشہ ورانہ ذرائع استعمال کرکے یہ جان لیا کہ عدالت سے جاری ہونے والا "حکم نامۂ طلبی" سفیان کو موصول ہوگیا تھا اور اس نے باقاعدہ دستخط کرکے وہ حکم نامہ وصول بھی کرلیا تھا جس کا سیدھا سادہ مطلب یہی سمجھ میں آتا تھا کہ وہ طلبی کی تاریخ پر عدالت میں ضرور حاضر ہوگا۔ یہ صورتِ حال انتہائی حوصلہ افزا اور تسلی بخش تھی کہ بہ الفاظِ دیگر اس کیس کو ہمارے حق میں ہموار کرتی دکھائی دیتی تھی۔ میں مطمئن ہوگیا۔

☆☆☆

عدالت نے سفیان کو بائیس فروری کو حاضر ہونے کا حکم دیا تھا مگر بیس فروری یعنی اس کی طلبی کی تاریخ سے دو دن

پہلے ایک ایسا سنسنی خیز واقعہ رونما ہوا کہ میرا سارا اطمینان اور سکون خاک میں مل کر رہ گیا۔

میں حسبِ معمول اپنے آفس میں بیٹھا کلائنٹس سے نمٹ رہا تھا کہ میری سیکریٹری نے انٹرکام پر مجھے اطلاع دی۔ "سر...... کوئی نور علی صاحب آئے ہیں۔ یہ آپ سے فوری ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔"

"نور علی......!" میں نے زیرِ لب دہرایا پھر پوچھا۔ "وہ کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں؟"

"وہ آپ کی ایک کلائنٹ فوزیہ صاحبہ کے حوالے سے کوئی اہم اطلاع دینا چاہتے ہیں۔"

میرا ماتھا ٹھنکا اور فوزیہ کا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔ میں نے اپنی سیکریٹری سے کہا۔ "ٹھیک ہے...... میں صغیر صاحب سے فارغ ہو جاؤں تو آپ نور علی کو اندر بھیج دینا۔"

"اوکے سر......!" سیکریٹری نے کہا۔

میں نے انٹرکام کا ریسیور کریڈل کردیا۔

پندرہ منٹ کے بعد نور علی نامی وہ شخص میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ نور علی کی عمر چالیس سے متجاوز نظر آتی تھی۔ وہ بھاری تن و توش کا مالک ایک سانولا شخص تھا۔ نور علی نے مناسب سائز کی ڈاڑھی رکھی ہوئی تھی اور اس کے سر کے نوے فیصد بال بے وفائی کرگئے تھے۔

میں نے رسمی علیک سلیک کے بعد سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "جی نور علی صاحب...... آپ فوزیہ کے بارے میں کیا بتانا چاہتے ہیں؟"

وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "جناب! فوزیہ بیٹھے بٹھائے ایک بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہوگئی ہے۔"

میں اپنی کرسی پر سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔ "کیسی مصیبت...... اور آپ کون ہیں؟"

"میں فوزیہ کا پڑوسی ہوں وکیل صاحب!" اس نے بتایا۔ "فوزیہ کو آج شام میں پولیس نے گرفتار کرلیا ہے۔"

"کیا......!" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ "پولیس نے فوزیہ کو کس جرم میں گرفتار کیا ہے؟"

"اس پر قتل کا الزام ہے۔"

"کس کے قتل کا الزام؟" میری حیرت گہری تشویش میں بدل گئی۔

"سفیان علی......" نور علی نے جواب دیا۔ "اس کے شوہر کے قتل کا الزام وکیل صاحب۔"

"اوہ مائی گاڈ!" میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔

بڑے لوگوں کی باتیں

☆ لوگ اپنی ضروریات پر غور کرتے ہیں۔ قابلیت پر نہیں (نپولین)

☆ عالم بے عمل اس پارس کے مانند ہے جو اوروں کو تو سونا بناتا ہے، مگر خود ہمیشہ پتھر رہتا ہے (نپولین)

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

"تفصیلات کیا ہیں؟"

"مجھے اس واقعے کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "فوزیہ کی ماں نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے...... یہی بتانے کے لیے۔ آپ تھانے میں جاکر خود فوزیہ سے ملاقات کرلیں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور استفسار کیا۔ "وہ کس تھانے میں ہے؟"

نور علی نے متعلقہ تھانے کا نام بتا دیا۔

فوزیہ مجھے بتا چکی تھی کہ اس نے اپنی والدہ سلمیٰ بیگم کو خلع والے کیس کے حوالے سے تفصیلاً آگاہ کر رکھا ہے جبھی سلمیٰ بیگم نے اس افتاد کے موقع پر نور علی کو میرے پاس بھیجا تھا۔ میں نے نور علی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"آپ فوزیہ کی والدہ کو اطمینان دلا دیں کہ فکرمند ہونے والی کوئی بات نہیں۔ میں ابھی فوزیہ سے تھانے جاکر ملاقات کروں گا۔ اگر اس نے جرم نہیں کیا تو کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

وہ میرا شکریہ ادا کرکے رخصت ہوگیا۔

رات کو آفس سے فارغ ہونے کے بعد میں فوزیہ سے ملنے متعلقہ تھانے پہنچ گیا۔ مذکورہ تھانہ میری واپسی کے روٹ پر تو نہیں تھا مگر اپنے کلائنٹ کی دادرسی روٹ سے زیادہ اہم تھی لہٰذا میں نے یہ گشت اٹھانے میں کوئی دقت محسوس نہ کی۔ کچھ ہی دیر کے بعد میں تھانے کے اندر موجود تھا۔

میں اس تفصیل میں پڑ کر آپ کا قیمتی وقت اور سسپنس کے نادر صفحات ضائع نہیں کروں گا کہ میں نے اپنی کلائنٹ سے ملاقات کرنے کے لیے کیا حربہ آزمایا تھا۔ اس طریقۂ واردات کا پہلے بھی کئی بار ذکر کیا جاچکا ہے۔

میں حوالات میں پہنچا تو فوزیہ کو ایک ٹھنڈے ٹھار فرش پر اکڑوں بیٹھے دیکھا۔ اس وقت رات کے ساڑھے

دس بج رہے تھے۔ فروری کے مہینے میں اگرچہ زیادہ سردی نہیں ہوتی تاہم رات کے اس حصے میں حوالات کا ماحول اچھا خاصا سرد ہو رہا تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی فوزیہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''وکیل صاحب! میں نے سفیان کو قتل نہیں کیا...... میں اس واردات کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی......؟''

''مجھے اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہے کہ آپ نے کوئی جرم نہیں کیا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ''لہٰذا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اطمینان سے مجھے بتائیں کہ آخر ہوا کیا تھا؟''

میری تسلی بخش باتوں سے اس کے چہرے پر امید کی کرن نمودار ہوئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے اس کی زخموں پر سکون بخش مرہم رکھ دیا ہو۔ اس کی گھبراہٹ اور سراسیمگی میں یکلخت کمی آگئی تھی۔

''وکیل صاحب......!'' وہ امید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اس وبال سے آپ ہی مجھے نکال سکتے ہیں۔''

''اسی لیے تو میں آپ کی مصیبت کا سنتے ہی فوراً یہاں پہنچ گیا ہوں۔'' میں نے بہ دستور ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ مجھ پر بھروسا کریں۔''

وہ تشکر آمیز نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے اپنا بریف کیس کھولتے ہوئے کہا۔ ''فوزیہ صاحبہ! میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ کسی وقت بھی تھانہ انچارج ہماری اس اہم ملاقات میں رخنہ ڈال سکتا ہے لہٰذا آپ فوری طور پر چند ضروری کاغذات پر دستخط کردیں۔''

''یہ کیسے کاغذات ہیں......؟'' اس نے پوچھا۔

''ان میں ایک تو درخواستِ ضمانت ہے۔'' میں نے کاغذات اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اور دیگر ضروری کاغذات ہیں جن کی عدالت میں کسی بھی موقع پر ضرورت پیش آسکتی ہے۔''

میں اپنے بریف کیس میں وکالت نامہ، درخواستِ ضمانت اور اسی نوعیت کے دوسرے ضروری کاغذات ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا کہ جانے کب اور کس جگہ ان کی ضرورت پیش آجائے۔ فوزیہ نے میرے بتائے ہوئے مقامات پر دستخط کردیے تو میں نے انہیں بریف کیس میں رکھنے کے بعد اس سے پوچھا۔

''فوزیہ صاحبہ! آپ کو کہاں سے گرفتار کیا گیا ہے؟''

''میرے گھر سے!''

''کتنے بجے؟''

''لگ بھگ چار بجے سہ پہر۔'' اس نے جواب دیا۔

''اور سفیان کو کہاں قتل کیا گیا ہے؟''

''بہادر آباد کے ایک فلیٹ میں......''

''اوہ...... بہادر آباد کے اس فلیٹ سے آپ کا کیا تعلق؟'' میں نے دریافت کیا۔ ''وہ کس کا فلیٹ ہے؟''

''آج دوپہر سے پہلے مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ فلیٹ کس کا ہے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ میں اب بھی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتی کہ وہ فلیٹ نرگس کا ہے یا کسی اور کا......'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

''نرگس کون؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''میں یہ بھی نہیں جانتی کہ نرگس کون ہے۔'' وہ بے بسی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیونکہ میں نے اسے دیکھا ہے اور نہ ہی کبھی اس سے میری ملاقات ہوئی ہے۔ مجھے تو وہ کوئی چال باز فراڈن لگتی ہے...... مجھ سے سخت غلطی ہوئی کہ میں نرگس کے بلانے پر بہادر آباد والے فلیٹ پر پہنچ گئی تھی۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا آپ جائے وقوعہ پر گئی تھیں......؟''

''جی ہاں......!'' اس نے اثبات میں گردن ہلادی۔

میں نے پوچھا۔ ''مجھے تفصیلاً بتائیں...... یہ واقعہ کس طرح پیش آیا تھا۔''

''آج صبح کم و بیش دس بجے میں نے ایک فون اٹینڈ کیا......'' وہ بتانے لگی۔ ''دوسری طرف بولنے والی نے اپنا نام نرگس بتایا اور مجھ سے پوچھا۔

''آپ فوزیہ بات کررہی ہیں، سفیان علی کی بیوی؟''

میں نے کہا۔ ''جی ہاں...... آپ کون ہیں؟''

''میرا نام نرگس ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''میں بھی بدقسمتی سے سفیان کی بیوی ہوں......''

''سفیان کی بیوی کا نام رضوانہ ہے۔ نرگس نامی اس عورت کا دعویٰ سن کر مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔

''لیکن سفیان کی بیوی کا نام تو رضوانہ ہے۔''

''رضوانہ اس کی اصلی بیوی ہے۔'' وہ نفرت آمیز لہجے میں بولی۔

''اصلی بیوی...... کیا مطلب؟'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں...... رضوانہ اور اس کے بچوں کے ساتھ وہ معزز انسانوں کی طرح گھریلو زندگی گزارتا ہے۔'' وہ زہرخند لہجے میں بولی۔ ''آپ، میں...... اور ہم جیسی پتا نہیں کتنی عورتوں کو

اس نے بیوی کے نام پر شہر کے مختلف حصوں میں رکھا ہوا ہے۔ وہ کمینہ ایک نمبر کا عیاش اور بدمعاش ہے۔''

نرگس کا دکھ میرے درد سے گہری مماثلت رکھتا تھا لہٰذا اس کی باتیں سن کر مجھے ذہنی سکون محسوس ہوا۔ میں نے دوستانہ انداز میں پوچھا۔

''نرگس صاحبہ! آپ نے کس سلسلے میں مجھے فون کیا ہے؟''

''سلسلہ وہی ہے، سفیان سے چھٹکارا۔'' وہ بیزاری سے بولی۔ ''مجھے پتا چلا ہے کہ آپ نے خلع کا کیس دائر کر رکھا ہے۔ میں بھی سفیان سے نجات حاصل کرنے کے لیے یہی راہ اختیار کرنا چاہتی ہوں۔ اگر ہم دونوں مل جائیں تو یہ کیس اور بھی زیادہ مضبوط ہوجائے گا۔ کیا خیال ہے آپ کا؟''

''قدرِ مشترک'' ایک ایسی شے ہے کہ یہ دو دشمنوں کو بھی ایک صف میں کھڑا ہونے پر مجبور کردیتی ہے۔ میرے اور نرگس کے مسائل اور مصائب میں گہری قدرِ مشترک پائی جاتی تھی چنانچہ میں اپنے دل میں اس کے لیے ہمدردی کے جذبات محسوس کرنے لگی اور میں نے پوچھا۔

''نرگس صاحبہ! بتائیں، میں آپ کے لیے کیا کرسکتی ہوں؟''

''مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔'' اس نے درخواست آمیز انداز میں کہا۔ ''میں بھی اپنا کیس اسی وکیل کو دینا چاہتی ہوں جو آپ کا کیس لڑ رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں آپ کو ان وکیل صاحب کا نمبر دے دیتی ہوں۔ وہ سٹی کورٹ کے قریب ہی ایک ملٹی اسٹوری بلڈنگ میں بیٹھتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں ان کے آفس کا ایڈریس بھی نوٹ کروا دیتی ہوں۔''

''میں آپ کے ساتھ ان وکیل صاحب سے ملنے جانا چاہتی ہوں۔'' وہ بے حد جذباتی لہجے میں بولی۔ ''اور اس سے پہلے میں آپ سے ایک بھرپور ملاقات کرنا چاہتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ جب کہیں گی، ہم مل لیں گے۔'' میں نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''جب نہیں...... آج ہی!'' وہ اصراری لہجے میں بولی۔ ''میں آپ سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ میں بہادر آباد کے علاقے میں رہتی ہوں۔ اگر آپ دن میں مجھے تھوڑا وقت دے دیں تو میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گی۔''

''نرگس نے اتنی منت اور لجاجت سے یہ بات کہی تھی کہ میں مجبور ہوگئی اور میں نے کچھ سوچے سمجھے بغیر ان سے کہہ دیا۔

''بتائیں...... آپ کتنے بجے مجھ سے ملنا چاہتی ہیں؟''

''دن میں ایک اور تین کے درمیان کسی بھی وقت آجائیں۔''

''میرے استفسار پر اس نے مجھے اپنے فلیٹ کا ایڈریس بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھا دیا اور ہمارے درمیان ٹیلی فونک سلسلہ ختم ہوگیا۔''

''اور آپ......'' فوزیہ سانس لینے کے لیے تھمی تو میں نے افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس عورت کے کہنے میں آکر بہادر آباد والے فلیٹ پر پہنچ گئیں......؟''

''جی بیگ صاحب!'' وہ گہری ندامت سے بولی۔ ''مجھ سے غلطی ہوگئی۔ اب محسوس ہورہا ہے کہ مجھے اس فلیٹ پر نہیں جانا چاہیے تھا۔''

''اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کو کم از کم مجھے اس معاملے سے آگاہ تو کرنا چاہیے تھا۔ اگر آپ مجھے نرگس کے فون کے بارے میں فوراً بتا دیتیں جیسا کہ پانچ دن پہلے سفیان کے فون کے بارے میں مجھے گھر پر فون کرکے...... آگاہ کیا تھا تو...... میں ہرگز ہرگز آپ کو نرگس کے فلیٹ پر نہ جانے دیتا۔''

''بیگ صاحب......!'' وہ شرمندہ سی صورت بناتے ہوئے بولی۔ ''پتا نہیں، اس وقت میرے دماغ کو کیا ہوگیا تھا۔ مجھے اپنی سوچ پر بالکل اختیار نہیں رہا تھا۔ واقعی، مجھے پہلی فرصت میں آپ کو مطلع کرنا چاہیے تھا۔'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''وہاں نرگس کے فلیٹ پر جو کچھ ہوا وہ بھی میری سمجھ سے باہر ہے۔ واپس گھر آکر میں کافی دیر تک اسی واقعے کے بارے میں سوچتی رہی اور پھر چار بجے پولیس نے مجھے اپنے گھر سے گرفتار کرلیا۔''

''آپ کی واپسی کتنے بجے ہوئی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''تین بجے سہ پہر......'' اس نے جواب دیا۔

''اور آپ بہادر آباد والے فلیٹ یعنی جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچی تھیں؟''

''یہی کوئی دو...... سوا دو بجے!''

''طارق روڈ سے بہادر آباد زیادہ دور نہیں ہے...... بمشکل دس پندرہ منٹ کا راستہ ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''آپ نے اپنی آمد و شد کے جو اوقات بتائے ہیں، اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ بہادر آباد والے فلیٹ پر آپ زیادہ دیر نہیں رکی ہوں گی۔''

"زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ۔"

"وہاں بہادر آباد والے فلیٹ پر ایسا کیا واقعہ پیش آیا تھا کہ جس کے بارے میں آپ گھر آ کر بھی کافی دیر تک سوچتی رہی تھیں؟" میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ "کیا آپ کی نرگس سے ملاقات ہوگئی تھی؟"

"نہیں......!" اس نے قطعیت سے گردن ہلائی۔ "میں آج تقریباً سوا دو بجے اس فلیٹ پر پہنچی تھی۔ وہ اپارٹمنٹس بلڈنگ بہادر آباد کے کمرشل ایریا میں واقع ہے۔ میں نے فورتھ فلور کے اپارٹمنٹ نمبر 'فور زیرو فور' کی گھنٹی بجائی اور ایک طرف رک کر دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگی۔ نرگس نے فون پر مجھے اسی فلیٹ کا ایڈریس سمجھایا تھا۔ جب گھنٹی کے جواب میں اندر سے کوئی نہیں نکلا تو میں نے دوبارہ گھنٹی بجادی۔

"اس بار بھی کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ میں نے سوچا، ہوسکتا ہے کہ نرگس واش روم میں ہو۔ احتیاطاً میں نے دروازے پر دستک بھی دے ڈالی اور اسی وقت مجھ پر ایک انکشاف ہوا۔ دروازہ لاک نہیں تھا۔ میری دستک کے دباؤ سے دروازہ کھل گیا۔ میرے اندر تجسس نے سر ابھارا اور ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ مجھے اندر داخل ہوجانا چاہیے اور پھر...... میں فلیٹ کے اندر داخل ہوگئی۔

"وہ تین کمروں کا ایک صاف ستھرا فلیٹ تھا مگر اس کے اندر خاموشی اور سناٹے نے میرا استقبال کیا۔ وہاں کسی ذی روح کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ میں فطری تجسس کے ہاتھوں مجبور ہوکر ایک کمرے سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے میں چکرائی رہی۔ میں نے واش روم اور کچن میں بھی جھانک کر دیکھ لیا لیکن وہ فلیٹ انسانی وجود سے خالی تھا۔

"مجھے حیرت ہوئی کہ جب نرگس نے مجھے ایک بجے سے تین بجے تک وہاں آنے کو کہا تھا تو پھر وہ کہاں غائب ہوگئی اور اگر کسی ایمرجنسی میں اسے باہر جانا ہی تھا تو مجھے فون کرکے اطلاع دے سکتی تھی اور...... یہ بھی کہ وہ فلیٹ کا دروازہ کھلا کیوں چھوڑ گئی......؟

"جلد ہی مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوگیا۔ مجھے یوں لگا جیسے نرگس نے مجھے بے وقوف بنانے کے لیے وہ ڈراما رچایا تھا۔ مجھے ایک اجنبی عورت کی کال پر یوں گھر سے اٹھ کر نہیں چلے آنا چاہیے تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں یہ سوچ بھی جاگزیں تھی کہ آخر نرگس کو میرے ساتھ ایسا بھیانک مذاق کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ ذہن میں فوری طور پر پیدا ہونے والے ایک سنسنی خیز خیال نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا...... کہیں یہ سفیان کی کوئی چال تو نہیں......؟

"میں نے دل ہی دل میں خود کو لعنت ملامت کی اور فوری طور پر اس فلیٹ سے نکل آئی اور گھر پہنچنے کے بعد بھی میں کافی دیر تک اسی عجیب وغریب واقعے کے بارے میں سوچتی رہی تھی......"

فوزیہ نے اپنا بیان مکمل کیا تو میں نے تصدیق طلب نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور ٹھیک چار بجے سہ پہر پولیس نے آپ کو آپ کے گھر سے گرفتار کرلیا؟"

"جی ہاں!" اس نے اثبات میں گردن ہلادی۔

"بہادر آباد والے فلیٹ کے بارے میں آپ نے اپنی والدہ کو بتایا تھا؟" میں نے پوچھا۔ "وہ اس صورت حال سے کس حد تک آگاہ ہیں؟"

"جاتے وقت انہیں میں نے کچھ نہیں بتایا تھا۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "لیکن واپس آنے کے بعد میں نے وہاں بہادر آباد والے فلیٹ پر پیش آنے والے واقعے کے بارے میں امی کو تفصیلاً بتادیا تھا۔"

میں نے جاننا چاہا۔ "پھر انہوں نے کیا کہا؟"

"امی میری بات سن کر پریشان ہوگئی تھیں۔" فوزیہ نے جواب دیا۔ "انہوں نے بھی یہی کہا تھا کہ مجھے اس فلیٹ پر نہیں جانا چاہیے تھا۔"

"ہوں......" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ نے اس فلیٹ میں مختلف چیزوں کو چھوا بھی تھا......؟"

"جی ہاں۔" وہ سر کو اثباتی جنبش ... دیتے ہوئے بولی۔ "جب میں نے اس فلیٹ کے تینوں کمروں اور باتھ روم اور کچن کو اچھی طرح جھانک کر دیکھا تھا تو ظاہر ہے، میں نے بے شمار چیزوں کو چھوا تو ہے......"

میں نے گمبھیر انداز میں پوچھا۔ "آپ کو بہادر آباد والے فلیٹ میں کسی نے داخل ہوتے یا باہر نکلتے ہوئے تو نہیں دیکھا؟"

"وہ بہادر آباد کا ایک کمرشل ایریا ہے بیگ صاحب۔" اس نے بتایا۔ "بلڈنگ میں داخل ہوتے وقت کئی افراد کی مجھ پر نگاہ پڑی ہوگی اور بعض نے مجھے بلڈنگ سے نکلتے ہوئے بھی دیکھا تھا لیکن میں سمجھتی ہوں ان میں سے کوئی بھی میرا شناسا نہیں تھا۔"

"اور فلیٹ میں داخل یا خارج ہوتے وقت کسی نے آپ کو دیکھا؟"

"جی نہیں، البتہ......!"

وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہوئی تو میں نے سوال کیا۔ "البتہ کیا؟"

"پولیس والے مجھ سے کہہ رہے تھے کہ ان کے پاس ایک عینی گواہ موجود ہے۔" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی۔ "جس نے مجھے فلیٹ نمبر چار سو چار کے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔"

پولیس نے سہ پہر چار بجے فوزیہ کو اس کے فلیٹ سے گرفتار کیا تھا جبکہ وہ لگ بھگ دو بجے اس فلیٹ پر گئی تھی اور یہ اتنی قلیل مدت تھی کہ کوئی عینی گواہ پیدا نہیں کیا جاسکتا تھا پھر یہ سوال بھی غور طلب تھا کہ پولیس کو کیسے پتا چلا کہ فوزیہ نے سفیان غنی کو بہادر آباد والے فلیٹ میں قتل کردیا ہے۔ وہ اتنی جلدی گرفتاری کے لیے اس کے فلیٹ پر کیسے پہنچ گئی۔ میری سمجھ میں یہی بات آئی کہ پولیس اسے ہراساں کرنے کے لیے کوئی چال چل رہی ہے۔

"آپ کو بالکل فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "مصیبت چھوٹی ہو یا بڑی، اس سے بہرحال نمٹنا ہی پڑتا ہے۔ بس، آپ اپنی ہمت کو مضبوطی سے تھام کر بیٹھی رہیں اور میری ہدایات کو ذہن میں نقش کرلیں۔ باقی تمام عدالتی معاملات سے میں خود ہی نمٹ لوں گا۔"

اس نے اطمینان کی سانس لی اور میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد بولی۔ "جی، حکم کریں...... میں پوری توجہ سے سن رہی ہوں۔"

آئندہ پانچ منٹ میں، میں نے فوزیہ کو چند اہم ٹپس دے دیں۔ اس نے میری ہدایات کو ذہن نشین کرنے کا وعدہ کیا اور ایک بار پھر میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد بولی۔ "بیگ صاحب! اوپر خدا اور نیچے آپ ہیں۔ میری ساری امیدیں آپ دونوں سے ہی وابستہ ہیں۔"

"ہم دونوں سے آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔" میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

اس دوران میں کانسٹیبل بہادر حوالات کی طرف تین چار چکر لگا چکا تھا۔ وہ منڈلانے والے انداز میں آتا تھا اور ہمیں جھانک کر واپس چلا جاتا تھا۔ میرا کام پورا ہوچکا تھا لہٰذا مزید وہاں رکنے کی ضرورت نہیں تھی۔

میں نے فوزیہ کو مناسب الفاظ میں تسلی تشفی دی اور تھانے سے نکل کر اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

اگلے روز پولیس نے ملزم فوزیہ کو عدالت میں پیش کرکے ایک ہفتے کے تفتیشی ریمانڈ کی درخواست کی۔ میں نے پچھلی رات، حوالات میں ملزمہ سے ملاقات کے وقت ضروری کاغذات پر اس کے دستخط لے لیے تھے لہٰذا عدالت میں پیش ہونے پر میں نے درخواستِ ضمانت کے ساتھ اپنا وکالت نامہ بھی دائر کردیا اور جج کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت ہی مؤدبانہ انداز میں کہا۔

"جنابِ عالی! یہ اپنی نوعیت کا ایک عجیب وغریب کیس ہے......"

وکیلِ استغاثہ نے آغاز ہی میں مجھ پر حملہ کردیا اور میری بات پوری ہونے سے پہلے تیز آواز میں بولا۔ "جنابِ عالی...... یہ عجیب وغریب نہیں، قتل کا ایک کیس ہے۔"

جج نے حیرت بھری نظر سے وکیلِ استغاثہ کی جانب دیکھا جیسے یہ جاننے کی جستجو میں ہو کہ...... اس میں بتانے والی کون سی بات ہے۔ جج کے متوجہ ہونے پر اس نے مزید کہا۔ "جائے وقوعہ پر ملزمہ کی انگلیوں کے نشانات کئی مقامات پر پائے گئے ہیں۔ پولیس کو اپنی تفتیش مکمل کرنے کے لیے کم از کم سات روزہ ریمانڈ کی ضرورت ہے لہٰذا ان ابتدائی مراحل میں، ملزمہ کی ضمانت کی درخواست منظور کرنا انصاف کے اصولوں کے منافی ہوگا۔"

"یورآنر!" میں نے درخواستِ ضمانت کے حق میں آواز بلند کرتے ہوئے کہا۔ "میری مؤکل اور اس مقدمے کی ملزمہ ایک معزز شہری ہے۔ وہ بے گناہ ہے۔ اسے کسی گہری سازش کے تحت اس کیس میں ملوث کیا گیا ہے۔ اپنے اس مؤقف کو ثابت کرنے کے لیے میرے پاس ٹھوس دلائل بھی ہیں جنہیں میں مناسب موقع پر عدالتی کارروائی کے دوران میں منظرِ عام پر لاؤں گا۔ فی الحال معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ میری مؤکل کی درخواستِ ضمانت کو منظور کرتے ہوئے رہائی کا حکم جاری کیا جائے۔"

"جنابِ عالی! عدالت صرف حقائق، ثبوت اور سچائی کی بنیاد پر فیصلے کرتی ہے۔" وکیلِ استغاثہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "کسی ملزم کو بے گناہ یا معصوم کہہ دینے سے بات نہیں بنتی۔"

"میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں میرے فاضل دوست!" میں نے نہایت ہی اطمینان سے کہا۔ "عدالت ٹھوس حقائق اور مضبوط دلائل کی روشنی ہی میں فیصلے کرتی ہے اسی لیے تو میں نے عرض کیا ہے کہ میں تمام حقائق اور ثبوت کو عدالتی کارروائی کے دوران میں منکشف کروں گا۔"

''جنابِ عالی! وکیلِ صفائی خوب صورت باتیں کر کے معزز عدالت کی توجہ اس کیس پر سے ہٹانا چاہتے ہیں۔'' وکیلِ استغاثہ نے تیز آواز میں کہا۔ ''اس سے عدالت کا قیمتی وقت برباد ہو رہا ہے۔ میں معزز عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ ملزمہ کی درخواستِ ضمانت کو نامنظور کرتے ہوئے اسے حوالۂ پولیس کیا جائے تاکہ اس کیس کا معاملہ کچھ آگے بڑھ سکے۔''

میں نے جج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''جنابِ عالی! یہ بات میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میری مؤکل کسی بھی قیمت پر اپنے شوہر سفیان علی کا خون نہیں کر سکتی۔''

جج، وکیلِ استغاثہ اور عدالت میں موجود ہر شخص نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ جج نے سنسناتے ہوئے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ ''بیگ صاحب! آپ اپنے اس دعوے کے حق میں کچھ کہنا چاہیں گے؟''

''ضرور کہنا چاہوں گا جنابِ عالی!'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آج اکیس فروری ہے۔ گزشتہ روز یعنی بیس فروری، وقوعہ کی سہ پہر میری مؤکل کو اس کے گھر سے، اپنے شوہر کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے جبکہ صرف آٹھ روز پہلے یعنی بارہ فروری کو میری مؤکل نے اپنے شوہر کے خلاف فیملی کورٹ میں ایک مقدمہ دائر کیا تھا۔ مذکورہ عدالت کی جانب سے مقتول سفیان علی کو بائیس فروری کو عدالت میں حاضر ہونے کا حکم نامہ جاری کیا گیا تھا اور بیس فروری کو سفیان علی قتل ہو جاتا ہے۔ یہ بڑی حیرت اور اچنبھے کی بات نہیں......؟''

''بیگ صاحب......!'' میری بات کے مکمل ہونے پر جج نے کہا۔ ''آپ کی مؤکل نے کس سلسلے میں فیملی کورٹ میں مقتول کے خلاف مقدمہ دائر کر رکھا تھا؟''

''جنابِ عالی...... خلع کا کیس!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''خلع کا کیس؟'' جج کے لہجے میں الجھن در آئی۔

''یس سر!'' میں نے اٹل انداز میں کہا۔ ''میری مؤکل اپنے شوہر کے ساتھ ہرگز ہرگز نہیں رہنا چاہتی تھی...... کیوں؟ اس سوال کا جواب بہت طویل ہے۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو عدالتی کارروائی کے دوران میں، میں اس معاملے کی وضاحت بھی کر دوں گا......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''ملزمہ فوزیہ نے اپنے شوہر یعنی مقتول سفیان علی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے بارہ فروری کو میری وکالت کے ساتھ ایک فیملی کورٹ میں خلع کا مقدمہ دائر کر رکھا ہے۔ عدالت بہ خوبی جانتی ہے کہ خلع کے کیسز کا فیصلہ بیوی کے حق میں ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگتا۔ فروری کے اختتام یا زیادہ سے زیادہ مارچ کے وسط تک میری مؤکل کو تو ویسے بھی مقتول سے نجات حاصل ہو ہی جانا تھی پھر وہ اسے قتل کرنے کی حماقت کیسے کر سکتی ہے اور...... اگر اسے مقتول کی زندگی کا چراغ گل کر کے ہی کلیجا ٹھنڈا کرنا تھا تو پھر اس غریب کو میرے جیسے مہنگے وکیل کی بھاری فیس ادا کر کے خلع کا مقدمہ دائر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

پھر میں نے خلع والے کیس کی نقول والی فائل جج کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اس فائل کے اندر موجود تمام کاغذات اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ سفیان علی کو میری مؤکل نے قتل نہیں کیا۔''

جج نے سرسری انداز میں اس فائل کی ورق گردانی کی اور پھر وکیلِ استغاثہ کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''وکیل صاحب! آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟''

''یہ ملزمہ فوزیہ کی کوئی گہری چال بھی ہو سکتی ہے جنابِ عالی!'' وہ خاصے پُرجوش انداز میں بولا۔ ''اس نے پہلے خلع کا مقدمہ دائر کیا پھر ایک سازش کے تحت مقتول سفیان علی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ خلع کا مقدمہ اس پیش بندی کا شاخسانہ ہو سکتا ہے کہ بعد میں ملزمہ پر شک کی گنجائش باقی نہ رہے اور...... میرے فاضل دوست اسی پیٹرن پر چل کر ملزمہ کی درخواستِ ضمانت منظور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ فوزیہ مجرم ہے...... جائے وقوعہ کے چپے چپے پر اس کی انگلیوں کے نشانات ملے ہیں۔ اسی نے مقتول سفیان علی کو موت کی نیند سلایا ہے۔''

''مجھے سخت اعتراض ہے جنابِ عالی!'' میں نے احتجاجی انداز میں کہا۔ ''وکیلِ سرکار میری مؤکل کو مجرم گردان کر عدالتی قواعد و ضوابط کی توہین کر رہے ہیں۔ جب تک کسی ملزم کا جرم ثابت نہیں ہو جاتا اسے مجرم نہیں کہا جا سکتا۔ علاوہ ازیں، میرے فاضل دوست نے بہت زور دے کر کہا ہے کہ میری مؤکل ہی نے مقتول سفیان علی کو موت کی نیند سلایا ہے۔ میں معزز عدالت کی اجازت سے وکیلِ استغاثہ سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا انہوں نے اپنی آنکھوں سے میری مؤکل کو قتل کی یہ واردات کرتے ہوئے دیکھا ہے......؟''

''ملزمہ کا جرم ثابت نہیں ہوا تو بہت جلد ثابت ہو جائے

گا۔'' وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ''اور جہاں تک ملزمہ کا قتل کی واردات میں ملوث ہونے کا سوال ہے تو مناسب وقت آنے پر اس امر کا ٹھوس ثبوت بھی مہیا کر دوں گا۔ ہمارے پاس ایک چشم دید گواہ بھی موجود ہے۔'' وہ لمحے بھر کے لیے سانس درست کرنے کو تھما پھر اپنا بیان مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''جنابِ عالی! جائے وقوعہ پر متعدد مقامات پر ملزمہ کی انگلیوں کے نشانات موجود ہیں اور استغاثہ کے پاس جو عینی شاہد ہے اس نے ملزمہ کو جائے وقوعہ پر جاتے اور وہاں سے واپس آتے ہوئے دیکھا ہے۔ اگر ملزمہ کی ضمانت قبول کر لی گئی تو تفتیش کے راستے میں ان گنت رکاوٹیں کھڑی ہو سکتی ہیں لہٰذا میری عدالت سے استدعا ہے کہ ملزمہ کی درخواستِ ضمانت کو رد کرتے ہوئے عرصہ سات یوم کا ریمانڈ دے دیا جائے تاکہ جلد از جلد اس مقدمے کا چالان پیش کر دیا جائے۔''

''یور آنر......!'' وکیلِ استغاثہ کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔ ''میری مؤکل بالکل بے قصور ہے۔ اسے کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت اس کیس میں پھنسانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ فی الحال میں تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا کیونکہ اس سے آگے والی عدالتی کارروائی کے متاثر ہونے کا شدید خدشہ ہے۔ میری مؤکل کسی بھی قیمت پر اپنے شوہر کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں تھی اور وہ اسے طلاق دینے کے حق میں نہیں تھا۔ مقتول نے طلاق والے معاملے کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ سب طرف سے مایوس ہونے کے بعد ہی اس مجبور و بے بس عورت نے انصاف کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کا فیصلہ کیا تھا۔ خلع کا مقدمہ اس کی مجبوری اور بے بسی کا کھلا ثبوت ہے۔ دونوں جانب سے حالات و واقعات و ثبوت و شواہد بعد میں عدالتی کارروائی کے دوران میں بھی ڈسکس کیے جا سکتے ہیں۔ سر دست میں معزز عدالت سے پرزور اپیل کروں گا کہ میری مؤکل کی درخواستِ ضمانت قبول کرتے ہوئے اس کی ہتھکڑی کھولنے کے احکام صادر کیے جائیں۔''

''یور آنر! ملزمہ فوزیہ ایک خطرناک اور عیار عورت ہے۔'' وکیلِ استغاثہ نے ملزمہ کی ضمانت رکوانے کے لیے ایک بار پھر زور مارا۔ ''اگر اس کی ضمانت منظور کر لی گئی تو تفتیش کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں کھڑی ہو جائیں گی۔''

ہمارے درمیان مزید پندرہ بیس منٹ تک اسی نوعیت کی نوک جھونک چلتی رہی پھر جج نے میری مؤکل کی درخواستِ ضمانت کو رد کرتے ہوئے سات روز کے لیے ملزمہ کو پولیس کی تحویل میں دینے کے احکام جاری کر دیے۔

پہلے بھی میں کئی بار اس بات کی وضاحت کر چکا ہوں کہ قتل کے ملزم کی ضمانت نہایت ہی مشکل اور ناممکن ہوتی ہے۔ اس کیس میں بہ قول استغاثہ، اس کے پاس اس واردات کا ایک عینی شاہد بھی موجود تھا۔ علاوہ ازیں جائے وقوعہ کے متعدد مقامات پر ملزمہ کے فنگر پرنٹس بھی ملے تھے لہٰذا اس کی درخواستِ ضمانت منظور ہونے کے امکانات صفر سے زیادہ نہیں تھے۔

میں نے اس ایک ہفتے میں بھاگ دوڑ کر کے اپنی مرضی اور کام کی بہت سی باتیں جمع کر لیں تاکہ عدالتی کارروائی کے دوران میں مجھے کسی مرحلے پر دقت کا سامنا نہ ہو۔ سر دست میں اس کی تفصیل آپ کی خدمت میں پیش نہیں کروں گا۔ مناسب موقع پر سب کچھ خود بہ خود آپ کے سامنے آ جائے گا۔

☆☆☆

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے اس مقدمے کا چالان عدالت میں پیش کر دیا۔ ابتدائی چند پیشیاں تکنیکی کارروائی کی نذر ہو گئیں۔ لگ بھگ دو ماہ کے بعد اس کیس کی باقاعدہ سماعت کا آغاز ہوا۔ جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزمہ نے صحتِ جرم سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد ملزمہ فوزیہ کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا گیا۔ اس نے بڑی تفصیل کے ساتھ بیان دیا تھا۔ اپنی اور مقتول کی زندگی کا گویا ایکسرے کر کے رکھ دیا تھا۔ اس بیان میں میری مؤکل نے نہایت ہی خفگی آمیز انداز میں مقتول کے لیے بے غیرت، بے شرم، آوارہ، کمینہ، بدمعاش، عیاش، بدقماش، شیطان، مکروہ، بدذات، بدکار، ہوس پرست، سفاک اور ظالم جیسے الفاظ استعمال کیے تھے۔ اپنے بیان کے اختتام پر اس نے ایک جذباتی جملہ بھی ٹانک دیا تھا حالانکہ میں نے حوالات میں ملاقات کے وقت بڑی سختی کے ساتھ اسے اس نوعیت کی جذباتی غلطی سے باز رہنے کی تلقین کی تھی۔ بہرحال، اس معاملے کو اب مجھے ہی ڈیل کرنا تھا۔

فوزیہ نے بڑی نفرت سے عدالت کے روبرو کہا تھا۔

''اگر اس نامراد کو قتل ہی کرنا ہوتا تو مجھے اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے خلع کا مقدمہ دائر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہاں اگر...... وہ اس کیس کو خراب کرنے کی کوشش کرتا یا اس کیس کا فیصلہ میرے حق میں ہو جانے کے بعد وہ کسی دوسری نوعیت کی کمینگی میں لگ جاتا تو میں نتائج کی پروا کیے بغیر موقع ملتے ہی اس کی جان لینے سے ایک

لمحے کے لیے بھی نہ چوکتی چاہے اس کے لیے بعد میں مجھے کتنی بھی مشکلات کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑتا۔"

ٹھیک ہے، یہ فوزیہ کا ایک جذباتی بیان تھا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ جوش بھرے الفاظ اس کے احساسات کی سچائی کی ترجمانی بھی کرتے تھے۔ حالات نے اس دکھوں کی ماری کو گھٹ گھٹ کر جینے کے بجائے ایک ہی بار اذیت سے گزر کر مرجانے پر راضی کرلیا تھا۔ وہ ذہنی طور پر "مرو یا مار دو" کے اصول پر عمل پیرا ہونے کا فیصلہ کرچکی تھی۔ اس نے اپنے حلفیہ بیان میں نرگس کی ٹیلی فون کال کی بھی تفصیل شامل کردی تھی جو اس کے کیس کو مضبوطی بخشتی تھی۔

استغاثہ کی جانب سے گواہان کی نہایت ہی مختصر سی فہرست دائر کی گئی تھی لیکن میں یہاں پر صرف انہی گواہوں کا تذکرہ کروں گا جن کے بیان میں کام کی کوئی بات موجود ہوگی یعنی گواہوں کی یہ فہرست اور بھی مختصر ہونے کے روشن امکانات ہیں۔

استغاثہ کی جانب سے شہادتوں کا سلسلہ شروع ہونے سے قبل ہی میں نے جج سے درخواست کی "یور آنر...... میں اس کیس کے تفتیشی افسر سے چند اہم سوال کرنا چاہتا ہوں۔"

جج نے فوراً میری فرمائش پوری کردی۔

اگلے ہی لمحے تفتیشی افسر وٹنس باکس (گواہوں والے کٹہرے) میں آکر کھڑا ہوگیا۔ کسی بھی کیس میں تفتیشی افسر یا انکوائری آفیسر کی حیثیت استغاثہ کے ایک گواہ اسی ہوتی ہے اور اسے ہر پیشی پر عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔ اس کیس کا انکوائری آفیسر عہدے کے لحاظ سے ایک اے ایس آئی تھا۔ وہ ایک فربہ اندام مگر چست و چالاک پولیس والا تھا۔

میں گواہوں والے کٹہرے کے قریب آگیا اور آئی او کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "آئی او صاحب! مجھے پتا چلا ہے، آپ اپنے ڈپارٹمنٹ میں "اے جی" کے نام سے جانے اور پکارے جاتے ہیں۔ یہ "اے جی" کیا شے ہے؟"

"اے جی!" وہ زیرلب مسکراتے ہوئے بولا۔

"مطلب عبدالغفار۔"

وہ ایک پستہ قامت، فربہ اور پھولے پھولے گالوں والا اے ایس آئی تھا اور جب وہ مسکراتا تھا تو اس کے گالوں میں ڈمپل بھی پڑتے تھے۔ میں نے اس کے جواب پر سرسری انداز میں کہا۔

"اوہ...... اچھا...... جیسے "اے ڈی" سے اللہ دتا اور "جی این" سے غلام نبی۔ میں دراصل یہ سمجھا تھا کہ "اے جی" شاید کوئی ڈگری وغیرہ ہے یا پھر...... "اے جی" کا مطلب اکاؤنٹنٹ جنرل ہے...... جیسے "اے جی سندھ" بھی کہا جاتا ہے۔"

اس نے میرے تبصرے پر کچھ کہنا مناسب نہ جانا اور چپ چاپ گہری نظر سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔ میں نے سوالات کے سلسلے کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"اے جی صاحب! آپ کو اس واقعے کی اطلاع کب اور کس نے دی تھی؟"

"ہمارے روزنامچے کے مطابق، یہ اطلاع وقوعہ کے روز یعنی بیس فروری کو بذریعہ ٹیلی فون دی گئی تھی۔" وہ پُرسوچ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اور اطلاع کنندہ کا نام ہے نورین......"

"نورین......!" میں نے زیرلب دہرایا پھر مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ "یہ نورین کون ہے؟"

"مقتول کی بیوی...... میرا مطلب ہے، مقتول کی بیوہ۔"

"لیکن مقتول کی ایک بیوہ کا نام تو رضوانہ ہے۔" میں نے تیز نظر سے تفتیشی افسر کو گھورتے ہوئے کہا۔ "اور دوسری بیوی اس کیس کی ملزمہ اور میری مؤکل فوزیہ ہے۔ آپ نے یہ تیسری بیوی کہاں سے پیدا کرلی...... میرا مطلب ہے، کہاں سے نکال لی؟"

وہ میرے اس چبھتے ہوئے سوال پر تلملا کر رہ گیا تاہم کوئی سخت قسم کا ردعمل ظاہر کرنے کے بجائے اس نے طنزآمیز لہجے میں جواب دیا۔

"نورین کو میں نے نہیں بلکہ اس کے والدین نے پیدا کیا ہے اور جہاں تک کہیں سے نکالنے کا تعلق ہے تو اس میں بھی میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ مقتول نے اس سے باقاعدہ نکاح کرکے اسے بہادرآباد والے فلیٹ پر رکھا ہوا تھا۔ وہ مقتول کی تیسری بیوہ ہے۔ قتل چونکہ اس کے فلیٹ پر ہوا تھا اس لیے اسی نے تھانے فون کرکے ہمیں اس واردات کی اطلاع دی تھی۔"

"اے جی صاحب!" میں نے جرح کے سلسلے کو نہایت ہی سنجیدگی سے آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ "آپ نے یہ نہیں بتایا کہ یہ اطلاع آپ کو کتنے بجے دی گئی تھی؟"

"لگ بھگ ڈھائی بجے......!" اس نے جواب دیا۔

"یعنی دو بج کر تیس منٹ پر؟"

"جی ہاں...... ڈھائی کا مطلب، دو بج کر تیس منٹ ہی ہوتا ہے۔" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔

"اوکے......!" میں نے اس کی تکلیف پر پھایا رکھتے ہوئے کہا پھر سوال کیا۔ "مقتول کی بیوہ نورین نے اپنے شوہر مقتول سفیان علی کی موت کی اطلاع کن الفاظ میں دی تھی؟"

"صرف ایک لائن میں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "جلدی پہنچیں۔ کسی نے میرے شوہر کو قتل کردیا ہے۔"

"آپ کے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ نورین نے اپنی آنکھوں سے مقتول کو قتل ہوتے دیکھا تھا؟" میں نے استفسار کیا۔

"میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔" وہ جلدی سے بولا۔ "اگر نورین نے اپنی آنکھوں سے یہ قتل ہوتے دیکھا ہوتا تو پھر اس کے الفاظ یہ ہوتے...... جلدی پہنچیں۔ فوزیہ نے میرے شوہر کو قتل کردیا ہے۔"

"تو گویا آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ نورین، فوزیہ کی صورت آشنا ہے؟"

"سوتنوں کو ایک دوسرے کی صورت آشنا تو ہونا ہی چاہیے۔" وہ متذبذب انداز میں بولا اور بات ختم کرکے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"یہ کوئی فارمولا نہیں ہے۔" میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "اس نوعیت کی شادیوں میں شوہر عموماً اپنی دوسری، تیسری یا چوتھی بیوی کو اپنی پہلی یا دوسری یا تیسری بیوی سے چھپا کر رکھنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ نقضِ امن کا خطرہ پیدا نہ ہو اور وہ اپنے نصیب کی آکسیجن کو اپنی مرضی سے پھیپھڑوں میں اتارتا رہے۔"

اس نے میری وضاحت پر کوئی تبصرہ کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔

میں نے پوچھا۔ "آپ جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟"

"ٹھیک تین بجے سہ پہر۔" اس نے جواب دیا۔

"اور ٹھیک چار بجے آپ نے میری مؤکل کو اس کے گھر سے اپنے شوہر کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا تھا......" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "ایم آئی رائٹ......؟"

"جی، آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "کم و بیش چار بجے میں نے ملزمہ فوزیہ کو گرفتار کیا تھا۔"

"ٹھیک ہے......" میں نے غیرمحسوس انداز میں اپنا جال پھیلاتے ہوئے کہا۔ "آپ ٹھیک تین بجے جائے وقوعہ یعنی نورین کے فلیٹ واقع بہادرآباد پہنچے۔ فلیٹ کے اندر آپ نے کیا دیکھا؟"

"جب میں اور دو ماتحت اہلکار جائے واردات پر پہنچے تو دروازہ مقتول کی بیوی نورین نے کھولا تھا۔ وہ ہمیں سیدھی بیڈروم میں لے گئی۔" وہ بڑے اعتماد کے ساتھ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اور بیڈروم میں، بیڈ کے اوپر مقتول سفیان کی لاش پڑی تھی۔"

"بیڈ پر لاش پڑی تھی......" میں نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "مطلب، پہلی نظر دیکھ کر ہی آپ کو اندازہ ہوگیا تھا کہ سفیان علی کو اب زندوں میں شمار نہیں کیا جاسکتا؟"

"جی ہاں، یہی بات ہے۔" اس نے ایک بار پھر اثبات میں گردن ہلائی۔ "اس کی کھوپڑی کا جو حشر ہوچکا تھا اس میں کسی شک وشبے کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی تھی۔ سارا لباس اور بیڈ کا کچھ حصہ بھی خون آلود تھا۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا کہ سفیان علی موت کے گھاٹ اتر چکا ہے۔"

"اوکے اے جی صاحب!" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "اب ذرا یہ بھی بتادیں کہ آپ نے پوسٹ مارٹم رپورٹ کو توجہ سے پڑھا ہے؟"

"جی ہاں...... پوری توجہ سے۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

"پڑھا تو میں نے بھی ہے......" میں نے خودکلامی کے انداز میں کہا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "میں آپ سے چند امور کی تصدیق چاہتا ہوں۔ کیا آپ میرے چند سوالات کے مختصر جوابات دینا پسند فرمائیں گے؟"

"ضرور...... آپ پوچھیں، کیا پوچھنا چاہتے ہیں......"

میں نے پوچھا۔ "پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق، مقتول سفیان علی کی موت بیس فروری کی دوپہر ایک اور تین بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی؟"

"جی ہاں......!" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"اس کی کھوپڑی پر سائیلنسر لگے اعشاریہ تین آٹھ کے ریوالور سے فائر کیا گیا تھا......؟"

"درست......!"

"صرف ایک گولی نے مقتول کا کام تمام کردیا تھا؟"

"جی...... رپورٹ یہی بتاتی ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "کھوپڑی کے اندر دھنسنے والی گولی نے اس کی کھوپڑی کے پرخچے اڑا دیے تھے اور بھیجا کھوپڑی کے اندر سے نکل کر ادھر ادھر بکھر گیا تھا۔"

"اور یہ فائر...... بے آواز فائر بہت نزدیک سے کیا

کیا تھا؟"

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"پوسٹ مارٹم رپورٹ میں بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا ہوا ہے کہ مقتول پر گولی اس کی بے خبری میں چلائی گئی تھی۔" میں نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔ "اور یہ گولی مقتول کی کھوپڑی کے عقبی حصے سے اس کے بھیجے میں داخل ہوئی تھی یعنی...... قاتل نے مقتول کے عقب سے نہایت ہی کم فاصلے سے اس پر ایک بے آواز فائر کیا تھا؟"

"جی ہاں...... یہی حقیقت ہے۔" وہ پُریقین انداز میں بولا۔

میں نے جرح کا زاویہ تبدیل کرتے ہوئے اپنے سوالات میں تیزی پیدا کی اور پوچھا۔ "یقیناً موقع واردات کی ضروری کارروائی مکمل کرنے کے بعد ہی آپ نے ملزمہ کے گھر کا رخ کیا ہوگا؟"

"ظاہر ہے......!"

"آپ کس کی نشان دہی یا راہنمائی میں ملزمہ فوزیہ کو گرفتار کرنے طارق روڈ کی سمت لپکے تھے؟" میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ "نورین نے فوزیہ کو وہاں آتے جاتے نہیں دیکھا تھا اور اگر دیکھا بھی ہوتا تو وہ پہچان نہیں سکتی تھی کیونکہ آپ ہی کے مطابق وہ ایک دوسرے کی صورت آشنا نہیں ہیں پھر...... پھر آپ نے یہ معاملہ کس طرح ٹیکل کیا؟"

"بات دراصل یہ ہے جناب......" وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "ہمیں جائے وقوعہ سے ایک ایسا گواہ مل گیا تھا جس نے ملزمہ کو نورین کے فلیٹ کے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ......"

"اچھا اچھا......" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "کہیں یہ وہی گواہ تو نہیں جس کا استغاثہ رپورٹ میں بڑی دھوم دھام کے ساتھ ذکر کیا گیا تھا؟"

"جی...... جی ہاں وہی!"

"کیا میں اس گواہ کا نام جان سکتا ہوں؟"

"فہمیدہ...... آنٹی فہمیدہ!" اس نے جواب دیا۔

"تو آپ کا دعویٰ ہے کہ یہ عینی شاہد فہمیدہ آنٹی ملزمہ فوزیہ کو شکل سے اچھی طرح پہچانتی ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"جی بالکل......!" اس نے پُروثوق انداز میں گردن ہلائی۔

"کیا فہمیدہ آنٹی نورین کو بھی پہچانتی اور جانتی ہے......؟"

"نن...... نہیں......!"

"تھینک یو اے جی صاحب!" میں نے تفتیشی افسر پر جرح ختم کرتے ہوئے کہا پھر روئے سخن جج کی طرف موڑتے ہوئے اضافہ کیا۔

"مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جنابِ عالی!"

آئی او نے سکھ کی سانس لی۔ اس کے بعد استغاثہ کی جانب سے کوئی گواہ مزید پیش کرنے کی نوبت نہیں آئی کیونکہ عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر آنٹی فہمیدہ کو استغاثہ کی جانب سے پیش کیا گیا۔ آنٹی فہمیدہ کی عمر چالیس سے متجاوز تھی۔ درمیانے قد اور بھاری بھرکم بدن کی مالک ایک قبول صورت عورت تھی۔ اس نے آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ موسم کی مناسبت سے اس نے پرنٹڈ لان کا سوٹ زیبِ تن کر رکھا تھا۔

فہمیدہ آنٹی اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کرا چکی تو وکیل استغاثہ نے اسے اپنے نرغے میں لے لیا۔ میں نے استغاثہ کے اس کردار سے متعلق اپنی تحقیقات مکمل کر کے اچھی خاصی مفید معلومات حاصل کر لی تھیں۔

وکیلِ استغاثہ نے فہمیدہ آنٹی کو اپنی جرح کے رگڑے سے نکالا تو میں سوالات کے لیے وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا۔ میں نے استغاثہ کی گواہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"فہمیدہ صاحبہ! میں آپ کو آنٹی فہمیدہ کہوں یا فہمیدہ آنٹی؟"

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا تاہم ضبط کا پلو بڑی احتیاط سے تھامتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ "وکیل صاحب! آپ مجھے صرف فہمیدہ کہیں تو زیادہ مناسب ہوگا......"

"فہمیدہ صاحبہ!" میں نے گہری سنجیدگی سے سوال کیا۔ "آپ کی رہائش کس جگہ پر ہے؟"

"طارق روڈ پر۔"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "طارق روڈ پر کس جگہ؟"

"وہیں...... جہاں ملزمہ فوزیہ کی رہائش ہے۔" اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ "میں بھی اسی بلڈنگ میں رہتی ہوں۔"

اب کی بار فوزیہ نے بڑی حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ اس کی حیرانی بجا تھی کیونکہ وہ اس حقیقت سے واقف نہیں تھی کہ فہمیدہ بھی اسی بلڈنگ کی رہائشی تھی جہاں وہ خود رہتی تھی۔ میں نے فہمیدہ کے حوالے سے تحقیق کرتے ہوئے اس امر کی تصدیق کر لی تھی، تاہم فوزیہ کو اس حوالے سے کچھ نہیں بتایا تھا۔ فہمیدہ آنٹی غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ وہ واقعی اسی بلڈنگ کی رہائشی تھی۔

"لیکن فہمیدہ صاحبہ......!" میں نے گواہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ "میری مؤکل اور اس کیس کی ملزمہ تو آپ کو نہیں جانتی۔ اس نے کبھی آپ کو اپنی بلڈنگ میں نہیں دیکھا تھا......؟"

"دراصل، مجھے اس بلڈنگ میں رہائش اختیار کیے ابھی چند ہی روز ہوئے ہیں۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "ملزمہ کا فلیٹ سیکنڈ فلور پر واقع ہے جبکہ میں فورتھ فلور کے ایک فلیٹ میں کرائے دار کی حیثیت سے آئی ہوں۔ اسی لیے فوزیہ کو میرے بارے میں کچھ علم نہیں۔"

"کمال کی بات ہے فہمیدہ صاحبہ۔" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "میری مؤکل تو آپ کو جانتی تک نہیں اور آپ اس کے بارے میں اچھی خاصی معلومات رکھتی ہیں۔"

"یہ تو اپنی اپنی جان کاری کی بات ہے وکیل صاحب!"

"بالکل درست فرما رہی ہیں آپ۔" میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "کیا آپ کو اس بات کا احساس ہے کہ آپ استغاثہ کی سب سے زیادہ اہم اور معتبر گواہ ہیں؟"

"میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ میں ایک گواہ ہوں۔" وہ بڑی سادگی سے بولی۔

"صرف گواہ نہیں فہمیدہ صاحبہ!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "آپ اس کیس میں استغاثہ کی جانب سے آئی وٹنس یعنی عینی گواہ کی حیثیت سے آج عدالت میں پیش ہوئی ہیں۔ وقوعہ کے روز آپ نے میری مؤکل فوزیہ کو بہادر آباد والے نورین کے فلیٹ میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔"

"جی ہاں...... یہ درست ہے۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"کیا میں یہ جان سکتا ہوں کہ آپ وقوعہ کے روز بہادر آباد والی اپارٹمنٹ بلڈنگ میں کیا کر رہی تھیں؟"

"میں وہاں اپنی خالہ سے ملنے گئی تھی۔" اس نے جواب دیا۔

"اچھا...... تو آپ کی خالہ بھی اسی بلڈنگ میں رہتی ہیں جس کے ایک فلیٹ...... نمبر چار سو چار میں سفیان علی بڑی بے دردی سے سر میں گولی مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا؟"

"جی ہاں، یہی حقیقت ہے۔"

"آپ کی خالہ کا نام کیا ہے؟"

"صفیہ خالہ......!"

"آپ کی صفیہ خالہ اس بلڈنگ کے کس فلیٹ میں رہتی ہیں؟"

"فلیٹ نمبر چھ سو دو۔" اس نے جواب دیا۔ "چھٹے فلور پر......"

"کیا آپ اکثر اپنی صفیہ خالہ سے ملنے اس بلڈنگ میں جاتی رہتی ہیں؟"

"جی ہاں......!"

"آپ نے ملزمہ فوزیہ کو کس وقت فلیٹ نمبر چار سو چار میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا؟" میں نے سوال کیا۔ "میرا مطلب ہے، جب آپ اپنی صفیہ خالہ سے ملنے جا رہی تھیں یا جب وہاں سے واپس آ رہی تھیں؟"

"جب میں اپنی خالہ سے ملنے جا رہی تھی۔" اس نے جواب دیا۔ "اسے اس بلڈنگ میں دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی لیکن میں نے اس سے بات کرنا یا کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا اور سیدھی اپنی خالہ کے فلیٹ کی طرف چلی گئی تھی۔"

"کیا ملزمہ فوزیہ نے بھی آپ کو اس بلڈنگ میں دیکھ لیا تھا؟"

ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے...... نہیں......!"

"ابھی تک آپ نے میرے جن سوالات کے جوابات دیے ہیں ان میں سے کسی میں کوئی تبدیلی تو نہیں کرنا......؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل نہیں...... میں نے جو بھی بتایا ہے، سولہ آنے سچ بتایا ہے۔" وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ "آپ یہ بات کیوں پوچھ رہے ہیں وکیل صاحب؟"

میں نے اس کے سوال کا جواب دینا مناسب نہ جانا اور سوالات کے سلسلے کو ایک انوکھا موڑ دیتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کی نشاندہی اور راہنمائی میں پولیس نے میری مؤکل کو اس کے گھر سے گرفتار کیا تھا اور اس امر کی تصدیق پچھلی پیشی پر انکوائری آفیسر اے جی نے بھی کی ہے۔ میں اپنی معلومات کی خاطر یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ نے کس طرح پولیس کی راہنمائی فرمائی تھی...... کیا آپ بھی پولیس کے ساتھ ہی واپس طارق روڈ والے فلیٹ پر گئی تھیں یا پس

انہیں میری مؤکل کا ایڈریس سمجھا دیا تھا؟"
"میں ان کے ساتھ نہیں گئی تھی۔" اس نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے جواب دیا۔ "بس انہیں گائڈ کر دیا تھا۔"
"آپ کا گھر بھی اسی بلڈنگ میں واقع ہے جہاں ملزمہ کی رہائش ہے۔" میں نے کرید کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ جتنا بڑا واقعہ پیش آیا تھا اس میں تو آپ کو فوراً اپنے گھر کی جانب ریس ہو جانا چاہیے تھا پھر آپ اطمینان سے اپنی صفیہ خالہ کے گھر میں کیوں بیٹھی رہی تھیں؟"
"میں کسی خاص کام سے صفیہ خالہ سے ملنے گئی تھی اور جب تک وہ کام ہو نہ جاتا، میں واپس نہیں آسکتی تھی۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "پھر یہ واقعہ میرے وہاں پہنچنے کے چند منٹ بعد ہی پیش آگیا تھا۔"
"چند منٹ......!" میں نے پوچھا۔ "مثلاً کتنے منٹ؟"
"یہی کوئی دس پندرہ یا بیس منٹ۔" اس نے جواب دیا۔ "میں ابھی جا کر اپنی خالہ کے پاس بیٹھی ہی تھی کہ نیچے سے شور اٹھا۔ پھر پتا چلا کہ چوتھے فلور کے ایک فلیٹ میں کسی کو قتل کر دیا گیا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد پولیس بھی تفتیش کے لیے موقع پر پہنچ گئی۔"
"آپ کب اس تحقیقاتی کمیشن یا تفتیشی ٹیم میں شامل ہوئی تھیں؟" میں نے طنزیہ انداز میں استفسار کیا۔ "مطلب یہ کہ پولیس نے آپ سے کب رابطہ کیا یا آپ نے کب پولیس کو بتایا کہ آپ نے میری مؤکل اور اس مقدمے کی ملزمہ فوزیہ کو فلیٹ نمبر چار سو چار کے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا؟"
"بات دراصل یہ ہے وکیل صاحب کہ جب یہ شور اٹھا کہ فلیٹ نمبر چار سو چار میں کسی بندے کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے تو میرا ماتھا ٹھنکا کیونکہ میں نے بیس پچیس منٹ پہلے اسی فلیٹ میں فوزیہ کو داخل ہوتے دیکھا تھا۔ میں گھر سے نکلی اور چوتھے فلور پر آگئی۔ خالہ صفیہ بھی میرے ہمراہ تھیں۔ چوتھے فلور پر پولیس تفتیش کرتے ہوئے مختلف لوگوں کے بیانات بھی لے رہی تھی۔ جب مجھ سے انہوں نے پوچھا تو میں نے انہیں سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔"
"وہ پھر...... آپ کی نشاندہی پر سیدھے طارق روڈ پہنچے اور آناً فاناً میری مؤکل کو گرفتار کر کے لے گئے۔" میں نے کہا۔ "میں غلط تو نہیں کہہ رہا فہمیدہ صاحبہ......؟"
"نہیں جی...... آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔"
"فہمیدہ صاحبہ!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔
"ابھی تک آپ نے میرے جن سوالات کے جوابات دیے ہیں ان میں سے کسی میں کوئی تبدیلی تو نہیں کرنا......؟"
"کک...... کیا مطلب ہے آپ کا......" وہ خفگی آمیز نظر سے مجھے تکنے لگی۔ "یہ سوال آپ پہلے بھی مجھ سے کر چکے ہیں۔"
"آبجیکشن یور آنر......!" وکیل استغاثہ نعرہ مستانہ لگاتے ہوئے فوراً اپنی گواہ کی مدد کو لپکا۔ "جناب عالی! میرے فاضل دوست استغاثہ کی معزز گواہ کو خوامخواہ ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں ایسے ہتھکنڈے آزمانے سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔"
جج نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔
میں نے کہا۔ "جناب عالی! میرے اس سوال کا ایک خاص مقصد ہے۔ اگر استغاثہ کا گواہ صرف ایک بار جواب دے دے تو میں آئندہ کبھی بھی ان سے یہ سوال نہیں کروں گا۔"
اب کی بار جج نے سوالیہ انداز میں فہمیدہ آنٹی کی طرف دیکھا۔
وہ جلدی سے بولی۔ "میں نے خدا کو حاضر و ناظر جان کر سب کچھ سچ بتایا ہے۔ آپ کی مرضی ہے، میری بات کا یقین کریں یا نہ کریں۔"
"آپ نے کہا اور میں نے یقین کر لیا فہمیدہ ماسی!" میں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔
فہمیدہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس نے گھبرا کر وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا۔ وکیل استغاثہ کچھ زیادہ ہی جوش میں آگیا اور آتشیں لہجے میں بولا۔
"جناب عالی! وکیل صفائی نے تمام اخلاقی حدود کو پامال کر دیا ہے۔ استغاثہ کی معزز گواہ کو ماسی...... یعنی نوکرانی کہہ دینا انتہائی گری ہوئی حرکت ہے...... اٹ از نو جج یور آنر......!"
وکیل استغاثہ کے اعتراض پر جج نے تشویش بھرے انداز میں مجھے گھورا اور پوچھا۔ "بیگ صاحب! آپ نے استغاثہ کی گواہ کے لیے اس قسم کے الفاظ کیوں استعمال کیے ہیں...... عدالت وضاحت چاہتی ہے۔"
"جناب عالی!" میں نے نہایت ہی ادب و احترام کے ساتھ اپنی معلومات کے دریا بہاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "پھول کو پھول، مالی کو مالی اور گالی کو گالی کہنا کسی بھی طور اخلاق سے گری ہوئی حرکت نہیں ہو سکتی اسی طرح......" میں نے دانستہ توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔
"اسی طرح ماسی کو ماسی کہنا بھی کوئی جرم نہیں یور آنر!"

"آپ کا مطلب ہے، استغاثہ کی گواہ فہمیدہ، گھروں میں کام کرنے والی ایک نوکرانی ہے......؟" جج کے استفسار سے بے یقینی جھلکتی تھی۔
"ویری چیک!" میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "اور میں اپنے اس دعوے کو ابھی معزز عدالت کے سامنے ثابت کر کے دکھا سکتا ہوں۔"
"پرمیشن گرانٹیڈ......!" جج نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔
"فہمیدہ صاحبہ!" میں نے استغاثہ کی گواہ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے سوال کیا۔ "آپ نے ابھی تھوڑی دیر پہلے میرے ایک سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ آپ اکثر اپنی صفیہ خالہ سے ملنے اس بلڈنگ میں جایا کرتی تھیں؟"
"جی...... میں نے یہی بتایا ہے۔" وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔
"معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ صفیہ نامی وہ عورت آپ کی سگی خالہ ہے یا سوتیلی؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
"کک...... کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ بے ساختہ بولی۔ پھر گڑبڑائے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ "آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟"
اس دوران میں، میں استغاثہ کی سب سے اہم گواہ فہمیدہ آنٹی کے بارے میں اچھی خاصی تحقیق اور تفتیش کر چکا تھا لہٰذا میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "ویری سمپل...... میں نے یہ پوچھا ہے کہ صفیہ رشتے میں آپ کی خالہ ہیں یعنی وہ آپ کی والدہ کی بہن ہیں یا پھر محض نام کی خالہ ہیں جیسا کہ کسی بھی خاتون کو خالہ کہہ دیا جاتا ہے؟"
"صفیہ خالہ میری سگی خالہ ہیں۔" اس نے اپنے لہجے میں مضبوطی پیدا کرتے ہوئے جواب دیا۔
"ویری گڈ......!" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "اس کا مطلب ہے، آپ رضیہ نامی کسی عورت کو بھی جانتی ہوں گی؟"
"کون رضیہ؟" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔
"کمال ہے، آپ رضیہ کو نہیں جانتیں!" میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ "بھئی، میں گلشن اقبال والی رضیہ کی بات کر رہا ہوں...... تمہاری صفیہ خالہ کی سگی بہن...... کیا رضیہ کو خالہ کہتے ہوئے تمہیں موت آتی ہے؟" میں اچانک "آپ" سے "تم" پر اتر آیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرا انداز بھی خاصا جارحانہ ہو گیا تھا۔ وہ گھبرا گئی اور جلدی سے بولی۔
"او...... ہاں...... جی بالکل...... وہ بھی میری سگی خالہ ہیں...... آپ نے اچانک سوال کیا تو میں الجھ کر رہ گئی تھی......"
"کوئی بات نہیں۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "اگر تم اس الجھن سے نکل آئی ہو تو میں سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاؤں......؟"
"جج...... جی...... ضرور......" اس نے اٹک اٹک کر کہا۔
"فہمیدہ!" میں نے بہ دستور سخت لہجے میں کہا۔ "تھوڑی دیر پہلے تم نے میرے ایک سوال کے جواب میں معزز عدالت کو بتایا تھا کہ وقوعہ کے روز تم کسی خاص کام سے اپنی صفیہ خالہ سے ملنے مقتول والی بلڈنگ میں گئی تھیں یعنی بہادر آباد والی اس اپارٹمنٹ بلڈنگ میں جہاں نورین اور فوزیہ اور رضوانہ کے شوہر سفیان علی کو قتل کر دیا گیا تھا؟"
"جی بالکل...... میں نے یہی بتایا ہے۔" اس نے مختصر جواب دیا۔
"وہ ضروری کام کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔ "جو جب تک ہو نہ جاتا، آپ وہاں سے واپس نہیں آسکتی تھیں؟"
"کیا اس کام کا ذکر کرنا ضروری ہے؟" وہ ہچکچائی۔
"جی ہاں...... بہت ضروری ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ نہیں بتائیں گی تو مجبوراً اس کا ذکر کرنا پڑے گا کیونکہ میں تو صفیہ خانم کو بھی اچھی طرح جانتا ہوں اور رضیہ خالہ کو بھی......!"
اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بری طرح پھنس گئی ہو۔ میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "آپ بتا رہی ہو یا میں یہ قصہ شروع کروں؟"
"آبجیکشن یور آنر!" وکیل استغاثہ فوراً اپنے سب سے اہم گواہ کی مدد کو لپکا۔ "میرے فاضل دوست خوامخواہ کے سوالات سے استغاثہ کی گواہ کو ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"
"میں نہ تو آپ کی گواہ کو ہراساں کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور نہ ہی میرا یہ سوال خوامخواہ کا ہے۔" میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ "میں تو معزز عدالت کی جانب سے پوچھے گئے ایک سوال کی وضاحت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" پھر میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑا اور نہایت ہی مؤدب لہجے میں کہا۔
"جناب عالی! میرے ایک انکشاف کے جواب میں آپ نے مجھ سے پوچھا تھا کہ...... آپ کا مطلب ہے،"

استغاثہ کی گواہ فہمیدہ گھروں میں کام کرنے والی ایک نوکرانی ہے؟"

"تو کیا ایسا ہی ہے؟" جج نے دلچسپی لیتے ہوئے مجھ سے استفسار کیا۔

"جناب عالی! اس سوال کا جواب تو استغاثہ کی سب سے اہم گواہ فہمیدہ آنٹی دیں گی...... اگر اس کی زبان کا تالا نہ کھلا تو مجبوراً مجھے یہ قصہ بیان کرنا پڑے گا۔"

"بی بی! تم کیا کہتی ہو؟" جج نے فہمیدہ کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

اس کے لیے "نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن" کی سی صورتِ حال پیدا ہوگئی تھی۔ پہلے اس نے وکیلِ استغاثہ کی جانب دیکھا پھر بولی۔

"مجھے رضیہ خالہ نے ایک ضروری کام سے صفیہ خالہ کے پاس بھیجا تھا۔"

"کون سے ضروری کام سے؟" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"جج...... جی...... وہ......" وہ بری طرح الجھ کر رہ گئی۔

"کیا جج لگا رکھی ہے!" میں نے اس پر چڑھائی کردی۔ "صاف کیوں نہیں کہتی ہو کہ کسی زمانے میں تم گلشن اقبال میں رہتی تھیں اور رضیہ نامی اس عورت کے گھر میں ایک نوکرانی کی حیثیت سے کام کیا کرتی تھیں۔ رضیہ کی بہن صفیہ کو جب ایک نوکرانی کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس نے اپنی بہن رضیہ سے کہا۔ رضیہ نے تم سے کہا کہ جا کر صفیہ سے مل لو اور تم اپنی "صفیہ خالہ" سے ملنے پہنچ گئیں۔" میں نے صفیہ خالہ کے الفاظ پر اچھا خاصا زور ڈالا تھا۔ "کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"ن......نہیں......" وہ لکنت زدہ لہجے میں بولی۔ "ایسا ہی تھا۔"

"یور آنر!" میں نے فاتحانہ انداز میں جج کی طرف دیکھا اور کہا۔ "جیسا کہ تھوڑی دیر پہلے میں نے عرض کیا تھا کہ میں اپنے اس دعوے کو معزز عدالت کے سامنے سچ کر کے دکھا سکتا ہوں کہ استغاثہ کی گواہ فہمیدہ آنٹی گھروں میں کام کرنے والی ایک نوکرانی ہے تو...... یہ بات ثابت ہوچکی لیکن اتنا ثابت ہوجانا کافی نہیں ہے۔"

"آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں وکیل صاحب؟" جج نے متعجب نظر سے مجھے دیکھا۔

"جناب عالی! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ معزز عدالت کے لیے یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ رضیہ نے فہمیدہ کو صفیہ کے پاس کس کام کی غرض سے بھیجا تھا۔"

"لیکن آپ بتا تو چکے ہیں کہ صفیہ کو ایک نوکرانی کی ضرورت تھی جبھی رضیہ نے فہمیدہ کو اس کے پاس بھیجا تھا۔" جج کے استفسار میں حیرت شامل تھی۔

"ایگزیکٹلی...... میں نے یہی کہا ہے۔" میں نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "لیکن اس امر کی وضاحت ہونا ضروری ہے کہ جب صفیہ کے گھر میں ایک ملازمہ پہلے سے کام کر رہی تھی تو پھر کسی اور نوکرانی کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟"

"بی بی! بتاؤ تم اس سلسلے میں کیا کہتی ہو؟" جج وٹنس باکس میں کھڑی فہمیدہ سے مستفسر ہوا۔

"وہ جی...... جج صاحب...... صفیہ خالہ کو نہیں بلکہ کسی اور کو ضرورت تھی۔"

"کس کو......؟" میں نے چیخ سے مشابہ آواز میں پوچھا۔

"جناب عالی! مجھے سخت اعتراض ہے۔" وکیلِ استغاثہ ایک مرتبہ پھر بیچ میں کود پڑا۔ "صفیہ خالہ کا زیرِ سماعت کیس سے کیا تعلق۔ وکیلِ صفائی ادھر ادھر کے غیر ضروری معاملات میں الجھ کر معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔"

اس مرتبہ میں نے وکیلِ استغاثہ کو آڑے ہاتھوں لیا اور درشت لہجے میں کہا۔ "میرے فاضل دوست! میں ادھر ادھر کا کوئی بھی غیر ضروری سوال نہیں کر رہا ہوں۔ نمبر ٹو، میں جو کچھ بھی پوچھ رہا ہوں اس کا زیرِ سماعت کیس سے گہرا تعلق ہے۔ نمبر تھری، برائے مہربانی میری بات مکمل ہونے سے پہلے آپ صبر اور سکون کے ساتھ کھڑے رہیں......" پھر میں دوبارہ استغاثہ کی گواہ فہمیدہ کی جانب متوجہ ہوگیا۔

وکیلِ استغاثہ نے مجھے ایسی نظر سے دیکھا جیسے کچا چبا جائے گا تاہم وہ منہ سے ایک لفظ نہیں بولا۔ میں نے فہمیدہ سے سوال کیا۔

"ملازمہ کی ضرورت کس کو تھی؟"

"نورین صاحبہ کو......" اس نے جواب دیا۔

"کون نورین؟" میں نے پوچھا۔ "کیا تم اسی نورین کا ذکر کر رہی ہو جو تھرڈ فلور کے فلیٹ نمبر چار سو چار میں رہتی ہے اور اسی فلیٹ میں اس کے شوہر سفیان علی کو کسی نے قتل کر دیا تھا؟"

"جی وہی نورین صاحبہ۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

ہلائی۔ ”میں اسی کی بات کر رہی ہوں۔ نورین نے اپنی ضرورت کا ذکر صفیہ خالہ سے کیا تھا۔ انھوں نے اپنی بہن رضیہ سے کہا اور اس طرح میں صفیہ خالہ کے پاس پہنچ گئی۔“

”گڈ......!“ میں نے فہمیدہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے، تم نورین کو اچھی طرح جانتی ہو؟“

”اچھی طرح تو نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”بس اتنا ہی جانتی ہوں کہ وہ چوتھے فلور کے فلیٹ نمبر چار سو چار میں رہتی ہیں اور انہیں ایک گھریلو ملازمہ کی ضرورت تھی۔“

”اس کا مطلب ہے، اس اپارٹمنٹ بلڈنگ میں داخل ہونے سے پہلے تمہیں یہ بات معلوم تھی کہ صفیہ خالہ نے تمہیں نورین کے کام کے لیے اپنے پاس بلایا ہے۔ وہ نورین جو چوتھے فلور کے فلیٹ نمبر چار سو چار میں رہتی ہے؟“

”جی...... جی ہاں۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

”اور جب تم صفیہ خالہ سے ملنے اس بلڈنگ کے چھٹے فلور کی طرف جا رہی تھیں تو تم نے ملزم فوزیہ کو نورین کے فلیٹ میں داخل ہوتے دیکھا تھا؟“

”جی بالکل...... میں نے دیکھا تھا۔“ اس نے ترت جواب دیا۔ ”اور مجھے اس بات پر حیرت بھی ہوئی تھی کہ فوزیہ یہاں کیا کر رہی ہے لیکن میں خاموشی سے صفیہ خالہ کی طرف بڑھ گئی تھی۔“

”اور جب صفیہ خالہ کے پاس بیٹھے تمہیں دس پندرہ منٹ ہوئے تھے تو نیچے ایک شور اٹھا۔ پھر پتا چلا کہ چوتھے فلور کے ایک فلیٹ میں کسی کو قتل کر دیا گیا ہے۔ تم صفیہ خالہ کے ہمراہ فوراً چوتھے فلور پر پہنچ گئیں۔ تب پتا چلا کہ قتل کی واردات نورین کے فلیٹ میں ہوئی تھی۔ نورین کے شوہر سفیان علی کو کسی نے قتل کر دیا تھا۔ تم نے چونکہ دس پندرہ منٹ پہلے فوزیہ کو نورین کے فلیٹ میں داخل ہوتے دیکھا تھا لہٰذا تمہارا ماتھا ٹھنکا اور تم نے اس سلسلے میں پولیس کی بھرپور راہنمائی کی جس کے بعد پولیس نے فوزیہ کو اس کے فلیٹ واقع طارق روڈ سے گرفتار کرلیا۔“ لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”حالات و واقعات کے بیان میں اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہو تو تم اس کی تصحیح کر سکتی ہو۔“

”نن...... نہیں۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”آپ نے جو کہا، ٹھیک کہا۔“

”فہمیدہ!“ میں نے انگلی سے اس کے چہرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔ ”کیا آپ نے یہ نظر کا چشمہ لگا رکھا ہے؟“

”جی!“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔

”دور کا یا نزدیک کا؟“

”دور کا۔“

”کیا آپ کے ساتھ یورک ایسڈ کا بھی کوئی مسئلہ ہے؟“ میں نے بڑی صفائی کے ساتھ اپنی جرح کو سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

”یورک ایسڈ...... یہ کیا ہوتا ہے؟“ اس نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

”یہ ایک خاص قسم کا کیمیکل ہے جس کی ایک خاص مقدار ہر انسان کے جسم میں موجود ہوتی ہے۔“ میں نے سادہ الفاظ میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”اس مخصوص مقدار میں اگر کسی قسم کی گڑبڑ ہو جائے یعنی کمی یا زیادتی ہو جائے تو انسان کے جوڑوں وغیرہ میں ورم آجاتا ہے اور چلنے پھرنے میں خاصی دشواری بلکہ تکلیف ہوتی ہے۔“

”جی ہاں...... جی ہاں...... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”میرے گھٹنوں کے ساتھ یہ مسئلہ ہے۔ ٹھنڈے موسم میں تو درد کی شدت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ چلنا پھرنا محال ہو جاتا ہے۔“

”خاص طور پر زینے چڑھنا تو کسی عذاب سے کم نہیں ہوتا۔“ میں نے سادہ سے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ”ہیں نا؟“

”جی بالکل!“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”جب آپ طارق روڈ پر کرائے کا فلیٹ لے رہی تھیں تو اس وقت بھی آپ نے یہ پوچھا تھا کہ وہ فلیٹ کس فلور پر ہے۔ آپ کو بتایا گیا کہ فلیٹ چوتھے فلور پر ہے تو آپ کو یہ سن کر اچھا نہیں لگا تھا لیکن اس وقت آپ کی مجبوری تھی لہٰذا آپ نے وہ فلیٹ لے لیا، حالانکہ دسمبر اور جنوری میں اچھی خاصی ٹھنڈک ہوتی ہے اور گھٹنوں کے درد کے ساتھ چوتھے فلور پر چڑھنا اور اترنا ایک عذاب ناک عمل ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”نہیں جناب! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ اس نے میرے موقف کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر مجبوری نہ ہوتی تو میں کبھی چوتھے فلور کا فلیٹ کرائے پر نہ لیتی۔“

”کیا آپ اپنی اس مجبوری کی وضاحت کریں گی؟“ میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

”وہ...... وہ...... وہ......“ وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔

”یہ کس قسم کی مجبوری ہے؟“ میں نے تیور بدل کر تیز لہجے میں پوچھا۔ ”وہ...... وہ...... وہ......!“

”وہ جی، میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ...... اس وقت نیچے کے کسی فلور پر مجھے اور کوئی فلیٹ مل نہیں رہا تھا اس لیے مجبوری میں چوتھے فلور کا وہ فلیٹ لے لیا۔“ وہ اپنی مجبوری کی وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”دوسری بات یہ کہ اوپر والے فلورز کا کرایہ بھی نسبتاً کم ہوتا ہے۔“

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تمہاری صفیہ خالہ کے فلیٹ کا کرایہ تو کافی کم ہوگا۔“ میں نے جرح کو اختتام کی طرف لاتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”وہ تو اسی بلڈنگ کے چھٹے فلور پر فلیٹ نمبر چھ سو دو میں رہتی ہیں۔“

”نہیں جی۔ ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

”پھر کیسی بات ہے؟“ میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔

”اول تو وہ فلیٹ صفیہ خالہ کی ذاتی ملکیت ہے۔ وہ کرائے دار نہیں ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”دوم، اس بلڈنگ میں لفٹ موجود ہے۔ لفٹ کی سہولت کی وجہ سے ہر فلور کے فلیٹس کی ویلیو ایک جیسی ہے۔“

”لفٹ کی یہ سہولت تمہارے لیے کسی نعمت سے کم نہیں ہوگی۔“ میں نے کہا۔ ”لفٹ کی مدد سے نیچے سے اوپر جاتے ہوئے تمہارے گھٹنوں کو بہت سکون محسوس ہوتا ہوگا؟“

”جی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”میں جب بھی صفیہ خالہ سے ملنے جاتی ہوں تو لفٹ کے ذریعے بڑی آسانی سے چھٹے فلور پر پہنچ جاتی ہوں۔“

”وقوعہ کے روز بھی تم لفٹ کے ذریعے ہی چھٹے فلور پر پہنچی تھیں؟“

”جی ہاں...... اس میں کیا شک ہے۔“ وہ حیرت آمیز لہجے میں بولی۔ ”مجھے تو کوئی شک نہیں البتہ آپ کے بیان سے وکیلِ استغاثہ کے لیے بہت بڑی مشکل کھڑی ہو سکتی ہے۔“

”کس قسم کی مشکل؟“ اس کا چہرہ شکن آلود ہو گیا۔

”آپ وکیلِ استغاثہ کی مشکل کا سوچ کر خود کو ہلکان نہ کریں۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”یہ وقت ہے خود کو بچانے کا۔ آپ ایک خونی دلدل میں گر چکی ہیں۔“

اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا، جھرجھراتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”میں نے کیا کیا ہے...... آپ کس دلدل کی بات کر رہے ہیں؟“

”اس خطرناک دلدل کا نام ہے ”لفٹ“۔ تم وقوعہ کے روز صفیہ خالہ کے فلیٹ تک لفٹ کے ذریعے ہی پہنچی تھیں نا؟“

”ہاں...... اور یہ بات میں آپ کو پہلے بھی بتا چکی ہوں۔“ وہ جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔

”دوبارہ بتانے سے معاملہ پکا ہو گیا۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”کون سا معاملہ؟“ اس کی الجھن پریشانی میں بدل گئی۔

”لفٹ کے ذریعے گراؤنڈ فلور سے سکس فلور تک پہنچنے کا معاملہ۔“ میں نے کہا۔ ”اس روز لفٹ میں تمہارے علاوہ اور کون تھا؟“

”کوئی بھی نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں اکیلی ہی تھی۔“

”کیا راستے میں کہیں لفٹ رکی تھی؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ”میرا مطلب ہے، کسی نے لفٹ کو کال کیا ہو۔ راستے میں کوئی لفٹ میں سوار ہوا ہو؟“

”بالکل نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

”یعنی اس روز تم اکیلی ہی لفٹ میں سوار ہو کر گراؤنڈ فلور سے سکس فلور تک پہنچی تھیں؟“

”ہاں...... ہاں...... ہاں!“ وہ روہانسی ہوگئی۔ ”یہ بات میں کتنی مرتبہ آپ کو بتاؤں؟“

”بس، اب مزید بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جتنا کچھ تم نے بتا دیا وہ تمہیں جیل کی دیواروں کے پیچھے پہنچانے کے لیے کافی ہے۔“

”جیل...... کیوں......“ وہ سراسیمہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔ ”میں نے کون سا جرم کیا ہے؟“

”غلط بیانی کا جرم۔“ میں نے زہرخند لہجے میں کہا۔ ”کسی کو غلط راہ پر ڈالنے کا جرم...... تمہارا ہر جرم بہت سنگین ہے۔“

”پتا نہیں، آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ وہ بکھری ہوئی آواز میں بولی۔ ”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

”جب حوالات کی سلاخوں کے پیچھے پہنچوگی تو تمہاری سمجھ بڑے اچھے انداز میں کام کرنے لگے گی۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ”تم استغاثہ کی ایک اہم گواہ ہو کہ نہیں؟“

”جی ہوں۔“ اس نے نحیف سی آواز میں جواب دیا۔

”صرف گواہ نہیں بلکہ عینی گواہ...... آئی وٹنس!“ میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم نے معزز عدالت کو حلفیہ بیان دیا ہے کہ وقوعہ کے روز جب تم اپنی صفیہ خالہ سے ملنے بہادرآباد کی اس اپارٹمنٹ بلڈنگ میں پہنچی تھیں تو

تم نے میری شوکل اور اس مقدمے میں ملزمہ فوزیہ کو اس بلڈنگ کے چار سو چار نمبر فلیٹ میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ تم نے یہی بیان دیا ہے نا؟"

"ج ...... جی ......" وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔

"کیا تم اس امر سے انکار کرسکتی ہو کہ فلیٹ نمبر چار سو چار چوتھے فلور پر واقع ہے؟"

"ظاہر ہے چار سو چار نمبر فلیٹ چوتھے فلور پر ہی واقع ہے۔" اس نے سرسری انداز میں جواب دیا۔ پھر امداد طلب نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھنے لگی۔

"وقوعہ کے روز تو تم بذریعہ لفٹ گراؤنڈ فلور سے سکس فلور تک پہنچی تھیں اور راستے میں لفٹ کہیں رکی بھی نہیں تھی۔" میں نے اسے گھورا۔ "پھر تم نے چوتھے فلور کے فلیٹ نمبر چار سو چار میں فوزیہ کو داخل ہوتے کیسے دیکھ لیا؟ کیا تم دیواروں کے پار دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہو؟"

میرا یہ حملہ اتنا کارگر تھا کہ اس کی ٹانگیں کپکپا کر رہ گئیں۔ میں نے اسے سنبھلنے کا ذرا موقع نہ دیا اور اس کے جواب دینے سے پہلے ہی سوال کردیا۔

"تم نے جھوٹ کیوں بولا ...... کس کے کہنے پر بولا؟"

وہ کٹہرے کی چوبی ریلنگ کو تھام کر گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ میں نے تابڑ توڑ حملوں کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ تم مقتول سفیان علی کی بیوہ نورین کو نہیں جانتی ہو۔ کبھی تمہاری اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "ایسا ہی ہے نا ......؟"

ان لمحات میں وہ مجھ سے آنکھ ملا کر بات نہیں کررہی تھی۔ کٹہرے کے فرش کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

"جی، میں نورین کو بالکل نہیں جانتی ......"

"اور کتنے جھوٹ بولوگی۔" میں نے دہاڑ سے مشابہ لہجے میں کہا۔ "تم نے طارق روڈ پر جو فلیٹ کرائے پر لیا ہے اس کا ڈپازٹ نورین کے اکاؤنٹ سے ادا کیا گیا ہے۔ اگر تم نورین کو نہیں جانتی ہو تو پھر اس کے اکاؤنٹ کا چیک تم نے ڈپازٹ میں کیوں دیا؟"

اس کی ہمت جواب دے گئی۔ "پ ...... پانی ......"

اس کی زبان سے بس یہ الفاظ ادا ہوئے پھر وہ کٹہرے کے فرش پر بیٹھ کر آنسو بہانے لگی۔

صورتِ حال روزِ روشن کی طرح عیاں ہوچکی تھی۔ استغاثہ کی سب سے اہم گواہ کی عینی شہادت کا نہ صرف بھانڈا پھوٹ چکا تھا بلکہ میری جرح کے نتیجے میں یہ بھی ثابت ہوگیا تھا کہ فہمیدہ کا نورین کے ساتھ گہرا ربط ضبط تھا۔

"جناب عالی!" میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ سفیان علی کے قتل میں بالواسطہ یا بلاواسطہ فہمیدہ ملوث ہے۔ معزز عدالت سے میں درخواست کروں گا کہ فہمیدہ کو شاملِ تفتیش کیا جائے تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوسکے۔ دیٹس آل یور آنر ......"

جج نے فوری طور پر متعلقہ عدالتی عملے کو فہمیدہ کی گرفتاری کا حکم دیا پھر اس کیس کے انکوائری آفیسر کو ہدایت کی کہ وہ آئندہ پیشی پر فہمیدہ سے ہونے والی تفتیش کی رپورٹ کے ساتھ ہی نورین کو بھی عدالت میں پیش کرے۔

اس کے بعد عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا۔

☆☆☆

جب کوئی شخص ٹھوس ثبوت کے ساتھ پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا ہے تو پھر اس سے اقبالِ جرم کرانے میں پولیس کو چنداں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ فہمیدہ نے ایک ہی رات میں زبان کھول دی تھی۔ وہ میری جرح کے جواب میں اس بری طرح گھر گئی تھی کہ اس کے پاس فرار کا کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ گویا میرے سوالات نے اس کے جھوٹ کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی تھی۔

فہمیدہ کے بیان سے پتا چلا کہ نورین نے اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا تھا۔ وہ سفیان کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا چکی تھی۔ اس کا دکھ بھی فوزیہ کے دکھ جیسا ہی تھا لیکن وہ فوزیہ سے زیادہ چالباز اور جوشیلی نکلی اور اس نے اپنے منصوبے کی تکمیل کے لیے ایک خاص پلاننگ کے تحت فہمیدہ کو طارق روڈ والے فلیٹ پر بسایا تھا کہ اس واردات کا ایک عینی شاہد پیدا کیا جاسکے۔ نورین، فوزیہ سے بھی نفرت کرتی تھی۔ لہٰذا اپنی سوتن کو سبق سکھانے اور قتل کی اس واردات میں پھنسانے کے لیے اس نے نرگس بن کر فوزیہ کو فون کیا اور اسے اپنے فلیٹ پر بلالیا۔ فوزیہ اپنی سادگی کے باعث نورین کے جال میں آگئی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کی تفصیل آپ جان چکے ہیں۔

سفیان علی کو نورین ہی نے سائلنسر لگے ریوالور سے قتل کیا تھا لیکن نورین کی گرفتاری کے لیے پولیس کو کافی پاپڑ بیلنا پڑے تھے۔ جیسے ہی نورین کو پتا چلا کہ فہمیدہ پولیس کی گرفت میں آگئی ہے، وہ منظر سے غائب ہوگئی تاہم دس پندرہ دن کی تلاش کے بعد آخر کار پولیس نے نورین کو راولپنڈی سے گرفتار کرلیا۔ اپنی تحویل میں لانے کے بعد جب پولیس نے اس پر سختی کی تو اس نے سفیان کے قتل کا اقرار کرلیا۔

(تحریر: حسام بٹ)

پکارا

سلیم انور

کچھ منظر انسان اپنی سوچوں میں ترتیب دے لیتا ہے اور خود ہی ان کے معنی بھی نکال لیتا ہے مگر ہائے ری قسمت... نہ منظر حقیقی ہوتا ہے اور نہ ہی معنی حسبِ خواہش ہوتے ہیں، ایسے میں انسان گھن چکر بن جائے تو عجب کیا... اس کے پیروں میں بھی کچھ ایسا ہی چکر تھا جسے پورا کرنا لازم تھا۔

کانوں کی سماعت کو چونکانے والی ہونٹوں کی جنبش کا احوال

یہ واقعہ گزشتہ رات پیش آیا تھا۔

میں فلورنس کو لینے کے لیے ریلوے اسٹیشن جارہی تھی۔ اس کی ٹرین کی آمد کا وقت گیارہ بجے کا تھا اور وہ بارہ گھنٹے سے ٹرین میں سفر کررہی تھی۔ وہ اس ٹرین کے انتظار میں تین گھنٹے تک لیورپول اسٹریٹ میں بیٹھی رہی تھی۔ صرف اس لیے کہ اس ٹرین کا ٹکٹ سب سے سستا تھا۔

بیٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔

میں اسٹیشن سے پہلے سگنل پر دائیں جانب مڑنے

کے لیے رکی ہوئی تھی جب وہ کار میری کار کے برابر میں آکر رک گئی۔ میں نے ایک اچٹتی نگاہ اپنی بائیں جانب ڈالی تو اتنے میں مڈل لین کی ٹریفک لائٹ سبز ہوگئی۔ پھر جوں ہی میرے برابر والی کار نے رفتار پکڑی تو میں نے دیکھا کہ اس کار کی عقبی نشست پر بیٹھی ہوئی عورت نے منہ کھول کر میری طرف دیکھتے ہوئے پکارا۔ ''ہیلپ!'' چونکہ کار کا شیشہ چڑھا ہوا تھا، اس لیے مجھے اس کی آواز سنائی نہیں دی۔ البتہ اس کے ہونٹوں کی جنبش سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ اس نے مجھے مدد کے لیے پکارا ہے۔

میں ایک لمحے کے لیے سراسیمہ ہوگئی۔ میری کار داہنی لین میں تھی اس لیے میں اس کار کے پیچھے سیدھی نہیں جاسکتی تھی۔ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں داہنی جانب اسٹیشن کی طرف مڑ جاؤں۔ میں نے ناچار اپنی کار ریلوے اسٹیشن کی جانب گھمادی۔

لیکن اسٹیشن کے سامنے پہنچ کر مجھے احساس ہوا کہ فلورنس کی ٹرین کی آمد میں ابھی وقت ہے۔ تب میں نے اپنی کار تیزی سے گھمائی اور اس کار کے تعاقب میں روانہ ہوگئی۔ میں اس عورت کی مدد کرنا چاہتی تھی۔

کچھ دیر کے بعد مجھے اس کار کی جھلک نظر آگئی۔ وہ ڈیملر کار تھی جو مجھ سے کچھ فاصلے سے آگے جارہی تھی۔ درمیان میں تین چار کاریں موجود تھیں۔ ڈیملر کار نگاہوں میں آئے بغیر نہیں رہ سکتی...... حتیٰ کہ مجھ جیسی کی نظروں سے بھی نہیں جو کاروں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔

اس کے علاوہ رات کے اس وقت سڑکوں پر زیادہ ٹریفک بھی نہیں تھا۔ مجھے ڈیملر کا تعاقب کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔ وہ ڈیملر نارِدچ کی عقبی سڑکوں پر پارک کی ہوئی گاڑیوں کے درمیان سے، پتلی گلیوں اور تنگ راستوں سے گزرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

ایک موقع پر تو وہ ایک پتھریلی سڑک پر بھی آگئی۔ مجھے یوں لگنے لگا جیسے ہمارا یہ سفر ہمیشہ جاری رہے گا۔

بالآخر ڈیملر ایک تین منزلہ وکٹورین ولا کے سامنے جا کر رک گئی۔ اس سڑک پر تمام وکٹورین ولا تین منزلہ بنے ہوئے تھے۔

میں اتنی احمق نہیں تھی کہ ان تک رسائی کرتی...... البتہ میں فاصلے پر رک کر انہیں دیکھتی رہی۔ کار سے چھ فٹ چار انچ قامت کا ایک تگڑا شخص نیچے اترا۔ اس کے ساتھ سنہری زلفوں والی وہ نازک اندام عورت بھی تھی جسے وہ دھکیلتے ہوئے ولا کے داخلی دروازے کی جانب لے جانے لگا۔ اس نے اپنے بازو اس عورت کے شانوں پر رکھے ہوئے تھے اور اسے اس مضبوطی سے خود سے چمٹایا ہوا تھا کہ اس عورت کے پاس راہِ فرار اختیار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ پھر میں نے پوری احتیاط کے ساتھ اس مکان کا نمبر اور سڑک کا نام اپنے پاس نوٹ کیا اور... پولیس کو فون کر دیا۔

فون کال جس کانسٹیبل نے وصول کی، وہ کوئی گاؤدی ٹائپ کا پولیس مین تھا۔ اسے میری بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ ''آپ کے نام میں دو ''ٹی'' آتے ہیں یا ایک؟'' اس نے پوچھا۔

جس کسی نے بھی خاندانی نام ''اسکاٹ'' سنا ہوگا، کیا یہ نہیں جانتا ہوگا کہ اس نام میں کتنے ''ٹی'' آتے ہیں؟ پھر اپنے پتے کی اسپیلنگ بھی لاحاصل بن گئی۔ اس لیے کہ پولیس کے صوتی الفاظ میں ''کریسنٹ'' کے ہجے آسان ثابت نہیں ہوئے جبکہ میں صرف ٹینگو، ایکو، رومیو اور جولیٹ کے علاوہ کسی اور ریڈیائی پیغام رسانی کے حروف سے واقف نہیں تھی۔

بالآخر میں اپنی بیٹی کو لینے کے لیے واپس ریلوے اسٹیشن کی جانب چل پڑی بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ میں نے واپسی کی کوشش شروع کر دی لیکن چونکہ میں نارِدچ کے اس علاقے میں پہلے کبھی نہیں آئی تھی تو بے بسی کی کیفیت میں یہاں گم ہوگئی۔

میرے پاس نہ تو کوئی نقشہ تھا اور نہ ہی جی پی ایس سسٹم!

مجھے جیسے صدیاں بیت گئیں۔ میں اِدھر اُدھر سڑکوں اور گلیوں میں کار گھماتی رہی، بھٹکتی رہی...... بالآخر کسی نہ کسی طرح ریلوے اسٹیشن پہنچ گئی۔

فلورنس کا منہ بری طرح پھولا ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مجھ پر گرجنا شروع کر دے گی۔ جب میں نے اسے پیار کرنا چاہا تو اس نے اپنا منہ دوسری جانب پھیر لیا۔ اس نے اپنے مختلف بیگ کار کی عقبی نشست پر پٹخ دیے اور خود سے اپنی نشست پر بیٹھ گئی۔

جب میں نے اسے تفصیل بتائی کہ کیا واقعہ پیش آگیا تھا تو اس نے شانے اچکاتے ہوئے اپنی آنکھیں یوں گھمائیں جیسے اس دنیا میں مجھ سے بڑا احمق کوئی اور نہیں ہوگا۔

ہوں! میں نے دل ہی دل میں کہا۔ اگر کسی کی زندگی بچانے کی خاطر میں نے اسے چند منٹ انتظار کرادیا تو اس میں آگ بگولا ہونے کی کیا بات ہے؟ اوکے، چند منٹ نہ سہی پون گھنٹا ہی سہی! تو اس میں کون سی آفت آگئی؟

☆☆☆

اگلے روز صبح پولیس ہمارے دروازے پر آگئی۔

انہوں نے مجھے سنہری زلفوں والی اس نازک اندام عورت کی تصویر دکھاتے ہوئے پوچھا کہ کیا میں اسے جانتی ہوں؟

میں نے تصویر کا بغور جائزہ لیا اور تصویر واپس کرتے ہوئے بولی۔ ''نہیں۔ میں نے گزشتہ شب سے پہلے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا!''

''یہ تو بڑی عجیب سی بات ہے، میڈم!'' پولیس افسر نے کہا۔

''وہ کیسے؟''

''اس لیے کہ وہ آپ کو جانتی ہے۔''

''کیا؟''

''اس کا کہنا ہے کہ تین ہفتے قبل ایک ڈنر ڈانس پارٹی میں آپ کی اس سے ملاقات ہوئی تھی۔''

اوہ لارڈ!

اور تب مجھے سب کچھ یاد آگیا۔ ہم سب ایک گول سی بڑی میز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں تھوڑا سا چیا پا نا بھی رہا تھا۔ وہ بڑی پُرلطف محفل رہی تھی۔ ہم سب خوب لطف اندوز ہوئے تھے۔ خاص طور پر اس پیارے سے جوڑے نے تو ہم سب کو خوب ہنسایا تھا۔

لیکن میں اب بھی ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔

''تو پھر اس نے مجھ سے ''ہیلپ'' کے لیے کیوں کہا تھا؟'' میں نے... پولیس افسر سے کہا۔ ''وہ کیا مدد چاہ رہی تھی؟''

میری اس بات پر وہ پولیس افسر مسکرا دیا۔ یہ ہمدردی اور طنز کی ملی جلی مسکراہٹ تھی۔

''لگتا ہے کہ آپ لب شناسی سے ناواقف ہیں...... ہیں نا؟ آپ کو ہونٹوں کی جنبش سے بات کو سمجھنا نہیں آتا!''

''کیا مطلب؟''

''اس نے حقیقت میں ''ہیلپ'' نہیں بلکہ آپ کو ''ہیلو'' کہا تھا۔ وہ اس ڈنر ڈانس پارٹی کے حوالے سے آپ کو پہچان گئی تھی۔ چونکہ ٹریفک سگنل گرین ہو چکا تھا اس لیے وہ صرف ''ہیلو'' ہی کہہ پائی جسے آپ نے ''ہیلپ'' سمجھا!''

اس موقع پر فلورنس بھی وہاں آچکی تھی لیکن پولیس افسر کی بات سن کر بھی وہ قطعی متاثر نہیں ہوئی۔ اس نے ایک بار پھر شانے اچکاتے ہوئے اپنی آنکھیں یوں گھمائیں جیسے حقیقت میں اس دنیا میں مجھ سے بڑا احمق کوئی اور نہیں ہوگا۔

ظرافت

ایک فقیر ایک گھر کے پاس آواز لگا رہا تھا۔

''کوئی بابا کو روٹی کھلا دو، بابا رائس بھی کھالیتا ہے۔

...... بابا آئس کریم بھی کھالیتا ہے۔

...... بابا برگر بھی کھالیتا ہے۔

...... بابا سینڈوچ بھی کھالیتا ہے۔''

گھر کے اندر سے آواز آئی ''بابا جوتے بھی کھالیتا ہے؟''

بابا۔ ''سخت غذا منع ہے۔''

٭٭٭٭

ایک کالی لڑکی کو جادوگر نے جادو سے پر لگا دیے۔

لڑکی۔ ''واؤ کیا اب میں پری بن گئی ہوں؟''

جادوگر۔ ''نہیں پگلی تم اب ڈینگی مچھر بن گئی ہو۔''

٭٭٭٭

سردار پولیس اسٹیشن میں تصویریں دیکھ کر بولا۔ ''یہ تصویریں کن لوگوں کی ہیں؟''

پولیس آفیسر۔ ''کرمنل لوگوں کی جن کو گرفتار کرنا ہے۔''

سردار۔ ''تو جب کھینچی تھی وہیں پکڑ لیتے۔''

٭٭٭٭

سردار۔ ''P.C.O. کے اندر گیا جیب سے موبائل نکالا اور بات کر کے باہر آگیا۔''

آدمی۔ ''سردار جی موبائل سے بات کرنی تھی تو P.C.O. میں کیوں گئے؟''

سردار۔ ''دوست نے کہا تھا P.C.O. سے کال کرنا پیسے کم لگیں گے۔''

مرسلہ: رضوان تنولی کریڈوی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

محفلِ شعر و سخن

❋ زاہد چودھری ...... چھور کینٹ
فراقِ یار قیامت سے کم نہیں عدم
نہ دن کو چین نہ راتوں کو نیند آتی ہے

❋ محمد کمال انور ...... نارتھ کراچی، کراچی
ردائے خاک نہیں آسمان ہے یہ بھی
کبھی کبھار تو ہوتا گمان ہے یہ بھی
میں اپنی ذات کے اندر بھی جھانک لیتا ہوں
کہ حیرتوں سے بھرا اک جہان ہے یہ بھی

❋ محمد اکبر ناتج ...... لودھراں
جس کی آنکھیں مجھے اندر سے بھی پڑھ سکتی ہوں
کوئی چہرہ تو میرے شہر میں ایسا لادے

❋ اظہر حسین پیچار ...... ہزاری، جتوئی
مجھے بھی شوق تھا نت نئے چہروں کی دید کا
رستہ بدل کے چلنے کی عادت اسے بھی تھی

❋ محمد خواجہ ...... کورنگی، کراچی
کتنی معصوم، نازک ہو، حماقت نہ کرو
بارہا تم سے کہا تھا کہ محبت نہ کرو

❋ طالب حسین طلحہ ...... نیو سینٹرل جیل، ملتان
ہر جذبہ اصول رہا جبر کا قیدی
ہر جسم میں بکھرا ہوا انسان رہا ہے
فطرت کے حسیں جذبوں کی آزادی کا سوچیں
ہر شخص کے اندر بھی تو زندان رہا ہے

❋ ایم کامران خالد ...... جھبپ
کرو کچھ رحم میری التجا پر، میری آہوں پر
اٹھو، بولو، ہنسو، دیکھو میں صدقے ان نگاہوں پر

❋ محمد عقیل چٹھہ ...... حافظ آباد
روح کے اندر گرانی بھی نہیں
اور دریا میں روانی بھی نہیں
میرے اندر ایک مجھ سا آدمی
مر رہا ہے اور فانی بھی نہیں

❋ عاطف شاہین ...... اڈہ اروتی
چلو یہ بات ستارہ شناس سے پوچھیں
کہیں نصیب میں اپنے وصال ہے کہ نہیں

❋ عتیق الرحمٰن ...... فیصل آباد
ہار جاتا میں خوشی سے کہ وفا کا تھا سوال
جیت جاتی وہ اگر شرط لگاتی مجھ سے

❋ اعجاز احمد راحیل ...... ساہیوال
مسندِ عشق ہماری ہے نہ وحشت اپنی
کون چلنے دے سرِ دشت حکومت اپنی
اپنے جیسا کوئی انسان تو ملنے سے رہا
میں بھلا کس پہ جتاؤں گا محبت اپنی

❋ حاجی محمد زاہد اقبال زرگر ...... نئی منڈی سانگھڑ
بادل سے کھیلتی رہیں اونچی عمارتیں
بجلی بھی گری تو شہر کے کچے مکان پر

❋ روبینہ اشرف ...... لاہور
مری وحشت علاجِ غم ہوئی ہے
کہ رونے سے اذیت کم ہوئی ہے
ہنسی آتی ہے اپنے آنسوؤں پر
کہ یہ برسات بے موسم ہوئی ہے

❋ محمد زاہد ...... گوجرانوالہ
مری جگہ پہ کوئی اور ہو تو چیخ اٹھے
میں اپنے آپ سے اتنے سوال کرتا ہوں
اگر ملال کسی کو نہیں ہرا نہ سہی
میں خود بھی کون سا اپنا ملال کرتا ہوں

❋ جنید احمد ملک ...... گلستان جوہر، کراچی
تب کہیں لوگ کھلے ہیں ہم پر
ان سے جب کام ہمارا نکلا
وہ بھی نکلا نہیں گھر سے اپنے
چاند بھی پھر نہ دوبارہ نکلا

❋ ایم عثمان انصاری ...... چوآسیدن شاہ (موہڑہ)
ہوتا تھا ان کے ایک تبسم پہ روز قتل
بے ساختہ ہنسے تو قیامت ہی آگئی

❋ مہرین ناز ...... حیدرآباد
وہ ہزار مجھ سے جدا رہے میرے دل سے پھر بھی جدا نہیں
وہی اپنی طرزِ وفا رہی، وہی ان کی مشقِ جفا رہی

❋ کہکشاں فاروق ...... ساہیوال
یہ بادل جس جگہ سایہ کریں گے
وہاں ہم دھوپ لے جایا کریں گے
اگر حد سے بڑھے گی یہ خموشی
تو ہم بھی چیخا چلایا کریں گے

❋ محمد اقبال ...... کورنگی، کراچی
اب کشتیوں پہ کس کو بچانے چلے ہو تم
ساحل کے آس پاس تو گھر بھی نہیں رہے

❋ ریاض بٹ ...... حسن ابدال
آگ لہجے نے ہی جلائی ہے ہمیشہ
لفظ کبھی آتش فشاں نہیں ہوتے

❋ زوہیب احمد ملک ...... گلستان جوہر، کراچی
پیار کی جوت سے گھر گھر ہے چراغاں ورنہ
ایک بھی شمع نہ روشن ہو ہوا کے ڈر سے

❋ بلقیس بانو ...... نواب شاہ
زندگی ہاتھ نہ آئی میرے
اور میں ہاتھ بڑھاتا ہی رہا
جب تلک پاؤں کے نیچے تھی زمیں
آسماں سر پہ اٹھاتا ہی رہا

❋ جہانزیب احمد ...... سرگودھا
یہ دنیا بے سر و سامان میری
کہاں ہے زندگی آسان میری
یہ کیسا خواب آیا ہے اچانک
ہوئی ہے آنکھ بھی حیران میری

❋ دانش عمیر ...... گلستان جوہر، کراچی
دل کی دنیا پر حکومت ہو کسی کی
ہاں اجارہ تو ہمارا ہی رہے گا
جس سمندر کے کنارے پر کھڑے ہیں
وہ کنارہ تو ہمارا ہی رہے گا

❋ رضوان تنولی کریڑوی ...... اورنگی ٹاؤن، کراچی
زہر پہلے تمہیں عطا کردو
پھر تم آبِ حیات پی لینا

❋ محمد اشفاق سیال ...... شورکوٹ سٹی
نرم لفظوں سے بھی لگ جاتی ہیں چوٹیں اکثر
دوستی اک بڑا نازک سا ہنر ہوتی ہے

❋ شبانہ حسن ...... لاہور کینٹ
اے زندگی ہمیں توڑ کر ایسے بکھیرو اب کی بار
نہ خود کو جوڑ پائیں ہم نہ پھر سے توڑ پائے کوئی

❋ دلنشین ...... کراچی
تم نے تعبیر بتا دی ہم کو
ورنہ ہم خواب ہی ڈھوئے جاتے
اب کسی پیڑ کی صورت ہوتے
ہم اگر خاک میں بوئے جاتے

❋ احمد حسن عرضی خان ...... قبولہ شریف باقی پاس
آیا نہ ایک بار بھی عیادت کو وہ مسیحا
سو بار ہم نے فریب سے بیمار ہو کے دیکھا

❋ زوبیہ صدیق ...... لالہ موسیٰ
فریبِ نظر کے صحرا تجھے پار کیسے کرتے؟
ہر سو سراب اور ہم تھے بھی پا پیادہ

❁ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان.....خورشید عباس
موت آئی نہ ہو مرے ذوقِ امید کو
محرومیوں میں کیف سا پانے لگا ہوں میں

❁ صابر علی.....عزیز آباد، کراچی
قرض تیرا کردوں بے باق لیکن یہ تو سوچ
پھر بھلا کیا تیرا میرا واسطہ رہ جائے گا

❁ ادریس احمد خان.....ناظم آباد، کراچی
اس غم کدے میں کٹ گئی یوں اپنی زندگی
قیدی پہ جیسے گزر جائے روزِ عید کا

❁ ڈاکٹر ناہید شیخ.....سرگودھا
تیری الفت کے طریقوں کو بڑی دیر سے سمجھا ظالم
میرے ارمان جلا کے دل کی بستی اجاڑ دی تو نے

❁ امتیاز علی.....سرگودھا
محبت کے جہانوں میں بھی دستور ہوتا ہے
دوبارہ عشق کی بازی یہاں کھیلی نہیں جاتی

❁ رمضان پاشا.....گلشن اقبال، کراچی
گو ہم سے بھاگتی رہی یہ تیز گام عمر
خوابوں کے آسرے پہ کٹی ہے تمام عمر

❁ محمد قدرت اللہ نیازی.....حکیم ٹاؤن، خانیوال
آج بھی میری عادتوں میں شامل ہے
تیرے کوچے سے ہوکر گھر جانا

❁ محمد اسلم.....تحصیل و ضلع خانیوال
بھول جانا اور بھلا دینا فقط اک وہم ہے
دلوں سے کب نکلتے ہیں محبت جن سے ہو

❁ ریما رضوی.....برطانیہ
تیری قربت سے دور ہوتے ہی
میں نے دوری قریب سے دیکھی ہے

❁ راجہ افتخار علی انی.....چوآسیدن شاہ (موہڑہ)
آج کی بارش بھی تیرے درد کی طرح ہے
ہلکی ہلکی ہے پر ہوتی جارہی ہے

❁ محمد نعمان ندیم.....صدر، کراچی
ہیں ناں میرے خواب جھوٹے دوست
جب بھی دیکھا تجھے اپنے ساتھ دیکھا

❁ احمد خان.....راولپنڈی
وہ کہتا تھا کہ پتھر دل لوگ رویا نہیں کرتے
اسے کیا خبر کہ چشمے ہمیشہ پتھروں سے نکلا کرتے ہیں

❁ مدحت.....کراچی
میرے وجود کی جاگیر اس نے مانگی ہے
عجیب خواب کی تعبیر اس نے مانگی ہے

❁ امتیاز احمد.....ملیر، کراچی
ان کی خوشبو نہیں جاتی گھر سے
ایک مدت ہوئی مہمان گئے

❁ جبران احمد ملک.....گلشن اقبال، کراچی
آج خزاں کی زد میں آئے ہیں تو ہمیں یاد آیا ہے
کل تک ہم بھی صف میں کھڑے تھے مہکے ہوئے گلزاروں کی

❁ محسن علی، عتیق الرحمٰن، اسد عباس.....فیصل آباد
وہ کہہ رہی تھی سمندر نہیں ہے آنکھیں ہیں
میں ڈوب گیا ان میں اعتبار کرتے ہوئے

❁ وقار حسن.....کراچی
نہ سائبان مجھے دھوپ سے بچاتا ہے
نہ دھوپ سر پہ اترتی ہے سائبان کی طرح

❁ عمران علی.....راولپنڈی
زندگی کم نہیں سزا سے مجھے
اب نکلنا ہے اس فضا سے مجھے

❁ قادر بخش.....کراچی
یہ کیسی رُت پلٹ آئی ہے مجھ میں
کہ سب منظر بکھرتے جارہے ہیں

❁ امبر علی.....حیدرآباد
تو نے رکھا نہیں خیال میرا
ورنہ ہوتا نہ ایسا حال میرا

نام : ....

پتا : ....

دعا

ڈاکٹر شیر شاہ سید

چاہت کسی بھی روپ میں ہو اللہ کو بے حد پسند ہے بہ شرطیہ کہ پُرخلوص ہو اور ایسی محبتیں دورِ حاضر میں چیدہ چیدہ ہی دیکھنے کو ملتی ہیں... ان کا جوڑا بھی کچھ ایسی ہی مثال پیش کرتا تھا کہ ایک دوسرے سے زندگی کی شراکت کرنے والے غربت و بے بسی کے طوفانوں کے باوجود ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھے۔

مقدر سے لڑنے والے ایک بے مثال جوڑے کی بے کسی کا ماجرا

اٹھارہ سال سے وہ میری مریضہ تھی۔ ہر بار کچھ مہینوں کے بعد اس کا شوہر اسے لے کر آجاتا، اسے دیکھتے ہی مجھے سخت تکلیف ہوتی۔ اندر بہت اندر جیسے کچھ ٹوٹ پھوٹ جاتا۔ گلے میں خشکی سی ہوتی اور دل زور زور سے دھڑکنے لگتا۔ یہ سمجھتے، جانتے بوجھتے ہوئے بھی کہ میں نے اپنی سی پوری کوشش کرلی تھی۔ جو کچھ ہوسکتا تھا، جو ممکن تھا، کسی طرح سے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی میں نے۔ اسے دیکھ کر اپنی ناکامی، اپنے فن کی ناکامی، سائنس کی ناکامی، طب کی دنیا

میں ہوتی ہوئی ترقی کی ناکامی اور سرجری کے ذریعے کیے جانے والے بعض عجیب و غریب آپریشنوں کی کامیابی کے باوجود اپنی سرجری کی ناکامی کا شدید احساس ہوتا تھا مجھے۔

وہ نازک سا دبلا پتلا لمبے قد کا بڑا سادہ سا انسان تھا۔

بہت سالوں پہلے وہ اپنی بیوی کو لے کر میرے پاس آیا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب! بڑی دور سے آپ کا نام سن کر آیا ہوں۔ میری بیوی کا علاج کرنا ہوگا آپ کو۔ بڑی امیدیں لے کر آیا ہوں آپ کے پاس، اسے ٹھیک کردیں، اچھا کردیں۔ اس کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی مجھ سے۔ میں سب کچھ بیچ دوں گا اس کے لیے۔ جو کچھ بھی میرے پاس ہے، خادم بن جاؤں گا آپ کا۔ ساری زندگی احسان نہیں بھولوں گا۔ بس اسے صحیح کردیں آپ۔ بڑی مہربانی ہوگی آپ کی۔"

وہ نہ جانے کیا کیا بولتا چلا جارہا تھا کہ میں نے اسے اشارے سے روکا اور کہا کہ بھائی، پہلے بیٹھ تو جاؤ پھر آپ کی بات سنوں گا۔

وہ دونوں میرے سامنے پڑی ہوئی بینچ پر بیٹھ گئے تھے۔ کملائے ہوئے، بے کس بے بس چہرے۔ اداس آنکھوں سے درد بہتا ہوا۔ مجھے آج تک ان دونوں کی وہ تصویر نہیں بھولی تھی۔

"جی بی بی اپنا نام پتا اور شکایت بتائیں۔" میں نے اس سے ہسٹری لینی شروع کی تھی۔

اس کا نام بانو تھا، شوہر کا نام غلام حسین اور وہ نیو کراچی سے آئی تھی۔ اس کے چار بچے تھے۔ تین بیٹے اور ایک بیٹی۔ چوتھے بیٹے کی پیدائش کے بعد یہ مسئلہ شروع ہوا تھا۔ بیٹا تو مرا ہوا پیدا ہوا۔ اس کی شکل بھی نہیں دیکھ سکی تھی وہ۔ صرف اس ننھے سے جسم کو محسوس کیا تھا اس نے۔

سب بچے گھر میں ہوئے تھے، دائی خدیجہ کے ہاتھوں۔ اس نے آہستہ آہستہ بتانا شروع کیا۔ "اس حمل میں بھی چھ مہینے گزرنے کے بعد میں نے دائی خدیجہ کو گھر بلایا تھا۔ اس نے دیکھا پھر کہا شاید میرا حساب غلط ہے، بچہ چھ مہینے کا نہیں سات مہینے کا لگ رہا تھا۔ اس نے کہا کہ شاید لڑکا ہوگا۔ سب کچھ ٹھیک تھا، ڈاکٹر صاحب سب کچھ ٹھیک، کوئی شکایت نہیں تھی مجھے۔ جیسے پہلے حمل ٹھہرے ویسا ہی حمل تھا وہ بھی۔ میں نے تو کم از کم یہی سوچا تھا اس وقت۔ پہلے بھی چار بچے گھر میں ہوچکے تھے، دائی خدیجہ کے ہاتھوں، یہ بھی ہوجائے گا۔ کون سی بڑی بات تھی۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی جیسے کچھ سوچ رہی ہو پھر سوچتے سوچتے ذرا رک کر آہستہ آہستہ پھر سے بولنا شروع کیا۔ "مگر ایسا ہوا نہیں۔ اس دفعہ کچھ گڑبڑ تھی، میرے حساب سے پہلے درد شروع ہوگئے۔ میں نے توجہ نہیں دی کہ اس طرح کے درد تو ہوتے ہی ہیں۔ مگر ڈاکٹر صاحب اس دفعہ درد بڑے خراب تھے، اتنے شدید تو کبھی بھی نہیں ہوئے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی چاقو سے ...... اندر ہی اندر میرے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے کاٹ رہا ہے۔

"دائی خدیجہ نے دیکھا۔ تسلی دی پھر کہا کہ چار پانچ گھنٹوں میں بچہ ہوجائے گا، فکر کی بات نہیں ہے۔ اصلی کے دو گرم گرم چمچے مجھے پلائے اور کہا کہ ذرا انتظار کرنا پڑے گا۔ پھر سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا، فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔

"انتظار بہت طویل ہوگیا، چار گھنٹے، آٹھ گھنٹے میں اور آٹھ گھنٹے، سولہ گھنٹوں میں اور پھر صبح سے شام ہوگئی۔ مجھے لگتا تھا کہ اس دفعہ میری جان چلی جائے گی۔ اپنے بچوں کو اکیلا چھوڑ کر اس دنیا سے میں چلی جاؤں گی۔ عورتیں تو بچہ جننے میں مرہی جاتی ہیں۔ میری خالہ کی بڑی بیٹی مرگئی۔ میری ماں کی سب سے چھوٹی بہن بھی زچگی کے دوران مرگئی تھی، میں بھی اب نہیں بچ سکوں گی۔ درد کے آنسوؤں کے ساتھ یہ سوچ کر میں بری طرح روتی کہ میرے بچے اکیلے رہ جائیں گے۔ کون دیکھے گا انہیں، کون کراچی کی گرمی میں لو سے بچائے گا۔ کون انہیں اسکول بھیجے گا، کون رات کو سلائے گا، سردی میں ان کے ٹھٹھرتے ہوئے جسم پر چادر ڈالے گا، ڈاکٹر صاحب سخت درد کے باوجود میں نے دل ہی دل میں دعا کی تھی کہ میرے اللہ میرے مالک بچالے مجھ کو۔ میرے بچوں کے لیے بچالے مجھ کو۔ کیا کمی ہے تیرے پاس۔ ایک جان بچ جائے گی تو کیا فرق پڑے گا۔ میں بچ گئی تھی، بڑی جدوجہد کے بعد دائی خدیجہ نے میرا پانچواں بچہ پیدا کرلیا، میری جان بچ گئی مگر وہ مرا ہوا پیدا ہوا تھا۔

"مجھے تو اندازہ بھی نہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا، میں تو اتنی نڈھال تھی کہ مجھے ہوش ہی نہیں رہا کہ کیا کچھ ہوچکا تھا میرے ساتھ۔ مجھے اس وقت کا صرف اتنا ہی یاد ہے کہ دائی خدیجہ نے مجھ سے سرگوشیوں میں کہا کہ میرا مرا ہوا بچہ پیدا ہوا ہے، پھر میں سوگئی اور نہ جانے کب تک سوتی رہی تھی۔

"زچگی کے بعد کے چھ سات دن بڑے بوجھ بنا گزرے، ایک میری تھکن پھر میرا غم۔ وہ میرا بچہ میرا بیٹا جو مرگیا مجھے یاد آتا رہا، خدا صبر دیتا ہے۔ مجھے بھی صبر آگیا۔ میں نے بھی اپنے آپ کو تسلی دی کہ شاید میرے بچے نے اپنی جان کا نذرانہ دے کر مجھے بچالیا ہے تاکہ میں اپنے

بچوں کو اپنے سائے میں بڑا کرسکوں، انہیں پالوں، بڑا کروں، اپنے شوہر کی خدمت کروں۔

"مگر ڈاکٹر صاحب! وہ آٹھواں نواں ہی دن تھا جب یکایک مجھے احساس ہوا کہ میرے جسم سے مسلسل پیشاب بہہ رہا ہے۔ صبح اٹھی تھی تو تمام بستر تر تھا، کمرے میں پیشاب کی بدبو کا احساس سب سے پہلے میرے شوہر کو ہی ہوا اور اب گزشتہ آٹھ سال سے میرا اپنے پیشاب پر کوئی اختیار نہیں ہے۔ آپ کے اسپتال کا نام سن کر ہم لوگ آئے ہیں، آپ لوگ اس بیماری کا آپریشن کرکے علاج کرتے ہیں، میرا بھی علاج کریں ڈاکٹر صاحب!" اس نے ڈبڈبائی آنکھوں اور لرزتے ہوئے لہجے میں التجا کی۔

اس کی کہانی سے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کی پیشاب کی تھیلی میں سوراخ ہوگیا ہے۔

ہندوستان، پاکستان جیسے ملکوں میں جہاں کروڑوں بچے گھروں پر دائیوں کے ذریعے پیدا ہوتے ہیں، جہاں بچے کے سر کے پھنس جانے کی صورت میں یہ انتظامات نہیں ہیں کہ فوری طور پر ان کا آپریشن کرکے بچہ نکال لیا جائے، پھر ان عورتوں کو یہ بیماری ہوجاتی ہے، فسٹیولا کی بیماری۔ ان دونوں ملکوں میں ہر سال ہزاروں عورتیں اس بیماری کا شکار ہوکر ایک دردناک زندگی گزارنے پر مجبور ہوجاتی ہیں۔

میں سوچتا تھا کہ ہندوستان پاکستان دونوں بڑی فوجی طاقتیں ہیں۔ دونوں ایٹم بم کے دھماکے کرچکے ہیں اور دونوں ملکوں کے حکمران بلند و بانگ دعوے کرتے رہتے ہیں اور دونوں ملکوں کی عورتیں محض معمولی سہولتوں کے نہ ہونے کی وجہ سے زندگی میں ہی زندہ درگور ہوجاتی ہیں۔

میرے اندر جیسے نفرت کا ایک سیلاب اٹھا تھا، ایک جوار بھاٹا۔ کاش یہ سیلاب، یہ جوار بھاٹا ان نام نہاد حکمرانوں کو بہالے جاتا، ان کے ایٹم بم بنانے والے سائنس دانوں کو ڈبو دیتا، امن و انصاف کی راہ میں حائل ان دانشوروں کو ختم کردیتا جو دن رات تبلیغ کرتے ہیں کہ ایٹم بم، میزائل، لڑاکا آبدوز، مضبوط فوج، قومی سلامتی کے ضامن ہیں۔ کیا قومی سلامتی اور کیا مضبوط فوج۔

اٹھارہ سال پہلے اسے میں نے داخل کیا تھا، یہ ایک خراب فسٹیولا تھا۔ گردوں سے آنے والی دونوں نالیوں میں سے پیشاب آتو رہا تھا لیکن اس پیشاب کو پیشاب کی تھیلی میں روکا نہیں جاسکتا تھا کیونکہ تھیلی کا نچلا حصہ ختم ہوچکا تھا۔ چار سال کے عرصے میں، میں نے تین دفعہ اس عورت کا آپریشن کیا۔ سوراخ کو بند کرنے کی کوشش، وہاں پر پیوند کاری بھی ناکام ہوگئی۔ پیشاب کی نئی تھیلی بنانے کی کوشش کی، وہ بھی نہیں بن سکی۔

مسئلہ یہ ہے کہ مختلف بیماریوں کے لیے دوائیں اور مصنوعی اعضا بنانے والی بڑی بڑی کمپنیوں کے پاس اس قسم کے غریب مریضوں کے لیے وقت نہیں تھا۔ وہ مصنوعی دل، پھیپھڑا اور ہڈیاں بنا کر تو پیسے کما سکتے ہیں، غریب عورتوں کے لیے پیشاب کی تھیلی بنا کر انہیں کیا ملے گا، دنیا کا نظام اسی اصول پر چل رہا ہے۔ دنیا امیر کے لیے چل رہی ہے غریب کے لیے کیا ہے؟ ذلت، دکھ بیماری، بے بسی کی موت۔

آپریشنوں کی ناکامی کے باوجود اس کا شوہر مہینوں سالوں میں اکیلا اور کبھی کبھی اس کے ساتھ میرے پاس آجاتا۔

"ڈاکٹر صاحب! دنیا میں بہت ترقی ہوگئی ہے۔ اخبار میں بیماریوں کے نئے نئے علاج کے طریقوں کے بارے میں آتا رہتا ہے۔"

اس کے چہرے پر بلا کا درد ہوتا، بیوی کی محبت اور بیوی کی پریشانی اس کے چہرے پر عیاں ہوتی۔ میں صرف سوچ کر رہ جاتا کہ کاش میں کچھ کرسکتا۔

ایک دفعہ میں نے ان دونوں کو بتایا کہ ایک طریقے سے علاج ممکن ہے جس میں ایک دوسرے قسم کا آپریشن کرکے دونوں گردوں سے آنے والی نالیوں کو آنتوں میں لگایا جاسکتا ہے، اس طرح پیشاب بہنا بند ہوجائے گا اور رفع حاجت کے ساتھ نکل جایا کرے گا مگر میں نے یہ بھی بتایا کہ

امت محمدی ﷺ کی فضیلت

☆......ان کو ضعیف اور کمزور بنایا تاکہ غرور نہ کریں۔"

☆......قد میں چھوٹا بنایا تاکہ کھانے پینے اور لباس کا بوجھ زیادہ نہ ہو۔

☆......ان کی عمریں چھوٹی کردیں تاکہ گناہ کم رہیں۔

☆......انہیں غریب بنایا تاکہ آخرت میں حساب ہلکا رہے۔

☆......اور انہیں سب سے آخری اُمت بنایا تاکہ قبر میں رہنے کی مدت کم ہو۔

اس طریقے سے آپریشن کے بعد یہ ممکن ہے کہ اس کی بیوی کی آنتوں میں کچھ سالوں کے بعد کینسر ہو جائے۔

وہ تو راضی ہو گئی مگر اس کا شوہر تیار نہیں ہوا تھا۔

''نہیں ڈاکٹر صاحب! ہم ایسے ہی ٹھیک ہیں۔ اسے اگر کینسر ہو گیا اور یہ اگر مر گئی تو میں کیا کروں گا؟ میں مر جاؤں گا اس کے بغیر۔'' اس نے صاف منع کر دیا تھا۔

بانو نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا شوہر ہی اس کا خیال رکھتا ہے، اس کے پیشاب سے آلودہ کپڑوں کو الگ رکھنا، اپنے کمرے کو صاف رکھنا، کمرے میں اور چھوٹے سے گھر میں عطر کا چھڑکاؤ رکھنا تاکہ پیشاب کی بدبو محسوس نہ ہو۔ یہ سارے کام غلام حسین نے اپنے ذمے لیے ہوئے تھے۔ میں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں کسی بیوی سے اتنی محبت کرنے والا یہ ایک ہی شوہر دیکھا تھا۔ فسٹیولا زدہ عورتیں اکیلی آتی تھیں، عام طور پر اپنی ماؤں یا کسی بڑی یا چھوٹی بہن کے ساتھ۔

عام طور پر فسٹیولا زدہ عورتوں کو شوہر چھوڑ دیتے ہیں۔ زیادہ تر طلاق دے دیتے ہیں اور اگر طلاق نہیں دیتے تو پھر ان سے کسی بھی قسم کے تعلقات نہیں رکھتے۔ غلام حسین ایک مختلف شوہر تھا، بالکل مختلف۔

سال گزرتے چلے گئے پھر کئی مہینوں تک نہ غلام حسین آیا اور نہ ہی بانو آئی۔ میں تقریباً ان دونوں کو بھول گیا تھا کہ ایک دن وہ میرے کمرے میں داخل ہوئی۔

میں پہلی نظر میں اسے پہچان بھی نہیں سکا۔ وہ انتہائی دبلی ہو گئی تھی۔ بال سوکھے ہوئے اور بے ترتیب، چہرا اجڑا ہوا، آنکھوں میں زندگی کی رمق تو تھی مگر زندہ رہنے کا شوق، جذبہ، امنگ نہیں تھا۔ اس کے کہنے سے پہلے میں نے اندازہ لگا لیا کہ غلام حسین کا انتقال ہو چکا ہے۔

اس نے آہستہ آہستہ رو رو کر بتایا کہ غلام حسین آٹھ مہینے تک جگر کے کینسر میں مبتلا رہ کر مر گیا۔ ''ڈاکٹر صاحب! اسے پہلے یرقان ہوا تھا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ کوئی ہیپاٹائٹس سی کی بیماری ہو گئی ہے اسے، علاج اتنا مہنگا تھا کہ ہم لوگ کرا ہی نہیں سکتے تھے پھر وہ خود بخود ٹھیک بھی ہو گیا اور ہم لوگ سمجھتے تھے کہ اب سب کچھ ٹھیک ہے مگر پھر اسے دوبارہ سے پیلیا ہو گیا اور پھر سے بیماری بڑھتی چلی گئی۔''

اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی بے ساختہ بہے چلی جا رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی، ایسے بے معنی الفاظ کہے جو ایسے موقعوں پر کہے جاتے ہیں۔ میں تھوڑی دیر بیٹھا رہا پھر مجھے آپریشن کرنے کے لیے آپریشن تھیٹر جانا پڑ گیا۔ میں فارغ ہوا تو وہ جا چکی تھی۔

چھ سات دن بھی نہیں گزرے تھے کہ اس دن صبح سویرے جب اسپتال میں کوئی بھی نہیں آتا ہے اور میں اپنے کمرے میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا کہ وہ آہستہ سے دستک دے کر میرے کمرے میں آ گئی۔

اداسی اور غم نے اس کی ساری شخصیت کو اپنے قبضے میں لیا ہوا تھا۔ وہ خاموشی سے میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے وہ بولی۔ ''ڈاکٹر صاحب! ابھی بھی میرا کوئی آپریشن نہیں ہو سکتا ہے جس سے میرا علاج ہو سکے؟''

میں نے اسے پھر اسی آپریشن کے بارے میں بتایا جس کے لیے غلام حسین نے منع کر دیا تھا۔ میں نے دوبارہ اسے تفصیلات سمجھائیں۔

''ڈاکٹر صاحب! یہ آپریشن کر دیں۔ بھلے میں آپریشن کے دوران یا آپریشن کے بعد مر ہی جاؤں۔ اس بدبودار زندگی سے تو نجات مل جائے گی۔ جب تک وہ زندہ تھا تو سب مجھے برداشت کرتے تھے کیونکہ میری اس حالت کے باوجود وہ مجھے اپنے ماتھے پر رکھتا تھا لیکن اب تو میری چھوٹی بہو نے کہہ دیا ہے کہ اس سے بدبو اور میرے ناپاک کپڑے برداشت نہیں ہوتے ہیں۔''

یہ کہہ کر وہ رو دی۔ تھوڑی دیر خاموش رہ کر وہ پھر بولی۔ ''ڈاکٹر صاحب! یہ بات اس نے مجھ سے اکیلے میں نہیں کی، میرے بیٹے کے سامنے کی۔ اسی بیٹے کے سامنے جس کے لیے زندہ رہنے کے لیے میں نے دعائیں کی تھیں۔ سارے بہوؤں اور بیٹوں کی نظر بدل گئی ہے میرے شوہر کی موت کے بعد ڈاکٹر صاحب۔ ایک بیٹی ہے جو مجھے اپنے گھر لے جانا چاہتی ہے مگر اس کے سسرال، اس بیماری کے ساتھ تو نہیں جا سکتی ہوں میں۔'' اس کے چہرے پر بہت سارے سوالات تھے۔ ایسے سوالات جن کا کوئی جواب نہیں تھا۔

مجھے غلام حسین کا آنسوؤں بھرا چہرہ یاد آ گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ میرے سامنے کھڑا ہے۔ دبلا پتلا، نظریں جھکائے ہوئے، آنکھوں میں التجا بھری ہوئی۔ دھیرے دھیرے میرے قریب آیا اور آہستہ سے بولا کہ ڈاکٹر صاحب اس کا آپریشن کر دیں، یہ بیٹوں پر بھاری ہو گئی ہے۔ بیٹی کے گھر میں مرنا اچھا نہیں ہے۔

میں نے بانو کو اسی وقت آپریشن کے لیے داخل کر لیا۔

گزشتہ شب وہ نشے میں تھا۔ آج صبح وہ سنجیدہ تھا لیکن اب بھی اپنے ارادے پر سختی سے قائم تھا۔ ''میں اسے مردہ دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''یس سر۔'' میں نے کہا۔

مسٹر ونٹرز خاصا دولت مند لیکن بگڑا ہوا امیر انسان ہے اور کبھی کبھار پاگل سا ہو جاتا ہے۔

ونٹرز جس شخص کو مردہ دیکھنے کا خواہش مند تھا، اس کا نام لینڈر میک کیولم تھا۔ گزشتہ شب کلب میں میک کیولم نے

قسمت

بابر نعیم

اس دنیا میں دولت ایک ایسی شے ہے جو ہمیشہ سے ایمان، احساسات اور جذبات سے نبرد آزما رہتی ہے اور اس معرکہ آرائی میں جیت اسی کی ہوتی ہے جس کا مقدر ساتھ دیتا ہے۔ وہ جو اپنے آقا کا بہت وفادار غلام تھا، ڈالرز کی مہک نے اسے ہوش و حواس سے بے گانا کر دیا تھا کہ اچانک ایک مانوس آواز نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیے۔

قسمت کی کچھ چلیوں کا چونکا دینے والا ایک عجب تماشا

یہ گستاخی کی تھی کہ ونٹرز کو تاش کے کھیل میں چیٹنگ کرتے ہوئے پکڑ لیا تھا۔ پہلے تو ان کے درمیان سخت الفاظ کا تبادلہ ہوا اور پھر نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔

ونٹرز مجھے گھورنے لگا۔ ”کلیرنس! جب میں نے کہہ دیا کہ میں میک کیولم کو مردہ دیکھنا چاہتا ہوں تو میرا مطلب ہے کہ میں اسے مردہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس معاملے میں فوری طور پر عمل کرو اور کسی قسم کی کوتاہی نہ کرنا۔“

”سر!“ میں نے رواداری سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”میرے خیال میں آپ مجھ سے جن کاموں کی توقع رکھتے ہیں، ان کی لازمی کچھ حدود بھی ہوں گی۔“

تب اس نے اپنی بات کی مزید وضاحت کی۔ ”میرا مطلب یہ نہیں کہ میں چاہتا ہوں تم ذاتی طور پر میک کیولم کو قتل کر دو۔ میرا مطلب ہے کہ تم میرے لیے کسی ایسے شخص کو تلاش کرو جو اس کام کو سرانجام دے سکے۔ بہ الفاظِ دیگر کوئی پیشہ ور قاتل!“

”یس سر۔“ میں نے بے ساختہ کہا اور پھر اس معاملے کو اپنے ذہن سے نکال دیا۔

میں ونٹرز کا پرسنل سیکریٹری، ذاتی خدمت گار، ٹریول ایجنٹ، شوفر اور موقع کی مناسبت سے ہر کام کرنے والا ہوں۔ مجھے ان کاموں کا بہت اچھا معاوضہ ملتا ہے۔ میں خاصا سفر بھی کر لیتا ہوں۔ ہمیشہ بہترین جگہوں پر رہائش اختیار کرتا ہوں اور نہایت عمدہ کھانوں سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔ بلاشبہ یہ تمام اخراجات ونٹرز کے کھاتے میں آتے ہیں۔ ان کاموں میں مجھے جسمانی مشقت نہیں کرنی پڑتی لیکن چوبیس گھنٹے کسی کی حکم برداری میں رہنا ذہنی بدمزگی اور چڑچڑاہٹ کا باعث ہوتا ہے۔

اگلے روز صبح ونٹرز نے دوبارہ مجھے گھیر لیا۔ ”ویل کلیرنس، تم اس بارے میں کیا کر رہے ہو؟“

”کس بارے میں سر؟“

”میرے لیے ایک پیشہ ور قاتل کی تلاش کے سلسلے میں تم نے ابھی تک کیا، کیا ہے؟“

”اوہ۔ وہ سر! ویل، کسی پیشہ ور قاتل کو یوں تلاش کرنا قدرے مشکل ہے...... آپ تو جانتے ہیں کہ وہ لوگ اپنا اشتہار تو شائع نہیں کراتے۔“ میں نے جواب دیا۔

اس بات پر وہ مجھے سخت نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔ ”کلیرنس! میں تمہیں بہترین تنخواہ دیتا ہوں اور تم سے بہترین نتائج کی توقع رکھتا ہوں یا تمہیں اپنا یہ کام پسند نہیں ہے؟“

”مجھے پسند ہے سر...... مجھے پسند ہے۔“

”تو پھر میرے لیے پیشہ ور قاتل ڈھونڈ کر لاؤ۔ تمہارے پاس جمعے تک کی مہلت ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے گلے پر انگلی چلائی جیسے چھری پھیر رہا ہو۔ ”جمعے تک کلیرنس...... جمعے تک!“

☆☆☆

گزشتہ کئی برسوں کے دوران مجھے اپنے آقا کے لیے چند قدرے عجیب اور بے ڈھب کام سرانجام دینے پڑے تھے لیکن ان کاموں میں کبھی کسی کو قتل کرنے کی ترغیب شامل نہیں رہی تھی اور نہ ہی اب میں اس قسم کے کسی کام کے آغاز کا ارادہ رکھتا تھا۔

بہرحال، مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ میں اس بارے میں پُریقین تھا کہ کچھ وقت گزرنے کے بعد ونٹرز کو اپنے پاگل پن کا احساس ہو جائے گا کہ وہ کیا تجویز کر رہا ہے اور وہ اپنے مطالبے سے خود ہی دست بردار ہو جائے گا لیکن اس دوران میں اس کو اطمینان دلانا بھی ضروری تھا۔

ظاہر ہے اب مجھے بناوٹ سے یہ کام لینا تھا کہ میں ایک پیشہ ور قاتل سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں اور یہ کہ اس قاتل سے گفت و شنید جاری ہے اور اس طرح میں اس معاملے کو طول دیتا رہوں گا۔ طول اور مزید طول!

اگلے روز ونٹرز نے معلومات اخذ کرنے کے لیے مجھے گھیر لیا۔

”ویل؟“

میں مسکرا دیا۔ ”میں بالآخر ایک پیشہ ور قاتل کا کھوج لگانے میں کامیاب ہو گیا ہوں، سر۔“

ونٹرز یہ سن کر حیران رہ گیا۔ ”واقعی کلیرنس، تم نے کھوج لگا لیا؟ تم نے یہ سب کس طرح کیا؟“

”سر! اگر کوئی کسی قاتل کو تلاش کرنا چاہتا ہے تو اسے ایسے فرد کو تلاش کرنا چاہیے جو پہلے بھی قتل کر چکا ہو۔ ایسے قاتلوں کو اخبارات سے تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ہم ان قاتلوں کے بارے میں مستقل پڑھتے رہتے ہیں جو اپنی عمر قید کے مطلوبہ بارہ سال اور آٹھ مہینے کی سزا بھگت چکے ہیں اور پیرول پر رہا ہو جاتے ہیں۔ جب آپ گزشتہ سہ پہر اپنے کلب کی بے دخلی کمیٹی کے روبرو پیشی کے لیے گئے ہوئے تھے تو مجھے اپنے شہر کے سب سے بڑے اخبار کے دفتر جانے اور پرانا ریکارڈ چھاننے کا موقع مل گیا تھا۔ میں نے کئی سال پہلے کے پرانے اخبارات کنگال کر ان ناموں کو منتخب کر لیا جو پیرول پر رہائی پا چکے تھے اور انہیں دوبارہ سے سکونت اختیار کرنے کا خاصا وقت مل چکا تھا۔ یہی نہیں بلکہ

انہوں نے اپنے نام بھی ٹیلی فون بک میں درج کرا لیے تھے۔ تب میں نے ان میں سے چند سے محتاط انداز میں فون پر رابطہ بھی کیا تھا۔ ویسے بائی دی وے سر، کلب کی ...... دخلی کمیٹی نے کیا ایکشن لینے کا فیصلہ کیا ہے؟“

ونٹرز کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ ”وہ لوگ ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچے ہیں۔ اس پیشہ ور قاتل کا نام کیا ہے، کلیرنس؟“ ونٹرز پھر اصل موضوع پر آ گیا۔

میں نے ذہنی طور پر اپنی اطالوی آنجہانی دادی سے معذرت کرتے ہوئے ان کا نام لے لیا۔ ”مارشیٹی!“

ونٹرز اٹھ کر چلا گیا لیکن فوراً ہی ہاتھ میں فون بک لیے پلٹ آیا۔

”اس میں چھ مارشیٹی نام درج ہیں۔ ان میں سے وہ کون سا ہے؟“ ونٹرز نے فون بک کا وہ صفحہ کھولتے ہوئے کہا جس پر یہ نام لکھے ہوئے تھے۔

”سب سے پہلا۔“ میں نے جواب دیا۔

”اے مارشیٹی؟ اے سے کیا مراد ہے؟“

”انجیلو!“

ونٹرز کو یہ نام بھا گیا۔ ”میرا خیال ہے کہ اس کا تعلق مافیا سے ہے؟“

”جسم و جان کے ساتھ۔“

ونٹرز نے سگار سلگا لیا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ میک کیولم کو اس جمعے کی رات قتل ہو جانا چاہیے۔ رات آٹھ بجے اور درمیانی شب کے درمیان۔“

”اس جمعے کی شب سر؟ یہ تو سخت دباؤ ڈالنے والی بات ہو گی۔ انجیلو عام طور پر اپنی مرضی سے اور مناسب وقت پر اپنا کام سرانجام دیتا ہے۔ وہ اپنے شکار کا مکمل طور پر جائزہ لینے میں دو یا تین ہفتے لگاتا ہے۔“ میں نے بتایا۔

”اس جمعے کلیرنس۔ میں رقم دے رہا ہوں تو کام میری مرضی سے ہو گا۔ میں جمعے کی شب تھامسن کے یہاں ہوں گا۔ اس کی شادی کی سالگرہ ہے اور اس نے ایک پارٹی کا اہتمام کیا ہوا ہے۔ وہاں پچاس سے زیادہ ایسے افراد موجود ہوں گے جو اس بات کی گواہی دیں گے کہ میں پوری رات اس کے گھر سے بالکل باہر نہیں گیا۔ یہ میری عدم موجودگی کا ثبوت ہو گا۔“ ونٹرز نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”انجیلو اس کام کا کتنا معاوضہ طلب کر رہا ہے؟“

میں نے فوراً ہی موقع سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اگر میں معاوضہ بہت زیادہ بتاتا ہوں تو شاید ونٹرز اپنا ارادہ تبدیل کر دے اور میک کیولم کو قتل کرانے کا خیال دل سے نکال دے۔

”دس لاکھ ڈالرز، سر!“

سرداریاں

سردار اسپتال کے باہر کھڑا زور زور سے رو رہا تھا۔

کسی نے پوچھا۔ ”کیوں رو رہے ہو؟“

سردار۔ ”20 سال بعد بیٹا پیدا ہوا وہ بھی چھوٹا سا۔“

❖❖❖

سردار بندوق لے کر دروازے میں کھڑا تھا۔

بیوی۔ ”کیا کر رہے ہو؟“

سردار۔ ”شیر کے شکار پر جا رہا ہوں۔“

بیوی۔ ”تو جاؤ ناں۔“

سردار۔ ”کیسے جاؤں باہر کتا کھڑا ہے۔“

❖❖❖

ایک سردار کو یوفون آفس میں جاب مل گئی۔ پہلے دن ہی کال آئی۔ ”سر میری یوفون کی سم بلاک ہو گئی ہے۔“

سردار۔ ”تو ماما ٹیلی نار کی سم ڈال لو، چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے تنگ نہیں کیا کرو۔“

❖❖❖

سردار بائیک پر جا رہا تھا کہ ایک لڑکی کو بائیک مار دی۔

لڑکی۔ ”ہارن نہیں مار سکتے تھے کیا؟“

سردار۔ ”پوری بائیک تو مار دی اب ہارن الگ نکال کے ماروں کیا؟“

❖❖❖

مریض۔ ”ڈاکٹر صاحب یہ دوائی تو کہیں سے نہیں مل رہی۔“

سردار۔ ”ڈاکٹر او یار، وہ دوائی لکھنا تو ہم بھول ہی گیا یہ تو ہمارا دستخط ہے۔“

مرسلہ۔ رضوان تنولی گریڈوی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

وٹنرز کو یہ سن کر حقیقت میں جھٹکا سا لگا۔ ”دس لاکھ ڈالرز؟ کیا تم کسی سستے قاتل کو تلاش نہیں کر سکتے؟“

”تحصیل کے اس اسٹیج پر یہ ممکن نہیں ہے، سر۔ میں نہیں سمجھتا کہ انجلو کمتر بولی کے اس معاملے پر کسی قسم کے ردعمل کا اظہار نہیں کرے گا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ یہ پیشہ ور قاتل ان معاملات میں کتنے حساس ہوتے ہیں۔“ میں نے بتایا۔

وٹنرز نے اپنا سگار چبانا شروع کر دیا۔ ”اوہ، ویل! میرے خیال میں افراط زر کے اس اتار چڑھاؤ میں ہمیں ہر شے کی قیمتوں میں اضافے کی ہی توقع رکھنی چاہیے۔ یہ معاہدہ پکا سمجھو، کلیرنس۔“

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ شام کو جب وہ گھر لوٹا تو اس کے پاس ایک بریف کیس بھی تھا۔ اس نے وہ بریف کیس کھول کر مجھے دکھایا جو کرنسی نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ ”دس لاکھ ڈالرز۔“

میں نوٹوں سے بھرا ہوا وہ بریف کیس لے کر اوپر اپنے کمرے میں آ گیا اور اسے اپنے بستر پر خالی کر دیا۔

دس لاکھ ڈالرز!

”کیوں نہ میں تمام رقم سمیٹ کر یہاں سے بھاگ نکلوں؟“ میں نے سوچا۔

نہیں! گو دس لاکھ ڈالرز کی رقم خاصی بڑی رقم ہوتی لیکن کیا یہ حقیقت میں اتنی اہمیت کی حامل ہے کہ دوستوں، عزیز و اقارب اور جانی پہچانی دنیا سے تمام رشتے ناتے قطع کر کے ایک مفرور کی حیثیت سے باقی زندگی گزار دی جائے؟ کوئی اتنی ڈھیر ساری رقم سے صرف سال دو سال ہی لطف اندوز ہو سکتا ہے پھر اس کے بعد؟

میں آہ بھر کر رہ گیا۔

نہیں، مجھے یہ رقم وٹنرز کو لوٹا دینی ہوگی اور یہ بتا دینا ہوگا کہ انجلو مارشیٹی کوئی پیشہ ور قاتل نہیں ہے۔ بلاشبہ مجھے ملازمت سے برخاست کر دیا جائے گا۔ ملازمت چھوٹ جانے سے درحقیقت مجھ پر کسی قسم کے ڈر یا خوف کا غلبہ نہیں ہوگا لیکن معاشی پریشانی کا سامنا ضرور کرنا پڑے گا۔

میں نے دوبارہ اپنی نظریں بیڈ پر پھیلی ہوئی دس لاکھ ڈالرز کی رقم پر مرکوز کر دیں۔ کیا دس لاکھ ڈالرز کے عوض میں کسی کو قتل کر سکتا ہوں؟

یقینی طور پر نہیں۔ دس لاکھ ڈالرز کے عوض بھی نہیں۔

تو پھر میری قیمت کیا ہے؟ کیا میری کوئی قیمت بھی ہے؟

ایک آئیڈیا جو میرے ذہن میں کلبلا رہا تھا، اب پختہ ہو گیا۔

فرض کریں کہ انجلو مارشیٹی حقیقت میں میک کیولم کو قتل کر دیتا ہے؟ فرض کریں کہ پھر وہ وٹنرز کو بلیک میل کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے؟ کیا وہ ان دس لاکھ ڈالرز کے علاوہ دو کئی لاکھ ڈالرز بٹور سکتا ہے؟

میں اس بات سے بہ خوبی باخبر تھا کہ سوال کی حیثیت اب بدل چکی ہے۔ کیا میں ان لاکھوں ڈالرز کے عوض قتل کر سکتا ہوں؟

میں نے اس سوال پر پوری سنجیدگی سے غور کرنے کے لیے خود کو پانچ منٹ کا وقت دیا۔

پانچ منٹ بعد میرا جواب ہاں میں تھا۔

ان دس لاکھ ڈالرز اور اس کے بعد بلیک میلنگ سے حاصل ہونے والے مزید لاکھوں ڈالرز کے عوض میں یہ قتل ضرور کر سکتا ہوں۔

☆☆☆

ڈنر کے وقت وٹنرز نے مجھے بتایا کہ وہ اپنی پاور بوٹ اسکواڈرن کی میٹنگ میں شرکت کے لیے یاٹ کلب جا رہا ہے اور رات گئے تک وہیں رہے گا اور یہ کہ وہ کار خود ہی ڈرائیو کرے گا۔

میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور اپنے لیے ایک مشروب تیار کر لیا۔ یہ معمول سے دگنی مقدار میں تھا۔

وٹنرز چاہتا تھا کہ میک کیولم کو کل رات قتل کر دیا جائے لیکن چونکہ اب میں نے خود کو اس کام کے لیے تیار کر لیا تھا تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ آج رات ہی اس کام کو نمٹا دیا جائے۔ وٹنرز یاٹ کلب میں تھا اور جب اس قسم کی رات کی میٹنگز میں شریک ہوتا تھا تو آدھی رات سے قبل اس کی واپسی کبھی نہیں ہوتی تھی۔

اس طرح وہ جائے واردات سے اپنی عدم موجودگی کا ٹھوس ثبوت پیش کر سکتا تھا جو میں اسے فراہم کرنے والا تھا۔

میں نے وٹنرز کے گن کلیکشن میں سے ایک ریوالور کا انتخاب کیا۔ وٹنرز کے پاس مختلف قسم کے چھوٹے ہتھیاروں کا ذخیرہ تھا۔ میں نے ریوالور کے چیمبر میں کارتوس بھرے اور ریوالور جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

پھر میں نے ٹیلی فون بک میں سے لینڈر میک کیولم کا نام اور پتا ڈھونڈ نکالا۔

جب میں میک کیولم کی اپارٹمنٹ بلڈنگ پہنچا تو نیچے ہال میں نصب ڈاک رکھنے کے طاقوں کا جائزہ لینے لگا۔ میک کیولم کا اپارٹمنٹ ساتویں منزل پر تھا۔ میں سیلف سروس لفٹ کے ذریعے ساتویں فلور کے لیے روانہ ہو گیا۔

سات سو چھ نمبر کے اپارٹمنٹ کے دروازے پر پہنچ

کر میں نے ڈور بیل کا بٹن دبا دیا اور انتظار کرنے لگا۔ میرا ہاتھ میری جیب میں موجود ریوالور کے دستے پر تھا۔

دروازہ خود میک کیولم نے کھولا۔ وہ مجھے ایک دو مرتبہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ البتہ یہ چونکہ میرا محتاط رویہ تھا کہ میں ہمیشہ پس پردہ رہا کرتا تھا اس لیے میں نہیں سمجھتا تھا کہ اس نے مجھے پہچان لیا ہوگا۔

میں نے گہری سانس لی اور تب مجھے احساس ہوا کہ اپنی شدید گھبراہٹ کے باعث مجھ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ جیب میں رکھا ہوا ریوالور باہر نکال لوں۔ ایک وجہ اور بھی تھی کہ میں ایک انسان ہونے کے ناتے ایک اور انسان کو قتل نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے بے دلی سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا گیری بالڈی کی رہائش گاہ یہی ہے؟“

میک کیولم جیسے ناراض سا ہو گیا۔ ”نہیں۔“ اس نے تنگی سے کہا اور دھڑ سے دروازہ بند کر دیا۔

☆☆☆

اگلے روز صبح لباس تبدیل کرنے کے بعد جب میں بریف کیس لے کر نیچے پہنچا تو وٹنرز کو اپنا منتظر پایا۔

اس نے بریف کیس پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”رقم انجلو کے پاس لے کر جا رہے ہو؟“

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں نے تمہیں بروقت پکڑ لیا۔ میں نے اس پورے معاملے میں دست بردار ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ وٹنرز نے جیسے دھماکا کیا۔

میں حیرت سے پلکیں جھپکاتا رہ گیا۔

”کلب کی بے دخلی کمیٹی کے چیئرمین نے آج صبح سویرے مجھے فون کیا تھا۔ انہوں نے اس معاملے کو درگزر کر دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ میک کیولم نے مجھ پر الزام لگایا تھا اور میں نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اس معاملے کا کوئی گواہ بھی نہیں تھا۔ لہٰذا اب میک کیولم کو مار ڈالنے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ اس لیے کہ کلب میں میری رکنیت برقرار رہے گی اور میری ممبر شپ خارج نہیں کی جائے گی۔ میں نے اسے مار ڈالنے کا ارادہ منسوخ کر دیا ہے۔“

میں آنکھیں پھاڑے وٹنرز کو دیکھنے لگا۔ مجھے اس پر غصہ بھی آ رہا تھا۔ ”منسوخ کر دیا ہے؟ کیا آپ اس معاملے کو اتنا آسان سمجھ رہے ہیں جتنی آسانی سے یہ بات کہہ رہے ہیں؟ انجلو اور مافیا آگ بگولا ہو جائیں گے۔ آخر کار معاہدے کی رقم کا نصف حصہ مافیا کو ملنے کی توقع تھی اور وہ تنظیم اس قسم کی نہیں ہے کہ اس کے ساتھ کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ یا حقارت آمیز رویہ اختیار کیا جائے۔ اتنی بڑی رقم ہاتھ سے نکل جانے پر وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“

وٹنرز یہ سن کر بے چین سا ہو گیا۔ ”ویل، میرا خیال ہے کہ آخری لمحات میں کسی معاملے کو منسوخ کر دینا یقیناً کسی حد تک ناراضگی کا سبب بن سکتا ہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں کیا کرنا چاہوں گا۔“ وٹنرز نے وقت ضائع کیے بغیر فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ان سے کہو کہ وہ قتل کے معاملے کو منسوخ کر دیں اور پوری رقم بھی اپنے پاس رکھ لیں۔“

لیکن میں اب بھی مطمئن نہیں تھا۔ ”سر! جرمانے کا سوال تو اب بھی باقی ہے۔“

”جرمانہ؟ کیسا جرمانہ؟“

”معاہدہ منسوخ کرنے کا جرمانہ! انجلو کے ساتھ معاہدے کی گفت و شنید میں اس نے اسی نوعیت کے ایک کیس اور اس کی منسوخی پر عائد کیے جانے والے جرمانے کی بات بھی کی تھی۔ مافیا یہ خیال کرے گی کہ آپ نے ان سے لطف لینے اور چھیڑ چھاڑ کی خاطر یہ معاہدہ کیا تھا اور یہ کہ ایک قاتل کی خدمات حاصل کرنے کے آپ کے ارادے میں خلوص قطعی طور پر شامل نہیں تھا۔ مزید یہ کہ آپ شاید ان کے طریق کار کے بارے میں کوئی کتاب لکھ رہے ہیں اس لیے سر ضروری ہے کہ ان کے احساسات کی لازمی تسکین کر دی جائے۔ ان کے شبہات کو دور کر دیا جائے۔ رقم لازمی ان تک پہنچا دی جائے اور جرمانے کی رقم بھی ساتھ ہی ادا کر دی جائے جو بلاشبہ معاوضے کی رقم کے برابر ہوگی۔ یعنی مزید دس لاکھ ڈالرز!“ میں نے بتایا۔

وٹنرز نے رومال کی مدد سے اپنی پیشانی پر سے پسینا صاف کیا اور قدرے ہچکچاہٹ کے بعد اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”آل رائٹ! کل بیس لاکھ ڈالرز۔ اس معاملے کو خوش اسلوبی سے نمٹا دو، کلیرنس!“

میں نے معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹا دیا۔

بیس لاکھ ڈالرز کی رقم میری تحویل میں ہے۔ میں نے مزید ایک سال تک وٹنرز کے پاس رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اسے مجھ پر کسی قسم کا شبہ ہو۔ ایک سال بعد جب میں اس کی بیس لاکھ ڈالرز کی رقم کے ساتھ یہاں سے رخصت ہوں تو وہ ہنسی خوشی مجھے الوداع کہہ دے۔ میں اس کی اجازت سے اس کی ملازمت کو خیرباد کہوں گا۔

اس دوران میں نے اپنے کیلنڈر پر اپنے دن شمار کرنا شروع کر دیے ہیں۔

ماروی

محی الدین نواب

پہلی قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پُرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوس قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا بادو باراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیّر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کی اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیّر خیز سنگم۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ داستان ہے دورِ جدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی منگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جمرو اور چاچی فتی کے ساتھ اندرونِ سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ گاؤں کا وڈیرا حشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہٰذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوٹھ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا وڈیرا حشمت کی منشی گیری کرتا تھا۔ وڈیرا حشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کردی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہو گیا۔ اس رات زلیخا نے اسے ایک قیمتی ہار بھی تحفتاً دیا تھا۔ گاؤں سے فرار ہو کر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے میمن گوٹھ آ گئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاچی کے ساتھ پہلے ہی آ چکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہوگئی جو کہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون، لیکن ہو بہو مراد کا ہم شکل تھا۔ بس دونوں کے درمیان صرف قسمت کا فرق تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ حشمت جلالی جو کہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کر چکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کرلی اور خاموشی سے فرار ہوگئی۔ وڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی برباد کرکے قتل کردیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے مسخ کر کے اسے اپنی بیٹی ظاہر کرکے الزام مراد پر لگا دیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا۔ ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہونا تھا۔ محبوب کے سرپرست اس کے والد کے زمانے کے معروف منگی تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل میرا کو سیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل و جان سے مرمٹا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا جس میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بطور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد کو شادی کے لیے ایک لاکھ کی ضرورت تھی۔ محبوب نے زلیخا کے دیے ہوئے ہار کو ایک لاکھ میں خریدنے کی پیشکش کی لیکن مراد راضی نہ ہوا۔ اسی دوران مراد کے گھر چوری کی واردات ہوئی اور چور نقد رقم کے ساتھ زلیخا کا وہ ہار بھی لے گئے لیکن پکڑے گئے یوں مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہوگیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی لیکن وڈیرا باپ اور بیٹوں کو خبر نہیں تھی کہ زلیخا کہاں اور کس حال میں ہے۔ سال نزاعِ جاتی تھی لیکن مراد سے نالاں تھی۔ وہ شوہر اور بیٹوں سے بھی ناراض تھی لہٰذا انہیں خبر نہیں کی۔ مراد اس قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کر رہا تھا۔ اسی باعث اس کی وڈیرا حشمت سے دشمنی ہوگئی یہ بات پارٹی کے لیڈر تک پہنچ گئی نتیجتاً چانڈیو استعفا دے کر چلا آیا۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہوگیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سہیلی کی شادی میں شرکت کے لیے گوٹھ گئی، تاہم محبوب چانڈیو اسے بچالایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکریٹ ایجنٹ برنارڈ کو رہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ جو کہ جیلر کی بیٹی ہے دیگر دو ساتھی بہرام اور دارا اکبر کے ساتھ آئے ہوئے ہیں۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی اور اس سے شادی اسے ورغلا کر ماروی سے دور کر رہی تھی جبکہ ماروی پر بھی دباؤ تھا کہ وہ محبوب سے شادی کرلے لیکن دونوں اپنے عشق پر قائم تھے۔ مقدمے کو معلوم نہیں کب تک چلنا تھا لیکن محبوب نیک نیتی سے ان کا مددگار تھا اور حتیٰ کہ جب ماروی محبوب کے احسانات سے بچنے کے لیے جان بوجھ کر غائب ہوگئی جس میں میرا بھی مددگار رہی تھی تاکہ محبوب ماروی کی مدد سے باز آجائے مگر اس خبر کے بعد وہ دلبرداشتہ ہو کر خود مراد کی جگہ جیل میں قید ہوگیا جبکہ دوسری جانب ماروی کی تلاش کا لالچ دے کر مراد کو مرینہ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہوگیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے شکنجے سے فرار ہوگیا۔ جبکہ دوسری جانب میرا اور منگی صاحب محبوب کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ ایک موقع پر مرینہ مراد کا پیچھا کرتے ہوئے راستے میں ماروی تک پہنچ گئی اور محبوب سے فون پر اپنے باپ کے ذریعے رابطہ کرایا تو اسی خبر سے محبوب میں نئی زندگی دوڑ گئی۔ مرینہ اپنے باپ کے بل پر بہت شاطرانہ چالیں چل رہی تھی۔ مگر قسمت کی دیوی مراد پر مہربان تھی جو مرینہ کے ہاتھوں سے نکل گیا تھا، اتفاق سے راستے میں ماروی چاچی اور چاچا کے ساتھ اس کے ہاتھ لگ جاتے ہیں لیکن کسی نہ کسی طرح مراد کو معلوم ہوجاتا ہے کہ مرینہ ماروی کو جام تماچو کے چودھری کے پاس لے جارہی ہے لہٰذا مشکلات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے وہ ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کرا لیتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگتی ہے جس کے باعث اس کی یادداشت چلی جاتی ہے۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کر کے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کرکے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہوجاتا ہے۔ محبوب اور مراد کے جگہ بدل لینے سے حالات بھی بدلتے جارہے تھے۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جارہا تھا۔ مرینہ کے پالتو غنڈے مراد کو کسی نہ کسی طرح جیل سے نکال کرلے جاتے ہیں۔ باہر نکال کر ان کے درمیان سخت مقابلہ ہوتا ہے۔ جس میں قانون کا خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مرجاتا ہے۔ دوسری جانب ماروی کے علاج کے لیے باہر سے ایک ڈاکٹر عدیلہ کو بلایا جاتا ہے جو خود بھی دہری شخصیت کا شکار ہے۔ وہ عدیلہ بھی ہے اور عادل بھی۔ مراد بھی محبوب کے گھر پہنچ گیا تھا مگر ماروی محبوب اور مراد دونوں کو پہچاننے کی کوشش میں تھی مگر اسے کچھ یاد نہیں آرہا تھا۔ ماروی کو عدیلہ کی حقیقت کا علم ہوگیا اور اس نے عدیلہ کو سختی کے ساتھ خود سے دور رہنے کا کہا۔ عدیلہ لندن چلی گئی۔ ادھر غیر ملکی ایجنٹ نے مراد کو قتل کرنے کا حکم دیا اس پر حملہ ہوا تاہم وہ بچ گیا۔ مراد نے ایک ایجنٹ کو پکڑ لیا۔ ایجنٹ بلا مراد کے ساتھ مل گیا۔ مراد عمرکوٹ میں تھا۔ پولیس نے مراد کو چاروں طرف سے گھیر لیا مگر اسی دوران مرینہ نے دھاوا بول دیا۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر کوبوبو کے ساتھ مل گیا۔ مراد کو ماسٹر کی طرف سے ایک کام ملا۔ اس نے پہلے ہی کام میں ایک کروڑ چالیس لاکھ کا ہاتھ مارا اور اپنے حصے کی رقم پاکستان میں موجود بینک اکاؤنٹ میں منتقل کرادی۔ مراد نے دوسرا کام کیا اور مرینہ کے راستے میں پھر رکاوٹ بن گیا۔ اس نے خفیہ معاہدے کی مائیکرو فلم حاصل کرلی اور مرینہ کو چاروں شانے چت کردیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ماسٹر فرانسس کوبوبو خوشی سے ناچنے لگا۔ مراد اس کے دشمن سے مائیکرو فلم چھین کرلے آیا تھا اور اسے موت کے گھاٹ اتار کر اس کا کلیجا ٹھنڈا کر چکا تھا۔

اس نے فون پر کہا۔ ”مراد! تم ایک تراشیدہ ہیرا ہو۔ تمہاری قیمت صرف میں جانتا ہوں۔ بائی گاڈ! میں یہ کبھی نہیں چاہوں گا کہ تم میرا ساتھ چھوڑ دو۔

”آج سے تم اپنی ذاتی کمائی کا صرف بیس پرسنٹ مجھے دیا کرو گے۔ یہ جو دو کروڑ لائے ہو، اس میں سے صرف پچاس لاکھ لوں گا، باقی تمہارے ہیں۔

”تم جب چاہو پاکستان جا سکتے ہو لیکن دو چار روز یہاں رک کر پہلے وہاں کے حالات معلوم کرو۔ دانش مندی یہ ہوگی کہ یہاں بیٹھ کر وہاں کے دوستوں اور دشمنوں کو اچھی طرح سمجھو پھر اپنی ہونے والی دلہن کے پاس جاؤ۔“

مراد نے کہا۔ ”آپ درست فرماتے ہیں۔ میں وہاں جانے سے پہلے بہت محتاط ہوں۔ میرا ایک جاں نثار ساتھی بلال احمد عرف بلا کراچی شہر میں میرے وفاداروں کی ایک ٹیم بنا رہا ہے۔ وہ ایسی خفیہ پناہ گاہیں بنا رہا ہے جہاں میں دشمنوں سے محفوظ رہ سکوں گا۔ آپ اطمینان رکھیں میں بہت محتاط ہوں اور آپ جلد ہی سنیں گے کہ میکی البرٹ کی طرح اس کا چچا عالی جناب بھی جہنم میں پہنچ گیا ہے۔“

”پاکستان کب جانا چاہتے ہو؟“

”میں اپنے دوستوں اور شناساؤں سے یہی کہوں گا کہ ایک ہفتے کے اندر آرہا ہوں لیکن کس دن آؤں گا' یہ نہیں بتاؤں گا۔ آپ سے کہتا ہوں کہ کل ہی جانا چاہوں گا۔“

”ٹھیک ہے، میں ابھی جگ دیو سے بات کرتا ہوں۔“ کوبوبو نے اسی وقت جگ دیو سے رابطہ کیا۔ اس وقت مرینہ اس کے پاس بیٹھی تھی۔

جگ دیو نے کہا۔ ”ماسٹر! مرینہ یہاں موجود ہے۔ میں وائڈ اسپیکر آن کررہا ہوں۔“

ماسٹر کوبوبو نے کہا۔ ”ہیلو مرینہ! تمہیں اندازہ ہے کہ تم نے وہ مائیکرو فلم حاصل نہ کرکے ہمیں کتنا نقصان پہنچایا ہے؟“

وہ بولی۔ ”میں شرمندہ ہوں ماسٹر! اس خبیث مراد کو پتا نہیں کیسے اس مائیکرو فلم کے بارے میں معلوم ہوگیا تھا۔ آپ یقین کریں میں بے خبری میں...“

ماسٹر نے بات کاٹ کر کہا۔ ”ناکام ہونے والے طرح طرح کی باتیں بنا کر اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کو چھپاتے ہیں۔ ہم کسی بھی مشن میں ایک ہی بات جانتے ہیں۔ کامیابی یا ناکامی...... اور تم ناکام ہو چکی ہو۔ تم جانتی ہو کہ مراد انڈر ورلڈ کے وینکٹ راؤ کے لیے کام کر رہا ہے اور وہ تمہارا دشمن ہے۔ وہ تم پر نظر رکھتا ہوگا لیکن تم نے اس کی اہمیت کو نظر انداز کیا۔ اس سے غافل رہیں۔ جس کا نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔ اس مائیکرو فلم سے میں کروڑوں ڈالرز حاصل کر سکتا تھا۔ مراد یہ منافع وینکٹ راؤ کی جھولی میں ڈال چکا ہے۔“

اس کی توہین ہو رہی تھی۔ وہ شدید غم و غصے سے بولی۔ ”میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“

”تم یہاں بیٹھے بیٹھے خیالوں میں اسے قتل کرتی رہو۔ کمزور دعوے کرتی رہو کہ اسے زندہ نہیں چھوڑو گی۔ اس کے برعکس وہ تمہاری زندگی کو عذاب بنا رہا ہے۔ یہ لکھ لو کہ آئندہ بھی کسی مشن میں اس سے چوٹ کھانے والی ہو۔“

وہ مٹھیاں بھینچ کر بولی۔ ”ہرگز نہیں۔ بس ایک بار سامنا ہو جائے پھر آپ کو اطلاع ملے گی کہ وہ میرے ہاتھوں مر چکا ہے یا اپاہج بن کر میرے قدموں میں پڑا ہوا ہے۔“

”تم نے مجھے کروڑوں ڈالرز کا نقصان پہنچایا ہے۔ وہ نقصان اس طرح پورا کر سکتی ہو کہ مراد کو ہلاک نہ کرو۔ نہ ہی زخمی کرو۔ اسے میرے کام کے لیے راضی کرلو۔ پھر تم دونوں مل کر کام کرو گے تو ناکامی دشمنوں کا مقدر بن جائے گی۔ تم دونوں مل جاؤ تو بڑی کامیابیاں حاصل کرو گے۔“

وہ مایوسی سے سر ہلا کر بولی۔ ”یہ ممکن نہیں ہے۔ وہ میرے ساتھ کبھی راضی نہیں رہے گا۔“

”سمجھنا چاہو تو اپنی کمزوریوں اور غلطیوں کو سمجھو کہ وہ تم سے راضی کیوں نہیں رہتا ہے۔ اس کے مزاج کے مطابق ڈھل جاؤ گی تو وہ ضرور تمہارا دوست بن جائے گا۔“

”میں ہتھیلی پر انگارے رکھ کر قسم کھاؤں گی کہ اس کی تابع دار دوست بن کر رہوں گی، تب بھی وہ یقین نہیں کرے گا۔“

”تم اپنے دماغ سے یہ احمقانہ خیال نکال دو کہ اسے اپنا غلام بنا سکو گی اور اس کے ساتھ راتیں گزار سکو گی۔ وہ ان مردوں میں سے ہے جو عیاش عورتوں کو گھاس نہیں ڈالتے۔“

”میں عیاش نہیں ہوں۔ صرف اس کی طلب گار ہوں۔ میں کتنے ہی شہ زور اور خوبرو جوانوں کو ٹھکرا چکی ہوں۔ وہ مجھے ٹھکراتا ہے تو مجھ سے غصہ برداشت نہیں ہوتا۔“

”پھر تو لکھ لو کہ وہ ٹھکراتا رہے گا اور تم غصہ دکھاتی رہو گی۔ دوستی کبھی نہیں ہو سکے گی۔“

”میری وجہ سے آپ کو کروڑوں کا نقصان پہنچا ہے۔ میں جلد ہی یہ نقصان پورا کروں گی لیکن اس مغرور سے

"دوستی نہیں کروں گی۔ اسے تو دیکھتے ہی گولی ماردوں گی۔"

وہ تنہائی میں سوچتی تھی اور مانتی تھی کہ اس کی دیوانی ہوگئی ہے۔ اسے یاد آتا تھا کہ مندر کی تاریکی میں وہ کس طرح اس پر حاوی ہوگیا تھا۔ وہ اس کے بوجھ تلے پھڑپھڑاتی رہی تھی شاید اس لیے کہ دل رہائی حاصل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ داوری عورت...!

وہ کرتی بھی کیا...؟ یہی سب کچھ پیار سے چاہتی تھی اور وہ دھتکار دیتا تھا۔ یہ بے عزتی تو وہ بھول نہیں سکتی تھی کہ اس نے اسے بے لباس کرکے گھر سے لے جا کے بیچ بازار میں چھوڑ دیا تھا۔ جیسے وہ کوئی گری پڑی بازاری عورت ہو۔

اس نے ماسٹر کوبوبو سے کہا۔ "میرا جی چاہتا ہے وہ ابھی سامنے آئے اور میں اس کی بوٹی بوٹی کردوں۔ آپ انتظار کریں۔ یہ نہ سمجھیں کہ میں جھنجلا کر ڈینگیں ماررہی ہوں۔ میں جلد ہی انڈر ورلڈ کے وینکٹ راؤ کو اس کی لاش کا تحفہ دوں گی۔"

ماسٹر نے کہا۔ "جب اپنی حسرت پوری کرلو گی تو ہم تمہاری برتری مان لیں گے۔ ابھی جاؤ، آرام کرو۔ مجھے جگ دیو سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

وہ وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ جگ دیو نے دروازے کو اندر سے بند کرنے کے بعد کہا۔ "یس ماسٹر! وہ جا چکی ہے۔ اس نے اب تک کوئی کام نہیں دکھایا ہے۔ باتیں بڑی بڑی کرتی ہے۔"

کوبوبو نے کہا۔ "لندن اور اسکاٹ لینڈ میں اس نے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں۔ مراد کے مقابلے میں اس لیے مات کھارہی ہے کہ عقل سے نہیں جذبات سے کام لیتی ہے۔ اب اس نے قسم کھائی ہے کہ مراد سے جذباتی لگاؤ نہیں رکھے گی۔ اسے دیکھتے ہی گولی ماردے گی۔"

جگ دیو نے کہا۔ "اگر واقعی وہ مراد پر کامیاب قاتلانہ حملہ کرے گی تو ہمیں نقصان پہنچے گا۔ ہمیں سب سے پہلے مراد کی سیکیورٹی کو اہمیت دینی ہوگی۔"

"بے شک، مراد ایک انمول ہیرا ہے۔ ہم نہیں چاہیں گے کہ اسے ذرا سا بھی نقصان پہنچے۔ ایسا کرو کہ ابھی مرینہ سے ایک اور اہم کام لو۔ اگر وہ اب بھی ناکام رہی تو اس سے نجات حاصل کرلو۔"

"یس ماسٹر! یہی ہوگا۔ ہم اسے ایک چانس دیں گے۔ ایک اور معاملے میں اسے آزمائیں گے۔"

"مراد کل ہی سرحد پار کرنا چاہتا ہے۔ اسے پوری سیکیورٹی کے ساتھ یہاں سے جانے دو۔"

"میں انتظام کرتا ہوں۔ یہ کام ہوجائے گا۔"

مراد بہت خوش تھا۔ اب سے تیس بتیس گھنٹے بعد ایک ماروی کی صورت دیکھنے والا تھا۔ اس سلسلے میں سوچ رہا تھا کہ وہاں پہنچتے ہی ماروی سے ملنا چاہیے یا نہیں؟ دانش مندی یہ ہوگی کہ وہاں پہنچنے کے بعد دو چار روز چھپ کر رہے اور حالات کا جائزہ لیتا رہے۔ کسی طرح دشمنوں کے ارادوں سے آگہی حاصل کرتا رہے اور محبوب ایسا تھا جو دوست بھی تھا اور دشمن بھی۔ واقعی دانش مندی یہی ہوتی کہ وہاں پہنچ کر ماروی سے ملنے کی جلدی نہ کرتا۔ دل نہ مانتا تو کہیں سے چھپ کر اسے دیکھ لیتا۔

وہ سرحد پار کرنے کے لیے کار ڈرائیو کرتا ہوا دہلی سے جے پور آرہا تھا۔ پھر جے پور سے دوسرے دن بارڈر پار کرنے کے لیے اس علاقے میں جانے والا تھا جہاں سے ایک رات ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑا ہوا آیا تھا۔ ماروی سے دور ہوکر جس راستے سے آیا تھا اسی راستے سے واپس جانے والا تھا۔

اگرچہ وہ جرائم کی دنیا کا ہوکر رہ گیا تھا۔ بڑے حوصلے اور جواں مردی سے اپنا ایک مقام بنا رہا تھا تاہم گمراہی سے کروڑوں روپے کما کر اپنی جانِ حیات کے پاس جا رہا تھا۔

مرینہ جے پور میں تھی۔ پچھلی رات ناکامی کے بعد جگ دیو کے پاس آئی تھی۔ وہاں اس نے فون کے ذریعے ماسٹر کوبوبو سے باتیں کی تھیں۔ پھر اس سے باتیں کرنے کے بعد جھنجلا کر رہ گئی تھی۔ وہاں سے چپ چاپ آرام کرنے کے لیے ایک ریسٹ ہاؤس کی طرف جارہی تھی۔

ایسے وقت اس نے مراد کو دیکھا۔ اسے دیکھتے ہی تن بدن میں آگ لگ گئی۔ یہ قسم کھا چکی تھی کہ اس کا سامنا ہوتے ہی اسے گولی ماردے گی لیکن وہ جگہ فائرنگ کے لیے مناسب نہیں تھی۔ ٹریفک زیادہ تھا، گولی مارنے کے بعد آسانی سے فرار کا راستہ نہ ملتا۔ وہ قانونی گرفت میں آنے والی کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

وہ فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب کرنے لگی۔ سوچ رہی تھی کہ کیا ہی اچھا ہو کہ وہ کسی ویرانے کی طرف جائے پھر وہ آسانی سے اسے شوٹ کرسکے گی۔ یہ اس کی زندگی اور موت کی طرح ایک بہت ہی اہم خواہش تھی۔

لیکن یا حیرت...! اس نے پندرہ یا بیس منٹ کے بعد ہی شدید حیرانی سے دیکھا۔ مراد کی کار جگ دیو کے بنگلے کے احاطے میں جا کر رک گئی تھی۔ وہ تو یہی جانتی تھی کہ مراد

انڈر ورلڈ کے وینکٹ راؤ کے لیے کام کرتا ہے پھر وہ جگ دیو کے پاس کیوں آیا تھا؟

مرینہ نے وہاں سے دور اپنی گاڑی روکی تھی۔ اُدھر سے ان کی نظروں میں نہیں آسکتی تھی۔ پھر اس نے دیکھا جگ دیو اپنے بنگلے سے نکل کر مسکراتا ہوا آیا اور بڑی خوشی سے دونوں بازو پھیلا کر مراد سے گلے مل رہا تھا۔ اسے بڑی عزت سے اپنے بنگلے کے اندر لے جارہا تھا۔

مرینہ کے دیدے حیرت سے پھیل گئے تھے۔ جگ دیو دشمن کے ایسے آدمی سے گلے مل رہا تھا جس نے کروڑوں روپے کا نقصان پہنچایا تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں انہیں حاصل ہونے والی مائیکرو فلم بھی چھین کر لے گیا تھا۔

یہ سنا تھا کہ دوستی کی آڑ میں دشمنی کی جاتی ہے لیکن یہ کبھی نہیں سنا تھا اور نہ دیکھا تھا کہ دشمنی کی آڑ میں دوستی کی جاتی ہے۔

وہ سمجھنا چاہتی تھی کہ مراد وہاں جگ دیو سے دوستی کرنے آیا ہے یا پہلے ہی سے ان کے درمیان درپردہ دوستی چلی آرہی ہے؟

اس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا کہ وہ ایک ہفتہ پہلے رہائش کے لیے دہلی گئی تھی اور مراد کو معلوم ہوگیا تھا کہ وہ دہلی آگئی ہے۔ وہ اس کی رہائش گاہ تک بھی پہنچ گیا تھا۔ مائیکرو فلم کی لین دین کا معاملہ بہت ہی سیکرٹ تھا۔ انتہائی رازداری کے باوجود مراد اس مندر میں پہنچ گیا تھا۔

اس کے ذہن میں یہ سوال چیخ رہا تھا۔ کیا جگ دیو اس کے بارے میں مراد کو معلومات فراہم کرتا رہا ہے؟ وہ جگ دیو کے بنگلے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ آنکھوں سے دیکھ کر یقین نہیں آرہا تھا کہ ایسے شخص کے ماتحت رہ کر کام کررہی ہے جو اس کے جانی دشمن سے دوستی رکھتا ہے۔

جگ دیو کا ایک خاص ماتحت گنگو... بنگلے سے نکل کر اسی راستے پر آرہا تھا جہاں وہ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ مرینہ نے کہا۔ "میں ابھی جگ دیو سے ملنے جا رہی ہوں۔ تم کہاں جارہے ہو؟"

وہ جلدی سے بولا۔ "دیو بھیا تو گھر میں نہیں ہیں۔ وہ کسی سے ملنے گئے ہیں۔"

وہ بولی۔ "تم میرے ساتھ آؤ۔ میں جہاں جارہی ہوں وہاں تمہارے جیسے گائڈ کی ضرورت ہے۔"

وہ اس کے ساتھ آکر کار میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ "کسی سے ٹکراؤ تو نہیں ہے؟ میرے پاس ایک بھرا ہوا ریوالور ہے۔ فاضل گولیاں نہیں ہیں۔ کیا گھر سے اور لے لوں؟"

وہ بولی۔ "میرے پاس بہت ہیں۔ فکر نہ کرو۔"

وہ تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتی ہوئی شہر سے باہر ایک کچے راستے پر آگئی پھر اس نے ایک ویران سی جگہ پہنچ کر گاڑی روک دی۔ اپنا ریوالور نکال کر اسے نشانے پر رکھتے ہوئے کہا۔ "دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھو۔"

وہ حیرانی سے بولا۔ "یہ کیا کررہی ہو؟"

"کوئی بات نہ کرو۔ فوراً ہاتھ اٹھاؤ۔"

اس نے دونوں ہاتھ پیچھے گردن پر رکھ لیے۔ مرینہ نے اس کے لباس کے اندر ہاتھ ڈال کر ریوالور نکال لیا۔ پھر پوچھا۔ "مراد اور جگ دیو کی دوستی کب سے ہے؟"

"مراد سے دوستی کیوں ہوگی؟ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"وہ ابھی جگ دیو کے ساتھ اس بنگلے میں ہے اور تم جھوٹ بول رہے تھے کہ جگ دیو باہر کسی سے ملنے گیا ہے۔"

وہ چپ رہا، مرینہ نے کہا۔ "کوئی بات بنائے بغیر فوراً جواب دو۔ مراد دشمن نہیں ہے۔ اپنا ہی آدمی ہے۔ وہ وینکٹ راؤ کے لیے نہیں، ماسٹر کوبوبو کے لیے کام کررہا ہے۔"

"میں نہیں جانتا، وہ کس کے لیے کام کررہا ہے۔"

مرینہ نے اس کے گھٹنے میں گولی ماری۔ وہ تکلیف کی شدت سے چیخنے لگا۔ وہ اس کی طرف کا دروازہ کھول کر اسے دھکا دیتے ہوئے بولی۔ "باہر جاؤ۔"

وہ کار سے باہر نکلتے نکلتے زمین پر گر پڑا۔ اپنی زخمی ٹانگ کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بولا۔ "مجھے نہ مارو۔ میں سچ بول رہا ہوں۔ مراد کو وینکٹ راؤ کے آدمیوں نے اغوا نہیں کیا تھا۔ تمہیں دھوکا دینے کے لیے اغوا کا ناٹک رچایا گیا تھا۔"

"مجھے دھوکا کیوں دیا جارہا ہے؟"

"تم سے مراد کی بنتی نہیں ہے۔ ماسٹر تم دونوں کو الگ رکھ کر دیکھنا چاہتا ہے کہ تم میں سے کون زیادہ کام آنے والا شاطر ہے۔"

مرینہ نے کہا۔ "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ جب آزمانا ہی تھا تو مجھ سے ناانصافی کیوں کی گئی؟ ہم دونوں کو ایک دوسرے کے مقابلے پر رکھنے کے دوران اسے مجھ سے باخبر رکھا گیا اور مجھے اس سے بے خبر رکھا گیا۔ ایسے میں مراد نے مردانگی دکھا کر کون سا کمال کیا ہے۔ آئندہ میں اس سے باخبر اور محتاط رہ کر کمالات دکھاؤں گی۔"

وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولا۔ "آئندہ تمہارا اس سے سامنا نہیں ہوگا۔ وہ یہاں نہیں رہے گا۔ کل رات

بارڈر پار کر کے پاکستان چلا جائے گا۔“

یہ مرینہ کے لیے ایک نئی اور اہم اطلاع تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا واقعی وہ پاکستان جا رہا ہے؟“

”ہاں کل رات کو دیو بھیا اسے سرحد پار کرائے گا۔“

وہ تکلیف سے کراہتا ہوا زمین سے اٹھنے لگا۔ وہ بولی۔ ”کیوں اٹھ رہے ہو؟ زمین پر ہی آرام کرو۔“

یہ کہتے ہی اس نے دوبارہ ٹریگر کو دبایا۔ دو گولیاں اس کے جسم میں اتار دیں۔ اس نے ابھی جو کہا تھا' وہی ہوا۔ وہ زمین پر ہی ہمیشہ کے لیے آرام کرنے لگا۔

وہ شہر کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ غصے سے دماغ گرم ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ بہت بڑا فراڈ ہو رہا تھا۔ اسے اتفاقاً معلوم ہو گیا تھا کہ مراد و ینکٹ راؤ کا نہیں ماسٹر کو بو بو کا آدمی ہے۔

یہ معلوم نہ ہوتا تو وہ اندھیرے میں ہی رہتی اور دھوکا دینے والے ماسٹر کو بو بو اور جگ دیو سے وفاداری کرتی رہتی اور ایسی اندھی وفاداری میں کسی دن مراد کے ہاتھوں ماری جاتی۔

وہ کار ڈرائیو کرتی ہوئی دانت پیس کر بڑبڑائی۔ ”مراد تم... تم پاکستان جاؤ گے؟ اونہہ! تمہارا تو باپ بھی نہیں جا سکے گا۔ اب میں باخبر ہوں اور تم بے خبر ہو۔

”یہ نہیں جانتے کہ کس طرح شب خون مارنے والی ہوں۔ تم دیکھو گے کہ بے خبری میں شہ زور بھی کیسے مارے جاتے ہیں۔“

مراد واقعی بے خبر تھا۔ اس کو اور جگ دیو کو اور ماسٹر کو بو بو کو یہ نہیں معلوم ہونے والا تھا کہ وہ اپنے ساتھ ہونے والے فراڈ سے واقف ہو چکی ہے۔ آئندہ میٹھی چھری بن کر انہیں کاٹنے والی ہے۔

مراد جگ دیو سے مل کر یہ طے کر چکا تھا کہ کل رات اسے سرحد پار پہنچا دیا جائے گا۔ وہ کل تک بے پور میں رہے گا پھر شام کو سرحدی بستی میں آ جائے گا۔

جگ دیو نے کہا۔ ”مرینہ یہاں آئی ہوئی ہے، تم کل تک مجھ سے ملاقات نہ کرنا۔ میں آج رات کو یا کل صبح تک اسے کسی کام سے دہلی روانہ کر دوں گا۔“

اسی وقت مرینہ نے فون پر جگ دیو سے کہا۔ ”ہیلو جگ دیو...! ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔“

اس نے کہا۔ ”ہاں بولو۔“

اس نے کہا۔ ”مجھے دہلی شہر بہت بھا گیا ہے۔ وہاں رہنے کا مزہ آ رہا ہے۔ خوب انجوائے کر رہی ہوں۔ یہاں بے پور میں میرا کوئی کام نہیں ہے۔ تم کہو تو دہلی چلی جاؤں؟“

وہ اس کے دل کی بات کہہ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ تمہارا یہاں کوئی کام نہیں ہے۔ تمہیں دہلی میں ہی رہنا چاہیے۔ وہاں رہو گی تو مراد پر نظر رکھ سکو گی۔ میں یہ معلوم کر کے بتاؤں گا کہ وہ وہاں کس علاقے میں رہتا ہے۔“

وہ بولی۔ ”یہ تمہاری مہربانی ہو گی۔ وہ میری نظروں میں آئے گا تو میں اس سے اپنی ناکامی کا انتقام لے سکوں گی۔“

”ہم یہی چاہتے ہیں۔ اس کمبخت نے ہمیں کروڑوں کا نقصان پہنچایا ہے۔ تم دہلی پہنچو، میں جلد سے جلد اس کے متعلق معلومات حاصل کر رہا ہوں۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔ مرینہ نے اسے بہت ہی غلیظ گالیاں دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ کیسے دوغلے اور کمینے ہیں۔ میرے ساتھ کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ مجھے دہلی بھیجا جا رہا ہے تاکہ میں یہاں رہ کر مراد سے ان کی یاری دوستی کو آنکھوں سے دیکھ سکوں اور مراد کے سرحد پار کرنے کے معاملے میں رکاوٹ نہ بنوں۔

”یہ کمینے کتنی خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔ میں ان کی کمینگی کی ایسی سزا دوں گی کہ ماسٹر کو بو بو مراد کی لاش کو بھی سرحد پار نہیں کرا سکے گا اور جگ دیو کو بھی اس کی مکاریوں سمیت جہنم میں پہنچا دوں گی۔“

وہ کار ڈرائیو کرتی ہوئی ریسٹ ہاؤس کے احاطے سے نکل کر مین روڈ پر آ گئی پھر وہاں سے تقریباً بیس کلومیٹر دور ایک چھوٹے سے ٹاؤن میں آ کر رک گئی۔ وہیں ایک رات گزارنے کا ارادہ تھا۔

شام ہونے تک ایک پولیس اسٹیشن سے جگ دیو کو اطلاع دی گئی کہ انہیں شہر سے دور ایک کچے راستے کے قریب گنگا رام عرف گنگو کی لاش ملی ہے۔ وہ آ کر اسے دیکھ لے۔

جگ دیو پولیس والوں کی مٹھیاں گرم رکھتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ گنگو اس کا دستِ راست ہے۔ کسی دشمن سے اس کی ٹھن گئی ہو گی۔ وہ اسے گولی مار کر روپوش ہو گیا ہے۔

جگ دیو نے پولیس اسٹیشن میں گنگو کی لاش دیکھی۔ وہ حیرانی سے سوچنے لگا کہ اپنے ہی علاقے میں اس کے دستِ راست کو ہلاک کرنے کی جرأت کس نے کی ہے؟

اس کی پر اسرار ہلاکت سمجھ میں آنے والی نہیں تھی۔ مرینہ کے پہلے حملے نے اسے الجھا کر رکھ دیا تھا۔ وہ اور مراد اس بات سے بے خبر تھے کہ آج رات کے بعد دوسری رات وہ جھنجلائی ہوئی شیرنی ان پر بھی حملہ کرنے والی ہے۔

ابھی مراد اپنی ماروی سے ملنے کی مسرتوں میں مست

تھا۔ اس نے فون کو بڑے پیار سے دیکھا جیسے رخِ روشن کو دیکھ رہا ہو پھر اسے مخاطب کیا۔ ”ہیلو مراد کی زندگی! مراد کی جان! کیسی ہو؟“

وہ بولی۔ ”بہت خوش ہوں۔ تم آ رہے ہو لیکن تمہارے آس پاس گولیاں چلتی رہتی ہیں۔ میں تصور میں دیکھتی ہوں تو گھبراہٹ طاری ہونے لگتی ہے۔“

وہ مسرتوں کو بھول کر اداس ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ”میں جن حالات سے گزر رہا ہوں' وہ مجھے مجرم بناتے جا رہے ہیں اور میرے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ کرتے جا رہے ہیں۔

”اکثر سوچتا ہوں کہ تمہیں اپنی دلہن بنا کر تم سے امن و سکون چھین رہا ہوں۔ یہ سراسر خود غرضی ہے۔ میں اپنے ساتھ تمہیں بھی عذاب میں مبتلا کرنے والا ہوں۔“

”نہیں مراد! ایسی باتیں نہ کرو۔ تم مجھے دلہن نہیں بناؤ گے تو میں جدائی کے عذاب میں مبتلا ہو جاؤں گی۔ تم ہی میرا امن اور سکون ہو۔ تم ہو تو دنیا ہے۔ ورنہ کچھ نہیں ہے۔“

”تمہاری والہانہ محبت مجھے نئی زندگی نئے حوصلے دیتی ہے۔ اللہ نے چاہا تو تمہاری سلامتی اور سیکیورٹی کے ایسے انتظامات کروں گا کہ کوئی دشمن تمہارے سائے تک بھی نہیں پہنچ پائے گا اور یہ بن لو کہ میں تمہیں محبوب صاحب سے بھی دور کر دوں گا۔ ان سے ملنے نہیں دوں گا۔ وہ کسی بھی وقت آستین کے خنجر ثابت ہو سکتے ہیں۔“

”میں تمہاری ہوں۔ تمہارے حکم کے مطابق ان سے دور ہو جاؤں گی لیکن سچی بات یہ ہے کہ وہ ہمارے دشمن نہیں لگتے۔ انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ میں تمہیں چھوڑ دوں اور ان کی منکوحہ بن جاؤں۔“

”ہاں، وہ بڑی حکمتِ عملی سے تمہیں متاثر کرتے آ رہے ہیں۔ انہوں نے اب تک بڑی مہربانیاں کی ہیں۔ بڑے احسانات کیے ہیں۔ اب بھی یہ کہہ کر نیکی کر رہے ہیں کہ تمہیں ایک مجرم کی شریکِ حیات نہیں بننا چاہیے۔ پہلے مجھے قبلہ درست کرنا چاہیے پھر شادی کرنا چاہیے۔“

اس نے ایک ذرا توقف سے کہا۔ ”اور قبلہ درست کرنے تک اور تمام مجرموں سے نجات حاصل کرنے تک جوانی گزر جائے گی بلکہ زندگی ہی گزر جائے گی۔“

وہ بولی۔ ”ٹھیک ہے کہ وہ میری بہتری اور سلامتی کی باتیں کرتے ہیں۔ وہ اپنے طور پر درست ہیں۔ ہم بھی اپنی جگہ درست ہیں' ہم اپنی محبت کے تقاضے پورے کریں گے۔“

”کیا وہ روز تمہارے پاس آتے ہیں؟“

”روز فون پر باتیں کرتے ہیں۔ کبھی کبھی آ جاتے ہیں۔ میں کل حضرت عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر منت مانگنے جاؤں گی کہ تم آ جاؤ گے تو دیگیں پکواؤں گی۔“

”ہاں ماروی! غازی بابا کے دربار میں ضرور دعا مانگنے جاؤ۔ وہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ ہمارے حق میں دعائیں ضرور قبول ہوں گی۔“

”محبوب صاحب اور معروف صاحب مجھے تنہا کوٹھی سے باہر جانے نہیں دیتے۔ کل چاچی تو ساتھ ہوں گی محبوب صاحب بھی ہوں گے۔ سمیرا نے فون پر کہا تھا کہ وہ بھی میرے ساتھ چلے گی۔“

”میں بھی یہاں دعائیں مانگتا رہوں گا۔ تم دیکھو گی کہ جلد ہی تمہارے پاس آؤں گا۔“

اس نے یہ نہیں بتایا کہ کل رات اپنے ملک کی زمین پر قدم رکھنے والا ہے اور پرسوں صبح کراچی پہنچ کر دور ہی دور سے چھپ کر اپنی جانِ حیات کی صورت دیکھنے والا ہے۔

☆☆☆

سمیرا جانتی تھی کہ معروف جگی اور حماد صدیقی نے ماروی کو محبوب کی دلہن بنانے کے لیے کیسی پلاننگ کی ہے۔ جبکہ وہ خود محبوب کی دلہن بننے کے خواب دیکھتی آ رہی تھی۔

وہ اپنی پلاننگ کے مطابق ماروی کو اغوا کرانے کے بعد جو ڈرامے پلے کرنے والے تھے، اس کے نتیجے میں ماروی مجبور ہو کر اپنا تن من محبوب کے حوالے کر دیتی اور یہ سمیرا کو منظور نہیں تھا۔

وہ بہ ظاہر ان کی پلاننگ میں شریک تھی لیکن دل میں عہد کر چکی تھی کہ ماروی کو اغوا ہونے نہیں دے گی اور اسے محبوب کی زندگی میں آنے کے لیے زندہ رہنے نہیں دے گی۔

وہ پچھلے دو دنوں سے سوچ رہی تھی کہ اس خوبصورت بلا کو محبوب کی زندگی سے کس طرح دور کر سکتی ہے پھر ایک ہلکا سا' کچا پکا سا خاکہ اس کے ذہن میں آیا کہ اسے اوپر پہنچانے کے لیے وہ کیا کر سکتی ہے؟ سوچنے سے کوئی نہ کوئی الٹی سیدھی تدبیر احمقوں کے ذہن میں بھی آ ہی جاتی ہے۔

وہ کچھ کر گزرنے کے لیے محبوب کے ساتھ ماروی کی کوٹھی میں آ گئی۔ ماروی چاچی کے ساتھ جانے کے لیے تیار تھی۔ محبوب کی کار میں آ کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ دیوانے نے عقب نما آئینے میں اسے حسرت سے دیکھا۔ وہ اس کی برابر والی سیٹ پر آ کر بیٹھ سکتی تھی۔ کچھ تو ہمسفر ہونے کی خوشیاں دے سکتی تھی۔

سمیرا نے اوپری دل سے کہا۔ ”ماروی! یہاں

سامنے آؤ۔ محبوب صاحب کے ساتھ بیٹھو۔"

وہ بولی۔ "وہاں تمہیں بیٹھنا چاہیے۔ میں یہاں چاچی کے ساتھ رہوں گی۔"

محبوب نے کہا۔ "مراد آنے والا ہے۔ یہ پرائی ہونے والی ہے۔ اسے اپنایت کے لیے نہ کہو سمیرا...! یہ ابھی سے پرائی ہوگئی ہے۔ تم آؤ میرے ساتھ بیٹھو۔"

وہ خوش ہوکر اس کے برابر آکر بیٹھ گئی۔ محبوب کے ساتھ ہمیشہ مسلح گارڈز ہوا کرتے تھے۔ وہ تین گارڈز دوسری گاڑی میں تھے۔ محبوب کی کار کے پیچھے وہاں سے چل پڑے۔

جمعرات کا دن تھا۔ سمندر کے کنارے غازی بابا کے مزار پر عورتوں، مردوں، بچوں اور بوڑھوں کا میلا لگا ہوا تھا۔ محبوب کو بزرگانِ دین سے عقیدت تھی لیکن وہ کسی مزار پر حاضری دینے نہیں آتا تھا۔ پہلی بار ماروی کی خاطر آیا تھا۔

حضرت عبداللہ شاہ غازی کا مزار مقدس بہت بلندی پر ہے۔ ایک پختہ کشادہ سیڑھی سیدھی اوپر تک گئی ہے۔ وہاں آنے سے پہلے سمیرا کے ذہن میں وہی سیڑھی تھی۔ کئی بار سمیرا کی سازشی آنکھوں نے ماروی کو اس بلندی سے گرتے اور لڑھکتے ہوئے دیکھا تھا۔

ماروی، سمیرا، چاچی اور محبوب وہاں پہنچ گئے۔ اس سیڑھی کے نچلے پائدان پر آگئے۔ پھر اوپر جانے لگے۔

سمیرا دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھی۔ "اے غازی بابا...! یہاں سب اپنی بہتری کی دعائیں مانگنے آتے ہیں۔ میں بھی اپنی بہتری چاہنے آئی ہوں۔ یا غازی بابا...! محبوب علی چانڈیو میرے نام ہوجائیں۔ میں ان کی شریکِ حیات بن جاؤں۔ یہ میری پہلی دعا ہے یا غازی بابا...! میری دوسری دعا ہے کہ میرے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ دور ہوجائے۔

میں ماروی، مراد اور محبوب کی بہتری کے لیے دعا مانگ رہی ہوں۔ ان کی بہتری اسی میں ہے کہ ماروی ان کے درمیان نہ رہے۔ میرے راستے میں کبھی نہ آئے۔ آج اسی سیڑھی پر اس کی سانسیں پوری ہوجائیں۔

ماروی سر پر آنچل رکھے ایک ایک پائدان پر قدم رکھتی ہوئی زیرِ لب پڑھتی جارہی تھی۔

"لاحول ولا قوۃ الّا باللہ۔ اللہ تعالیٰ قوی ہے قادرِ مطلق ہے۔ تمام قوتیں اللہ تعالیٰ پر ختم ہیں۔

"یا اللہ! یا میرے پاک پروردگار! میرے اور مراد کے حالات بدل دے، ہمیں سلامتی عطا فرما۔ لاحول ولا قوۃ الّا باللہ۔"

چاچی اس کے ساتھ سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ محبوب ان کے پیچھے تھا۔ اوپر جانے اور نیچے اترنے والوں کی بھیڑ تھی۔ وہ سب اوپری حصے میں آگئے۔ وہاں ایک طرف بہت لوگ عبادت میں مصروف تھے۔ دوسری طرف عورتوں اور مردوں کی بھیڑ تھی۔

ماروی نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔ "یا اللہ! حضرت عبداللہ شاہ غازی کے وسیلے سے میری کھوئی ہوئی یادداشت میرا کھویا ہوا ماضی مجھے واپس کردے میرے مالک!

"یا اللہ! مراد کو مجرموں کی دنیا سے نکال کر عزت اور شرافت کی زندگی گزارنے کی راہ پر پہنچا دے۔ میں بچپن سے اس کے نام ہوں۔ مجھے اس کی شریکِ حیات بنادے میرے اللہ! آمین۔"

سمیرا دعا مانگ رہی تھی۔ "یا غازی بابا...! نہ ماروی کی یادداشت واپس آئے گی، نہ وہ مراد کی دلہن بن پائے گی۔ اگر یہ زندہ رہی تو معروف صاحب اور حماد اسے محبوب صاحب کی دلہن بنا دیں گے۔ اس سے پہلے اسے موت آجائے بابا...! ہم سب کی مشکلیں آسان ہوجائیں بابا...! مجھے حوصلہ دو۔ میں اسے اوپر پہنچا کر سب کی مشکلیں دور کرکے نیکی کماؤں...

جتنے بندے ہیں، اتنے ہی ان کے مقاصد اور ارادے ہیں۔ اپنے ارادوں کے مطابق کوئی آگ لگانے کی دعائیں مانگتا ہے، کوئی آگ بجھانے کے لیے پانی مانگتا ہے۔ کوئی زہر مانگتا ہے، کوئی آبِ حیات طلب کرتا ہے اور یہ خدا کی قدرت ہے کہ وہ دعائیں قبول کرنے والا قادرِ مطلق نہ قبول کرنے والی دعائیں بھی قبول کرلیتا ہے۔ یہ وہی بہتر جانتا ہے کہ محبت کرنے والوں کے خلاف نفرت کرنے والوں کی مرادیں کیوں پوری کرتا ہے؟

واپسی میں وہ سب اس سیڑھی کے اوپری سرے پر آئے تو عورتوں اور مردوں کی آمد و رفت زیادہ ہوگئی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ ماروی کا ہاتھ سمیرا کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے محبوب کو دکھانے کے لیے اسے محبت سے تھام رکھا تھا۔ اس بلندی پر آتے ہی اس نے اپنا دل مضبوط کیا۔ حوصلہ کیا پھر محبوب کی اور چاچی کی نظریں بچا کر اسے زور کا دھکا دے دیا۔

ماروی نے گرتے گرتے اس کی شیطانی حرکت دیکھی۔ ایسا دھکا لگا تھا کہ وہ سنبھل نہ سکی۔ چیخیں مارتی ہوئی لڑھکتی ہوئی نیچے جانے لگی۔ چاچی بھی چیخنے لگی۔ محبوب نے

چونک کر اسے دیکھا پھر لوگوں کو دھکے دیتا ہوا ماروی کے پیچھے دوڑنے لگا۔ عورتیں گھبرا کر ایک طرف ہونے لگیں، اپنے مردوں کے ساتھ گرنے پڑنے سنبھلنے لگیں۔

اوپر کے پہلے پائدان پر گرتے ہی اس کے سر پر ایسی چوٹ لگی تھی کہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اس تاریکی میں کن پستیوں کی طرف لڑھکتی جارہی ہے۔ بہت زیادہ بھیڑ کے باعث وہ دور تک لڑھکتی ہوئی نہیں گئی۔ لوگوں نے اسے روک لیا۔ محبوب اسے آوازیں دیتا ہوا اس کے پاس پہنچا۔ پھر اسے دونوں بازوؤں میں تھام کر دیکھا۔ سر اور چہرہ لہو سے بھیگ رہا تھا۔ وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔

اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔ محبوب اسے بازوؤں میں اٹھا کر تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا جانے لگا۔ چاچی بھی اس کے پیچھے دوڑتی جارہی تھی۔ سمیرا سیڑھی کے اوپری سرے پر گم صم کھڑی رہ گئی تھی۔

وہ سوچ رہی تھی۔ "محبوب صاحب اسے اٹھا کر لے گئے ہیں۔ اس کا مطلب ہے وہ زندہ ہے۔ نیچے زیادہ دور تک لڑھکتی جاتی تو مر جاتی۔ ہوسکتا ہے اسپتال جاتے جاتے مر جائے۔"

یہ سوچ کر گھبراہٹ طاری ہوگئی کہ وہ بچ گئی تو کیا ہوگا؟ اس نے سمیرا کو دھکا دیتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ زندہ رہ گئی تو بیان دے گی کہ سمیرا نے اسے مارنے کی کوشش کی تھی۔ پھر کیا ہوگا؟ جس کی دلہن بننا چاہتی ہے، وہ محبوب کیا اسے زندہ چھوڑے گا؟

وہ سوچتی ہوئی سیڑھی سے اترنے لگی۔ اس کی دعا قبول ہوئی تھی۔ وہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔ "یا غازی بابا...! یہ ادھوری قبولیت ہے۔ اسے اسپتال پہنچنے سے پہلے مرجانا چاہیے۔ ورنہ ڈاکٹر اسے بچالیں گے۔

یا غازی بابا...! میں آپ کی کرامات دیکھنا چاہتی ہوں۔ بس یہ آخری دعا ہے۔ ڈاکٹر اسے بچا نہ سکیں۔"

اور ماروی نے بھی اپنی اور مراد کی سلامتی کی دعائیں مانگی تھیں۔ اس کی دعائیں کسی کو نقصان پہنچانے کے لیے نہیں تھیں۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ دونوں عورتیں ایک دوسرے کی ضد تھیں پھر دونوں کی مرادیں کیسے پوری ہوں گی؟

وہ باہر سڑک پر آئی تو محبوب کی کار نہیں تھی۔ اس نے اس کا انتظار نہیں کیا تھا۔ ماروی ہمیشہ سے اہم رہی تھی۔ اس وقت اور زیادہ اہم ہوگئی تھی۔ وہ اسے اسپتال لے گیا تھا۔ وہ فون کرکے معلوم کرسکتی تھی کہ کس اسپتال میں گئے ہیں۔ لیکن ہمت نہیں ہورہی تھی۔ عقل اسے روک رہی تھی۔ وہ اسپتال جاتی تو ماروی ہوش میں آتے ہی اس پر انگلی اٹھاتی پھر سب ہی ملامت کرتے۔ اس پر لعنت بھیجتے۔ وہ اقدامِ قتل کی مرتکب ہوچکی تھی۔

اس نے معروف بھٹی سے فون پر کہا۔ "ہم غازی بابا کے دربار میں ہیں۔ ماروی سیڑھی سے گر کر بے ہوش ہوگئی ہے۔ محبوب اسے کسی اسپتال میں لے گئے ہیں۔ وہ ابھی پریشان ہوں گے۔ اس لیے ان سے فون پر نہیں پوچھا کہ اسے کس اسپتال میں لے گئے ہیں۔ پلیز آپ معلوم کریں۔"

معروف بھٹی نے کہا۔ "تم فکر نہ کرو۔ میں معلوم کرتا ہوں۔"

وہ فون بند کرکے ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے گھر کی طرف جانے لگی۔ تھوڑی دیر بعد معلوم کرنا چاہتی تھی کہ وہ زندہ بھی ہے یا نہیں؟ اگر زندہ ہے تو اس کے خلاف ضرور بول رہی ہوگی۔

وہ گھر آکر فون کال کا انتظار کرنے لگی۔ اسے یقین تھا کہ محبوب ماروی کا بیان سنتے ہی فون پر اس کی ایسی کی تیسی کرنے گا۔ لیکن ایک گھنٹا گزرنے کے بعد بھی کوئی کال نہیں آئی۔

اس نے خوش ہوکر سوچا۔ "کیا وہ مرگئی ہے؟"

اس نے حوصلہ کرکے فون پر محبوب کو مخاطب کیا پھر پوچھا۔ "ماروی کیسی ہے؟"

اس نے کہا۔ "ابھی تک بے ہوش ہے۔ ڈاکٹر کہہ رہا ہے، دماغ کو چوٹ پہنچی ہے۔ آج رات تک یا صبح تک ہوش میں آئے گی۔ میں پریشان ہوں پھر کسی وقت بات کروں گا۔"

رابطہ ختم ہوگیا۔ اس کی پریشانی بڑھ گئی۔ یہ تو معلوم ہوگیا کہ اسے موت نہیں آئی ہے۔ وہ زندہ ہے اور اس کے خلاف بیان دینے کے لیے کسی وقت بھی ہوش میں آنے والی ہے۔

اس نے جھنجلا کر خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "خدا کرے وہ گونگی ہوجائے، اس کی قوتِ گویائی ختم ہوجائے تو سمجھوں گی کہ دعا قبول ہوگئی ہے۔"

اس نے صوفے پر آکر دعا مانگنے کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ خیال آیا کہ وہ [illegible] نے کبھی دینوی تعلیم [illegible] کی ہتھیلیں دی .... پھر بڑے دنوں کے بعد اسے یاد آیا کہ مسلمان اسی طرف منہ کرکے نماز پڑھتے ہیں اور دعائیں مانگتے ہیں۔ وہ گھوم کر قبلہ رو ہوگئی پھر اس کے ذہن

میں سوال پیدا ہوا کہ اگر اس نے کبھی قرآن مجید کو پڑھا ہوتا تو معلوم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ دعا صرف اللہ تعالیٰ سے مانگی جاتی ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی مرادیں پوری کرتا ہے۔ بزرگانِ دین اور اولیائے کرام دعاؤں کی قبولیت کا وسیلہ ہوتے ہیں۔

وہ تعلیم یافتہ تھی لیکن دین کے معاملات میں سراسر جاہل تھی، دل سے دعا مانگی۔ ''یا غازی بابا! ماروی کو کبھی ہوش نہ آئے۔ وہ بے ہوشی کی حالت میں چل بسے۔ اگر ہوش میں آئے تو ایک بار پھر اس کا دماغ پھر جائے۔ وہ مجھے بھول جائے۔ اسے یاد نہ رہے کہ میں نے اسے دھکا دے کر گرایا تھا۔''

اس نے پہلی بار ماروی کو راستے سے ہٹانے کے لیے بڑی ہمت سے ایک کوشش کی تھی اور وہ کوشش اسے مہنگی پڑ رہی تھی۔ اس کا سکون برباد ہو رہا تھا۔ اس نے پھر ایک گھنٹے بعد فون پر محبوب سے پوچھا۔ ''کیا ماروی کو ہوش آیا؟''

اس نے کہا۔ ''نہیں، پتا نہیں خدا کو کیا منظور ہے؟ اتنی طویل بے ہوشی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔''

وہ بولی۔ ''اللہ بہتری کرے گا۔ اس کے لیے دعائیں مانگ رہی ہوں۔''

''ہاں سمیرا...! اس کے لیے دعا کرو۔ یہ آنکھیں بند کیے بستر پر پڑی ہے۔ ہم اسے آوازیں نہیں دے سکتے۔ یہ ہماری آواز سن نہیں سکتی۔ ہمیں دیکھ نہیں سکتی۔ ایسے وقت صرف دعا کا ہی سب سے بڑا سہارا رہ جاتا ہے۔''

ماروی کو اسپتال وارڈ کے ایک کمرے میں رکھا گیا تھا۔ محبوب اس کے بیڈ سے لگا بیٹھا تھا۔ وہ بے ہوشی کی حالت میں اور زیادہ معصوم اور پُرکشش لگ رہی تھی۔ دل اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ اگر چاچی نہ ہوتی، وہ اسپتال کا کمرا نہ ہوتا تو وہ بے اختیار اس کے پاس آ کر اس سے لپٹ جاتا۔ شاید چومنے سے وہ ہوش میں آ جاتی۔ دیوانگی میں دل ایسے ہی مچلتا ہے۔ دوسرا دیوانہ سرحد پار تھا۔ اس نے فون پر اسے پکارا۔ اس کا فون چاچی کے پاس تھا۔ وہ بولی۔ ''بیٹے مراد! یہ تمہاری آواز نہیں سن سکے گی۔ پچھلے چار گھنٹوں سے بے ہوش پڑی ہے۔''

ایک عاشق کے لیے یہ دل دہلا دینے والی اطلاع تھی۔ اس نے تڑپ کر پوچھا۔ ''کیا ہوا ہے میری ماروی کو؟''

چاچی اسے بتانے لگی کہ وہ کس طرح سیڑھی سے گر پڑی تھی۔ اپنے مراد کی سلامتی اور واپسی کے لیے دعا مانگنے گئی تھی۔ اب وہ سب اس کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہے ہیں۔ اسے ہوش نہیں آ رہا ہے۔ وہ آنکھیں نہیں کھول رہی ہے۔

حیرانی اور پریشانی میں وہ سوچ رہا تھا۔ ''میری ماروی کے ساتھ ایسا دوسری بار ہوا ہے۔ پہلے بھی اونچائی سے ڈھلان میں لڑھکتی ہوئی ایک بڑے پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہو گئی تھی اور طویل بے ہوشی کے بعد ہوش میں آئی تھی۔''

مراد مضطرب ہو کر ٹہل رہا تھا۔ کبھی ادھر جا کر کھڑکی کے باہر دیکھتا، کبھی ادھر آ کر دروازے کے پاس باہر یوں دیکھتا تھا جیسے ابھی دوڑتا ہوا ماروی کے پاس پہنچ جائے گا۔

رات کے نو بجے تھے۔ وہ اگلے تین گھنٹے بعد آدھی رات کو سرحد پار کر کے ہی ماروی تک پہنچ سکتا تھا۔ اس وقت وہ سرحد سے تیس کلومیٹر دور ایک چھوٹی سی بستی میں تھا۔ وہاں کے رہنے والے اس بستی کو دیوانگری کہتے تھے۔ اسے جگ دیو نے آباد کیا تھا۔

وہاں جتنے مرد، عورتیں اور کمسن لڑکے لڑکیاں تھے، وہ سب اسمگلنگ کے دھندے میں ملوث تھے۔ دیوانگری کے سب ہی لوگ جگ دیو کے تابع دار اور جاں نثار تھے۔ مراد وہاں شام کو آیا تھا اور آدھی رات کے بعد اپنی ماروی کے پاس جانے والا تھا۔

مرینہ ان کی موت کا سامان کر چکی تھی۔ اس نے فون کی سم بدل کر بارڈر آرمی کے ایک اعلیٰ افسر کو میسج Send کیا۔

''بی الرٹ آفیسر...! یہ تمہارے لیے ہاٹ انفارمیشن ہے۔''

''بی الرٹ۔ دو روز پہلے ریکارڈ روم سے ایک سیکرٹ فائل کی معلومات چرائی گئی تھیں۔ اور اس چرانے والے ریکارڈ روم کے انچارج کی لاش پرانے مندر میں پائی گئی تھی۔ کسی شک و شبہے کے بغیر اسے قتل کرنے والا اور سیکرٹ فائل کی مائیکروفلم لے جانے والا ایک پاکستانی جاسوس ہے۔ تم اس جاسوس کو گرفتار کر سکتے ہو۔''

آفیسر نے تحریری میسج کے ذریعے پوچھا۔ ''تم کون ہو؟ فوراً ہمارے پاس آؤ۔ اسے گرفتار کراؤ۔ تمہیں تعظیم دی جائے گی۔ انعام بھی دیا جائے گا۔''

مرینہ نے لکھا۔ ''میں دیش بھگت ہوں۔ میں نہ شہرت چاہتا ہوں، نہ مجھے انعام کا لالچ ہے۔ ہمارے دشمن کا ایک راز اس مائیکروفلم میں ہے۔ وہ پاکستانی جاسوس آج اس مائیکروفلم کو سرحد پار لے جا رہا ہے۔ اگر آپ نے ابھی سے کارروائی شروع کی تو وہ محتاط ہو جائے گا۔ نہ سرحد پار کرے گا، نہ آپ کی گرفت میں آئے گا۔''

آفیسر نے کہا۔ ''تم ہمیں نہ سمجھاؤ۔ ہم جانتے ہیں کہ رات کی تاریکی میں کس طرح اسے گھیر کر گرفتار کریں گے۔ تمہاری دیش بھگتی کا شکریہ۔ کبھی مناسب سمجھو تو یہاں آ کر ہم سے ملاقات کرو۔''

مرینہ نے رابطہ ختم کر دیا۔ وہ جے پور کے قریب ایک چھوٹے سے ٹاؤن میں تھی۔ اس نے شوہر بن کر رہنے والے کیشو کو دہلی سے بلا لیا تھا۔ دیوانگری سے پچاس کلومیٹر دور رندھاوا نامی بستی میں ایک مکان کرائے پر لیا تھا اور اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ آج رات کیا کرنا ہے؟

وہ رات کی تاریکی پھیلنے کے بعد کیشو کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر دیوانگری سے کچھ دور آ کر رک گئی پھر اس سے کہا۔ ''بارڈر یہاں سے تقریباً پچیس یا تیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ رات کے سناٹے کے باوجود وہاں سے چلنے والی گولیوں کی آواز شاید سنائی نہیں دے گی۔

''ویسے اُدھر سے بھاگنے دوڑنے والے اِدھر سے گزر سکتے ہیں۔ یہاں ریت کے اونچے ٹیلے ہیں۔ تم کسی ٹیلے کے پیچھے گاڑی لے جانا۔ میں تم سے فون پر رابطہ رکھوں گی۔''

اس نے کار سے باہر آ کر شاٹ گن اور گولیوں کا تھیلا شانوں سے لٹکایا۔ ایک ریوالور ہاتھ میں لیا پھر وہاں سے جاتے ہوئے تاریکی میں گم ہو گئی۔

رات کے دس بجے جگ دیو نے مراد کے پاس آ کر کہا۔ ''آج شام کو بستی کے لوگوں نے آرمی کی ایک جیپ کو اِدھر سے گزرتے دیکھا ہے۔ بہت دنوں بعد آرمی والے اِدھر سے گزرے ہیں۔ سوچتا ہوں انہیں کسی طرح کا شبہ تو نہیں ہوا ہے؟''

مراد نے مایوس ہو کر پوچھا۔ ''کیا تم خطرہ محسوس کر رہے ہو؟ میں جا تو سکوں گا نا؟''

''ضرور جاؤ گے۔ ہم تو خطرات کا سامنا کرتے ہی رہتے ہیں۔ تمہارے لیے بارڈر کراس کرنے کا یہ پہلا تجربہ ہوگا۔''

مراد نے کہا۔ ''اگر آرمی نے اٹیک کیا تو میری فکر نہ کرنا۔ جب تک موت نہیں آئے گی نہیں مروں گا۔ کسی طرح یہاں سے نکل بھاگوں گا۔''

وہ بولا۔ ''ہمیں یہاں سے تیس کلومیٹر تک چھپتے ہوئے پیدل جانا ہوگا کیونکہ رات کو گاڑی کی آواز دور تک جائے گی۔''

''میں اپنی ماروی تک پہنچنے کے لیے دنیا کے آخری سرے تک پیدل جا سکتا ہوں۔ کیا اب ہم چلیں؟''

''ہاں چلو۔ میں تمہیں آدھی رات تک سرحد پار کرا دوں گا۔''

وہ دونوں گن اور ہلٹس کے بیگ اپنی اپنی پشت پر لاد کر مکان سے باہر آئے۔ جگ دیو کے دو جاں نثار وہاں منتظر تھے۔ وہ بھی ساتھ ہو گئے۔

بستی کی عورتیں اور مرد اپنے گھروں سے نکل آئے تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں چھوٹا بڑا اسلحہ تھا۔ ایک بوڑھے نے کہا۔ ''جگ دیو! تو ہمیں ساتھ نہیں لے جا رہا ہے، اچھا نہیں کر رہا ہے۔''

جگ دیو نے کہا۔ ''دادا میں نے کہا نا...... آج دشمنی کرنے والے اسمگلروں سے نہیں، آرمی سے خطرہ ہے۔ ان سے مقابلے کے لیے میرے ساتھ آؤ گے تو وہ اس بستی کو اجاڑ کر رکھ دیں گے۔ تم سب کو ان کی نظروں میں نہیں آنا چاہیے۔''

ایک عورت نے کہا۔ ''ہم تمہاری بات مانتے ہیں۔ تم وعدہ کرو، مصیبت آئے گی تو ہمیں فون کرو گے۔ ہم آندھی کی رفتار سے تمہارے پاس آئیں گے۔''

وہ ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے بولا۔ ''وعدہ کرتا ہوں۔ مجھے مدد کی ضرورت ہوئی تو ضرور کال کروں گا۔''

وہ بستی سے باہر آ گئے۔ رات کے پچھلے پہر چاند نکلنے والا تھا۔ ابھی تاریکی تھی۔ ادھر کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ کبھی کبھی ٹارچ روشن کرتے جا رہے تھے۔

وہ آگے بیس کلومیٹر تک بے باکی سے چلتے رہے پھر ٹارچ بجھا دی۔ اپنے اپنے فون کے سوئچ آف کر دیے۔ بہت محتاط ہو کر دائیں بائیں دیکھتے ہوئے جانے لگے۔

تاریکی میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ آگے چھ سات کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد انہوں نے ریتیلی زمین پر گھٹنے ٹیک دیے پھر گھوڑوں کی طرح چاروں ہاتھ پاؤں سے چلنے لگے۔

سرحدی تار کانٹے وہاں سے ایک ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر رہ گئے تھے۔ تب ہی جگ دیو نے پیش آنے والے خطرے کو دیکھ لیا۔ سرگوشی میں کہا۔ ''زمین پر لیٹ جاؤ۔''

مراد اور دونوں جاں نثار لیٹ گئے۔ جگ دیو نے

مراد کے قریب ہو کر کان میں کہا۔ "دائیں طرف دیکھو۔ دو ٹیلے سے سرخ دھبے نظر آرہے ہیں۔ ہمارا کوئی دشمن ہے۔ وہ اینٹی ڈارک لینس پہنے ہوئے ہے۔"

مراد نے دیکھا۔ ان سے بہت دور بلّے کی آنکھوں کی طرح چمک نظر آرہی تھی۔ پھر اور دو آنکھیں پھر اور دو آنکھیں دکھائی دیں۔ یہ اندازہ ہوا کہ دشمن ایک ایک کرکے اینٹی ڈارک لینس پہنتے جارہے ہیں اور تاریکی میں دور تک دیکھنے کی کوشش کررہے ہیں۔

وہ چاروں ریت پر اوندھے منہ پڑے ہوئے تھے اس لیے انہیں نظر نہیں آرہے تھے۔ وہ سانپوں کی طرح رینگتے ہوئے آگے جاسکتے تھے لیکن احتیاط لازمی تھی۔ یہ اندیشہ تھا کہ زمین پر گھسٹنے کی آواز وہاں تک جاسکتی ہے۔

وہ دم سادھے وہیں پڑے رہے۔ پھر وہ چمکتی ہوئی آنکھیں ایک ایک کرکے گم ہونے لگیں۔ انہیں کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ وہ اینٹی ڈارک چشمے اتار رہے تھے۔

وہ چاروں ٹھہر ٹھہر کر اوندھے منہ رینگنے لگے۔ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ فوجی انہیں ڈھونڈنے کے لیے کیا کریں گے؟

اچانک ہی ایک بڑی سی سرچ لائٹ آن ہوگئی۔ وہ سب روشنی میں نہا گئے۔ مراد نے بڑی پھرتی دکھائی۔ فوراً ہی کروٹ بدلتے ہوئے شاٹ گن کے ٹریگر کو دبایا۔ تڑاتڑ کی آواز کے ساتھ شیشے کا ایک چھناکا سا ہوا۔ سرچ لائٹ بجھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی پہلے جیسی تاریکی چھاگئی۔

جگ دیو اور اس کے ساتھیوں نے بجھی ہوئی لائٹ کی طرف اندھادھند فائرنگ کی۔ یکے بعد دیگرے تین چیخیں سنائی دیں۔ وہ چاروں زمین سے اٹھ کر ایک سمت بھاگنے لگے۔ ادھر سے بھی جواباً اندھادھند فائرنگ ہوئی۔ دو جاں نثاروں کی چیخوں کے علاوہ جگ دیو کی کراہ سنائی دی۔ مراد فوراً ہی زمین پر گر پڑا۔ ایک گولی سنسناتی ہوئی اس کے کان کے قریب سے گزری تھی۔

اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ "جگ دیو! تم ٹھیک تو ہو؟"

وہ کراہتے ہوئے بولا۔ "میری فکر نہ کرو۔ زمین پر رینگتے ہوئے ان کی شوٹنگ رینج سے دور جاؤ۔ پھر اٹھ کر دوڑو۔"

"سمجھ میں نہیں آتا، تاریکی میں کدھر جاؤں؟"

وہ پھر کراہتے ہوئے بولا۔ "جدھر بھی جاؤ۔ ان سے دور نکل جاؤ۔ میں تمہارے پیچھے آرہا ہوں۔"

وہ ریت پر تیزی سے رینگتے ہوئے جانے لگا۔ فائرنگ کی آواز سے پتا چل رہا تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کی ہلاکت کے بعد محتاط رہ کر ٹھہر ٹھہر کر آگے بڑھتے آرہے ہیں۔

وہ نہیں جان سکتا تھا کہ جگ دیو کتنا پیچھے رہ گیا ہے؟ اب وہ چاروں ہاتھ پاؤں کے بل تیزی سے جارہا تھا۔ فوجی بھی تاریکی میں اسے ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ بھی ایسے محتاط تھے کہ ٹارچ روشن کرنے کی غلطی نہیں کررہے تھے۔

البتہ ایک نے غلطی کی تھی۔ جگ دیو نے زمین سے اٹھ کر گولی ماردی۔ جواباً ایک گولی اسے بھی آکر لگی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ بارڈر پار کرنے والے کتنی تعداد میں آئے تھے۔ انہوں نے زمین پر رینگتے ہوئے قریب آکر جگ دیو کی لاش دیکھی۔ پھر ادھر ادھر رینگنے کے بعد دو اور لاشیں ملیں۔ بڑی دیر سے گولیاں نہیں چل رہی تھیں۔ ان کی سمجھ میں یہ آیا کہ وہ تین ہی تھے۔

انہوں نے ان کے لباسوں کی تلاشی لی تو مطلوبہ مائیکروفلم نہیں ملی۔ تب آفیسر نے کہا۔ "یہ صرف تین نہیں تھے۔ چوتھا بھی تھا اور وہی پاکستانی جاسوس ہوگا۔ مائیکروفلم اسی کے پاس ہوگی۔"

اس نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ "سرحدی تار کانٹوں کی طرف چلو۔ وہ ادھر گیا ہوگا۔"

وہ سب چاروں ہاتھ پاؤں سے رینگتے ہوئے ادھر جانے لگے۔ مراد نہیں جانتا تھا کہ کس سمت میں سرحدی تار کانٹے ہیں۔ وہ تاریکی میں بھٹک کر دوسری طرف نکل آیا تھا۔

وہ اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ دونوں پیروں سے دوڑتا ہوا کتنی دور نکل آیا ہے۔ جگ دیو نے زمین پر رینگتے وقت کہا تھا کہ بارڈر اب ایک یا ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر رہ گیا ہے۔

مراد ایک جگہ رک کر ہانپتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ "میں دو کلومیٹر سے بھی زیادہ دور آگیا ہوں لیکن کہیں تار کانٹوں کی رکاوٹ نہیں ہے۔ میں بھٹک گیا ہوں؟"

اس وقت پچھلے پہر کا چاند سرخی میں نہایا ہوا طلوع ہو رہا تھا۔ وہ ویرانہ سرخ چاندنی میں آگ کی طرح سلگتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔ وہ کسی گائیڈ کے بغیر تنہا اور بے یارومددگار تھا۔ چاروں طرف گھوم کر دیکھ رہا تھا۔ اسے دور تک تار کانٹے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ وہ پریشان ہو کر سوچنے لگا کہ میں الٹی سمت میں دوڑتا ہوا حد سے دور آگیا ہوں؟ یا خدا میں کدھر جاؤں؟

کسی سمت تو جانا تھا۔ پھر اسے ساتھ لے جانے کے لیے اچانک ہی ایک گولی آکر اس کے پاؤں میں لگی۔ اس کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ وہ اچھل کر گر پڑا۔ سائیلنسر لگے

پستول سے گولی چلی تھی۔ اس لیے آواز نہیں ہوئی تھی۔ وہ تکلیف برداشت کرتے ہوئے ریوالور کو مضبوطی سے تھام کر زمین پر لیٹا رہا۔ وہ سمجھنا چاہتا تھا کہ گولی کس سمت سے آئی تھی؟ پھر خاموش فائرنگ ہوئی۔ تین گولیاں آئیں اور اس کے آس پاس کی ریت اڑنے لگی۔ موت گونگی بن کر آرہی تھی۔ وہ جہاں تھا' وہیں دم سادھے پڑا رہا۔ ایک اندازہ ہوا کہ دائیں طرف جو ریت کا چھوٹا سا ٹیلا ہے' اس کے پیچھے سے فائرنگ ہو رہی ہے۔

پھر ادھر سے سریلی ہنسی سنائی دی۔ وہ ہنسنے کے بعد بولی۔ ''اپنی موت کو پیچھے لگانے والے...! میں آگئی ہوں۔''

وہ حیرانی سے اس ٹیلے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بول رہی تھی۔ ''جب تو اچانک مندر میں آیا تھا تو میں حیران رہ گئی تھی۔ اب تو حیران ہوگا کہ میں یہاں کیسے آگئی؟

''جواب میں کچھ کہنے سے پہلے یہ سن لے کہ جہاں ہے وہیں پڑے رہنا۔ وہاں سے ایک ذرا نہ ہلنا۔ اب جو گولیاں چلیں گی' وہ تجھے چھلنی کر دیں گی۔ اور تو جواباً فائر کرے گا تو دور تک آواز جائے گی۔ جن فوجیوں سے بچ کر آرہا ہے' وہ یہاں آجائیں گے۔''

مراد نے پوچھا۔ ''کیا تیری آواز دور تک نہیں جارہی ہے؟''

اس نے اپنی غلطی تسلیم کی۔ ''ہاں مجھے نہیں بولنا چاہیے۔ مجبوراً بول رہی ہوں۔ تو اپنی گن دور پھینک دے گا تو میں چپ چاپ تیرے پاس آؤں گی۔''

وہ سوچنے لگا کیا کرے؟

وہ ایک بلا کی طرح اچانک ہی نازل ہوئی تھی۔ فوراً ہی کوئی تدبیر نہیں سوجھ رہی تھی۔

وہ بولی۔ ''اچھی طرح سوچ لے۔ میں ہی تجھے یہاں سے دور لے جا سکتی ہوں۔ گن نہیں پھینکے گا' وہیں پڑا رہے گا تو فوجی کسی وقت بھی یہاں آجائیں گے۔ میں زیادہ انتظار نہیں کروں گی اور پانچ منٹ انتظار کروں گی۔ تو نے ہتھیار نہ پھینکا تو فائرنگ شروع کر دوں گی۔''

وہ جو کہہ رہی تھی' وہی ہونے والا تھا۔ وہ فوجیوں کی حراست میں نہیں جانا چاہتا تھا اور جس عورت کو اب تک مات دیتا آیا تھا' اس کے ہاتھوں مرنا نہیں چاہتا تھا۔

عقل مندی یہ تھی کہ فی الحال مرینہ کی بات مان لیتا۔ بعد میں اس کے شکنجے سے نکلنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ وہ بولا۔ ''یہ دیکھو، میں گن پھینک رہا ہوں۔''

اس نے ریوالور کو ایک طرف پھینک دیا پھر اپنے شانے سے شاٹ گن کو بھی اتار کر اسے دور اُچھال دیا۔

وہ ٹیلے کے پیچھے سے نکل آئی۔ چاندنی میں صاف نظر آرہی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے ریوالور کو تھام کر اس کا نشانہ لیتی ہوئی محتاط انداز میں ٹھہر ٹھہر کر اس کی طرف آنے لگی۔ مراد نے اسے اچھی طرح دہشت زدہ کر رکھا تھا۔ اس کے دیدے ایسے پھیلے ہوئے تھے، جیسے مراد سے چپک گئے ہوں۔ وہ ذرا بھی ہلتا تو اسے گولی مار دیتی۔

وہ ایک ایک قدم قریب آتے ہوئے بول رہی تھی۔ ''میں نے قسم کھائی تھی کہ تجھے دیکھتے ہی گولی ماردوں گی مگر کیا کروں، تیری طلب میں ڈبل مائنڈڈ ہو جاتی ہوں۔

''آج تجھے ٹریپ کرنے کا منصوبہ بناتے ہوئے سوچا' اگر تو میرے شکنجے میں بے دست و پا رہے گا تو تجھے زندہ رکھوں گی اور تجھ سے سچ مچ دوستی نباہوں گی۔''

وہ اٹھ کر بیٹھ رہا تھا۔ اس نے ٹریگر کو دبایا۔ ایک گولی آکر اس کے بازو کو چھیدتی ہوئی گزر گئی۔ وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے پھر زمین پر لیٹ گیا۔

وہ قریب آکر بولی۔ ''تیرے دونوں ہاتھوں کو بیکار ہونا چاہیے تاکہ تو مجھ سے ہاتھا پائی نہ کر سکے۔''

اس نے دوسرے ہاتھ پر گولی ماری۔ وہ تڑپ کر رہ گیا۔ کبھی زبر کبھی زیر۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ بکری شیر بن گئی تھی۔ جو شیر تھا اسے قربانی کا بکرا بنا رہی تھی۔

اس نے پھر کہا۔ ''میں پوری پلاننگ کے ساتھ آئی ہوں۔ اس بار تیرا باپ بھی ہتھکڑی سے نہیں نکل سکے گا۔''

اس نے زمین پر دوزانو ہو کر اس کی دونوں کلائیوں میں ہتھکڑی پہنادی۔ پھر اٹھ کر فون پر کیشو سے رابطہ کیا۔ اس سے کہا۔ ''گاڑی لے آؤ۔ انہی ٹیلوں کے درمیان چلے آؤ۔ میں گاڑی کی آواز سنتے ہی ٹارچ کے ذریعے سگنل دیتی رہوں گی۔''

مراد کو تین گولیاں لگی تھیں۔ وہ گولیاں اسے زخمی کرتے ہوئے گزر گئی تھیں۔ زخم گہرے نہیں تھے لیکن وہ ہاتھ پاؤں ہلانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ ایک چھوٹی سی گن بھی نہیں پکڑ سکتا تھا۔

اس وقت چپ چاپ تکلیف برداشت کر رہا تھا اور ہونٹوں کو سختی سے بھینچ کر دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔ ''یہ دُنیا آکر دوبار میرے شکنجے میں آئی۔ میں نے اسے زندہ چھوڑ کر غلطی کی۔ اس بار تو نہیں چھوڑوں گا۔''

''یہ کیا ... میں ... ہتھکڑی سے نہیں نکل سکوں گا؟''

''ٹھیک ہے اسے خوش فہمی میں مبتلا رہنا چاہیے

اسے اچانک ہی دماغی جھٹکا پہنچاؤں گا۔ میرے زخموں کی مرہم پٹی تو ہو جائے۔''

کیشو گاڑی لے کر آگیا۔

☆☆☆

سمیرا کی نیند اُڑ گئی تھی۔ وہ تمام رات سو نہ سکی۔ یہ دھڑکا لگا رہا کہ میری آنکھ لگے گی' اُدھر ماروی کی آنکھ کھلے گی تو ہوش میں آتے ہی میرے خلاف بیان دے گی۔ آخر صبح ہوگئی۔ دوسرا آدھا دن بھی گزر گیا لیکن محبوب اور معروف کا فون نہیں آیا۔ اس طرح یہ سمجھ میں آرہا تھا کہ اسے ہوش نہیں آرہا ہے یا پھر آگیا ہے۔ اس کی سوچ سہمی ہوئی تھی۔ ''اگر ہوش آگیا ہے تو وہ میرے خلاف زہر اگل چکی ہوگی اور محبوب غصے میں بھرا ہوا مجھے گولی مارنے آرہا ہوگا۔''

اس نے پچھلی رات سے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ وہ جھنجلا کر سوچ رہی تھی۔ ''مجھے سکون کیسے ملے گا؟ وہ خود تو آرام سے بے ہوش پڑی ہے اور مجھے اندیشوں کے عذاب میں مبتلا کر رہی ہے۔ کہیں مر تو نہیں گئی؟'' اس نے فون پر محبوب کو مخاطب کیا۔ ''ماروی اب کیسی ہے؟''

وہ بولا۔ ''کیا بتاؤں؟ بس زندہ ہے۔ آنکھیں کھول دی ہیں۔ کچھ بولتی نہیں ہے۔''

سمیرا نے دل میں کہا۔ ''خدا کرے کبھی نہ بولے۔''

پھر پوچھا۔ ''ایسا کیا ہو گیا ہے کہ نہیں بول رہی ہے؟ ڈاکٹر کیا کہہ رہے ہیں؟''

''وہ پہلے کی طرح پھر ایک بار کوما میں پہنچ گئی ہے۔ پتا نہیں بیچاری کے ساتھ کیوں ایسا ہو رہا ہے۔''

سمیرا نے اطمینان کی سانس لی۔ ابھی خیریت تھی۔ وہ ہوش میں آتو گئی تھی لیکن بولنے کے قابل نہیں رہی تھی۔

اس نے دعا مانگی تھی کہ وہ مر جائے۔ ہمیشہ کے لیے اسے چپ لگ جائے لیکن پوری دعا قبول نہیں ہو رہی تھی۔ دعا کی ادھوری قبولیت نے سکون برباد کر دیا تھا۔ یہ تو سمجھ میں آنے والی بات تھی کہ جس طرح وہ بے ہوشی سے نکل آئی تھی' اسی طرح آج یا کل کوما سے بھی نکل آئے گی پھر بولنے لگے گی۔ کیا مصیبت ہے؟

وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ یہ شہر چھوڑ کر چلی جائے۔ نواب شاہ میں اپنے انکل کے ہاں اس وقت تک رہے جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کوما سے نکل آئی ہے اور اس نے مخالفت میں کوئی بیان نہیں دیا ہے۔

محبوب اس کی سلامتی اور صحت یابی کے لیے پریشان تھا۔ اسپتال سے نہیں جا رہا تھا۔ اس کی مجنوں جیسی حالت دیکھ کر معلوم ہو رہا تھا کہ دیوانے ایسے ہی ہوتے ہیں۔

بہرحال وہ زیادہ دیر تک کومے میں نہیں رہی۔ رات کے آٹھ بجے چاچی اور محبوب اس کے بیڈ کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ تب چاچی نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''سائیں... ! دیکھو، یہ حرکت کر رہی ہے۔''

وہ دونوں اٹھ کر اس کے قریب آئے۔ اس نے سر گھما کر انہیں دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے محبوب کے لیے عقیدت ظاہر ہو رہی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ چاچی کی طرف بڑھایا۔

چاچی نے اس کا ہاتھ تھام کر خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے دعائیں دیں۔ محبوب نے کہا۔ ''میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔''

وہ کمرے سے چلا گیا۔ چاچی نے کہا۔ ''سائیں کی حالت دیکھ رہی ہو۔ یہ تمہارے ہوش میں آنے پھر کوما سے نکلنے کے انتظار میں کل سے یہیں ہیں۔ نہ نیند پوری کی ہے نہ کچھ کھایا ہے۔''

ماروی نے پوچھا۔ ''کیا میں کل سے یہاں ہوں؟ یہ کون سی جگہ ہے؟ ہم تو ایک جنگل میں تھے۔''

چاچی نے حیرانی سے پوچھا۔ ''کیا کہہ رہی ہو...؟ جنگل میں...؟ ہم جنگل میں تھے...؟

''نہیں بیٹی! تم کراچی میں ہو۔ کل غازی بابا کے مزار پر دعائیں مانگنے گئی تھیں۔ وہاں سیڑھی سے گر کر بے ہوش ہوگئی تھیں۔''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ''نہیں چاچی! ہم سب جنگل میں تھے۔ اندھیری رات تھی۔ مرینہ مجھے مار ڈالنا چاہتی تھی۔''

چاچی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''میں اس سے بچنے کے لیے بھاگی تو گر پڑی۔ مجھے تو بس اتنا ہی یاد ہے کہ میں ایک ڈھلان میں لڑھکتی جا رہی تھی اور کسی پتھر سے ٹکرائی تھی پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔''

چاچی کا منہ بند نہیں ہو رہا تھا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ محبوب ڈاکٹر کے ساتھ آیا تو وہ پریشان ہو کر بولی۔ ''یہ کیسی باتیں کر رہی ہے؟ کہتی ہے سیڑھی سے نہیں گری تھی۔ ایک جنگل میں تھی۔ مرینہ اسے ہلاک کرنا چاہتی تھی۔ یہ ڈھلان سے لڑھکتی ہوئی ... بے ہوش ہو گئی تھی۔''

ڈاکٹر یہ باتیں سن رہا تھا۔ محبوب سوچتی ہوئی نظروں سے ماروی کو دیکھ رہا تھا۔ چاچی نے کہا۔ ''سائیں! اسے کراچی شہر اور غازی بابا کے دربار کی سیڑھی یاد نہیں

ہے۔ اب سے آٹھ مہینے پہلے جنگل میں جو حادثہ پیش آیا تھا' وہ اسے یاد ہے۔"

ڈاکٹر نے پوچھا۔ "کیا آٹھ ماہ پہلے بھی اس کے سر پر چوٹ لگی تھی اور یہ بے ہوش ہوگئی تھی؟"

محبوب نے کہا۔ "ہاں۔ اس وقت بھی ہوش میں آنے کے بعد کوما میں پہنچ گئی تھی۔ پھر کوما سے نکلی تو یادداشت گم ہو گئی تھی۔ یہ اپنی پچھلی تمام زندگی کو بھول گئی تھی؟"

ماروی نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ "نہیں۔ میں نہیں بھولی ہوں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔"

وہ تختی سے بولی۔ "چاچی! ہم بستی سے آگے ایک گاؤں میں آپ کی بہن کے گھر میں رہنے جا رہے تھے۔ ایسے وقت مرینہ ہمیں دھوکا دے کر کہیں لے جا رہی تھی۔

"جب ہمیں معلوم ہوا کہ سائیں محبوب جیل میں مراد کی جگہ ہیں اور مراد ہماری تلاش میں کہیں بھٹک رہا ہے اور مرینہ ہمیں دھوکا دے رہی ہے تو ہم اس سے پیچھا چھڑانے لگے۔"

اسے پچھلی تمام باتیں یاد آ رہی تھیں۔ وہ بول رہی تھی۔ "مرینہ ہماری دشمن ہو گئی تھی۔ مجھے مار ڈالنا چاہتی تھی۔ رات کے وقت جنگل میں بہت اندھیرا تھا۔ میں اس اندھیرے میں بھاگتے وقت ایک ڈھلان میں گر پڑی تھی۔"

پھر وہ محبوب سے بولی۔ "سائیں! آپ تو جیل میں تھے۔ وہاں سے فون کے ذریعے کئی بار مجھ سے باتیں کر چکے تھے۔ مجھے تمام باتیں یاد ہیں پھر کیوں کہتے ہیں کہ میری... یادداشت گم ہو گئی ہے اور میں پچھلی زندگی کو بھول گئی ہوں؟"

محبوب نے پوچھا۔ "کیا تمہیں یاد ہے کہ تم نے ہوش میں آنے کے بعد مجھے نہیں پہچانا تھا۔ مجھے تو کیا چاچی چاچا اور مراد کو بھی نہیں پہچانا تھا؟"

وہ بولی۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ابھی تو ہوش میں آئی ہوں۔ آپ سب کو پہچان رہی ہوں۔"

"ماروی! میں آٹھ ماہ پہلے کی بات کر رہا ہوں۔ اس وقت تم ڈھلان سے گری تھیں اور ایک بڑے پتھر سے ٹکرائی تھیں۔"

وہ حیرانی سے بولی۔ "کیا اس حادثے کو آٹھ ماہ گزر چکے ہیں...؟ نہیں... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

چاچی نے کہا۔ "سائیں سچ کہہ رہے ہیں۔ تم آٹھ مہینے تک اپنی پچھلی زندگی کو بھولی ہوئی تھیں۔ کل بہت اونچی سیڑھی سے گرنے کے بعد بے ہوش ہو گئی تھیں۔"

پھر وہ ڈاکٹر سے بولی۔ "یہ میری بیٹی کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ یہ آٹھ ماہ پہلے اپنی پچھلی زندگی کو بھول گئی تھی۔ آج اسے پچھلی تمام باتیں یاد آ رہی ہیں تو یہ بھول گئی ہے کہ تب سے اب تک آٹھ ماہ گزر چکے ہیں۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "میں آپ لوگوں کی باتیں سن رہا ہوں اور بہت کچھ سمجھ رہا ہوں۔ آپ اپنی بیٹی سے اور باتیں کریں۔ اس نے آٹھ ماہ کا عرصہ آپ کے ساتھ کیسے گزارا ہے؟"

چاچی نے ماروی سے کہا۔ "کیا تمہیں یاد ہے تمہاری یادداشت واپس لانے کے لیے ایک لیڈی ڈاکٹر عدیلہ تمہارے پاس آیا کرتی تھی؟"

ماروی نے انکار میں سر ہلایا۔ چاچی نے کہا۔ "مراد تو تمہیں یاد ہے اسے تو کبھی نہیں بھولو گی؟"

وہ بولی۔ "ہاں۔ اچھی طرح یاد ہے' وہ مجھے تلاش کرنے کے لیے بستی کی طرف گیا ہے۔"

"نہیں بیٹی! وہ ہندوستان میں ہے۔ تم سے روز فون پر باتیں کرتا ہے۔ اس نے تم سے کہا ہے کہ وہ ایک ہفتے کے اندر آئے گا اور تمہیں اپنی دلہن بنائے گا۔"

"مراد نے مجھ سے فون پر کبھی بات نہیں کی۔ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں کہ وہ ہندوستان میں ہے۔"

محبوب نے کہا۔ "تم بھی جانتی ہو کہ وہ انڈیا میں ہے۔ تم اس کی دلہن بننے کی باتیں فون پر کرتی ہو۔ میں نے اعتراض کیا تھا کہ تمہیں اس کی شریکِ حیات نہیں بننا چاہیے وہ مجرموں کی دنیا میں رہنے لگا ہے' خود ایک مجرم بن گیا ہے۔"

وہ بولی۔ "سائیں! میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں۔ خدا کے لیے اسے مجرم نہ کہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میرے دلہن بننے کی بات کیوں ہو رہی ہے۔ میں نے مراد سے شادی کی کوئی بات نہیں کی ہے۔"

محبوب کے اندر ایک چور خوشی نے کروٹ لی۔ اچانک ہی بازی پلٹ رہی تھی۔ وہ بھول گئی تھی کہ بڑی لگن سے روز فون پر اس کی دلہن بننے کی بات کیا کرتی تھی۔ تقدیر نے اسے مراد کے گھر جاتے جاتے روک دیا تھا اور محبوب کے لیے دروازے کھل رہے تھے۔ ماروی کو پھر اپنی طرف مائل کرنے کی راہیں ہموار ہونے والی تھیں۔

ڈاکٹر نے چاچی سے کہا۔ "آپ لوگوں کی باتیں سن کر یہ معلوم ہوا کہ آٹھ ماہ پہلے آپ کی بیٹی کو ایک حادثہ پیش آیا تھا۔ سر پر چوٹ لگی تھی۔ دماغ متاثر ہوا تھا اور یہ پچھلی زندگی کو بھول گئی تھی۔"

محبوب نے کہا۔ "یہ اپنے آپ کو بھی بھول گئی تھیں۔"

پھر اس نے ماروی سے پوچھا۔ "تم اپنے تمام ماضی کے ساتھ خود کو پہچان رہی ہو نا؟"

"بے شک خود کو پہچان رہی ہوں۔ مجھے بچپن سے لے کر اب تک کی تمام باتیں یاد ہیں۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "اب تک کی زندگی میں صرف آٹھ ماہ گزارنے والی زندگی کو بھول گئی ہو۔ کیا تم آٹھ ماہ کے دوران ہونے والی کوئی بات بتا سکتی ہو؟"

وہ بولی۔ "آپ لوگ کس آٹھ ماہ کی باتیں کر رہے ہیں میں سمجھ نہیں پا رہی ہوں۔ میں تو اتنا ہی جانتی ہوں کہ ایک جنگل کی اندھیری رات تھی۔ میں کہیں ڈھلان میں گر پڑی تھی۔ بے ہوش ہو گئی تھی۔ اب یہاں اسپتال میں آ کر مجھے ہوش آیا ہے۔"

چاچی نے کہا۔ "وہ جو حادثہ پیش آیا تھا اور تم بے ہوش ہو گئی تھیں۔ تب ہم تمہیں سکھر کے ایک اسپتال میں لے گئے تھے۔

یہ دوسری بار تمہیں حادثہ پیش آیا ہے۔ بیٹی...! ابھی تم کراچی کے ایک اسپتال میں ہو۔"

وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "تم اپنے ذہن پر زور نہ ڈالو۔ تمہارا سر زخمی ہے۔ دماغ کمزور ہے اور تھکا ہوا ہے۔ کوئی الجھی ہوئی بات نہ سوچو۔"

وہ چاچی سے بولا۔ "پلیز! اپنی بیٹی کے سامنے پچھلے آٹھ ماہ کی باتیں نہ کریں۔ نہ اسے کوئی بات یاد کرنے دیں۔ یہ یاد رکھیں' اس کا دماغ کمزور ہے۔ اس کے ذہن پر بوجھ ڈالا جائے گا تو یہ دماغی مریضہ بن کر رہ جائے گی۔ یاد کرنے کے لیے جبر کیا جائے گا تو یہ پاگل ہو جائے گی۔"

"خدا نہ کرے۔ میری بچی کو کوئی دماغی نقصان پہنچے۔"

وہ ماروی کا ہاتھ تھام کر بولی۔ "تم ڈاکٹر صاحب کی باتیں سن رہی ہو۔ خاک ڈالو پچھلے آٹھ مہینوں پر۔ کبھی اپنے دماغ پر بوجھ ڈال کر نہ سوچو کہ تم آٹھ مہینوں تک کہاں گم رہی تھیں؟ تم کہیں گم نہیں ہوئی تھیں۔ تم بچپن سے میرے پاس ہو۔ ان آٹھ مہینوں میں بھی میرے ساتھ ہی رہی ہو۔"

ڈاکٹر اس کا معائنہ کرنے لگا' اس نے پوچھا۔ "تم ذہنی اور جسمانی کمزوری محسوس کر رہی ہو؟"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ "نہیں ڈاکٹر...! میں چاچی کے ساتھ گھر جانا چاہتی ہوں۔"

وہ بولا۔ "تمہیں اور ایک دن آبزرویشن میں رکھا جائے گا۔ پھر تم جا سکو گی۔"

ڈاکٹر نے دوائیں لکھیں۔ اسے دودھ پینے اور پھل کھانے کی ہدایات کیں پھر چلا گیا۔

چاچا اس کے لیے تازہ پھل لے کر آیا۔ چاچی نے کہا۔ "یہ تم نے اچھا کیا۔ ڈاکٹر نے خوب کھانے پینے کو کہا ہے۔ میں ابھی دودھ گرم کر کے ڈبل روٹی لاتی ہوں۔"

وہ کمرے سے باہر آئی۔ محبوب نے اس کے ساتھ باہر آ کر کہا۔ "چاچی! ایک بات کہنا ہے۔"

"ہاں کہو۔ آج تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ اسے بچپن سے اب تک کی تمام باتیں یاد آ گئی ہیں۔"

"میں بھی بیان نہیں کر سکتا کہ میرے اندر کتنی خوشیاں بھر گئی ہیں۔ چاچی! میں یہ کہہ رہا تھا کہ مراد کا فون کسی وقت بھی آ سکتا ہے۔ آپ ماروی کو ابھی بات نہ کرنے دیں۔ پہلے آپ بات کریں۔"

چاچی مٹی نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولا۔ "مراد کو فون پر سمجھائیں کہ ماروی کا دماغ کمزور ہو چکا ہے۔ اس سے پچھلے آٹھ ماہ کی باتیں نہ کی جائیں۔ آپ کے سامنے ہی ڈاکٹر نے سختی سے تاکید کی ہے۔"

وہ بولی۔ "ہاں مراد کو اس کے تمام حالات بتاؤں گی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ دو چار روز میں آنے والا ہے۔"

"تعجب ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ وہ فون کیوں نہیں کر رہا ہے؟ جبکہ روز ماروی سے باتیں کرتا رہا ہے۔"

محبوب کو اپنی پڑی تھی۔ اس نے کہا۔ "چاچی! وہ فون کرے تو اسے خاص طور پر یہ ضرور کہنا کہ ماروی سے دلہن بننے والی باتیں نہ کرے۔ جب یہاں آئے گا تو دیکھا جائے گا۔"

چاچی نے وعدہ کیا کہ مراد کو یہی سمجھائے گی پھر وہ دودھ گرم کرنے چلی گئی۔ محبوب کے اندر کھلبلی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ جلد سے جلد مراد کی شادی خانہ آبادی کا معاملہ ختم کر دینا چاہتا تھا۔ تقدیر اسے موقع دے رہی تھی۔ ماروی مراد کی دلہن بننے والی بات بھول گئی تھی۔ وہ چاہتا تھا' اب کوئی اسے یہ بات یاد نہ دلائے۔ عقل سمجھا رہی تھی کہ رقیب بن کر رہے۔ مراد کو نقصان تو نہ پہنچائے لیکن ماروی سے اب صاف اور سیدھی پیار کی باتیں کرے۔ اسے کسی بھی طرح اپنی طرف مائل کر لے۔

چاچا کمرے سے نکل کر ڈاکٹر کی پرچی دکھاتے ہوئے بولا۔ "میں یہ دوائیں لینے جا رہا ہوں۔ ابھی آ جاؤں گا۔"

وہ چلا گیا۔ محبوب دروازہ کھول کر کمرے میں آیا۔ وہ بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک سیب تھا۔ وہ قریب آ کر اس کے ہاتھ سے سیب لے کر بولا۔ "لاؤ میں کاٹ کر دیتا ہوں۔"

وہ ایک کرسی پر بیٹھ کر پلیٹ سے چھری اٹھا کر سیب کے ٹکڑے کرنے لگا۔ پتلی پتلی قاشیں بنا کر اسے دینے لگا۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ پھر بولی۔ "آپ بہت اچھے ہیں۔"

اس نے مسکرا کر پوچھا۔ "صرف اچھا ہوں؟ کیا مجھ میں ایسی خوبیاں نہیں ہیں کہ کوئی میری محبت کا جواب محبت سے دے؟"

وہ سیب چبا رہی تھی۔ یکلخت رک گئی۔ منہ بند ہو گیا۔ سر بھی جھک گیا۔ وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ سوچ میں پڑ گئی۔

محبوب نے کہا۔ "رک کیوں گئیں؟ کھاتی رہو۔ میری کوئی بات بوجھ لگے تو کہہ دینا۔ میں وہ بات پھر نہیں کروں گا۔"

وہ آہستہ آہستہ چبانے لگی۔ گہری سنجیدگی سے کچھ سوچ رہی تھی۔ پھر بولی۔ "آپ بہت مہربان ہیں۔ آپ کی مہربانیاں اور احسانات اتنے ہیں کہ میں انگلیوں پر نہیں گن سکتی۔ آپ زبان سے نہیں کہتے۔ پھر بھی میرے لیے جو محبت' جو دیوانگی ہے' وہ ان احسانات کے پیچھے سے جھلکتی رہتی ہے۔"

"خدا کا شکر ہے۔ تم میری دیوانگی کو سمجھتی ہو۔"

"سمجھتی ہوں اور الجھتی رہتی ہوں۔ میرا دل' میرا دماغ اور میرا ضمیر کہتا ہے کہ آپ کی محبت کا جواب محبت سے دینا چاہیے۔"

"تم ایسا سوچ رہی ہو۔ میں خدا کا جتنا بھی شکر ادا کروں' کم ہے۔ میری محبت میرا حوصلہ دیکھو کہ میں اب تک تم سے مایوس نہیں ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا رہتا ہوں کہ مجھے ماروی سے محبت کا جواب دل کی سچائی سے اور دل کی محبت سے ملے۔"

"میری الجھن یہ ہے کہ مراد مجھے بچپن سے چاہتا ہے۔ اس کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دوں گی تو ایک پیار کرنے والے غریب سے ناانصافی ہو گی۔ میں بہت ڈرتی ہوں۔"

"کس بات سے ڈرتی ہو؟"

"میں نے اسے مایوس کیا تو وہ اپنی جان پر کھیل جائے گا۔ میرے بغیر زندہ نہیں رہے گا۔"

"تم نے مجھے مایوس کیا تو یہی خبر سنو گی کہ جان پر کھیل گیا ہوں۔ تم دیکھ چکی ہو کہ تمہارے لیے گولی کھا چکا ہوں۔ اپنے اربوں روپے کے کاروبار کو مٹی میں ملا رہا ہوں۔ خدا جانتا ہے' میں بھی تمہارے بغیر زندہ نہیں رہوں گا۔"

"میں جانتی ہوں۔ اسی لیے الجھتی رہتی ہوں' کسی کو

مایوس نہیں کر رہی ہوں۔"

"کب تک دونوں کی دلجوئی کرو گی؟"

"میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے۔ مجھے اسی بات پر عمل کرنا ہو گا۔ یہ سمجھ لیں کہ میں اپنے اندر ایک فیصلہ کر چکی ہوں۔"

محبوب کے ہاتھ سیب کاٹتے کاٹتے رک گئے۔ اس نے پوچھا۔ "کیا فیصلہ کیا ہے؟"

وہ بولی۔ "آپ کیوں رک گئے۔ میں بول رہی ہوں۔ آپ سنتے رہیں اور کھاتے رہیں۔"

اس نے ایک ٹکڑا منہ میں ڈال کر چبایا۔ ماروی نے کہا۔ "ایک ماں اپنے کئی بچوں سے پیار کرتی ہے۔ ہر بچے میں اس کی جان اٹکی ہوتی ہے۔ ایک بہن کئی بھائیوں کو محبتیں دیتی ہے۔ ہر بھائی پر قربان ہوتی رہتی ہے۔ پھر کیا ایک محبوبہ اپنے دو چاہنے والوں سے برابر پیار نہیں کر سکتی؟

"یہ سننے سے عجیب سا لگتا ہے۔ دنیا دو مردوں سے پیار کرنے والی کو فوراً ہی بے حیا کہے گی۔ لیکن میں خود کو بے حیا اس وقت سمجھوں گی جب کسی کے ساتھ بے حیائی کا کوئی قدم اٹھاؤں گی۔ یہ جو ایک عرصے سے ہماری محبت قدم بہ قدم بنی ہوئی ہے' اس کا تقاضا ہے کہ ہم جسمانی ہوس نہ رکھیں۔ کوئی ایسی خواہش نہ رکھیں' جو ایک کو بامراد اور دوسرے کو نامراد کرے۔"

محبوب سن رہا تھا اور جواباً کچھ کہنے کے لیے بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ بول رہی تھی۔ "ہم کسی غرض اور ہوس کے بغیر ایک دوسرے کو اپنی محبت اپنی توجہ دیں گے اور ایسی محبت پر فخر کریں گے۔ ساری دنیا سے زیادہ ایک دوسرے کو اہمیت دیتے رہیں گے۔ اگر ایسی محبت نہیں ہوتی ہے تو ہم کریں گے اور ایک نئی مثال قائم کریں گے۔"

محبوب نے کہا۔ "تم دنیا سے نرالی باتیں کر رہی ہو۔ ایسا کبھی ہوا ہے نہ ہو گا۔ ایک مرد اور عورت کے درمیان چاہے کتنی ہی سچی محبت ہو' جسمانی طلب ضرور ہوتی ہے۔"

وہ بولی۔ "ایسی طلب ہو تو آپ دونوں کسی سے بھی شادی کر لیں۔ یہ میرا فیصلہ ہے کہ میں کسی سے شادی نہیں کروں گی۔ دونوں میں سے کسی کو مایوس نہیں کروں گی۔ میں یہ قربانی دے رہی ہوں کہ اپنے دلہن بننے کا خواب پورا نہیں کروں گی۔ آپ دونوں کی خاطر بن بیاہی رہوں گی۔"

محبوب نے پوچھا۔ "اگر ہم دونوں میں سے کوئی شادی کرے گا اور تمہارا ہی دیوانہ رہے گا تو؟"

"تو دیوانہ رہے۔ میں تو اپنے فیصلے پر قائم رہوں گی۔ جو کنوارا رہنے کی اور شادی نہ کرنے کی قربانی دینے میں ناکام رہے گا' اس کی اہمیت کم ہو جائے گی۔"

وہ بولا۔ "پھر تو دوسرے کی اہمیت بڑھ جائے گی' تم اس کنوارے کی قدر کرو گی؟"

"ہاں۔ جو میرے لیے ہوس کو اہمیت نہیں دے گا اور میرے انتظار میں کسی اور کی طرف مائل نہیں ہو گا' میں اس کی دل و جان سے قدر کروں گی اور اسی کی منکوحہ بن جاؤں گی۔"

محبوب نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم چپ چپ سی رہتی ہو۔ تمہاری سوچ کا پتا نہیں چلتا۔ آج تم نے بڑی ذہانت سے یہ فیصلہ کیا ہے۔ تم اپنے دونوں چاہنے والوں کو مایوس نہیں کرو گی۔ دونوں کو برابر توجہ اور محبتیں دو گی۔ اس طرح ہمارے درمیان رقابت نہیں رہے گی۔

"دونوں کو آزماتی رہو گی کہ کون شادی اور عورت کے بغیر رہ سکتا ہے۔ جو نہیں رہ سکے گا وہ خود ہی کم تر ہو جائے گا۔ جو آزمائش میں کنوارا رہ جائے گا' تم اس کی دلہن بن جاؤ گی۔ آج تمہاری یہ فیصلہ کن باتیں سن کر میں بہت مطمئن ہو گیا ہوں۔ یہ یقین ہو گیا ہے کہ تم مراد کو مجھ پر ترجیح نہیں دو گی۔ میری محبت کا جواب ہمیشہ محبت سے دیتی رہو گی۔"

مٹی چاچی دودھ گرم کر کے لے آئی۔ ماروی کو سیب کھاتے دیکھ کر بولی۔ "شاباش بیٹی! کھاتی پیتی رہو۔ تمہارا بہت خون بہہ گیا ہے۔ بہت کمزور ہو گئی ہو۔"

محبوب نے کہا۔ "آپ اسے کھلاتی پلاتی رہیں گی تو یہ جلد ہی چلنے پھرنے اور دوڑنے کے قابل ہو جائے گی۔"

چاچی نے اس کے سامنے سرہانے کی میز پر دودھ کا پیالہ اور ڈبل روٹی رکھتے ہوئے کہا۔ "لو کھاؤ۔"

اسی وقت ماروی کے فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ چاچی نے کہا۔ "ضرور مراد ہو گا۔"

اس نے فون اٹھا کر کال کرنے والے کے نمبر پڑھے پھر مایوس ہو کر بولی۔ "مراد نہیں ہے۔ بلے ہے۔"

محبوب نے پوچھا۔ "یہ بلے کون ہے؟"

چاچی نے کہا۔ "مراد کا کوئی خاص آدمی ہے۔ یہاں اس کے لیے کام کرتا ہے' اس کے دشمنوں سے لڑتا ہے۔"

محبوب نے کہا۔ "یعنی مراد نہیں ہے لیکن اس کی مجرمانہ کارروائی یہاں بھی جاری ہے؟"

"سائیں! دشمنوں نے اسے بندوق چلانے پر مجبور کر دیا ہے تو وہ اور کیا کرے گا۔ یہاں ماروی کے پاس آنے سے پہلے اپنے دشمنوں کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔"

محبوب نے چور نظروں سے ماروی کو دیکھ کر کہا۔ "وہ

اسی طرح دشمنوں کو ختم کرنے کی دھن میں قاتل اور خطرناک مجرم بن چکا ہے۔ یہاں سے انڈیا تک گولیاں چلا رہا ہے۔ اپنے دشمنوں کی تعداد بڑھاتا جا رہا ہے۔"

ماروی نے کہا۔ "آپ مراد کے بارے میں ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟ مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔"

وہ بولا۔ "میں رقابت سے نہیں بول رہا ہوں۔ چاچی سے پوچھ لو۔ میری ایک بات بھی غلط نہیں ہے۔"

چاچی نے کہا۔ "ہاں بیٹی! تم تو پچھلے آٹھ مہینے کی باتیں بھول چکی ہو۔ ورنہ تم بھی جانتی تھیں کہ وہ بندوق اٹھا کر ایسا پھنسا ہے کہ مجرموں کی دنیا سے نکل نہیں پا رہا ہے۔ وہاں انڈیا میں پتا نہیں کیسی خطرناک زندگی گزار رہا ہے۔ یہاں بلّے کے ذریعے دشمنوں کو ختم کرا رہا ہے۔"

"اس کام کے لیے تم نے بلّے کو ایک لاکھ روپے دیے تھے۔ مراد نے فون پر تم سے کہا تھا کہ بلّے کو مزید رقم کی ضرورت ہو تو میری کال کا انتظار نہ کرنا اسے رقم دے دینا۔"

ماروی نے پریشان ہو کر کہا۔ "یا اللہ۔۔۔! مراد کیسی خطرناک زندگی گزار رہا ہے۔ چاچی! ابھی فون پر اس سے بات کراؤ۔"

وہ بولی۔ "میں کل سے دو بار اسے فون کر چکی ہوں۔ یہی جواب ملتا ہے کہ فون بند ہے۔ رابطہ نہیں ہو سکتا۔" پھر وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "بیٹی! میرا دل گھبرا رہا ہے۔ دعائیں مانگ رہی ہوں کہ وہ خیریت سے ہو۔"

فون سے پھر رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ ممی نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ "ہاں بلّے! میں تمہیں فون کرنے ہی والی تھی۔ مراد کا فون کل سے بند پڑا ہے۔ وہ کہاں ہے؟ خیریت سے تو ہے؟"

وہ بولا۔ "میں کیا بتاؤں؟ میرا بھی اس سے رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔ وہ ضرور کسی مصیبت میں ہے۔ ایسا ہوتا ہے چاچی! ہم کسی مصیبت میں پھنس جاتے ہیں تو کئی دنوں تک اپنے گھر والوں سے بات نہیں کر سکتے۔"

وہ بولی۔ "ایسی زندگی کیوں گزار رہے ہو؟"

"اپنی خوشی سے کون اپنا سکون برباد کرتا ہے۔ میں نے کل ہی اپنی بلّی سے شادی کی ہے۔۔۔"

وہ حیرانی سے بولی۔ "تم نے بلّی سے شادی کی ہے؟"

وہ جلدی سے بولا۔ "وہ دراصل اس کا نام بشریٰ ہے۔ میں اسے بلّی کہتا ہوں۔ شادی کے بعد پریشان ہو کر سوچ رہا ہوں کب دشمنوں سے نجات ملے گی۔ یہ اندیشہ رہتا ہے کہ میری طرف آنے والی گولی میری بلّی کو نہ لگ جائے۔ میں کوشش کروں گا کہ میرے اور مراد کے دشمن اس شہر سے ختم ہو جائیں۔ اسی لیے ابھی فون کیا ہے۔ مجھے دو لاکھ روپے کی ضرورت ہے۔ کیا مل سکتے ہیں؟"

وہ بولی۔ "ماروی بیمار ہے۔ شاید کل تک اسپتال سے چھٹی ہو گی تو ہم گھر جائیں گے۔ پرسوں آ کر چیک لے جاؤ اور کسی طرح مراد کی خیریت معلوم کرو۔"

"میں خود اس کے لیے پریشان ہوں۔ یہ نہیں جانتا کہ وہ انڈیا میں کہاں ہے؟ اب اسی کی کال آئے گی تو خیریت معلوم ہو گی۔ ٹھیک ہے میں پرسوں بینک ٹائم میں آؤں گا۔"

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ چاچی بڑبڑانے لگی۔ "مراد اسے بڑی بڑی رقمیں دے رہا ہے۔ یہ پہلے ایک لاکھ روپے لے گیا تھا۔ اب دو لاکھ مانگ رہا ہے۔"

محبوب نے پوچھا۔ "کیا آپ مراد سے پوچھے بغیر اسے یہ رقم دے دیں گی؟"

وہ بولی۔ "مراد نے ہی کہا تھا کہ کبھی ضرورت کے وقت اسے لاکھ دو لاکھ دے دیا کروں۔ مجھے رقم کی نہیں مراد کی فکر ہے۔ اس کا فون کیوں بند ہو گیا ہے؟"

پھر وہ محبوب کا حلیہ دیکھ کر بولی۔ "آپ کل سے اسپتال میں ہیں۔ ذرا آئینہ دیکھیں کیا حالت بنا رکھی ہے۔"

پھر وہ ماروی سے بولی۔ "بیٹی! یہ تمہیں چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے تھے۔ دن رات کبھی تمہارے کمرے کے اندر کبھی باہر بھٹکتے رہتے تھے۔ دیکھو تو اپنا کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔"

ماروی محبوب کو اپنا فیصلہ سنا چکی تھی۔ اب اپنی محبت ظاہر کرنے میں کوئی جھجک کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ وہ مسکرا کر بولی۔ "آپ میرے لیے پاگل ہو جاتے ہیں۔ اب تو دیوانگی سے باز آجائیں۔ چلیں اٹھیں اور سیدھے گھر جائیں۔ وہاں شاور لے کر فریش ہو کر کچھ کھائیں پئیں اور بھرپور نیند لیں۔"

وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "تم اتنے پیار سے کہہ رہی ہو تو جانا ہی ہو گا۔ میں دو تین گھنٹوں میں آجاؤں گا۔"

وہ بولی۔ "جی نہیں۔ میں نے کہا نا آپ صبح تک بھرپور نیند لیں گے۔ صبح آٹھ بجے سے پہلے نہیں آئیں گے۔ جب آئیں گے تو آپ کے ساتھ ناشتا کروں گی۔"

اس نے اب سے پہلے اتنی محبت اور اپنایت سے بات نہیں کی تھی۔ وہ نہال ہو رہا تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ رات بھر سوئے گا۔ صبح آئے گا۔ پھر وہ کمرے سے باہر آگیا۔ پہلی بار ایسی خوشی ملی تھی۔ وہ مسرتوں سے بھر گیا تھا۔ زمین پر چل رہا

تھا اور لگ رہا تھا کہ وہ خلا میں پرواز کر رہا ہے۔ وہ باہر آ کر کار میں بیٹھا تو کالنگ ٹون سنائی دی۔ ننھی سی اسکرین پر سمیرا کا نام تھا۔ اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا پھر کہا۔ "آہا سمیرا۔۔۔! تم کہاں ہو؟ آج میں بہت خوش ہوں آج مجھے ایک نئی زندگی ملی ہے۔"

سمیرا نے سہم سہم کر فون کیا تھا۔ اس کا خیال تھا ماروی نے ہوش میں آ کر ضرور کہا ہو گا کہ اسے سمیرا نے سیڑھی کی بلندی سے دھکا دیا تھا۔ پھر محبوب اس سے نفرت کرے گا لیکن وہ تو فون پر خوشی سے جیسے پاگل ہو رہا تھا۔

اس نے پوچھا۔ "بات کیا ہے؟ آپ بہت خوش ہیں۔ کیا ماروی ہوش میں آگئی ہے؟"

"ہاں۔ ایک عجیب سی بات ہوئی ہے۔ اس کی یادداشت واپس آگئی ہے۔ اسے پچھلی زندگی کی تمام باتیں یاد آگئی ہیں اور یہ تو میرے حق میں اچھا ہی ہوا ہے کہ وہ پچھلے آٹھ ماہ کی تمام باتیں بالکل ہی بھول گئی ہے۔ اسے یہ یاد نہیں ہے کہ اس نے مراد سے دلہن بننے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ گزرے ہوئے کل کی باتیں بھی بھول گئی ہے۔ یہ بھی یاد نہیں ہے کہ وہ کل شام غازی بابا کے دربار میں گئی تھی۔"

سمیرا سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اس نے جلدی سے پوچھا۔ "کیا سچ کہہ رہے ہیں؟ وہ بھول گئی ہے کہ وہاں سیڑھی سے گری تھی؟"

"ہاں کہہ تو رہا ہوں۔ اسے پچھلے آٹھ ماہ کی کوئی ایک بھی بات یاد نہیں ہے۔"

وہ فون پر بے اختیار چیخ پڑی۔ "یا غازی بابا۔۔۔!"

اس کے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔ وہ الزام سے بری ہو گئی تھی۔ یکلخت خوشی کے مارے رو پڑی۔ محبوب نے حیرانی سے سنا وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کیوں رو رہی ہو؟"

وہ بولی۔ "ماروی بہت اوپر سے گری تھی۔ اسے نئی زندگی ملی ہے۔ مجھے رونے دیں۔ میں خوشی سے رو رہی ہوں۔ غازی بابا نے میری دعائیں سن لی ہیں۔"

وہ بولا۔ "میری بھی دعائیں سن لی ہیں ہائے سمیرا۔۔۔! ماروی میری طرف لوٹ آئی ہے۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

محبوب نے کہا۔ "ابھی تم سے کہا ہے نا وہ اور باتوں کی طرح یہ بھی بھول گئی ہے کہ وہ مراد کی دلہن بننا چاہتی تھی۔ میرے لیے تو یہ معجزہ ہو گیا ہے۔ اب وہ آئے گا تو اس سے شادی نہیں کرے گی۔"

"کیا اس نے ایسا کہا ہے؟"

"آج اس نے میرے ساتھ تنہائی میں ایسی باتیں کی ہیں کہ میں ہواؤں میں اڑ رہا ہوں۔"

اس بار وہ صدمے سے رو پڑی۔ پھر یہی ہو رہا تھا۔ اس کی آدھی دعا قبول ہوئی تھی۔ وہ بہت بڑے الزام سے بچ گئی تھی۔ لیکن ماروی اس کے محبوب کو پھانسنے کے لیے زندہ رہ گئی تھی۔

آخر محبوب نے بھی دعا مانگی تھی۔ اس کی بھی دعا قبول ہوئی تھی۔ اسی لیے مراد سے ماروی کی شادی کھٹائی میں پڑ گئی تھی۔ اب وہ دعا اس کے محبوب کو ہواؤں میں اڑا رہی تھی۔

سمیرا سوچ رہی تھی ماروی نے بھی دعائیں مانگی تھیں۔ اس کی بھی بہتری ہو رہی تھی۔ اس کی یادداشت واپس آگئی تھی۔ اب وہ مراد جیسے غریب مجرم کی شریک حیات نہیں محبوب جیسے رب پتی کی دلہن بننے والی تھی۔

محبوب کی خوشیاں یہی کہہ رہی تھیں اور وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ محبوب نے پوچھا۔ "کب تک روتی رہو گی؟"

وہ سسکتی ہوئی بولی۔ "میں کیا کروں؟ آپ کو اتنی خوشیاں مل رہی ہیں کہ خوشی کے مارے میرے آنسو نہیں رک رہے ہیں۔ پلیز مجھے رونے دیں۔ میں پھر کسی وقت فون کروں گی۔"

اس نے رابطہ ختم ہوتے ہی شدید غصے سے تلملا کر فون کو سامنے دیوار پر دے مارا۔

جس نے بھی جو دعا مانگی تھی وہ کسی نہ کسی حد تک پوری ہو رہی تھی۔

ان دونوں کے ساتھ آ کر دعا مانگنے والے محبوب کا بھی بھلا ہوا تھا۔ وہ محبت کی ہاری ہوئی بازی جیت رہا تھا۔ غازی بابا کے دربار میں سب ہی کے ساتھ انصاف ہوا تھا۔ یہ بات سمیرا کی سمجھ میں آنے والی نہیں تھی۔

☆☆☆

وہ ایک آرام دہ بیڈ پر چاروں شانے چت پڑا تھا۔ شامت اسی طرح آتی ہے۔ اس کی دونوں کلائیوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ اس کی ایک ٹانگ اور دو بازوؤں میں گولیاں لگی تھیں۔ وہ ہاتھ پاؤں کے ہوتے ہوئے بھی۔۔۔ بے دست و پا پڑا ہوا تھا۔ اگرچہ گولیاں جسم میں پیوست نہیں ہوئی تھیں۔ اسے لگ کر گزر گئی تھیں۔ تاہم اسے زخمی ناکارہ اور بے یار و مددگار بنا گئی تھیں۔ وہ بیڈ سے اٹھ کر کہیں جا نہیں سکتا تھا۔۔۔

عزیزہ کو ایسے زخم کھانے اور ان کا علاج کرنے کا

خاصا تجربہ تھا۔ وہ طبی امداد کا تمام سامان پہلے سے اس گھر میں لے آئی تھی۔ اس نے بڑی مہارت سے رستے ہوئے لہو کو روکا اور تمام زخموں کی مرہم پٹی کر دی۔ اسے دوائیں بھی کھلائی تھیں۔ انجکشن بھی لگائے تھے۔ ایسی حالت میں مجرم نہ اسپتال جاتے ہیں، نہ کسی ڈاکٹر کو گھر میں بلا سکتے ہیں کیونکہ گھر میں آنے والے ڈاکٹر تھانے میں مخبری کر دیتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو راز دار بنائے۔ کسی پر اعتماد کرے اور دھوکے میں ماری جائے۔ وہ بڑی راز داری سے مراد کے ساتھ وہاں رہنے والی تھی۔ بڑی لگن سے مسیحا بن کر دن رات اس کا علاج کرنے کی دھن میں لگی ہوئی تھی۔ اس مکان کے ایک کمرے میں کیشور رہتا تھا۔ وہ اس کا زرخرید راز دار ماتحت تھا۔ اس کے تمام احکامات کی تعمیل کے لیے ہر وقت دوڑتا بھاگتا رہتا تھا۔ جب مرینہ اسے آواز دیتی تو وہ حاضر ہوتا تھا۔ ورنہ اس کے بیڈ روم میں نہیں آتا تھا۔ وہ دروازے کو اندر سے بند کر کے اس کا علاج اور تیمار داری کر رہی تھی۔

مراد چپ چاپ پڑا رہتا تھا۔ اسے دیکھتا تک نہیں تھا۔ اس سے نظریں چرانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ کم سے کم لباس میں رہتی تھی۔ وہ بڑی مشکل میں تھا۔ جب اس سے منہ پھیرتا تو وہ دوسری طرف خیالوں میں دکھائی دیتی تھی۔ وہ منظر دکھائی دیتا تھا جب وہ بالکل ہی بے لباس تھی اور وہ اسے بازوؤں میں اٹھا کر کار کے اندر لے گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد وہ خود ہی جیسے سزا پا تا رہا تھا۔ وہ شعلہ بدن اس کے ذہن میں نقش ہو گئی تھی۔

وہ اس حقیقت سے انکار کر رہا تھا کہ مرینہ اس کے حواس پر چھا گئی ہے۔ اسے جانی دشمن کہتا تھا اور اس سے نفرت کرتا رہتا تھا۔ خود نہیں جانتا تھا کہ خواہشات کو بھڑکانے والی ہوس اور اس کی طلب اندر ہی اندر سرنگ بنا رہی ہے۔ دوسری بار ہتھکڑیاں پہننے کے بعد اسے یہ فکر نہیں تھی کہ اس کے شکنجے سے کیسے نکلے گا؟ اس کی خود اعتمادی اور قوت ارادی کہہ رہی تھی کہ زخم بھرنے کے بعد وہ ہتھکڑیوں کے باوجود اسے دبوچ لے گا۔

لیکن اس بیڈ روم میں پہنچ کر وہ پریشان ہو گیا تھا۔ اس عورت کے پاس جیسے پہننے کے لیے کپڑے نہیں تھے۔ بڑی ہیجان انگیز خاموش اداؤں سے یاد دلاتی تھی کہ جو بازار میں کیا تھا، اب اسی تماشے کو تنہائی میں جھیلو۔ وہ خاموش تھا۔ وہ بھی بڑے اعتماد سے اور بڑی خاموشی سے اس کی خدمت میں لگی ہوئی تھی۔ مراد کی پریشانی یہ تھی کہ مرینہ نے رفتہ رفتہ اس کی لاعلمی میں انجانے میں اسے سستی خواہشات کے شکنجے میں کس لیا تھا۔ وہ لوہے کی ہتھکڑیوں سے تو نکل سکتا تھا۔ لیکن خواہشات کے شکنجے سے نکلنا تقریباً ناممکن ہو گیا تھا۔

وہ ایسے وقت ماروی کو اپنے دھیان میں لے آتا تھا۔ آنکھیں بند کر کے اس سے کہتا تھا۔ جس طرح تم نے اپنے وجود کو میری امانت کے طور پر سنبھال کر رکھا ہے اسی طرح مجھے صرف تمہارے لیے خود کو سنبھال کر رکھنا چاہیے۔ تم صرف میرے لیے ہو۔ میں صرف تمہارے لیے ہوں۔ تمہارے سوا مجھے اور کوئی حاصل نہیں کر سکے گا۔

ماروی کی طرف دھیان کرنے کے باوجود مرینہ بند آنکھوں کے پیچھے بھی چلی آتی تھی۔ ماروی کے برابر آ کر کہتی تھی۔ دونوں کو دیکھو۔ اس کا اپنا رنگ روپ اپنی جگہ ہے۔ میرا اپنا حسن، اپنی شوخ اور چنچل ادائیں ہیں۔ ماروی گرمی میں ٹھنڈی چھاؤں ہے۔ میں سردی میں گرمی پہنچانے والی دھوپ ہوں۔

وہ مجبور تھا۔ بیڈ سے اٹھ کر کہیں جا نہیں سکتا تھا۔ ایک پاؤں اور دو بازو زخمی تھے۔ ہتھکڑیوں نے اور بے بس کر دیا تھا۔ ایک جگہ پڑا ہوا تھا اور وہ آتی جاتی دھوپ کی طرح لگ رہی تھی۔ اسے حرارت پہنچا رہی تھی۔ وہ کوئی ایسی دوا کھلا رہی تھی کہ زخموں سے ٹیسیں نہیں اٹھ رہی تھیں۔ قدرے آرام تھا۔ یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ اپنی حسرت پوری کرنے کے لیے اسے جلد سے جلد آرام پہنچا رہی ہے۔ آج کی رات ماروی کے نام سے رہنے والی پارسائی دم توڑنے والی ہے۔

مرینہ کے رویے میں غرور نہیں تھا۔ وہ فاتحانہ انداز میں اسے طعنے نہیں دے رہی تھی۔ یہ عجیب سی بات تھی کہ وہ مغرور اس کی کمزوری اور بے بسی کا مذاق نہیں اڑا رہی تھی۔ وہ ایک گھریلو خدمت گزار شریکِ حیات کی طرح سنجیدگی سے اس کی خدمت کر رہی تھی۔ چونکہ بازو زخمی تھے۔ وہ ہتھکڑی میں تھا اس لیے وہ اپنے ہاتھ سے اسے کھلا رہی تھی۔ اس نے بڑے پیار سے سر کی مالش کی تھی۔ پاؤں دباتی رہتی تھی لیکن اس کی طرح خاموش تھی کچھ نہیں بول رہی تھی۔

آخر اس نے شام کو کہا۔ "میں صبح سے انتظار کر رہی ہوں کہ کچھ بولو گے لیکن تمہاری خاموشی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ ہاتھ پاؤں میں جان آتے ہی میرے لیے عذاب بن جاؤ گے۔ یہاں سے نکل بھاگنا چاہو گے۔" وہ اس کے پاؤں کو چوم کر اس پر سر رکھ کر بولی۔ "مراد... ادشمنی ختم کر دو۔ میں ہار گئی ہوں۔"

مراد نے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ ایک سرکش عورت کا قدموں میں سر رکھنا اچھا لگ رہا ہے۔

پچھلی رات جب اس ضدی اور سنگدل عورت نے اس پر گولیاں چلائی تھیں' اسے زخمی کر کے اپنا قیدی بنایا تھا' تب وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ دشمن ہے اور دشمن ہی رہے گی۔ اس کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھ کر سوچنا حماقت ہے۔

اب اس کا قیدی بن کر اس بیڈ روم میں آ کر وہ حیرانی سے دیکھ رہا تھا کہ اس کی دم سیدھی ہوگئی تھی۔ وہ بڑی سنجیدگی سے اور بڑی اپنائیت سے اس کا علاج کر رہی تھی۔

وہ اس کے قدموں پر سر رکھے کہہ رہی تھی۔ "دشمنی ہم دونوں کو مہنگی پڑتی ہے۔ میں خوب سوچ سمجھ کر تمہیں یہاں لائی ہوں۔ میں نے سوچا ہے۔ یہاں تمہارے ساتھ جتنے بھی دن گزار سکتی ہوں' گزاروں گی۔ دیکھ لینا' تم نفرت کرتے رہوگے میں محبتیں دیتی رہوں گی۔

"مجھے یقین ہے تم بھی مجھ سے محبت کرنے لگو گے۔ یہ یقین اس لیے ہے کہ تمہارے زخم بھرتے ہی میں تمہیں ماروی تک پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کروں گی۔"

مراد نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ اسے بے یقینی سے دیکھا۔ اس نے پاؤں کو چوم کر پوچھا۔ "بولو۔ پھر تو میری عزت کروگے؟ مجھ سے محبت کروگے؟"

ماروی کے نام سے اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی تھی۔ مرینہ اس کی کمزوریوں کو سمجھتی تھی۔ قدموں سے سر اٹھا کر بولی۔ "مراد...! اب تو کچھ بولو۔"

وہ بولا۔ "عورت لباس میں اچھی لگتی ہے۔"

وہ فوراً اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ تیزی سے چلتی ہوئی بیڈ کے سرہانے الماری کی طرف چلی گئی۔ وہ سر گھما کر ادھر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جب وہ تھوڑی دیر بعد سامنے آئی تو پورے لباس میں تھی۔

وہ بولا۔ "تم میری بات مان کر مجھے خوش کر رہی ہو۔ پہلے بھی کئی بار ایسا ہو چکا ہے۔ تم نے دوستی کرتے کرتے دشمنی کی ہے۔ میں بھی کم نہیں ہوں۔ میں نے بھی بڑے پیار سے پیش آتے آتے تمہیں سزائیں دی ہیں۔ ہم ایک دوسرے کا اعتماد کھو چکے ہیں۔ پہلے ہی بتا دو' تمہاری اس محبت' فرمانبرداری اور خدمت گزاری کے بعد کیا ہوگا؟

"میرا تجربہ کہتا ہے دُم سیدھی نہیں ہوگی۔ تم اپنی حسرتیں پوری کر کے اپنا اصل روپ ضرور دکھاؤ گی۔"

وہ وال کلاک کی طرف دیکھ کر بولی۔ "رات ہو چکی ہے۔ بس یہ آج کی رات گزر جانے دو۔ میں اپنی محبت اور سچائی کا ثبوت دوں گی۔ صبح سے پہلے ہتھکڑی کھول دوں گی۔"

"ابھی کیوں نہیں کھولو گی؟"

"تم نے ابھی درست کہا تھا کہ ہم ایک دوسرے کا اعتماد کھو چکے ہیں۔ پلیز ایک رات کی بات ہے۔ میں اعتماد نہ کرنے کے باوجود ہتھکڑی کھول دوں گی۔ اس کے بعد تمہارے زخمی ہاتھوں میں اتنی سکت تو ہوگی کہ میرا گلا دبوچ کر یہاں سے جاسکو گے۔"

کسی کی عادت بدل جاتی ہے' فطرت نہیں بدلتی۔ اس وقت پہلی بار اس کی باتوں سے اور سنجیدگی سے لگ رہا تھا کہ مراد کی خاطر اس کی فطرت بدل گئی ہے۔

ویسے بھی مراد کو اس کے رحم و کرم پر رہنا تھا۔ وہ ابھی اس قابل نہیں تھا کہ اس کی کسی بات پر اعتراض کرتا اور وہاں سے اٹھ کر یوں مردی دکھاتا۔ ایسے ہی وقت عبرت حاصل کی جاتی ہے کہ شہزور کس طرح اچانک کمزور اور بے بس ہو جاتے ہیں۔

انہوں نے رات کے آٹھ بجے کھانا کھایا۔ مرینہ نے اسے دوائیں کھلائیں' ایک انجکشن لگایا پھر سونے کے لیے لائٹس بجھادیں۔ زیرو پاور کا بلب آن کر دیا۔

پتا نہیں اس نے کون سا انجکشن لگایا تھا۔ وہ ہلکا ہلکا سا سرور محسوس کر رہا تھا۔ وہ پاس آئی تو جیسے جادو سے ہلکی سبز روشنی میں سبز پری دکھائی دینے لگی۔ کچھ نشہ تھا اور کچھ جادو۔ وہ بڑی مہارت سے ایسا سحر پھونک رہی تھی کہ نشہ حاوی ہوتا چلا گیا۔ اس کے باوجود وہ سنبھلنا اور کترانا چاہتا تھا لیکن بہت کمزور ہو چکا تھا۔ مرینہ نے اس کے کان میں ماروی کو اس کی کمزوری بنا کر کہا۔ "میرے سرکش دلدار...! انکار موت ہے۔ اقرار ماروی کی آغوش ہے۔ میں ہی تجھے اس کی آغوش میں پہنچاؤں گی۔ تُو میری راہ گزر سے گزر کر ہی وہاں پہنچے گا۔"

وہ ایک طویل عرصے تک اس سے لڑتا رہا تھا اور اسے مات دیتا رہا تھا۔ ان لمحات میں پہلی بار اس سے مات کھا گیا۔

عورت ارادہ کرلے، دل میں ٹھان لے تو کیا نہیں کرسکتی؟

پہاڑ کو سر کرنا کوئی کھیل نہیں ہے مگر اس نے سر کیا تھا۔

مرینہ نے بڑے پاپڑ بیلے تھے۔ مراد سے اتنی مار کھائی تھی کہ موت کی دہلیز پر پہنچ گئی تھی۔ مگر وہ بڑی ضدی عورت۔ اس نے اسکاٹ لینڈ یارڈ میں تربیت حاصل کی تھی۔ لندن میں MET آفیسر بن گئی تھی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہاں اس کے سروس ریکارڈ میں اس کے

طرح طرح کے کارناموں کی رپورٹس درج تھیں اور اس کے لیے لکھا گیا تھا۔ "مرینہ کی سب سے خطرناک خوبی یہ ہے کہ وہ ہار ماننا نہیں جانتی۔ ہارتے ہارتے' مرتے مرتے بھی بازی جیت لیتی ہے۔"

ماسٹر کوبوبو نے انڈیا میں اس کی اور مراد کی خدمات حاصل کی تھیں۔ وہ دونوں کو آزما رہا تھا کہ ان میں سے کون زیادہ شاطر ہے؟ اب تک مراد اس پر بازی لے جاتا رہا تھا۔ ماسٹر نے مرینہ کی ناکامی پر جگ دیو سے کہا تھا کہ مرینہ کا صرف نام ہی نام ہے۔ کوئی کام نہیں ہے۔ اسے ایک اور معاملے میں آزمایا جائے۔ اگر وہ ناکام رہے گی تو اسے ختم کر دیا جائے۔ ماسٹر سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کتنا بڑا کارنامہ انجام دے گی۔ وہ ماسٹر جسے تراشیدہ ہیرا کہتا تھا جس کے گن گاتا تھا' وہ اس سرکش اڑیل گھوڑے کو لگام دے کر اسے جیت چکی تھی۔ مراد چاروں شانے چت پڑا چھت کو تک رہا تھا۔ اسے زندگی میں پہلی بار ایسی مسرتیں حاصل ہوئی تھیں جنہیں وہ زلیخا کے بعد بھول گیا تھا۔ وہ ایک عجیب سے سرور میں تھا۔ ابھی تک وہی خواب دیکھ رہا تھا۔ جو اپنی تعبیر پیش کر کے گزر چکا تھا۔

مرینہ اس کے سینے پر سر رکھے لیٹی ہوئی تھی۔ اسے بہت اچھی بہت اپنی سی لگ رہی تھی۔ عورت ہو یا مرد ہو۔ وہ ایک دوسرے سے ہار کر بھی جیت جاتے ہیں' مراد مرینہ سے ہار کر اسے جیت چکا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "میں اپنی ایک ضد پوری کرنے کے لیے تمہارے آگے اپنا سب کچھ ہار چکی ہوں۔ آج سے میں تمہاری صرف تمہاری ہوں۔ تمہارے نام رہ کر پوری زندگی گزار دوں گی۔ کبھی تم پر آنچ بھی آئے گی تو تمہاری سلامتی کے لیے جان پر کھیل جاؤں گی۔"

وہ بولا۔ "آنے والا وقت بتائے گا کہ تم کتنی سچی ہو۔ میں اپنی بات کہتا ہوں کہ آئندہ کبھی تم سے دشمنی نہیں کروں گا اور نہ ہی کسی کو تم سے دشمنی کرنے دوں گا۔ تم نے جتنا خوش کیا ہے' اتنا ہی میں مغموم ہوں۔ بار بار ماروی یاد آرہی ہے۔ میں نے اس کے اعتماد کو دھوکا دیا ہے۔"

"تم اسے جان سے زیادہ چاہتے ہو۔ اس لیے شرمندگی سے ایسا سوچ رہے ہو۔ ورنہ مرد ایک سے زیادہ شادیاں کرتا ہے۔ تم نے حالات سے مجبور ہو کر صرف مجھے اپنایا ہے۔ میں یقین سے کہتی ہوں میرے بعد تم کسی کو منہ نہیں لگاؤ گے۔

"ماروی تمہارے بچپن کی محبت ہے۔ تمہیں دل و جان سے چاہتی ہے۔ وہ پہلے تو تم سے ناراض ہوگی پھر سمجھوتا کر لے گی۔"

وہ خلا میں تکتے ہوئے اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔ کیسی من موہنی سی تھی۔ ایسی تو کوئی نہیں تھی۔ اس نے تڑپ کر کہا۔ "میں ابھی اس سے بات کروں گا۔"

وہ بولی۔ "ذرا صبر کرو۔ بہت رات ہوگئی ہے۔ ابھی کال کرنا مناسب نہیں ہے۔"

"نہیں مرینہ! میں نے اس کی محبت اور اس کے ساتھ تنہائیوں میں گزارنے والے تمام لمحات تمہیں دے دیے ہیں۔ میرے اندر عجیب سی بے چینی ہے۔ میں اس سے بات کیے بغیر سکون سے نہیں رہ سکوں گا۔"

مرینہ کی گردن فخر سے تن گئی۔ اس نے ماروی کے حقوق چھین لیے تھے۔ وہ جتنا چاہتی تھی اس سے زیادہ حاصل کر چکی تھی۔ مراد اس کے حسن و شباب کا دیوانہ ہوگیا تھا۔

اس نے مراد سے بحث نہیں کی۔ ماروی کے نمبر پنچ کر کے فون اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ اسے لے کر کان سے لگا کر انتظار کرنے لگا۔ رات کے تین بجے تھے۔ سب سو رہے تھے۔ بڑی دیر بعد چاچی تنی کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو۔ کون ہے؟"

"چاچی...! میں بول رہا ہوں مراد..."

وہ اس کی آواز سنتے ہی اُٹھ بیٹھی۔ "مراد! تم کہاں ہو؟ اپنا فون کیوں بند کر دیتے ہو؟ اور یہ تم کسی اور کے فون سے بول رہے ہو۔"

"ہاں' کیا بتاؤں۔ یہ مصیبتیں پیچھا نہیں چھوڑتی ہیں۔ میں پھر مصیبت میں پڑ گیا تھا۔ ماروی سے بات کراؤ چاچی!"

"کچھ نہ بتایا تو سمجھا۔ وہ بے چاری بھی ایک بڑی مصیبت سے نکلی ہے۔ بہت اونچی سیڑھی سے گر کر بے ہوش ہوگئی تھی۔"

تنی نے اسے ماروی کے بے ہوش ہونے اور اس کی یادداشت واپس آنے کے بارے میں [illegible] ... "وہ بیمار ہے۔ ابھی گہری نیند میں ہے۔ کیا اسے جگانا مناسب ہوگا؟"

اس نے کہا۔ "نہیں۔ اسے آرام سے سونے دو۔ میں کل کسی وقت اس سے بات کروں گا۔"

چاچی تنی سے رابطہ ختم ہوگیا۔ اس نے مرینہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ سیڑھیوں سے گر کر زخمی ہوگئی ہے۔ ابھی آرام سے سو رہی ہے۔ اب کل ہی اس سے بات کروں گا۔"

وہ بولی۔ "میں نے تو پہلے ہی سمجھایا تھا مگر تم اس کی

آواز سننے کے لیے تڑپ رہے تھے۔"

"اب بھی تڑپ رہا ہوں لیکن اس کے حالات کو سمجھ کر صبر کر رہا ہوں۔ مجھے یہ سن کر خوشی ہو رہی ہے کہ اس کی یادداشت واپس آ گئی ہے۔ اسے اپنے بچپن کی محبت یاد آ گئی ہوگی۔"

وہ خلا میں تکتے ہوئے اُسے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اسے بہت کچھ یاد آ رہا ہوگا۔ اسے بچپن سے جوانی تک گزرے ہوئے تمام پیار بھرے دن رات یاد آ رہے ہوں گے۔ اب وہ بڑے پیار سے میرا انتظار کر رہی ہوگی۔"

مرینہ نے کہا۔ "ابھی یاد نہیں کر رہی ہے۔ گہری نیند میں ہے۔ میری ایک بات مانو گے؟"

"ہاں بولو..."

"کل فون پر اس سے ہماری باتیں نہ کرنا۔ یہ نہ کہنا کہ میں تمہاری زندگی میں آ گئی ہوں۔"

اس نے سر جھکا کر سوچا پھر کہا۔ "بات تو چھپانی چاہیے۔ لیکن کب تک چھپائی جا سکتی ہے؟ اور کیوں چھپائی جائے؟"

"صرف کچھ دنوں تک اس لیے کہ اس کے سر پر چوٹ لگی ہے۔ یہاں کی بات معلوم ہوگی تو اسے زبردست دماغی جھٹکا پہنچے گا۔ پہلے اس کا علاج ہونے دو۔ اسے ابھی صدمہ نہ پہنچاؤ۔"

وہ قائل ہو کر بولا۔ "تم درست کہتی ہو۔ میں مناسب موقع دیکھ کر اس سے تمہاری بات کروں گا۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "مرد ہماری بات مانے تو اس پر بڑا پیار آتا ہے۔ جسٹ اے منٹ۔ ابھی آئی۔"

وہ بیڈ سے اتر کر چلی گئی۔ زیرو پاور کی روشنی میں وہاں سے جاتے وقت اس کا سراپا دکھائی دیا۔ اسے سر سے پاؤں تک حاصل کرنے کے بعد احساسات بدل گئے تھے۔ وہ کچھ سے کچھ ہو کر بڑی پرکشش لگ رہی تھی۔

جب وہ آئی تو مراد نے کہا۔ "میرے پاس آؤ۔"

وہ قریب آ کر اس پر جھکی تو اس نے دونوں بازوؤں میں اسے سمیٹ لیا۔ اسے والہانہ انداز میں پیار کرنے لگا۔ وہ بولی۔ "کیا کر رہے ہو؟ تمہارے دونوں بازو زخمی ہیں۔"

وہ بولا۔ "ہاں۔ ذرا تکلیف ہو رہی ہے مگر اچھا لگ رہا ہے۔ تم نے تو میری سوچ میرے ارادے میرا مزاج بدل کر رکھ دیا ہے۔"

وہ دل کی گہرائیوں سے قائل ہو رہا تھا۔ اس کی طرف مائل ہو رہا تھا۔ مرینہ دل ہی دل میں اس پر قربان ہو رہی تھی۔ وہ بولی۔ "ایک ذرا چھوڑ دو۔ ابھی آتی ہوں۔"

"کہاں جاؤ گی؟"

"یہیں رہوں گی۔ تمہیں دکھاؤں گی کہ میں کتنی سچی ہوں۔"

اس نے چھوڑ دیا۔ مرینہ نے الگ ہو کر اسے ایک چھوٹی سی چابی دکھائی۔ ذرا مسکرائی پھر اس کی ہتھکڑی کھول کر ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ "یہ لو شیر آزاد ہو گیا۔ اب مجھے چیر پھاڑ کر میری بوٹی بوٹی کر سکتا ہے۔"

وہ پھر اس کے سرہانے الماری کی طرف گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک پستول تھا۔ وہ بولی۔ "یہ بھرا ہوا ہے۔"

اس نے وہ پستول مراد کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ پھر بیڈ پر آ گئی۔ اس کے پاس لیٹ کر اس کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا۔

اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ اداؤں سے کہا۔ "لو مارو یا چھوڑ دو۔ تمہاری مرضی۔ پستول دشمنی سے بھرا ہوا ہے اور میں دوستی سے بھرپور ہوں۔"

اس نے پستول کو ایک طرف پھینک کر اسے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ ایک طویل عرصے تک جاری رہنے والی بدترین دشمنی کو مرینہ کی حکمت عملی نے دوستی میں بدل دیا تھا۔

اس رات وہ سو نہیں سکا تھا۔ مرینہ اسے لحہ بہ لحہ متاثر کر رہی تھی اور اس کے اندر اپنے پیار کی سچائی کا سکہ جما رہی تھی۔ اس نے رات کے تین بجے کہا۔ "ہمیں دوستوں اور دشمنوں کی خبر رکھنا چاہیے۔ چوبیس گھنٹے گزر چکے ہیں۔ میں نے ماسٹر سے اور جگ دیو سے رابطہ نہیں کیا ہے۔ کیا تم نے ان سے بات کی ہے؟"

"ہاں۔ آج صبح جگ دیو کو کال کی تھی۔ دوسری طرف سے کسی اجنبی کی آواز سنائی دی۔ اس نے بڑے رعب دار لہجے میں پوچھا۔ "کون ہو تم؟ جگ دیو کو کیسے جانتی ہو؟" میں نے فوراً ہی فون بند کر دیا۔ وہ سم بدل دی ہے۔"

مراد نے تشویش میں مبتلا ہو کر پوچھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے۔ دوسری طرف کون ہوگا؟"

"کوئی آرمی کا افسر ہوگا۔ پچھلی رات انہوں نے جگ دیو کو گرفتار کیا ہوگا۔ میں یقین سے کہتی ہوں وہ بے چارہ بارڈر آرمی کی حراست میں پہنچ گیا ہے۔"

وہ بولا۔ "یہ تو بہت برا ہوا۔ آرمی والے تو اس پر تھرڈ ڈگری کی انتہا کر دیں گے۔ کیا اسے کسی طرح رہائی دلائی جا سکے گی؟"

"آرمی کی قید سے کسی کو نکالنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ وہاں سے جگ دیو کی لاش ہی باہر آئے گی۔"

"کیا تم نے ماسٹر سے بات کی تھی؟"

"نہیں۔ اپنا فون بند رکھا ہے۔ اس نے مجھے کال کی ہوگی۔ میں نے سوچا جلدی کیا ہے پہلے تم سے دوستی کروں گی پھر اس سے بات کروں گی۔ جیسا کہ تم جانتے ہو۔ ماسٹر اور جگ دیو ڈبل گیم کھیل رہے تھے۔ تمہیں رازداری سے اپنا کارندہ بنا کر مجھے دھوکا دیتے رہے تھے اور تمہیں دشمن راؤ کا آدمی کہتے رہے تھے۔

میں نے تمہیں قسم کھائی تھی کہ میں بھی انہیں دھوکا دیتی رہوں گی۔ اب ہماری دوستی ہو گئی ہے۔ تم بولو۔ میں ماسٹر کی وفادار رہوں یا اس کی طرح میں بھی اسے دھوکا دیتی رہوں؟"

مراد نے کہا۔ "انہوں نے میری خاطر تمہیں دھوکا دیا تھا۔ یہ بات بھول جاؤ۔ غصہ تھوک دو۔ ہم انڈیا میں ہیں۔ ہمیں وسیع ذرائع اور اختیارات رکھنے والے ماسٹر کی سرپرستی میں رہنا ہوگا۔ ورنہ مارے جائیں گے۔"

"ہاں۔ میرے ذہن میں بھی یہی بات ہے۔ ہم ابھی سرحدی علاقے سے بہت دور ہیں۔ یہ غریبوں کی ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ پولیس اور آرمی والے ادھر کبھی بھولے بھٹکے آ جاتے ہیں۔

اگر آ گئے تو ہم پر شبہ کریں گے۔ اس لیے کہ مکان کے سامنے ہماری کار کھڑی ہے۔ ہم اپنے پہناوے اور رہن سہن سے یہاں والوں سے الگ دکھائی دیتے ہیں۔ ہم ماسٹر کی سرپرستی میں رہ کر ہی کہیں سلامتی سے روپوش رہ سکیں گے۔ ہمیں اس سے بنا کر رکھنی ہوگی۔"

"تو پھر اس سے بات کرو۔ کیا وہ جاگ رہا ہوگا؟"

مرینہ نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "وہاں ابھی رات کے نو بجے ہوں گے۔ وہ سونے سے پہلے پی رہا ہوگا۔"

اس نے اپنے فون میں سم ڈال کر ماسٹر کو کال کی۔ رابطہ ہونے پر معلوم ہوا کہ واقعی وہ پی رہا تھا۔ اس کی نشیلی آواز سنائی دی۔ "ہائے مرینہ! تم کہاں مر گئی ہو؟ میں بہت پریشان ہوں۔ تمہیں کئی بار کال کر چکا ہوں۔"

"سوری ماسٹر! حالات ایسے ہیں کہ میں فون کو آن نہیں رکھ سکتی تھی۔ ابھی میں مراد کے ساتھ ہوں۔ ہم دونوں پولیس والوں سے چھپتے پھر رہے ہیں۔"

اس کا نشہ جیسے ہرن ہو گیا۔ اس نے چونک کر پوچھا۔ "کیا مراد زندہ ہے؟ تم بہت بڑی خوش خبری سنا رہی ہو۔ بائی دا وے وہ میری کال اٹینڈ کیوں نہیں کر رہا تھا؟"

"میں نے کہا نا۔ ہم نے اپنا فون بند رکھا ہے۔ مراد بہت زخمی ہے۔ میں کسی طرح اس کے زخموں کی مرہم پٹی کر رہی ہوں۔ آپ جگ دیو سے بولیں کہ وہ ہمیں فوراً کسی خفیہ پناہ گاہ میں پہنچائے ورنہ ہم پکڑے جائیں گے۔"

وہ بولا۔ "جگ دیو از نو مور... ویری سیڈ... آرمی والوں نے اسے گولی ماردی ہے۔"

وہ بولی۔ "او گاڈ! ہمارا کیا ہوگا؟"

"فکر نہ کرو۔ میں جو ہوں۔ تم دونوں کو فوجیوں کے ہاتھ لگنے نہیں دوں گا۔ ایک ذرا انتظار کرو۔ تھوڑی دیر بعد کال کروں گا۔ مراد کہاں ہے؟ اس سے بات تو کراؤ۔"

"میں نے اس کی مرہم پٹی کی ہے اسے نیند کا انجکشن دیا ہے۔ وہ گہری سو رہا ہے۔"

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ مرینہ نے کہا۔ "وہ تم سے بات کرنا چاہتا تھا۔ نشے میں ہے۔ ابھی اس سے اپنا کام نکالنا ہے۔ ہمیں صبح سے پہلے کسی خفیہ پناہ گاہ میں پہنچ جانا چاہیے۔"

تھوڑی دیر بعد اس نے کال کی۔ مرینہ سے کہا۔ "جگ دیو انڈیا میں ہمارا جونیئر ماسٹر تھا۔ وہ بڑی مہارت سے اور کامیابی سے اپنے فرائض ادا کرتا تھا۔ اب اس کی جگہ ہم نے دوسرا جونیئر ماسٹر مقرر کیا ہے۔ اس کا نام چمپت راؤ ہے۔ میں اسے تمہارا نمبر دے رہا ہوں۔ وہ تمہیں کال کرے گا۔ تم اس سے بات کرو۔ اسے اپنا موجودہ پتا بتاؤ۔ یہ تمہیں مراد کے ساتھ ایک خفیہ پناہ گاہ میں پہنچا دے گا۔"

دس پندرہ منٹ کے بعد ہی جونیئر ماسٹر چمپت راؤ کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو مرینہ! ملاقات ہوگی تو ہم باتیں کریں گے۔ ابھی اپنا پتہ بتاؤ۔"

مرینہ نے اسے اپنا پتا بتایا وہ بولا۔ "تم اپنا ضروری سامان پیک کرو۔ میں اپنے آدمیوں کے ساتھ آ رہا ہوں۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ مرینہ نے فون بند کر کے کہا۔ "تھینکس گاڈ! ہماری سلامتی کا سب سے اہم مسئلہ حل ہو رہا ہے۔"

وہ مراد کے پاس آ کر بڑے پیار سے اس پر جھک گئی۔

☆☆☆

ماروی اسپتال سے گھر آ گئی۔ محبوب بھی اس کے ساتھ جیسے اسپتال کا ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے بھی گھر آ کر شیو کیا، غسل کرنے کے بعد فریش ہوا اور پھر ماروی کی کوٹھی میں آ گیا۔ وہاں سمیرا اور معروف بھی پہنچے ہوئے تھے۔ سمیرا نے ماروی کو ہنستے مسکراتے دیکھا تو جل بھن کر رہ گئی۔ بے شک صدمہ پہنچنے کی بات تھی۔ جسے مر جانا چاہیے تھا اسے ایک نئی زندگی مل گئی تھی۔ وہ ماروی کو دیکھ کر اوپری دل سے مسکرا کر بولی۔ "تم حادثے کے بعد پہلے سے زیادہ نکھر گئی ہو۔ جیسے جادو ہو گیا ہے۔ کسی پہلو سے بیمار نہیں لگ رہی ہو۔"

معروف نے کہا۔ ''ماروی کی یادداشت واپس آگئی ہے۔ یہ اتنی بڑی خوشی ہے کہ اب بیمار نظر نہیں آئے گی۔ میری دعا ہے کہ یہ اسی طرح ہنستی بولتی صحت مند رہے۔''

پھر وہ محبوب کو دیکھ کر بولا۔ ''محبوب اور مراد ایک طویل عرصے تک امید و بیم سے گزر رہے تھے۔ دونوں تم سے آس لگائے ہوئے تھے اور کبھی دونوں ہی مایوس ہوجاتے تھے۔ اب نہیں ہوں گے۔ تم پر خدا کی رحمت ہو۔ تم نے ایسا فیصلہ سنایا ہے کہ اب یہ دونوں خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہیں گے اور نہ ہی مایوس ہوں گے کہ تم کسی ایک کو چھوڑ کر دوسرے کی منکوحہ بن جاؤ گی۔''

ماروی نے کہا۔ ''میں نہیں چاہتی تھی کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے رقیب بن کر رہیں۔ اب ان کے ذہنوں سے یہ بات نکل گئی ہے کہ میں کبھی کسی سے متاثر ہوکر اس کی شریکِ حیات بن جاؤں گی۔ نہ میں کبھی شادی کروں گی۔ اور نہ ہی یہ دونوں کبھی شادی کریں گے۔ جب تک مجھ سے کسی غرض اور طلب کے بغیر محبت کرسکتے ہیں' کرتے رہیں گے۔ جب بیزار ہوجائیں گے۔ شادی خانہ آبادی ان کے لیے ضروری ہوجائے گی تو یہ کسی سے شادی کریں گے۔ اس کے بعد عشق کا دعویٰ خود بخود ختم ہوجائے گا۔ پھر جو چاہنے والا رہ جائے گا میں اس کی منکوحہ بن جاؤں گی۔''

معروف نے کہا۔ ''شاباش ماروی! تمہارے اس فیصلے سے محبوب بہت خوش ہے۔ دراصل اس کی دیوانگی اس بے یقینی کی وجہ سے تھی کہ تم اسے محبت کا جواب محبت سے نہیں دو گی۔ مراد کو ترجیح دو گی تو یہ ٹوٹ کر رہ جائے گا۔ اب اسے یقین ہوگیا ہے کہ یہ جب تک شادی نہیں کرے گا' اسے تم ایک محبوبہ کا پیار دیتی رہو گی۔''

محبوب نے بڑے پیار سے ماروی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اور کیا چاہیے؟ صرف اور صرف ماروی کی محبت اور توجہ۔ اب یہ مجھے مل رہی ہے۔ آپ سب دیکھیں گے کہ میری زندگی میں اور کوئی نہیں آئے گی۔ میں اسے محبتیں دیتے دیتے دنیا سے چلا جاؤں گا۔''

سمیرا کو یہ بات تلوار کی دھار کی طرح لگی۔ محبوب نے واضح کردیا تھا کہ اس کی زندگی میں اور کوئی نہیں آئے گی اور یہ بات اس کے منہ پر کہہ دی تھی۔

یہ ایسا صدمہ پہنچانے والی بات تھی کہ اس سے برداشت نہیں ہورہی تھی۔ وہاں سے چلی جانا چاہتی تھی لیکن یہ بات آدابِ محفل کے خلاف ہوتی۔ وہ تعلیم یافتہ تھی۔ محفل سے اٹھ نہیں سکتی تھی۔ اس نے بڑی بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''ایکسکیوزمی۔ میں واش روم جانا چاہتی ہوں۔''

ماروی نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''آؤ میرے واش روم میں چلو۔''

سمیرا اٹھ کر اس کے ساتھ چلتی ہوئی بیڈ روم میں آگئی۔ ماروی نے الماری کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ''ذرا ایک منٹ۔ میں نیا صابن اور تولیا نکالتی ہوں۔''

وہ اُدھر جانا چاہتی تھی۔ سمیرا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے اپنے ہاتھ کو، پھر سمیرا کو سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر تعجب سے کہا۔ ''سمیرا...! کیا بات ہے تم کانپ رہی ہو؟''

وہ اچانک ہی دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔ تب ماروی کی سمجھ میں آیا۔ وہ جانتی تھی کہ سمیرا نے محبوب سے بڑی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ اس نے انجان بن کر اس کے دونوں بازوؤں کو تھام کر پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ کیوں رو رہی ہو؟''

وہ بولنا چاہتی تھی لیکن روتے روتے ہچکیاں آرہی تھیں۔ وہ بول نہیں پا رہی تھی۔ ماروی اسے تھپکنے لگی پھر وہ بڑی مشکل سے بولی۔ ''مجھ سے اپنی توہین برداشت نہیں ہو رہی ہے۔''

ماروی نے پوچھا۔ ''کیسی توہین...؟''

وہ سسکتی ہوئی ٹھہر ٹھہر کر بولی۔ ''محبوب صاحب نے آج۔ آج سب کے سامنے...''

وہ پھر سسکنے لگی۔ ماروی نے اسے تھپکتے ہوئے کہا۔ ''ہاں بولو۔ محبوب صاحب سے کیا شکایت ہے؟''

وہ بولی۔ ''انہوں نے آج سب کے سامنے میرے منہ پر کہا ہے کہ ان کی زندگی میں اور کوئی نہیں آئے گی۔ جبکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں انہیں جان سے زیادہ چاہتی ہوں۔ ان کی شریکِ حیات بننے کے خواب دیکھتی ہوں۔ تم ہی بولو کیا انہیں میرے منہ پر دل توڑنے والی بات کہنا چاہیے' وہ بھی سب کے سامنے؟''

وہ بولی۔ ''ہاں۔ واقعی محبوب صاحب سے غلطی ہوئی ہے۔ چلو اِدھر بیٹھو۔ آنسو پونچھو۔''

وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ ماروی نے کہا۔ ''جہان جی آئیں گی یا محبوب صاحب آکر دیکھیں گے تو کیا سوچیں گے۔ اتنے حوصلے والی... لڑکی رو رہی ہے۔''

وہ بولی۔ ''میں بڑی سے بڑی بات برداشت کرسکتی ہوں۔ لیکن محبوب صاحب نے جیسی ناقدری کی ہے وہ برداشت نہیں ہورہی ہے۔''

''تم مخالف حالات سے گزرنا جانتی ہو۔ کاروباری

دنیا میں مخالفین سے کیسے نمٹ لیتی ہو؟ اسی طرح محبوب صاحب سے بھی نمٹو۔"

وہ بولی۔"کاروباری دنیا میں انسان، انسان کے دماغ سے کھیلتا ہے۔ مجھے کھیلنا اور مات دینا آتا ہے۔ لیکن پیار کی دنیا میں دل سے دل کا معاملہ ہوتا ہے۔ کسی کا دماغ الٹنا آسان ہے لیکن عاشق کا دل پھیرنا ممکن نہیں ہے۔"

پھر وہ کرسی سے اٹھ کر واش روم کی طرف جاتے ہوئے بولی۔"معروف صاحب جیسے جہاں دیدہ بزرگ تمہارے فیصلے کی تعریف کر رہے ہیں۔ تمہیں دعائیں دے رہے ہیں۔ کیونکہ محبوب صاحب اب بڑی دل جمعی سے بزنس کی طرف توجہ دیں گے۔"

اس نے واش روم کا دروازہ کھلا رکھا۔ واش بیسن پر جھک کر منہ دھوتے ہوئے بولی۔"یہ اچھی بات ہے کہ دو عاشقوں کے درمیان رقابت نہیں رہے گی۔ دونوں مطمئن رہیں گے۔"

"لیکن تمہارے اس بہترین فیصلے نے مجھے ڈبو دیا ہے۔ مجھے امید تھی کہ محبوب صاحب کبھی نہ کبھی تم سے مایوس ہو کر مجھے لائف پارٹنر بنا لیں گے۔ اب یہ امید دم توڑ چکی ہے۔ اب تو میری طرف دیکھیں گے بھی نہیں۔"

"ایسا نہ کہو۔ وہ تمہاری بہت عزت کرتے ہیں۔ تمہاری ذہانت کی تعریفیں کرتے ہیں۔"

"میں ان سے پیار کرتی ہوں۔ ان سے اپنی ذہانت کی تعریفی سند نہیں چاہتی۔ میں چاہتی ہوں وہ میرے دماغ میں نہیں دل میں جھانکتے رہیں اور پیار سے انعام دیتے رہیں۔"

وہ تولیا سے منہ پونچھنے کے بعد ماروی کے قریب آ کر بولی۔"تم چاہو تو مجھے ڈوبنے سے بچا سکتی ہو۔"

وہ اس سے تولیا لے کر اسے ایک طرف پھیلا کر رکھتے ہوئے بولی۔"میں کیسے بچا سکتی ہوں؟"

"اپنے فیصلے میں ایک ذرا تبدیلی کرو۔ ان سے کہو وہ مجھ سے شادی کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد بھی تم ان کی محبت کا جواب محبت سے دیتی رہو گی۔"

وہ پیچھے ہٹ کر بولی۔"پھر تو مراد کو بھی یہ رعایت دینی ہو گی کہ وہ بھی کسی سے شادی کرے گا تو اس کی محبت کا جواب محبت سے دیتی رہوں گی۔"

"ہاں۔ تمہارا کیا جائے گا۔ دونوں کو شادی کرنے دو۔ دونوں سے محبت کرتی رہو۔"

ماروی نے کہا۔"واہ کیا خوب مشورہ دے رہی ہو۔ وہ دونوں شادی شدہ زندگی کے مزے لوٹتے رہیں اور میں بن بیاہی دونوں کا محبت سے دل بہلاتی رہوں۔"

"تم کنواری نہ رہو۔ تم بھی شادی کر لو۔"

"کیا میرا شوہر ان دو عاشقوں سے عشق کرتے رہنے کی اجازت دے گا؟"

وہ فوراً ہی کوئی جواب نہ دے سکی پھر بولی۔"تم خوا مخواہ بحث کر رہی ہو۔ دونوں سے چپک کر رہنا چاہتی ہو۔ صاف کہو نا کہ کسی کو چھوڑنا نہیں چاہتیں۔ تمہیں برا تو لگے گا۔ لیکن خود ہی کہو کیا دو مردوں سے پیار کرتے رہنا بے حیائی نہیں ہے؟"

"کیا تم نے اب تک کوئی بے حیائی دیکھی ہے؟ نہ میں بے حیا ہوں، نہ آئندہ ان کے ساتھ بے حیائی سے رہوں گی۔"

"کون یقین کرے گا کہ تم دونوں کے ساتھ ہنستی کھیلتی گھومتی پھرتی ہو اور پارسا بھی ہو؟"

"دنیا والے تو باتیں بناتے ہیں۔ کیچڑ اچھالتے ہیں۔ میں پچھلے پندرہ مہینوں سے محبوب کی کوٹھی میں رہ رہی ہوں اور عیش و عشرت کی زندگی گزار رہی ہوں۔ دنیا والے باتیں بنا رہے ہیں کہ محبوب نے مجھے داشتہ بنا کر رکھا ہوا ہے۔ میں بولنے والوں کی زبان نہیں پکڑ سکتی اور بھی تمہاری بھی زبان نہیں پکڑوں گی۔ لیکن تمہاری بھی مجال نہیں ہے کہ محبوب اور مراد کے سامنے مجھے ان کی داشتہ کہہ سکو۔ جاؤ اپنی سوسائٹی میں مجھ پر کیچڑ اچھالتی رہو اور خوش ہوتی رہو۔"

سمیرا ذرا چپ رہی۔ وہ ماروی کو باتیں سنا کر محبوب کی نظروں سے گرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کہا۔ "پلیز۔ یہ نہ سمجھو کہ میں تمہیں ان کی داشتہ سمجھتی ہوں۔ بائی گاڈ تم تو نیک سیرت اور شرم والی لڑکی ہو۔ میں دنیا والوں کی بات کہہ رہی تھی کہ وہ تمہیں پہلے ایک کی داشتہ کہتے تھے اب دو عاشقوں کی...."

ماروی نے ہاتھ اٹھا کر اسے آگے کہنے سے روک دیا۔"خاموش ہو جاؤ۔ میں بے حیا ہوں یا حیا والی ہوں۔ نیک نامی کی زندگی گزار رہی ہوں یا بدنامی کی، یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ تم اپنا مسئلہ حل کرو۔ میں نے محبوب سے یہ نہیں کہا ہے کہ وہ تم سے دل نہ لگائے اور تم سے شادی نہ کرے۔ تم بلاشبہ بہت حسین اور بہت ہی ذہین ہو۔ عورت کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ زاہد و عابد کی توبہ توڑ دیتی ہے۔ حسن زور کے ارادوں کو کمزور بنا دیتی ہے۔ جاؤ اپنی ذہانت کو آزماؤ۔ یہاں باتیں نہ بناؤ۔ وہاں جاؤ اور محبوب

کی توبہ توڑ دو۔ اسے مجھ سے پھیر دو۔ ایسا نہ کر سکو تو کمزور عورت کی طرح روتی پیٹتی رہو۔ لیکن میرے پاس سوکن بن کر کبھی نہ آؤ۔"

ایسے ہی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ چاچی کی آواز سنائی دی۔"ماروی! جلدی آؤ۔ مراد کا فون آیا تھا پھر بند ہو گیا۔ ابھی پھر آ سکتا ہے۔"

وہ فوراً ہی کمرے سے باہر آ گئی۔ چاچی سے فون لے کر دیکھا۔ اسکرین پر مس کال لکھا ہوا تھا اور وہاں مراد کا فون نمبر تھا۔

وہ چاچی اور سمیرا کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آئی۔ اسی وقت پھر رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ ماروی جان بوجھ کر سمیرا کو دکھانے کے لیے محبوب کے پاس آ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ فون کا بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر کہا۔"ہیلو مراد....!"

مراد اس وقت ایک خفیہ پناہ گاہ میں تھا۔ مرینہ سو رہی تھی، وہ دوسرے کمرے میں آ کر بول رہا تھا۔"ہیلو ماروی! خدا کا شکر ہے تمہاری آواز سن رہا ہوں۔ کیا اسپتال سے آ گئی ہو؟"

"ہاں۔ گھر میں ہوں۔ چاچی نے بتایا ہو گا کہ میری یادداشت واپس آ گئی ہے۔ مجھے پچھلی تمام باتیں یاد آ گئی ہیں۔"

"ہاں۔ جب سے میں نے سنا ہے، تب سے سوچ رہا ہوں کہ اب ہمارے بچپن کی محبت کی ایک ایک بات تمہیں یاد آئے گی۔ میرے لیے تمہاری محبت اور مستحکم ہو گی۔ بے چارے سائیں محبوب اور مایوس ہو گئے ہوں گے۔"

ماروی نے کن انکھیوں سے پاس بیٹھے ہوئے محبوب کو دیکھا۔ پھر کہا۔"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے سائیں کی تمام نیکیاں یاد آ رہی ہیں۔ تم جتنے عرصے تک جیل میں رہے اتنے عرصے تک سائیں نے مجھے عزت آبرو سے رکھا تھا۔ یہ نہ ہوتے تو دشمن مجھے دو کوڑی کا کر دیتے۔ تم ہی بولو، آج میں کس کی مہربانی سے عزت آبرو سے ہوں؟"

وہ بولا۔"ہاں۔ یہ درست ہے لیکن...."

وہ بات کاٹ کر بولی۔"تم جیل میں تھے۔ دشمن مجھے اغوا کر لینا چاہتے تھے۔ سائیں گولیوں کی بوچھاڑ میں مجھے بچا کر لے گئے اور میری خاطر گولی بھی کھائی۔"

"تم یہ باتیں کیوں کر رہی ہو؟ کیا یہ جتانا چاہتی ہو کہ وہ تمہاری حفاظت اور سلامتی کے لیے بہت کچھ کرتے آئے تھے اور میں نے کچھ نہیں کیا ہے؟"

"تم نے بھی بہت کیا ہے۔ تم نے میری خاطر وڈیرے کی بیٹی کو اور لاکھوں روپے کو ٹھکرا دیا۔ تم میری خاطر جھوٹے الزام میں جیل گئے۔ وڈیرے سے دشمنی مول لے کر پھانسی کے پھندے تک پہنچنے والے تھے۔ میرے پاس آنے کے لیے، میرے ساتھ رہنے کے لیے دشمنوں سے ایک طویل جنگ لڑتے آ رہے ہو۔ تمہارے ساتھ بہت برا ہو رہا ہے۔ میری خاطر گھر سے بے گھر اور وطن سے بے وطن ہو گئے ہو۔

"مراد! ایسا نہیں ہے کہ میں ایک طرف جھک رہی ہوں اور دوسرے کو نظر انداز کر رہی ہوں۔ تم دونوں میرے سامنے ترازو کے دو پلڑوں کی طرح برابر ہو۔ تم ایک ذرا سائیں کی تمام مہربانیوں اور نیکیوں کو یاد کرو۔ آخر وہ اتنی نیکیاں کیوں کرتے رہے؟ یہ ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ وہ بھی مجھے چاہتے ہیں۔ کیا انہیں ان کی نیکیوں کا صلہ نہیں ملنا چاہیے؟"

وہ پریشان ہو کر بولا۔"کیا کہہ رہی ہو؟ کیا ان کی نیکیوں کے صلے میں وہ محبتیں دو گی جو صرف میرے لیے ہیں؟"

"تم میرے سوال کا جواب دو۔ لین دین کی اس دنیا میں وہ میری خاطر اپنا سب کچھ لٹاتے آئے ہیں۔ صرف میری محبت چاہتے ہیں۔ کیا مجھے صلہ نہیں دینا چاہیے؟"

"نہیں ہرگز نہیں...." وہ غصے سے بولا۔"تم صرف میری ہو۔ میرے لیے پیدا ہوئی ہو۔ بے شک انہوں نے بے مثال نیکیاں کی ہیں۔ اس کے عوض ان کے گھر کی نوکرانی بن جاؤ۔ ان کے جوتے صاف کرو لیکن میری محبت کسی کو نہ دو۔"

"میں انہیں اس طرح محبتیں دوں گی کہ تمہاری محبت تمہاری ہی رہے گی۔ تمہیں کوئی شکایت نہیں ہو گی۔ میں دونوں سے برابر محبت کروں گی۔ پیار کا ترازو میرے ہاتھوں میں ہے۔"

"یہ ناممکن ہے۔"

"ممکن ہے۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں، کسی سے شادی نہیں کروں گی۔ نہ تم سے نہ ان سے۔ کسی کی شریک حیات بن کر نہ ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گی، نہ ان کے ساتھ۔

"ہم تینوں کسی لالچ اور ہوس کے بغیر محبت کرتے رہیں گے۔ ہمارے پیار میں سراسر پاکیزگی ہو گی۔"

"کیا بکواس ہے؟ ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ ایک مرد اور ایک عورت کا پیار جسمانی حصول کے لیے ہی ہوتا ہے۔"

"ہاں۔ پیار اسی لیے ہوتا ہے لیکن عشق جسمانی حصول سے یا کسی طرح کی بھی طلب سے بالاتر ہوتا ہے۔"

"ایسا ہی ہے تو سائیں سے بولو ایسا عشق کرتے

رہیں۔ میں تو نہیں کروں گا۔

"وہ تو مان گئے ہیں۔ تمہیں بھی راضی ہونا ہوگا۔"

"وہ تو ضرور مانیں گے۔ اس طرح انہوں نے تمہاری محبت اور توجہ جیت لی ہے اور مجھے تمہارے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنے سے محروم کردیا ہے۔ ماروی! عقل سے سوچو۔ وہ کتنے چالباز ہیں۔ پہلے دن سے ہمیں دولت کی مار مار رہے ہیں۔

"وہ عام دشمن رقیبوں کی طرح مجھے رقیب نہیں کہتے تھے۔ تمہیں جتاتے تھے کہ کتنے امن پسند اور شریف انسان ہیں۔ تمہاری عزت آبرو کی حفاظت اس لیے کرتے رہے کہ ایک دن تمہیں جیت لینے والے تھے۔ وہ تمہیں اپنی چیز سمجھ کر تم پر اپنی دولت لٹاتے آرہے ہیں۔ وہ کتنی ذہانت سے سیاست سے اور مکاری سے تمہارے دل و دماغ پر قبضہ جما چکے ہیں۔ یہ تمہاری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔"

ماروی نے کہا۔ "تمہیں غصہ آرہا ہے۔ تم سمجھ رہے ہو کہ تمہارا حق انہیں دے رہی ہوں۔ جبکہ میری محبت دونوں کے لیے برابر ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ شادی ازدواجی زندگی لازمی ہے تو تم دونوں میں سے جس کے لیے بہت لازمی ہوجائے گی' وہ کسی سے شادی کرلے گا اور جو نہیں کرے گا' وہ میرا سچا عاشق ہوگا۔

"تمہیں صرف اتنی سی قربانی دینی ہے کہ میرے عشق میں کسی اور کو اہمیت نہیں دوگے۔ میں بن بیاہی رہوں گی تم بھی رہوگے۔"

"تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں ساری عمر صرف تمہارا رہوں گا اور کسی کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔"

اسی وقت مرینہ نے کمرے میں آکر کہا۔ "مراد...! کیا ہوگیا ہے تمہیں؟ فون پر چیخ چیخ کر کیوں بول رہے ہو؟"

ماروی اس آواز کو سن کر چونک گئی۔ مرینہ بول رہی تھی۔ "کیا اس طرح جنونی ہوکر بولتے ہیں؟ میں نیند سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی ہوں۔ یہاں آکر سن رہی ہوں۔ تمہاری باتوں سے معلوم ہورہا ہے کہ تم ضرور ماروی سے بات کررہے ہو۔"

دوسری طرف سے ماروی نے پوچھا۔ "کیا یہ مرینہ بول رہی ہے؟ میں اس دشمن عورت کی آواز لاکھوں میں پہچان سکتی ہوں۔ یا خدا... تم اس دشمن عورت کے ساتھ رہتے ہو؟"

وہ الجھ کر رہ گیا۔ ماروی نے ابھی کہا تھا کہ وہ اسے ترجیح دے گی جو اس کی خاطر ہوس کا طالب نہیں ہوگا۔ کسی دوسری کی طرف مائل نہیں ہوگا۔

مگر وہ تو ہوچکا تھا۔ صرف مائل نہیں ہوا تھا بلکہ تو نکاح کے بغیر ازدواجی رشتہ بھی قائم کرچکا تھا۔ اس نے سوچا تھا' ماروی کا دل نہیں دکھائے گا۔ مرینہ سے تعلقات کی باتیں اس سے چھپاتا رہے گا۔ لیکن اچانک ہی بھید کھل گیا تھا۔ وہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ اُدھر سے مرینہ نے ماروی کو اِدھر سے ماروی نے مرینہ کو فوراً ہی پہچان لیا تھا۔

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "وہ دراصل بات یہ ہے ماروی کہ میں تمہیں بتانے والا تھا کہ..."

وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ "کہ تم انڈیا جاکر اسی کے ساتھ رہتے ہو۔ واردات کرتے ہو۔ لاکھوں روپے کما کر میرے اکاؤنٹ میں بھیجتے ہو۔ اُدھر اُسے اور اِدھر مجھے خوش رکھتے ہو۔"

"یہ بات نہیں ہے..."

مرینہ نے کہا۔ "تم ڈرتے کیوں ہو۔ بولتے کیوں نہیں کہ دشمن ہمیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ ہم اپنی جان بچانے کے لیے ایک مکان میں چھپے ہوئے ہیں۔"

وہ ہاتھ بڑھا کر بولی۔ "لاؤ فون مجھے دو۔ میں اسے سمجھاتی ہوں۔ آج نہیں تو کل ہم تینوں کو پیار محبت سے رہنا ہوگا۔"

ماروی نے کہا۔ "فون مرینہ کو دو۔ مجھے معلوم تو ہو کہ وہ دشمن سے دوست کیسے بن گئی ہے۔ اس نے ایسا کیا پیار جگایا ہے کہ ہم تینوں کو پیار محبت سے رہنے کی بات کہہ رہی ہے۔ یہاں تو ایک لمبے عرصے سے ہم تین ہیں۔ کیا وہاں بھی تم نے پیار کا تکونی بنالیا ہے؟ وہ اپنے اور تمہارے ساتھ مجھے کیوں شامل کررہی ہے۔ وہاں کیا ہورہا ہے مراد؟"

وہ جھنجلا کر بولا۔ "کچھ نہیں ہورہا ہے۔ تم دونوں بکواس کررہی ہو۔ دو عورتیں ہمیشہ مصیبت بن جاتی ہیں۔ اُدھر سے تم بولتی جارہی ہو۔ اِدھر سے یہ بولتی جارہی ہے۔"

"اس طرح خوامخواہ غصہ نہ دکھاؤ۔ فون مرینہ کو دو۔ ابھی اس کے منہ سے سچ نکل رہا ہے۔"

"کوئی سچ نہیں ہے۔ جب تم میری مجبوریاں سنو گی تو دل تھام لوگی۔ تم نہیں جانتیں میں کن حالات سے گزر رہا ہوں۔ میں اس وقت زخموں سے چور ہوں۔ ایسی بے یاری و مددگاری کے وقت مرینہ ایک خفیہ پناہ گاہ میں میرا علاج کررہی ہے۔"

"ابھی مرینہ پیار محبت سے رہنے کی بات کررہی تھی۔ کیا تمہارا علاج کرتے کرتے پیار ہوگیا ہے؟"

"ماروی! طعنے نہ دو۔ میں تمہیں سمجھاؤں گا کہ یہاں میرے ساتھ کیا ہوچکا ہے؟"

مرینہ نے اچانک ہی فون چھین کر کہا۔ "جب وہ مجھ سے بات کرنا چاہتی ہے تو کرنے دو۔"

پھر اس نے فون پر کہا۔ "سنو ماروی! تم یقین کرو یا نہ کرو۔ مراد تمہارا ہے اور تمہارا ہی دیوانہ رہے گا۔ سچ یہ ہے کہ میں اس پر مرمٹی ہوں۔ اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ پہلے کئی بار اسے حاصل کرنا چاہا مگر ناکام رہی۔ آخر جس رات یہ بارڈر پار کرکے تمہارے پاس جارہا تھا' تب میں نے چھپ کر اس پر فائرنگ کی۔ اسے گولیوں سے زخمی کیا۔ پھر اسے ہتھکڑی پہنا کر ایک خفیہ جگہ لے آئی۔ اب تم دل کی آنکھوں سے دیکھو کہ تمہارا یار کس طرح مجبور ہوگیا تھا۔ ایسے وقت میں نے اسے حاصل کرلیا۔ تم محبت سے سوچو کہ یہ اب بھی مجبور ہے۔

"یہ میرے رحم و کرم پر ہے۔ میری خواہشات پوری نہیں کرے گا تو میں اسے تمہارے پاس جانے نہیں دوں گی۔ کیسی عجیب سی بات ہے کہ میں اس پر جبر کررہی ہوں لیکن اپنی محبت سے مجبور ہوکر۔ میرے پیار کی سچائی یہ ہے کہ اب میری زندگی میں کوئی دوسرا نہیں آئے گا۔ میں مراد کے ہی نام سے زندگی گزار دوں گی۔ میں نے مراد کو زبان دی ہے کہ زخم بھرتے ہی اسے تمہارے پاس جانے سے نہیں روکوں گی۔

زخموں کا کیا ہے؟ یہ تو ایک آدھ ہفتے میں بھر جاتے اور یہ تمہارے پاس چلا آتا لیکن ہمیں دوسری مصیبتوں نے گھیر لیا ہے۔ مراد کے خلاف وارنٹ جاری ہوا ہے کہ وہ پاکستانی جاسوس ہے۔ پولیس انٹیلی جنس اور آری والے اسے ہر صوبے ہر شہر اور ہر علاقے میں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ ہم کتنے دِنوں' کتنے ہفتوں اور کتنے مہینوں تک یہاں چھپے رہیں گے۔"

ماروی نے کہا۔ "تمہارا شکریہ۔ تم نے سچ سچ کہہ دیا کہ اسے دل و جان سے چاہتی ہو۔ اس کے بغیر نہیں رہو گی۔ میں یہ کہہ دوں کہ مجھے یہ منظور نہیں ہے کہ تم اس کے پیچھے دوڑو اور وہ میرے پیچھے دوڑتا رہے۔ میں نے اپنے دو چاہنے والوں کی دوڑ یہاں کسی طرح ختم کی تھی۔ وہاں تم نے شروع کردی ہے۔ بہتر ہے مراد کو وہیں اپنے کلیجے سے لگا کر رکھو۔ اس سے کہو مجھے فون نہ کرے۔"

اس نے فون بند کردیا پھر فوراً ہی آنچل میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ وہاں بیٹھے ہوئے تمام افراد سمجھ گئے تھے کہ مراد مرینہ کی زلفوں کا اسیر ہوگیا ہے۔

محبوب خوشی کے مارے کچھ بول نہیں پارہا تھا۔ چاچی نے آکر ماروی کا سر سہلا رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ "کیوں رو رہی ہو۔ جیسی گمراہی کی زندگی وہ گزار رہا ہے' وہاں ایسے ہی گناہ ہوتے ہیں۔ کوئی پارسا نہیں رہتا۔ مراد کے ساتھ بھی یہی ہونا تھا' ہوگیا۔ خدا سائیں کو سلامت رکھے۔ یہ تمہاری آنکھ میں آنسو نہیں آنے دیں گے۔"

محبوب نے کہا۔ "چاچی! اسے رونے دیں۔ اس کے اندر دھواں بھرا ہے۔ یہ جسے بچپن سے چاہتی آرہی تھی' اس سے یہ توقع نہیں کرسکتی تھی کہ وہ ایسا صدمہ پہنچائے گا۔ آپ اسے کھل کر رونے دیں۔"

وہ روتے ہوئے بولی۔ "آپ درست کہتے ہیں۔ یہ صدمہ برداشت نہیں ہورہا ہے۔ سب کچھ معلوم کرکے بھی یقین نہیں آرہا ہے کہ مراد میرے لیے مرچکا ہے۔ پتا نہیں میں کب تک اس کی میت پر آنسو بہاتی رہوں گی۔"

وہ وہاں سے اٹھ کر اپنا فون چاچی کے پاس پھینک کر تیزی سے چلتی ہوئی ڈرائنگ روم سے جانے لگی۔ بچپن سے جوانی تک محبت کے دم دلاسے دینے والا اچانک ہی کسی دوسرے کا ہوگیا تھا۔ یہ کوئی معمولی صدمہ نہیں تھا۔ یہ تو طے تھا کہ اس نے اپنی اہمیت کھودی ہے۔ ابھی مراد کے بچھڑنے کا غم بھاری تھا۔ وہ ابھی کسی سے بولنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ وہاں رو رو کر دل کا بوجھ ہلکا کررہی تھی۔

ادھر مراد سر جھکائے بیٹھا تھا۔ مرینہ نے کہا۔ "ماروی کو شاک پہنچا ہوگا۔ ابھی وہ صدمہ اٹھا رہی ہوگی۔ اگر وہ رو رہی ہوگی تو اسے رونے دو۔ زندگی میں پیش آنے والا کوئی بھی صدمہ ہمیشہ نہیں رلاتا۔ تم ذرا صبر کرو۔

"بہتر یہی ہے مراد... کہ ماروی کو جب صبر کرنا اور سمجھوتا کرنا آجائے۔ تب اس سے بات کرو۔"

"وہ سمجھوتا نہیں کرے گی۔ محبوب اسے کرنے نہیں دے گا۔ اسے سنہری موقع ملا ہے۔ وہ میرے خلاف اسے بھڑکا رہا ہوگا۔ لاؤ مرینہ! فون مجھے دو۔ میں محبوب کو اپنے خلاف کوئی کھیل نہیں کھیلنے دوں گا۔"

مرینہ نے ری ڈائل کرکے فون اسے دیا۔ وہ اسے کان سے لگا کر سننے لگا۔ دوسری طرف بیل جارہی تھی پھر چاچی کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو مراد! تم ہو؟"

"ہاں چاچی۔ فون ماروی کو دیں۔"

"کیوں ماروی کو دوں؟ بڑا آیا اس سے بات کرنے

والا' کس منہ سے باتیں کرے گا اس سے؟ بے شرم کہیں کا۔ اُدھر منہ کالا کر رہا ہے۔ اِدھر اس سے بولتے ہوئے شرم نہیں آئے گی؟"

"چاچی! میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے یہ میرا خدا جانتا ہے۔ مجھے اس سے بات کرنے دو۔ میں اسے سمجھاؤں گا۔"

"ابھی وہ تم سے تو کیا ہم سے بھی بات نہیں کر رہی ہے۔ اپنے کمرے میں اکیلی ہے۔ اپنی قسمت کو رو رہی ہے۔"

"خدا کے لیے چاچی اسے سمجھاؤ۔ مناؤ کہ ایک بار مجھ سے بات کرے۔ نہیں تو میں۔ نہیں تو میں..."

"ارے کیا نہیں تو میں...؟ کیا کرے گا تُو؟ وہ تو اپنے فون سے تیرا نمبر ہی مٹا دے گی۔"

"میں دو ملکوں کی سرحدیں توڑ کر آسکتا ہوں۔ یہ نہیں سوچوں گا کہ پولیس اور آرمی والے مجھے گولی مار دیں گے۔ بہت مجبور ہو گیا ہوں۔ میرا ایک پاؤں اور دو باز و زخمی ہیں۔ میں لنگڑا کر چلتا ہوں۔ میں کیا کروں؟ یا خدا...! ابھی ماروی کے پاس آنا چاہتا ہوں لیکن نہیں آسکوں گا۔"

"آ کر کیا کرو گے۔ ماروی کے فیصلے کے مطابق تم اپنی اہمیت کھو چکے ہو۔"

"وہ بے وقوف ہے۔ میں اس کا احمقانہ فیصلہ نہیں مانوں گا۔"

"اسے بے وقوف کہو یا عقل مند' وہ جسے قبول کرے گی' اس کی منکوحہ بنے گی۔"

"محبوب اسے بہکائے گا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے جلد سے جلد اپنی شریکِ حیات بنانا چاہے گا۔ خدا کی قسم' میں ایسا ہونے نہیں دوں گا۔"

"تم وہاں بیٹھے بیٹھے تلملاتے رہو۔ یہاں جو ہونا ہے' وہ تو ہو کر ہی رہے گا۔"

"اچھی بات ہے' میں بھی دیکھتا ہوں کہ وہ کیسے میری ماروی کو مجھ سے چھین لے گا۔ میرا نام مراد ہے۔ دیکھ لینا' میں یہاں بیٹھے بیٹھے اس کی زندگی چھین لوں گا۔"

وہ فون بند کر کے اسے مٹھی میں بھینچنے لگا۔ جیسے وہ فون نہیں تھا' محبوب کی گردن تھی۔ خیالوں میں اسے دبوچ رہا تھا۔

مرینہ نے اسے تھپکتے ہوئے کہا۔ "صبر کرو۔ سمجھداری سے کام لو۔ غصے میں پاگل ہوتے رہو گے تو یہ غصہ تمہیں ماروی کے پاس پہنچنے نہیں دے گا۔"

"میں ایک ہی بات جانتا ہوں۔ مجھے کسی بھی طرح ماروی کے پاس پہنچنا ہو گا۔ کوئی تدبیر کرو۔"

"یہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہاں سے نکل نہیں سکو گے۔ پولیس اور آرمی کے لوگ تمہاری بُو سونگھتے پھر رہے ہیں۔" اس نے مرینہ کو غصے سے دیکھا اور بے بسی سے رو دینے کی شکایت کی۔

وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔ "گڑے مُردے نہ اکھاڑو مراد! میں نے اس وقت گولیاں چلائی تھیں۔ جب ہمارے درمیان دشمنی تھی۔ ابھی دیکھ رہے ہو کہ کس طرح جی جان سے تمہارا علاج کر رہی ہوں۔ تمہاری خدمت کر رہی ہوں۔"

"خدمت گزاری نہ کرو۔ کسی طرح ماروی تک پہنچاؤ۔"

"کیوں چیخ رہے ہو اور جھنجلا رہے ہو۔ تمہیں سمجھا رہی ہوں کہ غصہ تھوکو اور ٹھنڈے دماغ سے سوچو۔ کیا وہاں بلّے سے کوئی کام لے سکتے ہو؟ کیا وہ محبوب کو ماروی سے دور کر سکے گا؟"

مراد چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ سوچنے لگا۔ پھر انکار میں سر ہلا کر بولا۔ "نہیں۔ وہ ایک اچھا شوٹر ہے۔ اندھیرے میں بھی اپنے ٹارگٹ کا صحیح نشانہ لیتا ہے لیکن محبوب علی چانڈیو بہت اونچی ہستی ہے۔ وہ بڑے وسیع ذرائع کا مالک ہے۔ ایجنسی کا ایک افسر حماد صدیقی بلّے کو پیس کر رکھ دے گا۔"

"پھر کیا کیا جائے؟"

وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگے۔ پھر اس نے مرینہ کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "تم نے مجھے ناکارہ بنا دیا ہے۔ اب تم ہی میرا کام کرو گی۔ تم پاکستان جاؤ گی۔"

"میں...؟" وہ چونک کر بولی۔ "میں تمہیں ایسی حالت میں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔"

ماسٹر کے دستِ راست چیت راؤ نے انہیں بہت ہی محفوظ جگہ پہنچایا تھا۔ مراد نے کہا۔ "تم مجھے چھوڑ کر جاؤ گی تو یہاں میرا خیال رکھنے والے بہت ہیں۔ فوراً ماسٹر کو فون کرو۔ اس سے بولو کہ وہ کسی بھی طرح تمہیں آج رات سرحد پار کرائے۔"

مرینہ نے کہا۔ "میں تمہاری دیوانگی اور بے چینی کو سمجھ رہی ہوں۔ تمہیں چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی مگر جانا ہو گا۔ تمہیں ناراض نہیں کروں گی۔ تمہیں خوش کرنے کے لیے ماروی کو محبوب کی جھولی میں جانے نہیں دوں گی۔"

فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ مراد نے کہا۔ "ماروی ہو گی۔ فون مجھے دو۔"

"ماروی نہیں ماسٹر کو یو یو کال کر رہا ہے۔ عجیب اتفاق ہے' ابھی ہم اسے کال کرنے والے تھے۔"

مرینہ نے فون کو کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو ماسٹر! ہم آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہیں۔"

وہ بولا۔ "ہائے مرینہ! تمہارے لیے ایک خوشخبری ہے۔ لندن کے MET ڈیپارٹمنٹ والے تمہیں تلاش کر رہے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔"

مرینہ نے پوچھا۔ "وہ کیا کہہ رہے تھے؟"

"وہ تمہارے بارے میں بہت پُرجوش تھے۔ تمہیں اپنے ڈیپارٹمنٹ سے نکالنے کے باوجود تمہاری تعریفیں کر رہے تھے۔ تمہارا فون نمبر مانگ رہے تھے۔ کیا میں انہیں دے دوں؟"

"ہاں دے دیں۔ دیکھتی ہوں' وہ مجھے کیوں ڈھونڈ رہے ہیں اور مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں۔"

"تو پھر انتظار کرو۔ ابھی ان کی کال آئے گی۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ مراد نے غصے سے کہا۔ "تم ماسٹر سے آج سرحد پار کرنے کی بات کرنے والی تھیں۔ تم میری بے چینی کو کیوں نہیں سمجھ رہی ہو؟ کیا تمہاری نظروں میں میرے مسائل کی' میرے معاملات کی کوئی اہمیت نہیں ہے؟ لندن والوں کی توجہ ملتے ہی ان کی طرف دوڑی جا رہی ہو۔"

"پلیز مراد! اسٹریس نہ کرو۔ میری نظروں میں تم سے زیادہ کسی کی اہمیت ہو ہی نہیں سکتی۔ ذرا صبر کرو۔ آج ہر حال میں پاکستان جاؤں گی۔ تمہاری ماروی کو محبوب کے ہاتھ نہیں لگنے دوں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

"جن لوگوں نے تمہیں ٹھکرا دیا تھا' تمہاری ملازمت چھین لی تھی' ان سے کیوں بات کر رہی ہو؟"

"میں انہیں کال نہیں کر رہی ہوں۔ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ سراغ رسانی کی دنیا میں اسکاٹ لینڈ یارڈ کی سب سے زیادہ اہمیت ہے اور MET ڈیپارٹمنٹ ان کا ایک ضمنی ادارہ ہے۔ مجھے ان کی بات سن لینی چاہیے۔"

فون کی رنگ ٹون کہنے لگی ضرور لندن سے کال آرہی ہے۔ مراد نے مرینہ کو دیکھا۔ وہ فون کو کان سے لگا کر بولی۔ "ہیلو..."

دوسری طرف سے آواز آئی۔ "ہیلو مرینہ! میں MET کا ڈائریکٹر جنرل جان انتھونی بول رہا ہوں۔"

وہ بولی۔ "بہت عرصے بعد آپ کی آواز سن کر خوشی ہو رہی ہے۔ فرمائیے کیسے یاد کیا؟"

"ہم تو تمہیں یاد کرتے ہی رہتے ہیں۔ تم نے ایسے ایسے کارنامے انجام دیے ہیں کہ تمہیں کبھی بھلایا نہیں جا سکے گا۔"

"اس کے باوجود مجھے اس ڈیپارٹمنٹ سے نکال دیا گیا۔"

"سو سوری مرینہ! تمہارے خلاف فیصلہ کرنے والوں سے غلطی ہو گئی۔ انکوائری بورڈ کی رپورٹ نے بتایا ہے کہ برنارڈ کے سلسلے میں جو ناکامی ہوئی تھی' اس کی ذمے دار تم نہیں ہو۔ ان دنوں واقعی کسی دشمن نے تمہیں گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔ تم نیم مُردہ ہو کر اسپتال میں پڑی تھیں۔"

وہ بولی۔ "تھینکس گاڈ! میرے سر سے ناکردہ غلطی کا الزام ختم ہو گیا ہے۔ اب میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"لندن آجاؤ۔ اپنی ڈیوٹی جوائن کرو۔"

"تھینک یو سر! ابھی ایک پرابلم میں ہوں۔ میری ایک مشکل آسان ہو گی' تب ہی لندن آسکوں گی۔"

"کیا تم کسی مشکل میں ہو؟"

"آپ کے لیے یہ کوئی بڑی مشکل نہیں ہے۔ میرے پاس بھی MET آفیسر کا آئی ڈی کارڈ اور اہم کاغذات ہوتے تو میں قانونی طور پر یہ ملک چھوڑ کر پاکستان پہنچ جاتی۔ میں انڈیا میں ہوں۔ آج رات تک میرا کراچی پہنچنا ضروری ہے۔"

"تمہارا نیا آئی ڈی کارڈ اور اہم کاغذات کل تک تیار ہوں گے پھر تم کسی روک ٹوک کے بغیر کسی بھی ملک میں جا سکو گی۔"

"پلیز آپ مجھے آج رات بارڈر پار کرا دیں۔"

"انڈیا میں ہمارا ایک سیکرٹ ایجنٹ ہے۔ میں ابھی اس سے بات کرتا ہوں۔ ہم چاہتے ہیں تم کل ہی یہاں چلی آؤ۔"

"کراچی میں دو چار روز رہوں گی۔ اپنا ایک اہم کام کروں گی۔ پھر آ کر ڈیوٹی جوائن کر لوں گی۔"

وہ بول رہی تھی اور مسکرا کر مراد کو دیکھ رہی تھی۔ وہ خوش ہو رہا تھا۔ مرینہ آج کراچی جانے کی بات کر رہی تھی۔ اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچ کر ایک بازو کے حصار میں لے لیا۔

اُدھر سے ڈائریکٹر جنرل انتھونی بول رہا تھا۔ "تمہاری بہت ضرورت ہے۔ تمہیں یہاں آ کر اپنی ڈیوٹی کا چارج لیتے ہی پھر برنارڈ کے کیس کو ٹیک اَپ کرنا ہے۔"

اس نے پوچھا۔ "برنارڈ...؟ تعجب ہے۔ کیا برنارڈ کا معاملہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے؟"

"او نو۔ سنڈیکیٹ ریڈ الرٹ والے بہت زیادہ

جھنجلائے ہوئے ہیں' برنارڈ کا قاتل نہ گرفتار ہوا ہے نہ ہی اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔"

مرینہ نے کن انکھیوں سے مراد کو دیکھا۔ اس وقت وہ برنارڈ کے قاتل کی آغوش میں تھی۔ وہ مسکراتی ہوئی' ذرا کسمساتی ہوئی اس سے الگ ہو کر بیٹھ گئی۔

ڈائریکٹر جنرل کہہ رہا تھا۔ "اس قاتل کا نام مراد علی منگی ہے۔ تمہیں وہاں کے اخبارات سے اور الیکٹرونک میڈیا سے معلوم ہوا ہوگا۔ پاکستان میں اسے محبِ وطن کہہ کر سر پر چڑھایا جا رہا ہے۔ ہم نے اس کے بارے میں انکوائری کی ہے۔ یہ معلوم کر کے حیرانی ہو رہی ہے کہ وہ ایک دو کوڑی کا گدھا گاڑی والا تھا اور بندوق پکڑنا نہیں جانتا تھا۔"

مرینہ نے بڑے پیار سے مراد کو دیکھا پھر کہا۔ "ہاں۔ میں اس کی ہسٹری جانتی ہوں۔"

پھر وہ اچانک ہی فرنچ لینگویج میں بولی۔ "مسٹر انتھونی! میں نہیں چاہتی کہ یہاں کوئی میری بات سنے اور سمجھے ہم اس لینگویج میں باتیں کریں گے۔"

انتھونی نے کہا۔ "نو پرابلم۔ کوئی اہم بات کہنے والی ہو کیا؟"

وہ بولی۔ "ہاں۔ وہ جو بندوق پکڑنا نہیں جانتا تھا' وہ ایک خطرناک شوٹر بن گیا ہے۔"

"میں بھی تم سے کہنے والا تھا۔ اس کمبخت نے ریڈ الرٹ کے کئی شوٹرز کو مار ڈالا ہے۔ پتا نہیں وہ انڈیا کیسے پہنچ گیا ہے۔ فار یور انفارمیشن' وہاں تو اس نے اور ایک دھماکا کیا ہے۔ ریڈ الرٹ کو اور زیادہ شاک پہنچایا ہے۔ ان کے سربراہ میکی البرٹ کو مار ڈالا ہے۔"

"میں جانتی ہوں۔"

"میکی البرٹ کا ایک بھائی میکی براؤن انڈر ورلڈ کا ون آف دی ماسٹرز ہے۔ وہ مراد کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے پاکستان اور انڈیا کے انڈر ورلڈ والوں سے ڈیلنگ کر چکا ہے۔ میں حیران ہوں' ایک گدھا گاڑی والے کو کتنے ہی ملکوں کے سیکرٹ ایجنٹس اور خطرناک شوٹرز تلاش کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہم سے بھی معاہدہ کیا ہے۔ تم آؤ اور فوراً ڈیوٹی جوائن کرو۔ مرینہ! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم نے اس کی لاش گرا دی تو تمہیں پچاس لاکھ ڈالرز ملیں گے۔"

مراد چپ چاپ بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ وہ زبان سمجھ میں آنے والی نہیں تھی۔ اس نے اشارے سے پوچھا۔ "کیا باتیں ہو رہی ہیں؟"

وہ اردو زبان میں بولی۔ "وہاں ڈائریکٹر جنرل کے پاس کوئی بیٹھا ہوا ہے۔ وہ یہ لینگویج نہیں سمجھتا ہے اس لیے میں بھی یہ زبان بول رہی ہوں۔"

وہ بولا۔ "معلوم تو ہو کیا باتیں ہو رہی ہیں۔"

"تمہارے مطلب کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ وہاں لندن میں ایک خطرناک قاتل کو ٹھکانے لگانے کی بات ہو رہی ہے۔"

ادھر سے انتھونی نے پوچھا۔ "وہاں کون ہے؟ تم کس سے باتیں کر رہی ہو؟"

وہ پھر فرنچ لینگویج میں بولی۔ "اسے پیار سے بول رہی تھی۔ آپ کو اور نہ جانے کتنی ہی خطرناک ایجنسیوں کو معلوم ہو چکا ہے کہ وہ بہت شاطر ہے' کسی کے ہاتھ نہیں آ رہا ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اسی قاتل نے مجھے گولیوں سے چھلنی کر کے اسپتال پہنچایا تھا۔"

وہ حیرانی سے بولا۔ "کیا واقعی؟ اس کا مطلب ہے اس نے تم سے بھی دشمنی مول لی ہے۔ پھر تو وہ تم سے نہیں بچے گا۔"

"آپ جانتے ہیں۔ میرا اسروس ریکارڈ بھی یہی کہتا ہے کہ کوئی مجرم' کوئی دشمن مجھ سے بچ کر زندہ نہیں رہتا۔ اگر کبھی مصلحتاً کسی کو زندہ چھوڑ دیتی ہوں تو پھر اسے انگلی کا ناچ نچاتی رہتی ہوں۔"

"ہاں مجھے یقین ہو گیا ہے' مراد نے تم سے دشمنی مول لے کر اپنی موت کو پیچھے لگا لیا ہے۔"

"پیچھے نہیں' میں اس کے آگے رہتی ہوں۔ اس کی دھڑکنوں سے لگی رہتی ہوں۔ اس منہ زور طوفان کو بانہوں کی زنجیریں پہنا کر اپنا قیدی بنا کر رکھتی ہوں۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو' میں سمجھا نہیں؟"

وہ بولی۔ "مسٹر انتھونی! میں نے اس پر کئی حملے کیے اور مات کھا گئی۔ اس نے مجھے نیم مردہ کر کے اسپتال پہنچا دیا۔ تب میرے غصے کی انتہا نہ رہی۔ میں نے قسم کھائی کہ زندہ رہ گئی تو اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ لیکن یہ ناقابلِ شکست اور ناقابلِ تسخیر ہے۔ آپ یقین نہیں کریں گے میں نے اسے قیدی بنا کر لوہے کی ہتھکڑی اور بیڑیاں پہنائی' یہ انہیں بھی توڑ کر نکل گیا۔"

اس نے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ کر چور نظروں سے مراد کو دیکھا پھر کہا۔ "یہ کتا مجھے برہنہ کر کے بیچ بازار میں چھوڑ گیا تھا۔ میرا نام مرینہ ہے۔ کوئی میری ایسی تذلیل

کرے اور میرے ہاتھوں سے زندہ بچتا رہے' یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ تب میں نے اس بے ایمان دل پر ہاتھ رکھ کر سوچا' یہ مرد ہے زبردست۔ میں تو اس پر مرمٹی ہوں۔

"میں نے فیصلہ کر لیا کہ اسے زندہ رکھوں گی اور بڑی محبت سے مارتی رہوں گی۔ در پردہ اسے اس طرح نقصان پہنچاتی رہوں گی کہ یہ کبھی سمجھ نہیں پائے گا کہ اس کے ساتھ کیوں ایسا ہو رہا ہے؟ اور کون ایسا کر رہا ہے؟ یہ قسم کھائی کہ جب بھی ہاتھ آئے گا' اسے بہت پیار سے بہت آہستہ آہستہ مارتی رہوں گی۔"

"یہ اچھی پلاننگ ہے لیکن تم ایسے سر پھرے شوٹر کو محبت سے زیر نہیں کر سکو گی۔"

اس نے صوفے پر سکڑ کر لیٹتے ہوئے' اپنا سر مراد کے زانو پر رکھتے ہوئے کہا۔ "میں اسے اپنی بانہوں میں قید کر چکی ہوں۔ ان لمحات میں اس کے زانو پر سر رکھے آپ سے باتیں کر رہی ہوں۔"

وہ حیرت سے اچھل پڑا۔ "کیا سچ کہہ رہی ہو؟"

وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ "جسے سنڈیکیٹ اور انڈر ورلڈ والے ڈھونڈ رہے ہیں' وہ تمہارے پاس ہے؟ یہ یہ کیا کہہ رہی ہو' تم ابھی اس کی آغوش میں ہو؟"

"ہاں۔ اسی لیے اس لینگویج میں باتیں کر رہی ہوں۔ یہ نہیں سمجھ رہا ہے کہ میں اس کے بارے میں بول رہی ہوں۔"

وہ اپنے ویل فرنشڈ آفس میں ایک بڑی سی میز کے پیچھے ریوالونگ چیئر پر بیٹھا تھا۔ شدید حیرانی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ فون کو کان سے لگائے ادھر سے ادھر جاتے ہوئے بولا۔ "مرینہ! تم کیا ہو...؟ کیا ہو مرینہ...؟ تم نے ہمیشہ اپنے کارناموں سے چونکایا ہے۔ پلیز مجھے یقین دلاؤ کہ جو کسی کے ہاتھ نہیں آ رہا ہے' اسے تم نے اپنی ٹانگوں میں دبوچ رکھا ہے۔"

وہ بولی۔ "مرینہ جھوٹ نہیں بولتی۔ خوامخواہ ڈینگیں نہیں مارتی۔ آپ یقین کر لیں کہ یہ میرا اسیر ہے۔ پیار کی زنجیر لوہے کی ہتھکڑیوں اور بیڑیوں سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔ یہ میرے شکنجے سے کبھی نکل نہیں سکے گا۔"

"تم ابھی کہاں ہو؟ انڈیا کے کس صوبے کس علاقے میں ہو؟ فوراً اپنا پتا بتاؤ۔"

"میں آج ہر حال میں پاکستان جانے والی ہوں۔ یہاں کا پتا پوچھ کر کیا کریں گے؟"

"تم سمجھتی کیوں نہیں ہو؟ پچاس لاکھ ڈالرز آج ہی ہمیں ملیں گے۔ تم پاکستان جاؤ لیکن اسے ہماری کسٹڈی میں دے کر جاؤ۔"

وہ ذرا چپ رہی پھر بولی۔ "مسٹر انتھونی! پچاس لاکھ ڈالرز بہت بڑی رقم ہے۔ میں اپنے ادارے کو ضرور فائدہ پہنچاؤں گی۔ ہم یہ رقم ضرور حاصل کریں گے لیکن ابھی نہیں..."

"ابھی کیوں نہیں...؟"

"میں اسے اس طرح کمزور بنا رہی ہوں کہ یہ کبھی میرے بغیر کہیں جا نہیں سکے گا۔ ایک تو یہ کہ ابھی اس کے زخم بھرنے میں کئی مہینے لگیں گے۔

"پھر یہ کہ شراب اور شباب' یہ دو چیزیں بڑے بڑے وردوں کو کمزور اور ناکارہ بنا دیتی ہیں۔ میں اس کا علاج کر رہی ہوں اور برانڈی کا ایک بڑا پیگ دوا کے طور پر پلاتی ہوں۔ اسے نشے کا عادی بنا رہی ہوں۔ آج سے خوراک بڑھا دوں گی۔ اسے ڈبل پیگ دیا کروں گی۔ ابھی یہ میرا عادی ہوا ہے۔ رفتہ رفتہ اسے حسین کھلاڑی عورتوں کا عادی بنا دوں گی۔ آپ جلد ہی دیکھیں گے کہ یہ جو شیر کی طرح دھاڑتا رہتا ہے جلد ہی میرے سامنے چوہا بن کر رہے گا۔ میں وعدہ کرتی ہوں جس دن اس کا بچہ میرے پیٹ میں آئے گا' میں اسے آپ کے حوالے کر دوں گی۔"

"او گاڈ! تم عورتیں بھی کیا ہوتی ہو۔ بیک وقت دشمن بھی ہوتی ہو اور دیوانی محبوبہ بھی۔ جس کی جان لینا چاہتی ہو' اس کی اولاد کو اپنی کوکھ میں رکھنا چاہتی ہو۔ تم شاید نہیں مانو گی۔ حقیقت یہ ہے کہ تم اس مرد پر مرمٹی ہو۔ اس سے انتقام لینے کے لیے سلو پوائزن کی طرح اسے کمزور بنانے کی باتیں کر رہی ہو۔ جب اس کا بچہ پیٹ میں آئے گا تو تم اس کی اور دیوانی ہو جاؤ گی۔ خوشی سے پاگل ہو کر ناچتی پھرو گی۔"

وہ ذرا چپ رہی۔ جان انتھونی کی بات دل کو لگ رہی تھی۔

اسے پاکستان سے یہاں لانا ضروری نہیں تھا۔ وہیں اسے گولی مار سکتی تھی لیکن اس کی ہوس اور طلب نے مراد کو اس کے انتقام سے بچا لیا تھا۔

اس نے فون کو دیکھا پھر کہا۔ "نہیں سر! میں وعدہ کرتی ہوں۔ صرف چار مہینے انتظار کروں گی۔ اگر ماں بننے کے آثار پیدا نہیں ہوں گے تو میں اسے آپ کے حوالے کر

دوں گی۔لیکن یہ یاد رکھیں اس سے پہلے آپ در پردہ کوئی چال نہیں چلیں گے۔اپنے خفیہ ذرائع سے یہ معلوم نہیں کریں گے کہ میں نے اپنے یار کو کہاں چھپا کر رکھا ہے۔

”میں صاف کہہ دیتی ہوں۔میری مرضی کے خلاف آپ کا جو بھی جاسوس اس تک پہنچے گا‘ وہ زندہ نہیں جائے گا۔میں اس کی خاطر اپنے ہی ڈیپارٹمنٹ سے دشمنی مول لے لوں گی۔“

”تم اطمینان رکھو۔ہم تمہارے مزاج کو سمجھتے ہیں‘ ہم چار ماہ تک انتظار کریں گے۔پانچویں ماہ کی پہلی تاریخ کو تم اسے ہمارے حوالے کر دو گی۔“

”بے شک وعدہ کرتی ہوں۔اب آپ اپنے سیکرٹ ایجنٹ سے بولیں کہ وہ آج رات ہی مجھے پاکستان پہنچا دے۔“

”میں اسے فون کر رہا ہوں۔انتظار کرو۔ابھی تھوڑی دیر میں وہ تمہیں کال کرے گا۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔وہ فون بند کر کے مراد کے زانو سے سر اٹھا کر بولی۔”ابھی ایک سیکرٹ ایجنٹ کی کال آئے گی۔“

وہ بہت خوش تھا۔مرینہ آج ہی پاکستان پہنچ کر محبوب کو ماروی سے دور کرنے والی تھی۔وہ اسے گلے لگا کر بولا۔”میری جان! تم نے دل خوش کر دیا ہے۔“

وہ اس پر قربان ہونے لگی۔وہ بول رہی تھی۔”میں بہت خوش ہوں پھر سے MET آفیسر بن گئی ہوں۔جانتے ہو تمہیں کتنا فائدہ پہنچے گا؟ میں وہاں جا کر محبوب کو اور اس کے اینٹی جنس والوں کو تگنی کا ناچ نچا دوں گی۔تم مراد ہو۔وہ عاشق نامراد ہوگا۔کبھی ماروی کے سائے تک بھی پہنچ نہیں پائے گا۔“

واقعی مرینہ جرائم کی دنیا میں MET آفیسر بن کر وسیع ذرائع اور اختیارات حاصل کرنے والی تھی۔اس کی پیار بھری دشمنی دو دھاری تلوار تھی۔وہ بڑی خوبی اور مہارت سے دہری چالیں چل رہی تھی۔پیار بھری میٹھی چھری بن کر مراد کے کلیجے میں اترتی جا رہی تھی۔

وہ بہت خوش تھا۔اس نے اپنی دانست میں مرینہ سے دوستی کر کے غلطی نہیں کی تھی۔منافع کا سودا کیا تھا۔ماروی اس کی غیر موجودگی میں محبوب کی پہنچ سے دور رہنے والی تھی۔

ایک گھنٹے بعد سیکرٹ ایجنٹ نے مرینہ سے فون پر کہا۔”میں ہیلری ہڈسن بول رہا ہوں۔ڈائریکٹر جنرل نے کہا ہے‘ تمہیں کراچی پہنچایا جائے۔تم ابھی کہاں ہو؟“

”میں جے پور میں ہوں۔“

”تم کسی بھی فلائٹ سے شام تک دہلی آ جاؤ۔آج رات دس بجے ایک طیارہ لندن کے لیے روانہ ہوگا۔کراچی اس کی بریک جرنی ہوگی۔تمہیں وہاں اتار دیا جائے گا۔“

”اس طیارے کا عملہ وقتِ ضرورت ہماری مرضی سے تبدیل ہو جاتا ہے‘ تم یہاں سے ائر ہوسٹس بن کر جاؤ گی۔“

”جس ائر ہوسٹس کے کاغذات پر جاؤ گی‘ وہ ایک عام مسافر کی طرح کراچی تک جائے گی۔وہاں سے وہ اپنی ڈیوٹی پر آ جائے گی۔کراچی ائر پورٹ پر تمہیں چور راستے سے باہر پہنچا دیا جائے گا۔“

”تھینک یو مسٹر ہڈسن! میں ابھی سیٹ او کے کرانے کے بعد فون کروں گی۔“

اس نے اسی وقت جے پور ائر پورٹ کے ایک نمبر پر فون کیا۔ایک ائر لائن سے معلوم ہوا کہ دو گھنٹے بعد جانے والی فلائٹ میں سیٹ مل جائے گی۔

اس نے مراد سے کہا۔”میں ٹکٹ لینے جا رہی ہوں۔ابھی آ جاؤں گی۔اپنا خیال رکھو۔“

وہ چلی گئی۔مراد اپنے زخموں کو اور اپنی بے بسی کو بھول گیا تھا۔وہ اس خفیہ پناہ گاہ میں رہنے کے باوجود مرینہ کی صورت میں ماروی کے قریب جانے والا تھا اور آج رات کی صبح ہونے سے پہلے اپنے رقیب کو اس سے دور کر دینے والا تھا۔آدمی خوش فہمی میں رہ کر بڑے دھوکے کھاتا ہے۔مراد کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ بھی بے خبری میں فریب کھاتا۔

وہ دیکھ رہا تھا کہ مرینہ اس کی مسیحا بن گئی تھی۔خود اس کا علاج کر رہی تھی۔اس نے وعدہ کیا تھا کہ اسے ماروی کے پاس پہنچائے گی اور اس کی معشوق کو محبوب کی جھولی میں نہیں جانے دے گی۔وہ اپنا یہ وعدہ پورا کرنے کے لیے اسی رات پاکستان جا رہی تھی۔یہ ثابت کر رہی تھی کہ وہ اس کی خدمت گزار‘ وفادار ہی نہیں اس کی ماروی کی محافظ بھی ہے۔

کون سوچ سکتا تھا کہ ایسی عورت کے اندر زہریلی ناگن بیٹھی ہوئی ہے؟ اسے یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے اور کیا کرنے والی ہے؟

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردش ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

اعتراف

عشام قادر

عورت...! جس کے روپ ہزار... اور ہر روپ دوسرے سے جدا۔کہیں فولاد کی مانند ڈٹ جانے والی اور کہیں ریت کی طرح بکھر جانے والی... کہیں برسات کی بوندیں... کہیں جھلستی دھوپ کا احساس... لیکن ہزاروں روپ بدلنے کے باوجود عورت محبت کے نام پر اپنا سب کچھ قربان کردیتی ہے۔یہی حال اس کا بھی تھا جو جانے کب سے سارے تانے بانے توڑنے کے درپے تھی کہ چاہے جانے کا ایک پوشیدہ جذبہ اس کے دل کے نازک تاروں اور مضبوط عزائم کو ہلا گیا۔

[illegible] ٹوٹے ہوئے انسان کا اعتراف شکست

تین برس پہلے جب اس نے مجھ سے اظہار کیا تھا کہ ”وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔“ تو میں نے اس سے کہا تھا کہ ”کیا پاگل ہو گئی ہو۔“ اور آج تین برس بعد جب اس نے کہا کہ ”وہ مجھ سے طلاق چاہتی ہے۔“ تب بھی مجھے پہلا فقرہ دہرانا پڑا۔

”کیا پاگل ہو گئی ہو؟“

”تم جو چاہے سمجھو...... اگر تم نے طلاق نہ دی تو......“

اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا اور میں اس کی بات پر مسکرا دیا۔

”تین برس پہلے جب تم نے اسی طرح کا فقرہ ادا کیا تھا تو فقرہ ادھورا نہیں چھوڑا تھا‘ تمہاری آواز میں اعتماد تھا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“ اس نے کسی قدر تیز لہجے میں سوال کیا۔

''میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ تین برس پہلے تمہاری ریہرسل مکمل تھی لیکن اس بار......'' میں نے فقرہ ادھورا چھوڑا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ وہ غصے کا نہیں، بوکھلاہٹ کا شکار ہوگئی تھی۔

''آخر تمہارا مقصد کیا ہے؟'' خاموشی کا طویل ہوتا ہوا وقفہ بالآخر اس نے ختم کیا۔

''تم نے اپنے طور پر اچھی کوشش کی لیکن تمہاری آواز کی کپکپاہٹ غصے کی نہیں، احساسِ گناہ کی ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا اور وہ اس جگہ پھر بیٹھ گئی جہاں سے وہ چند لمحے پہلے اٹھی تھی۔

''میرا کون سا احساسِ گناہ ہے جس کا تم حوالہ دے رہے ہو؟''

''اگر تم یہ سمجھ رہی ہو کہ میں تمہیں تین برس پہلے کی وہ باتیں یاد دلا رہا ہوں جب تم مجھ سے شادی کرنے کے لیے خودکشی کر رہی تھیں تو تم غلط سوچ رہی ہو۔'' میں نے کہا تو وہ ایک بار پھر مجھے گھورنے لگی۔

''ہر انسان زندگی میں غلطی کرتا ہے۔'' اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''تم نے کبھی شیر کے شکار کے بارے میں پڑھا ہے؟'' میں نے سوال کیا تو وہ یوں دیکھنے لگی جیسے سمجھ نہ پا رہی ہو کہ اس بے وقت کے سوال کا یہاں کیا ذکر ہے۔

''میں نے پڑھا ضرور ہے۔'' اس نے مختصراً جواب دیا۔

''شیر جب چارے کی جانب بڑھتا ہے تو وہ شکار کرنے ہی بڑھتا ہے لیکن شکار کرنے کے بجائے خود شکار ہوجاتا ہے۔'' میں نے کہا لیکن اس کی آنکھوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کچھ سمجھ نہیں سکی ہے۔

''میں سمجھی نہیں کہ تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟'' میں بولتے بولتے رکا تو اس نے سوال کیا۔

''جلد بازی اچھی چیز نہیں ہے مسز نازیہ احتشام۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''تم کھل کر بات کرو...... شیر...... شکار اور نہ جانے کیا کیا بات گھما رہے ہو۔'' طنز کے انداز اپناتے ہوئے اس نے کہا۔

''چارے کو دیکھ کر شیر ضرورت سے زیادہ بلکہ غیر ضروری خود اعتمادی کا شکار ہوجاتا ہے۔'' میں نے کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''شیر کے شکار پر آپ کی تحقیق قابلِ قدر ہے۔'' وہ ایک بار پھر طنزیہ انداز میں گویا ہوئی۔

''پھر وہ شکار، جس میں شکار کرنے والا خود شکار ہوجائے، وہ ایک طرح کا ہی ہوتا ہے۔'' میں نے سادہ سے انداز میں کہا لیکن وہ بری طرح چونکی۔ اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوگئی اور وہ خالی نظروں سے دیکھنے لگی۔

''اس بات کا مطلب؟'' اس نے آہستگی سے سوال کیا۔

''صرف اتنا ڈاکٹر نازیہ احتشام کہ شیر اگر صرف یہ سوچ لے کہ شکار اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ کیوں نہیں رہا جیسے کہ اس کے ہر شکار پر ہوتا تھا۔'' میں نے کہا لیکن اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا۔

''شاید تم مجھے کوئی دھمکی دے رہے ہو؟'' اس نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔

''میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ لاچار اور مجبور شکار کو دیکھ کر شیر اتنا مطمئن ہوجاتا ہے کہ احتیاط کا دامن بھی چھوڑ دیتا ہے۔'' میں نے کہا تو اس کے ہاتھوں سے ایک بار پھر صبر کا دامن چھوٹ گیا۔

''لیکن یہ میرے سوال کا جواب نہیں۔'' اس کے لہجے میں ایک بار پھر تیزی آگئی۔

''میں یہ کہہ رہا ہوں کہ شکار کرنے والا اس وقت خود شکار ہوجاتا ہے جب وہ ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا شکار ہوجاتا ہے۔'' میں نے کہا تو وہ کاندھے اچکا کر کہنے لگی۔

''تم کہنا کیا چاہ رہے ہو کہ جب تم نے مجھ سے شادی......'' وہ جو کچھ کہنا چاہ رہی تھی، میں نے اسے بیچ سے روک دیا۔

''میں نے تم سے نہیں، تم نے مجھ سے شادی کی تھی۔'' میں نے تصحیح کی تو اس نے اپنی عادت کے مطابق کاندھے اچکا دیے۔

''ایک ہی بات ہے۔'' اس نے بات ٹالنے والے انداز میں کہا تو میں نے باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

''تم کہاں جا رہے ہو؟'' اس نے مجھے کمرے سے باہر جاتا دیکھ کر سوال کیا۔

''باہر لان میں بیٹھ کر چائے پینا چاہتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''چائے تم یہاں بھی پی سکتے ہو۔'' اس نے مجھے روکنا چاہا۔

''جب تک میں چائے پی لوں، تم تین برس پہلے کے واقعات کو اچھی طرح دہرالو تاکہ میری باتیں تمہاری سمجھ میں پوری طرح آجائیں۔'' میں نے کہا اور باہر کی جانب چل دیا۔

میں لان میں آیا تو وہ بھی ساتھ چلی آئی۔ ملازم نے ہمیں آتا دیکھا تو کرسیوں کی پھر سے صفائی کرنی شروع کردی۔ ہم دونوں اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے تو وہ وہاں سے چلا گیا۔

''احتشام! میں چاہتی ہوں کہ ہم دونوں کے درمیان معاملہ بغیر کسی تنازع کے حل ہوجائے۔'' اس نے کچھ دیر بعد کہا۔

''یعنی میں کسی حیل وحجت کے تمہاری یہ فرمائش بھی اسی طرح پوری کردوں جس طرح آج تک ہر فرمائش پوری کرتا رہا ہوں؟'' میں نے مسکراتے ہوئے سوال کیا تو اس نے نگاہیں دوسری جانب کرلیں۔

''احتشام...... میں......'' اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن مجھے اپنی جانب متوجہ پا کر وہ گڑبڑا گئی۔

''میں سننے کے لیے بے تاب ہوں ڈاکٹر نازیہ احتشام یا پھر ڈاکٹر نازیہ متین؟'' میں نے کہا...... نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں طنز کی کڑواہٹ شامل ہوگئی تھی جسے اس نے پوری طرح محسوس کیا تھا۔

''میں اعتراف کرتی ہوں کہ آپ نے مجھے ہر سہولت دی۔'' اس نے کچھ کہنے کا آغاز کیا ہی تھا کہ میں ہنس دیا اور وہ جو پہلے ہی نروس تھی اور زیادہ نروس ہوگئی لیکن میں ہنستا ہی رہا۔

''کن کن باتوں کا اعتراف کروگی نازیہ متین؟'' میں نے سوال کیا لیکن اس وقت تک وہ اپنا کھویا ہوا اعتماد کسی حد تک بحال کرچکی تھی۔

''ہر بات کا۔'' اس نے میرے طنزیہ انداز کو محسوس تو کیا لیکن نظر انداز کردیا۔

''اس بات کا اعتراف کروگی کہ تمہارے والد میرے دفتر میں اکاؤنٹس کلرک تھے؟'' میرے لہجے کا طنز بڑھ گیا۔

''میں اعتراف کروں یا نہیں، یہ ایک حقیقت رہی ہے۔'' اس نے ایک بار پھر میرے لہجے کو نظر انداز کیا۔

''یہ اعتراف بھی کہ تمہیں میڈیکل کالج میں ایڈمیشن تو مل گیا تھا لیکن تمہارے والد کے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ وہ اخراجات برداشت کرسکتے؟'' میں نے کہا تو اس نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا بلکہ خالی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔

خاموشی کا یہ وقفہ طویل تر ہوتا چلا گیا۔ اس دوران ملازم چائے کی ٹرالی لے کر آگیا۔ جب تک ملازم میز سجاتا، ہم دونوں ہی خاموش رہے لیکن جب اس نے چائے بنانی چاہی تو اس نے روک دیا۔

''تم جاؤ، میں بنالوں گی۔'' اس نے کہا۔

وہ خاموشی سے چائے بناتی رہی اور میں صرف اسے دیکھتا رہا۔ ماضی سلائڈ کی فلم کی طرح میرے سامنے سے گزر رہا تھا، میرا وجود وہاں تھا لیکن میرا ذہن ماضی میں وہاں پہنچ گیا تھا جہاں اکاؤنٹس کلرک عبدالمتین اجازت لے کر میرے چیمبر میں آیا تھا۔

''خیریت تو ہے متین صاحب؟'' میں نے اسے اپنے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

''خیریت ہی ہے سر۔'' اس نے بہت ہی نرم آواز میں کہا اور پھر خاموش ہوگیا جیسے جن الفاظ کو چن کر وہ اپنے ساتھ لایا تھا، وہ اچانک کہیں کھوگئے ہوں۔

عبدالمتین یوں بھی ایک مرنجان مرنج قسم کا شخص تھا۔ چھوٹا سا قد اور نحیف سا شخص جس کی بیوی کا دو برس پہلے انتقال ہوگیا تھا۔

''تم کچھ کہنا چاہ رہے تھے؟'' میں نے نگاہیں نیچی کیے ہوئے عبدالمتین سے سوال کیا تب بھی فوری طور پر وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

''سر! میری بیٹی نے انٹر کا امتحان پاس کرلیا ہے۔'' اس نے کہا لیکن اس کی نظریں بدستور نیچی ہی تھیں۔

''یہ تو بہت خوشی کی بات ہے اور تم بغیر مٹھائی کے آگئے ہو۔'' میں نے حوصلہ دینے والے انداز میں کہا۔

''آپ اس وقت ملک میں نہیں تھے۔'' اس نے کہا تو میں چونک گیا۔ دو روز قبل ہی میں امریکا سے ناکام واپس آیا تھا۔ میں اپنے گھریلو معاملات سدھارنے گیا تھا لیکن ایسا نہیں ہوسکا تھا۔

''ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔'' میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

''سر! نازیہ کا داخلہ میڈیکل کالج میں ہورہا ہے۔'' عبدالمتین نے یوں کہا جیسے کسی کی موت کی اطلاع دے رہا ہو۔

''یہ تو بہت زبردست خبر ہے۔ اس پر تو ہمیں مٹھائی منگوانی چاہیے۔'' میں نے کہا لیکن عبدالمتین کچھ نہیں کہہ سکا۔ اس کی نظریں بدستور فرش کی جانب ہی رہی تھیں۔ بالکل کسی مجرم کی طرح جو رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو۔ لیکن کچھ نہ کہنے کے باوجود میں سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ بیوی کی بیماری نے معاشی طور پر اسے تباہ کردیا تھا اگرچہ اس نے دفتر سے کبھی ایڈوانس نہیں لیا تھا۔

''آپ ایسا ہے عبدالمتین۔'' میں نے کچھ کہنے کی تمہید

باندھی ہی تھی کہ اس نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا۔

"دراصل سر میں اور میری وائف دونوں ہی جاب کرتے تھے۔" اس نے کہا تو مجھے کچھ کہنے سے قبل ہی رک جانا پڑا۔ عبدالمتین شاید یہ سمجھا تھا کہ میں اسے جانے کے لیے کہنے والا ہوں۔

"یہ تو اچھی بات تھی۔" میں نے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا تھا۔

"وہ گورنمنٹ اسکول میں ملازم تھی لیکن ہم اس کی تنخواہ بینک سے نکالتے نہیں تھے۔" اس نے عجیب سے انداز میں کہا۔ عبدالمتین کا انداز کچھ ایسا تھا کہ میں کچھ بھی نہیں سمجھ سکا۔

"ہم چاہتے تھے کہ وہ رقم نازیہ کی تعلیم اور اس کی شادی پر خرچ کر سکیں لیکن......" وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اس کی آواز بھرا گئی۔

"یہ قدرت کا قانون ہے عبدالمتین۔" میں نے تسلی دینی چاہی لیکن وہ اس سے پہلے ہی سنبھل چکا تھا۔

"ہماری تمام جمع پونجی اس کی بیماری میں ختم ہو گئی بلکہ میں قرض دار بھی ہو گیا۔" اس نے کہا۔

"کتنا قرض ہے؟" میں نے سوال کیا لیکن اس نے فوراً ہی نفی میں سر ہلا دیا۔

"میں اس کی پنشن اس قرض میں ادا کر رہا ہوں بلکہ اب تو قرض بہت کم رہ گیا ہے۔" اس نے جواب دیا تو مجھے ایک بار پھر خاموش ہو جانا پڑا۔

"تم کہہ رہے تھے کہ تمہاری بیٹی کا ایڈمیشن میڈیکل کالج میں ہو رہا ہے؟" خاموشی کا وقفہ طویل تر ہونے لگا تو مجھے ہی خاموشی توڑنی پڑی۔

"سر! اگر مجھے کچھ ایڈوانس مل جاتا تو......" عبدالمتین نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"اس برس ایڈوانس لو گے اور اگلے برس؟" میں نے سوال کیا۔

"اگلے برس تک قرض ختم ہو جائے گا اور اس کی ماں کی پنشن اس کی تعلیم پر خرچ کریں گے۔" عبدالمتین نے جواب میں کہا تھا۔

"کیوں نہ ہم ایک سودا کر لیں؟" میں نے کہا تو عبدالمتین نے عجیب انداز میں مجھے دیکھا۔

"میں تمہاری بیٹی کے تمام تعلیمی اخراجات برداشت کروں گا اگر تمہاری بیٹی یہ وعدہ کرے کہ کسی قابل ہوتے ہی وہ اس سے دگنی رقم کسی مستحق بچے کی تعلیم پر خرچ کرے گی؟" میں نے اپنی آفر دی تو عبدالمتین سوچ میں ڈوب گیا۔

"یہ وعدہ میں نازیہ سے پوچھ کر ہی کر سکتا ہوں۔" عبدالمتین نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

"تم تو معاہدہ کر بھی نہیں رہے ہو عبدالمتین۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا اور پہلی بار میں نے عبدالمتین کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ دیکھی تھی جیسے اس نے بادلوں میں چھپے عید کا وہ چاند دیکھ لیا جو کسی اور کو نظر نہیں آیا ہو۔

"احتشام......" میرے کانوں میں نازیہ کی آواز آئی اور میں چونک کر ماضی سے اچانک حال میں پہنچ گیا۔

ہم دونوں ہی اپنی اپنی چائے کی پیالیاں ختم کر چکے تھے لیکن چائے کے باقی لوازمات اسی طرح موجود تھے جس طرح لائے گئے تھے۔ میں خالی نظروں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ میرا ذہن بھی خالی تھا لیکن وہ اسے کچھ اور ہی سمجھی تھی۔

"اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟" اس نے سوال کیا۔

"دیکھ رہا ہوں کہ اس نازیہ متین میں جو پہلی بار میرے دفتر آئی تھی اور اس نازیہ میں کتنا فرق ہے۔" میں نے کہا تو وہ جھینپ سی گئی۔

"تم مجھے بار بار ماضی میں گھسیٹ کر کیا کہنا چاہ رہے ہو؟" اس نے کسی قدر تیز لہجے میں کہا۔

"آج سے پہلے میں نے کبھی یہ ذکر نہیں کیا حالانکہ......" میں نے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ دیا جبکہ اس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ کچھ سننا اور اس کے جواب میں کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔

جس دوران میں ماضی میں گھومتا رہا تھا، اس دوران اس نے اپنی گفتگو کو دوبارہ ترتیب دے لیا تھا اور اب اس کا اظہار کرنا چاہ رہی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ ایسا کرتی، اس کا موبائل بج اٹھا۔

"فوزیہ پہنچ رہی ہے۔" اس نے اطلاع دی۔

"تمہیں تو شاید اس کے گھر پارٹی میں جانا تھا۔" میں نے کہا۔ مجھے یاد آ گیا تھا کہ چند دن قبل نازیہ نے مجھے بتایا تھا۔

"صرف مجھے ہی نہیں، تمہیں بھی جانا تھا لیکن تم تو شاید......" اس نے بات طنزیہ انداز میں ختم کی۔

"علیحدگی کا فیصلہ کر لینے کے باوجود تم چاہتی ہو کہ میں بھی تمہاری طرح اداکاری کروں؟" میں نے کہا لیکن وہ کوئی جواب دیے بغیر وہاں سے چلی گئی۔ شاید اپنی سہیلی کے سامنے وہ ہمارے درمیان موجود تلخی کو ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

وہ وہاں سے گئی تو میں بلاوجہ ہی ایک بار پھر ماضی کی

جانب نکل گیا۔ اس دن کی جانب جب نازیہ عبدالمتین سے میری پہلی بار ملاقات ہوئی تھی۔ عبدالمتین سے گفتگو ہونے کے اگلے روز میں دفتر پہنچا تو میری سیکریٹری نے مجھے بتایا کہ عبدالمتین اپنی بیٹی کے ساتھ آئے ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

"میٹنگ ختم ہو جائے تو انہیں بھیج دینا۔" میٹنگ میں جانے سے قبل میں نے ہدایت دی۔

وہ میٹنگ ایک جاپانی وفد کے ساتھ تھی اور شرمندگی یہ تھی کہ میں تاخیر سے دفتر پہنچا تھا۔ میٹنگ میری توقعات سے زیادہ بہتر رہی تھی لیکن تفصیلات طے کرتے ہوئے کافی دیر ہو گئی۔ مہمانوں کو رخصت کر کے میں اپنے چیمبر میں پہنچا تو سیکریٹری نے اجازت لینے کے بعد باپ بیٹی کو بھیج دیا۔

"سر! میں نے ذکر کیا تھا تو اس نے کہا کہ یہ خود آپ کے سامنے وعدہ کرے گی۔" عبدالمتین نے اشارہ پا کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ بہت اچھا ہوا کہ ہم دونوں براہِ راست واقف ہو گئے۔" میں نے پہلی بار عبدالمتین کی بیٹی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اور وہ جواب میں صرف جی کہہ کر رہ گئی۔

وہ ایک عام سی لڑکی تھی جس کے چہرے پر اس کی آنکھیں اس قدر نمایاں تھیں کہ کسی اور شے کے بارے میں غور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن دبلی بلکہ بہت ہی دبلی ہونے کے باوجود وہ کہیں سے بھی عبدالمتین کی بیٹی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ وہ باپ سے بھی قد میں اونچی تھی اور اس کا رنگ بھی اپنے باپ سے بالکل مختلف تھا۔

"تو محترمہ ڈاکٹر نازیہ صاحبہ۔" میں نے براہِ راست ڈاکٹر کہہ کر مخاطب کیا تو اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ آ گئی۔

"جی سر۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا لیکن اس کا انداز باپ سے مختلف تھا۔ وہ براہِ راست میری جانب دیکھ رہی تھی۔

"یہ معاملہ تحریری نہیں ہو گا کیونکہ ہم دونوں ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"شکریہ سر۔" اس نے جواب میں کہا۔

"شکریہ کس بات کا...... میں تمہیں قرض دے رہا ہوں اور تم سود سمیت واپس کرو گی۔" میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

"شکریہ اس لیے کہ آپ نے میری ذات کی گارنٹی قبول کر لی۔" اس نے صاف لیکن شائستہ انداز میں کہا اور مجھے محسوس ہوا کہ وہ ایک پُراعتماد لڑکی ہے۔ اس کا جواب اس طرح کا تھا کہ میں سر ہلا کر رہ گیا۔

"اس معاہدے میں کوئی تیسرا فریق نہیں ہے، نہ میرا دفتر اور نہ تمہارے والد۔" میں نے وضاحت کی۔

"جی بہتر۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

نازیہ واپس آتے ہوئے نظر آئی تو میں ذہنی طور پر بھی وہیں حاضر ہو گیا جہاں جسمانی طور پر موجود تھا۔ وہ خاموشی سے وہیں آ کر بیٹھ گئی جہاں سے اٹھ کر گئی تھی۔

"فوزیہ جلدی میں تھی اس لیے گیٹ سے مل کر چلی گئی۔" میرے کچھ نہ پوچھنے کے باوجود اس نے بتایا۔

"یہ بہت اچھا ہوا۔" میں نے کہا تو وہ مجھے گھور کر رہ گئی لیکن اس نے الجھنے سے گریز کیا۔

"اب تک کی گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ معاملات اس طرح سے حل نہیں ہوں گے جیسا میں چاہتی تھی۔" اس نے ایک مختصر وقفے کے بعد کہا۔

"تم جانتی ہو نازیہ کہ تم میں سب سے اچھی عادت کیا ہے؟" میں نے سوال کیا تو اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے سمجھنا چاہ رہی ہو کہ میں اس کی تعریف کر رہا ہوں یا یہ کوئی مختلف انداز کا طنز ہے۔

"تمہارے نزدیک وہ اچھی عادت کیا ہے؟" اس نے بہت واضح انداز میں طنز کیا۔

"تم اپنا مقصد متعین کر لیتی ہو اور پھر تمہاری تمام تر کوشش اور توجہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہوتی ہے۔" میں نے سادہ سے انداز میں کہا لیکن وہ بدستور مجھے گھورتی رہی۔

"احتشام صاحب! کیا آپ طنز کیے بغیر سنجیدگی سے گفتگو نہیں کر سکتے؟" اس نے سوال کیا تو میں ہنس دیا۔

"یہ بتاؤ کہ اتنا بڑا کاروبار چلانے والا کیا بے وقوف ہو سکتا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"کاروبار تو تمہیں وراثت میں ملا تھا۔" نازیہ نے جواب دیا۔

"تم سمیت تمام لوگ جانتے ہیں کہ بابا سے جو ورثے میں ملا تھا، آج وہ کاروبار شاید دس گنا سے بھی زیادہ ہے۔" میں نے کہا تو وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

"اس طرح اگر آپ خود کو عقلمند ثابت کرنا چاہتے ہیں تو مان لیتے ہیں۔" اس کے ہونٹوں پر بہت دیر بعد مسکراہٹ آئی۔

"کاروبار چھوٹا ہو یا بڑا، اسے کامیابی سے چلانے کے لیے اپنے ہر کارکن پر پوری نظر رکھنی ضروری ہوتی

ہے۔'' میں نے اگلی بات کی لیکن اس کے چہرے سے یہی ظاہر ہوا جیسے وہ کچھ نہ سمجھی ہو۔

''شیر کی نفسیات سمجھانے کے بعد کیا اب کاروبار سمجھاؤ گے؟'' نازیہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''صرف اتنا کہہ رہا ہوں، اپنے ورکرز پر نظر رکھنے والا اپنے قریب ترین لوگوں سے کیسے غافل ہوسکتا ہے۔'' میں نے اس بار براہِ راست وار کیا تھا جس کی وہ توقع نہیں کررہی تھی۔

''تم کہہ رہے ہو کہ تم میری جاسوسی کرتے رہے ہو؟'' اس نے کہا لیکن میں خاموش رہ کر صرف اسے دیکھتا رہا اور وہ بھی یہ کہہ کر خاموش رہی۔

''ابھی تو صرف ایک حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔'' میں نے کہا تو وہ مجھے غصیلی نظروں سے دیکھنے لگی۔

''اور باقی حقائق کا اعتراف آپ کب کریں گے؟'' اس نے غصے اور طنز سے بھرپور لہجے میں پوچھا۔

''شیر کے شکار کی لایعنی گفتگو جب تمہاری سمجھ میں آجائے تو بہت سے حقائق بھی سمجھ لوگی۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا ہمارے درمیان کورٹ فیصلہ کرے گا؟'' اس کے انداز میں دھمکی تھی۔

''تم جانتی ہو کہ تم کورٹ نہیں جاسکتیں۔'' میں نے کہا تو وہ غصے سے اکھڑ گئی۔

''کون روکے گا مجھے؟'' اس نے تنک کر کہا۔

''جب تم پر حقیقت پوری طرح آشکار ہوجائے گی تو......'' میں نے فقرہ ادھورا چھوڑا۔

''تب کیا ہوگا؟'' اس کے مزاج کی گرمی برقرار تھی۔

''ہم ایسا کرتے ہیں کہ اپنے کمرے میں آرام سے بیٹھ کر شروع سے لے کر اب تک تمام حقائق کو آشکار کرتے ہیں۔'' میں نے کہا تو وہ خاموشی سے مجھے گھورتی رہی جیسے کچھ کہنا چاہ رہی ہو لیکن کہہ نہ پارہی ہو۔

''جب میں اعتراف کرچکی ہوں کہ میں ہر احسان کو تسلیم کرتی ہوں تو......'' اس نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہم دونوں تصویر کے دونوں رخ جانتے ہیں لیکن اعتراف نہیں کرتے۔'' میں نے جواب میں کہا۔ وہ الجھی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔

''کون سے دوسرے رخ؟'' اس کے لہجے میں الجھن بڑھ گئی تھی۔

''کچھ باتیں ہیں جو تم نہیں جانتیں اور کچھ ایسے حقائق ہیں جنہیں تم سمجھتی ہو کہ میں نہیں جانتا۔'' میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ جنہیں تم حقائق سمجھ رہے ہو......'' وہ کچھ اور بھی کہنا چاہ رہی تھی لیکن میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

''باقی باتیں بیڈروم میں ہوں گی اور وعدہ ہے ایک گھنٹے میں ختم ہوجائیں گی۔'' میں نے پہلا قدم اٹھانے سے قبل کہا اور آگے بڑھ گیا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا نہیں۔ جس طرح وہ اپنی جگہ بیٹھی رہی تھی اس سے یہی ظاہر ہورہا تھا کہ وہ میرے پیچھے نہیں آرہی ہے لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ آئے گی ضرور۔

میں نے بیڈروم پہنچ کر چینج کرلیا لیکن وہ نہیں آئی اور میں اطمینان سے بیڈ پر دراز ہوگیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ماضی میں جاؤں لیکن غیر ارادی طور پر میرا ماضی کا سفر ایک بار پھر شروع ہوگیا۔

وہ نازیہ کا میڈیکل میں تیسرا سال تھا جب حمید صاحب کا ایکسیڈنٹ ہوا اور وہ موقع پر ہی جاں بحق ہوگئے۔ میں اس وقت ملک میں نہیں تھا لیکن جس روز آیا، اسی روز ان کے گھر گیا تھا۔ حادثے کو سولہ دن ہوچکے تھے اور نازیہ خود کو کسی حد تک سنبھال چکی تھی۔ وہ مجھ سے ملی تو کسی حد تک کمپوز تھی لیکن اس کی آنکھوں میں مستقبل کی تشویش ضرور تھی۔

''میں آپ کی اور آپ کے دفتر کے لوگوں کی شکرگزار ہوں کہ انہوں نے ہمارا ساتھ دیا۔'' اس نے فاتحہ کے فوراً بعد کہا۔

''تمہارا اب کیا ارادہ ہے؟'' میں نے بند لفظوں میں وہ سوال کیا جو مجھے پریشان کررہا تھا۔

''خالہ نے میری درخواست مان لی ہے اور یہ میرے ساتھ شفٹ ہوگئی ہیں۔'' اس نے ساتھ بیٹھی خاتون کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

''یہ تو بہت بہتر ہوگیا۔'' میں نے اس کی تائید کی۔

''مجھے یہی سمجھ میں آیا تھا۔'' اس نے کہا۔

''جس حوصلے کا تم مظاہرہ کررہی ہو، امید ہے کہ اس حادثے کا تمہاری پڑھائی پر زیادہ اثر نہیں ہوگا۔'' میں نے کہا تو پہلی بار اس کی آنکھیں نم سی ہوگئیں۔

''ابا کے خواب پورے کرنے کے لیے اب شاید میں اور زیادہ محنت کروں گی۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔

''ہمارے معاہدے میں اب ایک چھوٹی سی تبدیلی

یہ کرنی ہوگی کہ اب تم براہِ راست مجھے فون کرلوگی اور میں......'' میں نے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔

وہ ہر ماہ باپ کے ہاتھوں پرچی بھجوا دیتی تھی کہ اسے کس ماہ میں کتنی رقم درکار ہوگی اور میں عبدالمتین کے ہاتھوں وہ رقم بھجوا دیا کرتا تھا۔

''جی بہتر۔'' اس نے جھکے ہوئے سر کے ساتھ کہا۔

میں وہاں زیادہ دیر رکا نہیں لیکن واپسی کے سفر میں یہ ضرور سوچتا رہا کہ ان ڈھائی برسوں میں وہ خاصی تبدیل ہوگئی تھی۔ اس کے کپڑوں میں تبدیلی تو آئی ہی تھی جسمانی طور پر بھی وہ اب پہلے کی طرح ایک دبلی پتلی مخنی سی لڑکی نہیں رہی تھی۔ چہرہ بھر جانے سے اس کی آنکھوں کے ساتھ اب اس کے دوسرے نقش بھی ابھرنے لگے تھے۔

میں آنکھیں بند کیے ماضی میں سفر کررہا تھا جب دروازہ بند ہونے کی آواز سے چونکا۔ وہ کمرے میں آچکی تھی لیکن بیڈ کی جانب رخ کرنے کے بجائے وہ بیڈ کے قریب کرسی کھینچ لائی تھی۔

''میں ایک بار پھر سے آپ کے احسانات کی فہرست دہرائے جانے کی منتظر ہوں۔'' نازیہ نے طنزیہ انداز میں کہا تو میں مسکراہٹ لائے بغیر دل ہی دل میں ہنس دیا۔ تین برس ساتھ رہنے کے باوجود میرے بارے میں اس کے اندازے قطعی غلط تھے۔

''میں نے کہا ہے کہ ہم ان حقائق پر بات کریں گے جو تم سمجھتی ہو کہ میں نہیں جانتا یا مجھے یقین ہے کہ تم ناواقف ہو۔'' میں نے کہا تو وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں مجھے دیکھتی رہی۔

''اور ان حقائق میں سے پہلی حقیقت کیا ہے؟'' اس نے سوال کیا۔ اس کا لہجہ اب بھی طنزیہ تھا۔

''سب سے پہلی حقیقت یہ ہے ڈاکٹر نازیہ کہ جب تم میڈیکل کالج میں پہنچیں تو پہلی بار دنیا تم پر آشکار ہونا شروع ہوئی۔'' میں نے کہا تو اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے گھورنا شروع کیا۔

''آپ اپنی اس بات کی وضاحت کریں گے؟'' اس نے کہا لیکن اس بار اس کا لہجہ طنزیہ نہیں تھا۔

''میڈیکل کالج آنے تک تم اپنے ہی جیسے لوگوں کے درمیان تھیں لیکن میڈیکل کالج میں امیر گھرانوں کی لڑکیوں اور لڑکوں کو دیکھ کر تم نے کچھ اور خواب بھی دیکھنے شروع کردیے۔'' میری بات مکمل ہوئی تو وہ کاندھے اچکا کر رہ گئی۔

''یہ آپ کے اندازے تو ہوسکتے ہیں لیکن حقیقت

اعترافِ جرم

ایک آدمی نے مرتے وقت اپنے دوست سے کہا۔ ''یار پچھلے سال تمہارے پچیس ہزار روپے کا غبن میں نے کیا تھا اور فیکٹری کے مزدوروں کو میں نے ہی بھڑکایا تھا۔ اگر تمہیں بدلہ لینا ہے تو لے لو۔''

''کوئی بات نہیں، تمہیں زہر بھی میں نے ہی دیا ہے۔''

لمبی تان کر سونا

یہ بھی پرانے وقتوں کے رواج میں شامل ہے، کیونکہ جب لمبی چادر دستیاب ہی نہ ہو۔ تو اسے لمبی تان کر کیسے سویا جاسکتا ہے؟ کیونکہ آج کل عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ہر سونے والے کے پاؤں چادر سے باہر ہی ہوتے ہیں البتہ ٹیکسٹائل ملوں کے مالک حضرات چونکہ چادریں خود ہی بناتے ہیں۔ اس لیے سردست وہ لمبی تان کر سوسکتے ہیں۔ بشرطیکہ انہوں نے خواب آور گولیاں بھی کھا رکھی ہوں، البتہ فونڈری والے لوہے کی چادر بھی تان کر سوسکتے ہیں۔

ظفر اقبال کی کتاب وال ولیہ سے اقتباس

انتخاب۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

لڑکوں کے ٹاپ 10 جھوٹ

1۔ مجھے تمہاری بہت فکر ہے (جھوٹا)
2۔ تم میری زندگی کی پہلی اور آخری پسند ہو۔ (استغفار)
3۔ بہن کی کال ہے یار (حد ہوگئی)
4۔ سیل فون سائیلنٹ پر تھا (لڑکے کا فون اور سائیلنٹ پر)
5۔ ہماری شادی ضرور ہوگی (خوابوں میں)
6۔ تمہارے سوا کسی سے بات نہیں کرتا (توبہ کرو)
7۔ تم نے شادی نہ کی تو کنوارا بیٹھا رہوں گا (ایک ہفتے تک)
8۔ تم نہ ملیں تو مر جاؤں گا (کسی اور پر)
9۔ تمہارے لیے جان بھی دے دوں گا (پتا نہیں کب تک)
10۔ تمہارا نہ ہوسکا تو کسی کا بھی نہ ہوسکوں گا۔ (بڑا جھوٹ)

مرسلہ: سوہا، لاہور کینٹ

نہیں۔" اس نے دوٹوک انداز میں کہنے کی کوشش کی لیکن اس کا لہجہ پوری طرح اس کا ساتھ نہیں دے سکا۔

"کالج میں تمہارے دو افیئرز چلے تھے اور وہ دونوں ہی......" میں وضاحت کرنا چاہ رہا تھا لیکن وہ میرے یہاں تک پہنچنے پر ہی چلا اٹھی۔

"احتشام! تم مجھ پر گھٹیا الزام لگا رہے ہو۔"

"میں کوئی الزام نہیں لگا رہا ہوں...... بلکہ تمہاری شرافت کا مجھ سے بڑا گواہ کوئی نہیں ہے۔" میں نے اس کے احتجاج کو نظر انداز کر دیا۔

"لیکن تم یہ کہہ رہے ہو کہ میرے افیئرز تھے؟" اس نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔

"میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ندیم الحسن اور سعید چناے دونوں امیر باپ کے بیٹے تھے۔ انہوں نے تمہاری خواہشات سے فائدہ اٹھانا چاہا لیکن تم نے خواہش کو کمزوری نہیں بننے دیا۔" میں نے وضاحت کی تو وہ کچھ دیر خاموش رہی۔

"آپ تک ہماری دوستی کو غلط انداز میں پہنچایا گیا۔" اس نے بہت ہی مدھم آواز میں کہا۔

"میں تو غلط کہہ بھی نہیں رہا ہوں بلکہ......" میں نے کہنا چاہا لیکن اس نے مجھے روک دیا۔

"بہتر ہوگا کہ ہم اس موضوع کو یہیں ختم کر دیں۔" اس نے کہا۔

"وہ نازیہ جو میرے دفتر آئی تھی اور وہ نازیہ جس سے میں اس کے والد کی وفات پر ملا تھا، ان دونوں میں بہت فرق تھا۔" میں نے کہا تو وہ ایک بار پھر اس طرح دیکھنے لگی جیسے کچھ نہ سمجھی ہو۔

"کیا فرق تھا؟" اس نے سوال کیا لیکن میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کر دیا۔

"یہ فرق مزید واضح ہوتا چلا گیا جب تم سے ہر ماہ ملاقات ہونے لگی۔" میں نے کہا تو اس نے چونک کر میری جانب دیکھا۔

"آپ کی وائف کی وفات کے بعد؟" اس نے سوالیہ انداز میں کہا لیکن میں نے ایک بار پھر براہِ راست جواب دینے سے احتراز کیا۔

"بہتر مستقبل کے لیے کوئی کوشش کرنا بری بات نہیں ہے اور تم نے اگر ایسا کیا تو غلط نہیں کیا۔" میں نے کہا لیکن وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

"جو گھٹیا الزامات آپ لگا رہے ہیں وہ آپ کی سوچ کے سوا اور کچھ نہیں۔" اس نے تیز لہجے میں کہا۔

"میں کوئی الزام نہیں لگا رہا ہوں۔" میں نے تردید کرنی چاہی لیکن اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔

"میرے لیے آپ ایک ایسے تنہا شخص تھے جس کی بیوی نے بچوں سمیت اسے چھوڑ دیا تھا۔" اس کا لہجہ تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔

"اور تم نے تنہا شخص پر ترس کھا کر شادی کر لی؟" میں نے کہا تو اس نے اس بار بھی سنی ان سنی کر دی۔

"میں آپ کی احسان مند تھی اور احسانات اتارنے کے لیے یہی طریقہ سمجھ میں آیا تھا۔" اس نے کہا اور باہر کی جانب چل دی۔

"یہ تمہارا کہنا ہے لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔" میں نے کہا تو وہ جاتے جاتے رک گئی۔

"میں تمہارے الزامات سے بھاگ نہیں رہی ہوں۔" وہ جاتے جاتے رک گئی۔ "تمہارے گھٹیا الزامات سے ذہن میں جو غبار جمع ہو گیا ہے، تازہ ہوا میں اسے دور کر کے واپس آتی ہوں۔" اس نے بات مکمل کی اور باہر چلی گئی۔

میں جانتا تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی تھی۔ جس نہج پر میں نے گفتگو کا آغاز کیا تھا، وہ اس کے لیے قطعی غیر متوقع تھی۔ اس تمام عرصے میں میری جانب سے ایسا کوئی عمل نہیں ہوا تھا کہ وہ سوچ بھی...... سکتی کہ میں اس کے بارے میں وہ کچھ بھی جانتا ہوں جو اس نے اپنے سائے سے بھی چھپایا ہوا ہے۔ وہ ایک گفتگو کو ترتیب دے کر آئی تھی جسے اب وہ دوبارہ سے ترتیب دینے گئی تھی۔

"تمہیں ایک بار نہیں کئی بار اس طرح سے جانا پڑے گا کیونکہ گفتگو ہر بار ایک نئے انداز سے ہوگی۔" میں بلاوجہ بڑبڑایا لیکن اس کے ساتھ ہی میں ایک بار پھر غیر شعوری طور پر ماضی میں چلا گیا۔

میں بیوی کی تدفین سے واپس کراچی پہنچا تو ائر پورٹ پر ڈرائیور کے ساتھ نازیہ کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے اپنی اس حیرت کا اظہار کیا تو اس نے کہا تھا۔ "کل سے تو آپ کے یہاں بڑے لوگ تعزیت کے لیے آئیں گے، میں نے سوچا کہ یہاں آپ تنہا ہوں گے اس لیے......" اس نے کہا تو میں صرف شکریہ ادا کر کے رہ گیا۔

ائر پورٹ سے روانہ ہوئے تو مجھے بھوک کا احساس ہوا جس کے ساتھ ہی مجھے یاد آیا کہ میں پوری فلائٹ میں سوتا ہوا آیا تھا۔ بیٹے کا فون ملتے ہی امریکا روانہ ہو گیا جہاں سے سیدھا اسپتال پہنچا تھا لیکن مجھے دیر ہو چکی تھی۔ رضوانہ دنیا میں نہیں رہی تھی۔ وصیت کے مطابق اور بیٹوں کی خواہش پر

وہیں دفن کرنے کے بعد ہی میں نے یہ جاننے کے باوجود کہ وہ انکار کر دیں گے، میں نے بیٹوں سے واپس چلنے کے لیے کہا تھا لیکن ماں کی طرح انہوں نے بھی انکار کر دیا تھا۔

کار گھر کی جانب رواں دواں تھی جب میں نے ڈرائیور کو گاڑی ہوٹل کی جانب لے جانے کے لیے کہا تھا۔ نازیہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگی تو میں نے وجہ بتا دی۔

"تمام راستے سوتا ہوا آیا ہوں اس لیے بھوک لگ رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ گھر چلیں، میں دس منٹ میں کھانا تیار کر لوں گی۔" اس نے آفر کی تھی۔

"پھر کبھی سہی۔" میں نے ٹالا لیکن اس نے اصرار کیا۔

"آپ یقین کریں، میں بہت اچھی کک ہوں۔" ... نے جس دیا تھا۔

"اس قدر بھوک میں یہ رسک نہیں لیا جا سکتا۔" میں نے کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔

اس کے ائر پورٹ پہنچنے پر مجھے حیرت ہوئی تھی لیکن اس کی موجودگی خوشگوار تھی۔ ہم ہوٹل پہنچے اور جس طرح مجھے وہاں ریسیو کیا گیا اس کے بعد میں نے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی چمک محسوس کی تھی پھر اس کا اظہار کرنے میں اس نے دیر بھی نہیں کی۔ ہم ٹیبل پر بیٹھے ہی تھے کہ وہ بول پڑی۔

"آپ اکثر یہاں آتے ہیں شاید؟" اس نے کہا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"پہلی بار تو تم بھی نہیں آئی ہو۔" میں نے کہا تو اس نے بھی اثبات میں گردن ہلا دی۔

"تیسری بار آئی ہوں لیکن عزت پہلی بار ملی ہے۔" اس نے کہا اور آہستہ سے ہنس دی۔ میں بھی مسکرانے پر مجبور ہو گیا۔

کھانے کے دوران ہم اس کی تعلیم پر بات کرتے رہے تھے۔ شاید دونوں ہی رضوانہ کی موت کے بارے میں بات کرنے سے گریز کر رہے تھے۔ کھانے کے بعد بھی میں نے چاہا کہ اسے گھر چھوڑ دیا جائے لیکن اس نے انکار کر دیا۔

"میں رکشا یا ٹیکسی سے گھر پہنچوں گی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ سب جانتے ہیں کہ ڈیوٹی کے بعد تقریباً اسی وقت گھر آتی ہوں۔" اس نے وضاحت کی تھی اور مجھے اس کی یہ احتیاط پسند آئی تھی۔

گھر پہنچنے کے بعد بھی میں دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا لیکن یہ سوچ ایک خاص دائرے میں ہی رہی تھی۔ ایک ایسی لڑکی کے بارے میں سوچتا رہا تھا جو اپنی محنت سے اپنا راستہ بنا رہی تھی۔ ساتھ ہی ایک خوشی یہ بھی تھی کہ میں ایک صحیح لڑکی کا مددگار رہا ہوں۔

اگلی صبح بیدار ہونے سے قبل ہی تعزیت کرنے والے پہنچنے شروع ہو گئے اور انہی میں مجھے نازیہ بھی نظر آئی جس نے میزبانی کی ذمے داریاں سنبھال رکھی تھیں۔ اس نے خود کو مہمانوں کے کمرے سے دور رکھا تھا لیکن جس انداز میں کام ہو رہا تھا اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ انتظام کسی سلیقہ مند ہاتھوں میں ہے۔ شام میں دیر تک وہ نظر آتی رہی اور پھر جھپکے سے غائب ہو گئی۔ رات گئے جب مہمانوں کا سلسلہ ختم ہوا تب ملازمین نے بتایا کہ نازیہ بی بی یہ کہہ کر گئی تھیں کہ صبح ان کا ٹیسٹ ہے اور انہیں کچھ تیاری کرنی ہے۔

وہ کمرے میں واپس آ چکی تھی۔ مجھے احساس نہ ہو سکا۔ جب اس نے مخاطب کیا تو میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"جو الزام تم نے لگائے ہیں، اس کے بعد ہمارا ساتھ رہنا ناممکن ہے۔" اس نے کہا لیکن میں مسکرا دیا۔

"ابھی تو کتاب کا پہلا ورق کھلا ہے اور تم......" میں نے فقرہ ادھورا چھوڑا۔

"میں تمہارے بقیہ گھٹیا الزامات کا سامنا کرنے کے لیے بھی تیار ہوں۔" اس نے تلخ انداز میں کہا۔

"میں پھر کہوں گا کہ میں کوئی الزام عائد نہیں کر رہا۔" میں نے جواب میں کہا۔

"یہ کیا ہے جو تم کہہ رہے ہو؟" اس کے لہجے کی تلخی برقرار تھی۔

"اپنی زندگی بہتر بنانے کے لیے ایک لڑکی کی کوشش بیان کر رہا ہوں جسے میں نے کبھی برا نہیں سمجھا۔" میں نے جواب میں کہا۔

"ندیم اور سعید کے ذکر کو کیا کہو گے؟" اس کا انداز جارحانہ تھا۔

"ناکام کوششوں کو ہر شخص فراموش کرنا چاہتا ہے لیکن وہ پھر بھی ماضی کا حصہ ہوتی ہیں۔" میں نے جواب دیا لیکن اس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ مطمئن نہیں ہے۔

"تم نے یہ بھی کہا میں نے تمہاری بیگم کے بعد......" اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"جو بات میں نے کہی تھی وہ صرف اتنی تھی کہ پہلی بار تمہیں لاشعوری طور پر یہ احساس ہوا تھا کہ میرے ساتھ

تمہیں زندگی کی کون سی آسائشیں حاصل ہوسکتی ہیں۔‘‘ میں نے کہا تو اس کی گردن نفی میں ہل گئی۔

’’ایسا کوئی خیال میرے دل میں نہیں تھا۔‘‘ اس نے تردید کرنی چاہی۔

’’لیکن یہاں میں یہ اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ ان تین چار دنوں میں، میں نے یہ طے کیا تھا کہ میں تمہیں بڑھا دوں گا۔‘‘ میں نے کہا تو وہ بری طرح چونک گئی۔ کچھ دیر وہ صرف خاموشی سے دیکھتی رہی پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھر یہ مسکراہٹ گہری ہوتی چلی گئی۔

’’احتشام صاحب! آپ جانتے ہیں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟‘‘ اس نے سوال کیا۔

’’میں بغیر سوچے سمجھے بات نہیں کرتا اور اس حساس موضوع پر تو......‘‘ میں نے کہا تو وہ سنجیدہ ہوتی چلی گئی۔

’’جو الزام آپ مجھ پر عائد کر رہے تھے، آپ اس کی تردید کر رہے ہیں۔‘‘ اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

’’جس انداز میں تم مرسیڈیز میں بیٹھی تھیں، جو انداز ہوٹل پر تمہارا کھانے کے دوران تھا، جس طریقے سے تم نے گھر پر کنٹرول کیا اور ملازم کو لے کر شاپنگ کی تھی، اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا تھا......‘‘ میں کہہ رہا تھا کہ اس نے قطع کلامی کی۔

’’اس نتیجے پر پہنچا کہ میں تمہاری مرحوم بیوی کی جگہ لینا چاہ رہی ہوں۔‘‘ اس نے اپنے طور پر میرا فقرہ مکمل کیا۔

’’اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ تم زندگی کی سہولتیں حاصل کرنا چاہتی ہو۔‘‘ میں نے اس کے فقرے کی تصحیح کی تو وہ طنزیہ ہنسی ہنس دی۔

’’لوئر مڈل کلاس کی لڑکی امراء کی محفل میں شامل ہونا چاہتی ہے۔‘‘ اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

’’اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد ہی میں نے تم پر آہستہ آہستہ آسائشیں بڑھائی تھیں۔‘‘ میں نے اعتراف کیا۔

’’اب تک آپ کہتے رہے تھے کہ میں نے آپ کے گلے پڑ کر شادی کی تھی اور اب کہہ رہے ہیں کہ ایک پلان کے ساتھ آپ نے یہ سب کیا تھا۔‘‘ اس کے لہجے میں طنز کے علاوہ کچھ نہیں تھا لیکن میں نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔

’’میں نے گفتگو کی ابتدا میں کہا تھا کہ شیر آتا ہے شکار کرنے اور چارے کو آسان شکار سمجھتا ہے لیکن خود شکار ہو جاتا ہے۔‘‘ میں نے کہا تو اس کے چہرے پر اس طرح کا تاثر ابھرا جیسے بات کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آ گئی ہو۔

’’تو وہ سب میرے لیے چارا تھا؟‘‘ اس نے سوال کیا۔

’’چارا تو بعد میں لگا تھا ڈاکٹر نازیہ عبدالمتین کو سب سے پہلے ہانکا تھا۔‘‘ میں نے کہا اور ہنس دیا۔

’’چارا تھا یا ہانکا لیکن شکار تو مجھے کیا گیا۔‘‘ اس نے آہستگی کے ساتھ کہا۔

’’تم آسائشوں کی عادی ہونے لگیں۔ تمہیں کار کی لت لگی پھر ہفتے میں دو بار فائیو اسٹار ہوٹلز میں ڈنر اور لنچ کرنے لگیں۔‘‘ میں نے کہا۔

’’تم تو کہتے تھے کہ تمہیں میرے ساتھ وقت گزارنا اچھا لگتا ہے۔‘‘ اس نے کہا لیکن جو تاثر اس کے لہجے میں تھا، وہ کچھ عجیب سا تھا۔

’’تمہاری فرمائشیں بڑھتی رہیں اور میں انہیں پوری کرتا رہا کہ تمہیں یقین ہو جائے کہ تمہارے خوابوں کو میں حقیقت میں بدل سکتا ہوں۔‘‘ میں نے کہا۔

’’بقول تمہارے تم میرے گرد ہانکا کرتے رہے اور میں تمہارے جال میں الجھتی چلی گئی۔‘‘ اس کے لہجے میں تاسف نمایاں تھا۔

’’تم نے تاج محل دیکھنے کی خواہش ظاہر کی اور میں نے تمہاری اور تمہاری خالہ کی بکنگ انڈیا کے پانچ شہروں کے اعلیٰ ہوٹلوں میں کروا دی۔‘‘ میں نے کہا۔

’’میں تسلیم کرتی ہوں کہ تجربے کی جیت ہوئی۔‘‘ اس نے کہا تو میں ہنس دیا۔

’’جب تم نے شادی کی خواہش کی تھی تو تم ستائیس سال کی تھیں اور میں اٹھاون برس کا۔‘‘ میں نے اسے یاد دلایا۔

’’میں تسلیم کر چکی ہوں کہ تجربہ جیت گیا۔‘‘ اس نے اپنی بات دہرائی لیکن اس بار طنزیہ انداز بڑھ گیا تھا۔

’’ابھی حقائق کے کچھ اور باب کھلنے ہیں لیکن اس وقت میں کچھ اور کہنا چاہتا ہوں۔‘‘ میں نے کہا اور وہ جو لاتعلقی ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی، متوجہ ہو گئی۔

’’اور وہ کچھ کیا کہنا چاہتے ہیں؟‘‘ اس نے سوال کیا۔

’’میں تمہیں کسی طور پر نقصان پہنچتا نہیں دیکھ سکتا، چاہے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔‘‘ میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

’’مجھ میں اپنا اچھا برا سمجھنے کی صلاحیت ہے۔‘‘ وہ یہ کہتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

’’ایک لمحے پہلے تم کچھ اور تسلیم کر چکی ہو اور میں پورے ثبوت کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ تم گہری کھائی میں چھلانگ لگا رہی ہو۔‘‘ میں نے کہا تو وہ دوبارہ سے بیٹھ گئی۔

’’کیسے ثبوت......؟‘‘ اس نے سوال کیا۔ اس کے انداز میں تجسس کے سوا کچھ نہیں تھا۔

’’بات اگر ایک جوان لڑکی کو حاصل کرنے کی ہوتی تو اس سے بہت کم سرمائے میں حاصل ہو سکتی تھی۔‘‘ میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کیا۔

’’تو پھر بات کیا تھی؟‘‘ سوال کرتے ہوئے وہ بے اختیار کچھ آگے ہو گئی۔

’’ایک دوسرے انداز سے میں نے تمہارے بارے میں سوچنا شروع کیا تو مجھے احساس ہوا کہ تم میرے حواس پر قابو پا رہی ہو۔‘‘ میں نے کہا۔ وہ خالی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی جیسے اس کے پاس کہنے کو کچھ نہ ہو۔

’’اور پھر آپ نے وہ کچھ کیا......‘‘ کچھ دیر بعد اس نے سوال کیا۔

’’میں جانتا تھا کہ ستائیس برس کی لڑکی اٹھاون برس کے بوڑھے سے محبت نہیں کر سکتی۔‘‘ میں نے جواب دیا۔

’’احتشام...... آپ غلط......‘‘ اس کے ہونٹوں سے لفظ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔

’’میں یہ حقیقت بہت پہلے تسلیم کر چکا تھا لیکن ساتھ ہی مجھے یہ ادراک بھی تھا کہ تمہارے بغیر زندگی اور بھی مشکل ہو جائے گی۔‘‘ میں نے کہا۔

’’شاید آپ پوری طرح صحیح نہیں ہیں۔‘‘ اس نے کچھ دیر بعد کہا تھا لیکن اسے اپنی آواز بہت کم سنائی دی ہوگی اور میں نے بھی فوری طور پر اس کی تردید نہیں کی۔

’’میں نے ابتدا میں تم سے کہا تھا کہ چارے کو آسان شکار سمجھ کر شیر اس کی جانب پوری خود اعتمادی سے بڑھتا ہے لیکن شکار کرنے کے بجائے خود شکار ہو جاتا ہے۔‘‘ میں نے ایک وقفے کے بعد دوبارہ سے اپنی گفتگو کا آغاز کیا تو وہ ہنس دی۔

’’پھر آ گیا وہ شیر کا شکار۔‘‘ یہ کہتے ہوئے وہ دوبارہ ہنس دی۔

اس کی ہنسی میں پھر سے وہ کھنکناہٹ آ گئی تھی جو کبھی مجھے مقناطیس کی طرح اپنی جانب کھینچتی تھی۔ ایک بار میرا دل چاہا کہ میں مزید تلخ حقائق پر سے پردہ نہ ہٹاؤں لیکن پھر میں نے خود ہی اپنی تردید کر دی۔

’’تم تذبذب کی حالت میں تھیں جب میں نے تمہیں چارے کی جانب متوجہ کیا تھا۔‘‘ میں نے کہا تو وہ ایک بار پھر چونک گئی۔

’’کون سا چارا؟‘‘ اس نے چونک کر کہا۔

’’تم نے میری بیماری کی جو رپورٹس دیکھی تھیں......‘‘ میں نے کہنا شروع ہی کیا تھا کہ وہ درمیان میں بول پڑی۔

’’وہ سب جھوٹی تھیں؟‘‘ اس نے سوالیہ انداز میں کہا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

’’میں بہت پہلے اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی۔‘‘ اس نے کہا۔

’’اس وقت جب میں لندن علاج کے لیے جا رہا تھا اور ڈرائنگ روم میں تم نے وہ رپورٹس دیکھی تھیں، تب اس نتیجے پر نہیں پہنچی تھیں۔‘‘ میں نے کہا تو وہ ایک بار پھر خالی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔

’’آپ فخریہ طور پر لوگوں کو بتا سکتے ہیں کہ آپ کا یہ وار بھی بھرپور طور پر کامیاب رہا تھا۔‘‘ اس نے طنز کیا۔

’’یہ بات تو میں نے کبھی تم سے بھی نہیں کی۔‘‘ میں نے جواب دیا۔

’’جس جان لیوا بیماری کی رپورٹس آپ نے چالاکی سے مجھ تک پہنچوائی تھیں، اس کے بعد ہی میں فیصلے پر پہنچی تھی لیکن اس طرح نہیں جس طرح آپ سمجھ رہے ہیں۔‘‘ اس نے کہا۔

’’میں غلط ہوں تو آپ تصحیح فرما دیں۔‘‘ میں نے کہا تو وہ کچھ دیر خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی۔

’’نروس سسٹم کی اس بیماری میں مریض انچ انچ کر کے مرتا ہے۔‘‘ اس نے کہنا شروع کیا۔

’’میں جانتا ہوں۔‘‘

’’رپورٹس دیکھنے کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔‘‘ اس نے اپنی بات آگے بڑھائی۔

’’لیکن اس میں مریض بچ بھی جاتا ہے۔‘‘ میں نے وہی کہا جو ڈاکٹر نے مجھے سمجھایا تھا۔

’’سو میں سے شاید دو یا تین۔‘‘ اس کا جواب تھا۔

’’ہاں...... لیکن......‘‘ میں نے کہنا چاہا مگر پھر خاموش ہو گیا۔ بہرحال یہ اس کا شعبہ تھا۔

’’آپ کی ناکام خانگی زندگی کے بارے میں میرے علم میں سب کچھ تھا۔‘‘ اس نے کہا اور پھر رک گئی۔

’’مثلاً کیا کچھ علم میں تھا؟‘‘ میں نے سوال کیا لیکن اس نے میرے سوال کو مکمل نظر انداز کر دیا۔

’’میرا فیصلہ تھا کہ ان ختم ہوتے ہوئے لمحوں میں کچھ ایسا دوں گی جو اس سے پہلے آپ کو نہیں ملا تھا۔‘‘ اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔

’’اور سال ڈیڑھ سال بعد تمام جائداد بھی تمہارے پاس۔‘‘ میں نے کہا تو وہ مسکرا دی۔

’’تین برس میں کتنی بار میں نے وراثت کے بارے میں بات کی؟‘‘ اس نے سوال کیا۔

''تم جانتی ہو کہ وہ دونوں شاید میرے جنازے میں بھی نہ آئیں۔'' میں نے کہا تو وہ آہستہ سے ہنس دی۔

''وہ آپ کے بیٹے ہیں۔ جنازے میں شاید نہ آئیں لیکن جائیداد کا حصہ لینے ضرور آئیں گے۔'' اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

وہ خاموش ہوئی تو ہم دونوں ہی خاموش ہو گئے پھر خاموشی کا یہ وقفہ طویل سے طویل تر ہوتا چلا گیا۔ میرے پاس کہنے کو اب بھی بہت کچھ تھا لیکن میں مزید کچھ کہنے سے گریز کرتا رہا۔

''اگر تم سمجھ رہی تھیں کہ تمہاری آئندہ زندگی احسان کے ساتھ بہتر طور پر گزر سکتی ہے تو......'' ایک نتیجے پر پہنچ کر میں نے کہا۔

''میرا خیال یہی تھا۔'' اس نے کہا اور میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

میرے علم میں تھا کہ ان دونوں نے تعلیم جاری رکھنے کے لیے امریکا یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا۔ تعلیمی اخراجات کے لیے نازیہ کے اکاؤنٹ میں رقم موجود تھی۔ احسان اور نازیہ کو ملوانے میں نازیہ کی سہیلی فوزیہ کا اہم کردار رہا تھا۔ نازیہ کی طرح احسان بھی مڈل کلاس سے تعلق رکھتا تھا۔ پانچ برس پہلے ایم بی اے کرنے کے بعد وہ اپنے گھریلو اخراجات پورے کرنے کے لیے نوکریاں کر رہا تھا کیونکہ باپ کی موت کے بعد وہ گھر کا واحد کفیل تھا۔

''میرا خیال ہے مجھے تمہاری اس خواہش کا بھی احترام کرنا چاہیے۔'' میں نے کہا۔

''آپ نے میرے فقرے پر غور نہیں کیا۔'' میں فیصلہ کن انداز میں اپنی جگہ سے اٹھا تو اس نے مجھے روکنے کے انداز میں کہا۔

''تم نے کیا کہا تھا؟'' میں نے اس کے الفاظ دہرانے چاہے لیکن میں الجھ کر رہ گیا۔

''میں نے کہا تھا کہ میرا خیال یہی تھا۔'' اس نے اپنا فقرہ دہرایا۔

''تمہارا مطلب یہ تھا کہ......'' میں نے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

''میں نے کہیں پڑھا تھا کہ شریکِ حیات اسے بنانا چاہیے جو آپ سے محبت کرے۔'' اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

''میں سمجھا نہیں۔'' میں نے اپنی جگہ دوبارہ بیٹھے بغیر سوال کیا۔

''یہ بھی پڑھا کہ اس کی شریکِ حیات نہ ہو جس سے تم محبت کرتے ہو۔'' اس نے کہا اور یہ کہتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

''نازیہ......'' میں اس سے آگے کچھ نہیں کہہ سکا۔

''ہم دونوں غلط فہمیوں میں مبتلا تھے احتشام!'' اس نے دوٹوک انداز میں کہا لیکن میں خاموش رہا۔ ''تم کسی غلط فہمی میں تھے اور میری غلط فہمی کچھ اور تھی۔'' اس نے اپنی بات مکمل کی۔

''تم شاید یہ سمجھ رہی......'' میں نے کہنا چاہا لیکن اس نے میرے ہونٹوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔

''جو کچھ کہنا تھا اور جو کچھ سننا تھا، وہ ہم دونوں ہی کہہ اور سن چکے۔'' اس نے مجھے خاموش کر کے اپنی بات مکمل کی۔

''میں یہ کہنا چاہ رہا تھا......'' میں نے دوبارہ سے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

''احتشام! تمہارے اعترافِ محبت کے بعد میں ایک نشے کی کیفیت میں ہوں، میرا نشہ خراب نہ کرو۔'' اس کے لہجے میں التجا تھی۔

''تمہاری یہ بات بھی مان لیتے ہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم عورت ہوتے تو سمجھتے کہ عورت ماؤنٹ ایورسٹ پر پہنچ جاتی ہے جب اس کا شوہر اعتراف کرلے کہ وہ اسے والہانہ چاہتا ہے۔'' اس نے کہا اور باہر کی جانب جانے لگی۔

''کہاں......؟'' میں نے سوال کیا تو وہ رک گئی۔

''فون کر رہی ہوں کہ میرے تمام پروگرام کینسل......'' اس نے کہا اور باہر کی جانب چل دی۔

وہ قدم بہ قدم جا رہی تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ وہ مجھ سے دور جا رہی ہے یا میرے قریب آ رہی ہے۔ اس نے دروازہ کھولا لیکن فوراً ہی باہر نہیں گئی بلکہ دروازے پر رک گئی اور پھر رک کر میری جانب دیکھا۔

''ایک بات کہوں احتشام!'' اس نے دروازے پر کھڑے ہو کر مجھے مخاطب کیا۔

''وہ کیا......؟'' میں نے سوال کیا۔

کچھ کہنے سے قبل اس نے قدم اٹھایا پھر رکی اور کہا۔ ''محبت اور جنگ میں سب جائز ہے اور...... سب کے لیے جائز ہے۔'' وہ چلی گئی لیکن میں دیر تک سوچتا رہا اور پھر اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ مجھے جواز مہیا کر رہی تھی...... ''محبت اور جنگ میں سب جائز ہے اور...... سب کے لیے جائز ہے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام

رضوانہ ساجد

تیسرا اور آخری حصہ

ربِ کائنات کی منشا اور حکمت عملی کو سمجھنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ قدرت کا قانون ہے کہ جب اندھیرا حد سے بڑھ جائے تو کہیں قریب ہی اجالا چھپا ہوتا ہے اور پھر دھیرے دھیرے ظلمت کی یہ چادر سمٹتی چلی جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جب مخلوق اپنے خالق سے غافل ہو کر بت پرستی میں مشغول تھی اور صنم خانے آباد تھے ایسے میں اللہ تعالیٰ کو معجزہ دکھانا مقصود ہوا اور جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو زمین پر اتارا جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنی ذات کے ہونے کی وجہ تلاش کرنے... اپنے خالق کی جستجو اور تسلیم و رضا کے سانچے میں ڈھلنے میں گزرا... اپنے ہی ہاتھوں تراشے ہوئے خداؤں کو زمیں بوس کر کے آپ علیہ السلام نے کسی معبود کے ہونے کا یقین دلایا اور اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہ کیا... حتیٰ کہ انہی کوششوں میں حج بیت اللہ کے مناسک بھی رقم ہو گئے جن پر رہتی دنیا تک تمام مسلمانانِ عالم کو عمل کرنا ہے۔

نمرود سے ٹکرانے اور اللہ کی آزمائشوں پر پورا اترنے والے جلیل القدر پیغمبر کی سوانح حیات

اس روز حضرت ابراہیم علیہ السلام بے حد اداس تھے۔ اداسی کا بظاہر کوئی سبب بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ جو اداسی گھر کے آنگن میں پھیلی ہوئی تھی اس کے تو وہ عادی ہو چکے تھے لیکن آج ماجرا کچھ دوسرا ہی تھا۔

اللہ نے بڑی دعاؤں کے بعد ایک بیٹا دیا تھا وہ نظروں سے دور ہو گیا تھا۔ مکہ کے صحرا میں بنو جرہم کے بچوں کے ساتھ کھیل کود کر بڑا ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی اسے جا کر دیکھ بھی آتے تھے لیکن کوئی دوسری اولاد نہیں تھی جسے ہر وقت آنکھوں کی ٹھنڈک

بنائے رکھتے۔

قربانی کا واقعہ گزر چکا تھا اور اب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام عمر کی تیرہ منزلیں طے کر چکے تھے۔

اداسی نے ایسا زور باندھا کہ آپؑ اس خیال سے شہر سے باہر نکل گئے کہ شاید کوئی اجنبی مل جائے اور اسے مہمان بنا کر گھر لے آئیں۔ کچھ دیر اس کی صحبت سے لطف اندوز ہوں، جی بہل جائے۔

آپ ابھی ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے سیر میں مشغول تھے کہ تین حسین نوجوان دکھائی دیے۔ غور کیا تو یقیناً اجنبی تھے، اس سے پہلے انہیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آپؑ ان کے اتنے قریب چلے گئے کہ وہ آسانی سے آپ کی بات سن سکیں۔

''تم تو اجنبی معلوم ہوتے ہو۔''

''آپ نے ٹھیک پہچانا۔ ہم اس زمین کے نہیں ہیں۔ ہمارا مطلب ہے ہم آج ہی یہاں آئے ہیں۔''

''خدا جانے کتنی دور سے آ رہے ہو۔ تھک تو گئے ہوگے؟''

''ہاں تھکن تو ہو گئی ہے۔''

''اگر آپ لوگ مجھے میزبانی کا موقع دیں تو میں آپ کو آرام کی جگہ بٹھاؤں اور بھوک مٹانے کا کچھ بندوبست کروں۔''

''آپ تو ہمیں بہت مہربان آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کیا ہم آپ کی پیشکش ٹھکرا سکتے ہیں؟''

وہ تینوں مہمان حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ آپ کے گھر چلے آئے۔ آپؑ نے ان کے لیے پانی کا برتن لا کر رکھ دیا تاکہ وہ ہاتھ منہ دھو کر تازہ دم ہو جائیں۔ اس کے بعد آپؑ نے اپنے غلام الیعزر کو حکم دیا کہ وہ ریوڑ سے ایک بچھڑا نکال کر ذبح کرے اور اسے بھون کر مہمانوں کے سامنے پیش کرے۔

جب دسترخوان سج گیا اور بھنا ہوا گوشت مہمانوں کے سامنے رکھ دیا گیا تو دستور کے مطابق حضرت سارہ مہمانوں کی پشت کی جانب کھڑی ہو گئیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام منتظر تھے کہ مہمان کھانے کی طرف ہاتھ بڑھائیں تو وہ بھی کھانا شروع کریں لیکن مہمان ہاتھ بڑھانے کے بجائے ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ کہنے کے باوجود ان کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ رواج تھا کہ دشمن ایک دوسرے کا کھانا نہیں کھاتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو شک گزرا کہ وہ دشمنوں کو گھر لے آئے ہیں۔

''آپ کھانا کیوں نہیں کھاتے ہو کیا مجھ سے آپ کی کوئی چھپی ہوئی دشمنی ہے؟''

''یہ بات نہیں بلکہ ہمیں کھانے سے کیا سروکار۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں۔''

''اے ابراہیم! خوف نہ کھاؤ۔'' نوجوانوں نے کہا۔ ''ہم دشمن نہیں اللہ کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں اور تمہیں خوش خبری سنانے آئے ہیں۔ تمہاری بیوی سارہ سے ایک بیٹا پیدا ہوگا۔ تم اس کا نام اسحٰق رکھنا۔''

ہنسنے کی بات ہی تھی۔ حضرت سارہ کو یہ خبر سن کر بے اختیار ہنسی آ گئی۔ ''کیا میں اب اولاد کو جنم دوں گی جبکہ میں بوڑھی ہو چکی ہوں اور یہ میرے شوہر بھی بوڑھے ہو گئے ہیں اور پھر میں تو جوانی سے بانجھ ہوں۔''

فرشتوں نے کہا۔ ''کیا تو اللہ کے حکم سے تعجب کرتی ہے۔ اے نبی کے گھر والو، تم پر خدا کی رحمت و برکت ہو۔ اللہ ہر طرح قابلِ حمد اور بزرگ ہے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی کچھ کم تعجب نہیں تھا کیونکہ ان کی عمر سو کے قریب ہو رہی تھی۔ فرشتوں نے ان کے تعجب کو پہچانا اور انہیں مزید مضبوط کیا۔

''آپ مایوس ہونے والوں میں نہ ہوں۔ آپ کو حق تعالیٰ نے اسحٰق اور اس کے بیٹے یعقوب کی بشارت دی ہے۔''

قرآن پاک کے الفاظ یہ ہیں۔

''اور ابراہیم (علیہ السلام) کی بیوی کھڑی ہنس رہی تھی۔ پس ہم نے اسحٰق کو اور اس کے بعد (اس کے بیٹے) یعقوب علیہ السلام کی بشارت دی۔''

وہ فرشتے یہ خوش خبری سنانے کے بعد رخصت ہو گئے۔

چراغ درمیان میں تھا۔ ایک طرف حضرت ابراہیم بیٹھے تھے، دوسری جانب حضرت سارہ تھیں۔ دونوں خاموش تھے۔ جیسے بولنے کے لیے کسی کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔

''کیا جو کچھ ہم نے سنا ہے وہی ہے؟'' حضرت سارہ نے ہمت کر کے کہا۔

''کیا تم خدا کی ذات سے مایوس ہو؟''

''اگر ایسا ہوا تو میری طرح دوسرے بھی ہنسیں گے۔''

''وہ اگر ہنسے تو خدا پر ہنسیں گے۔'' حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا۔ ''تمہیں یاد ہے، میں اسمٰعیل کے چلے جانے پر کتنا اداس تھا۔ اب میں اس کی جدائی کا دکھ بھول جاؤں گا۔''

''اب آپ چاہیں تو اسمٰعیل کو واپس لے آئیں۔ اب میں ہاجرہ سے کیوں حسد کرنے لگی۔''

''میں خدا کے حکم سے ماں بیٹے کو فاران کی وادیوں میں چھوڑ کر آیا تھا۔ خدا کا حکم ہوا تو آ جائے گا۔ اب تو تم اسحٰق کے آنے کا انتظار کرو۔''

حضرت اسحٰق علیہ السلام کی بشارت کے بعد بھی آپؑ کو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا خیال رہتا تھا اور آپؑ ان کے حق میں دعائیں کرتے رہتے تھے۔

''کاش! اسمٰعیل تیرے حضور جیتا رہے۔''

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کا یہ جواب دیا۔

''اسمٰعیل کے حق میں، میں نے تیری سنی۔ دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اس کو بہت بڑھاؤں گا اور اس کے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اس کو بڑی قوم بناؤں گا۔'' (توریت، باب پیدائش)

☆☆☆

حضرت اسحٰق علیہ السلام کی پیدائش ہو چکی تھی۔ حضرت سارہ کو اس بڑھاپے میں کھلونا مل گیا تھا۔ قبیلے میں کچھ دن سب کو تعجب ہوتا رہا اور پھر خدا کی شان سمجھ کر حضرت اسحٰق علیہ السلام کو قبول کر لیا گیا۔

حضرت اسحٰق علیہ السلام کی پرورش ناز و نعم میں ہو رہی تھی۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام لڑکپن کی حدود سے نکل کر جوانی کی عمر میں داخل ہوئے تو ظاہری حسن و جمال میں یکتا تھے۔

حضرت ہاجرہ کو آپ کی شادی کی فکر ہوئی۔

یہ سعد بن اسامہ بن اکیل العمالیقی کا گھر تھا جہاں حضرت ہاجرہ داخل ہوئی تھیں اور اس لڑکی کا نام عمارہ تھا جس کو آپ نے حضرت اسمٰعیل کی دلہن کے طور پر منتخب کیا۔

ایسے بابرکت خاندان میں کون شادی کے لیے تیار نہ ہوتا۔ ایک مقررہ تاریخ کو آپ کی شادی عمل میں آ گئی۔

اس شادی کے کچھ عرصے بعد حضرت ہاجرہ کا انتقال ہو گیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام عرصہ ہوا، مکہ نہ جا سکے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی پیدائش اور پھر حضرت سارہ کی کچھ عرصے تک بیماری نے آپ کو فلسطین سے نکلنے نہیں دیا تھا۔ اس روز بھی بس بیٹھے بیٹھے خیال سا آیا۔

''بہت دن ہو گئے میں اسحٰق میں ایسا کھویا کہ اسمٰعیل کو دیکھنے تک نہ جا سکا۔'' حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہ سے کہا۔

''میں تو خود آپ سے کہنے والی تھی اور یہ بھی کہنے والی تھی کہ بس خیریت پوچھ کر چلے آئیے گا۔ میں زیادہ دن آپ کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی۔''

''بس اسمٰعیل کو دیکھوں گا اور زیادہ سے زیادہ ایک شب کے قیام کے بعد چلا آؤں گا۔''

آپؑ اپنے گدھے پر سوار ہوئے۔ راستے کے لیے کھانے کا کچھ سامان لیا اور روانہ ہو گئے۔

آپ مکہ پہنچے تو سب کچھ بدل چکا تھا۔ حضرت ہاجرہ انتقال کر گئی تھیں اور معلوم ہوا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے شادی کر لی ہے۔

آپ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے گھر پہنچے تو اتفاق سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام گھر پر نہیں تھے۔ ایک عورت

دروازے پر آئی۔ یہ یقیناً آپؑ کی بہو تھی لیکن اپنے بارے میں کچھ بتانا مناسب نہ سمجھا۔

اس عورت نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بارے میں جس انداز سے باتیں کیں، اس سے معلوم ہوتا تھا کہ دونوں کے درمیان محبت نہیں ہے بلکہ عورت بدزبان بھی ہے۔ آپ سخت مایوس ہوئے اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا انتظار کیے بغیر واپسی کا ارادہ کرلیا۔

"تمہارا شوہر واپس آئے تو اس سے کہنا جو آئے تھے، وہ کہہ گئے ہیں کہ اپنی چوکھٹ بدل لو۔"

"آپ نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔"

"بس میرا حلیہ بتا دینا، وہ سمجھ جائے گا۔"

وہ عورت یہ کہتی ہوئی گھر میں چلی گئی۔ "عجیب آدمی ہے، نام تک نہیں بتایا۔"

گھر کے اندر پہنچ کر وہ آپ کے بارے میں سوچنے بیٹھ گئی۔ کچھ اور تو یاد نہیں رہا بس یہ جملہ دہراتی رہی۔ "تیرا شوہر آئے تو اس سے کہنا اپنی چوکھٹ بدل لے۔"

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام گھر واپس آئے تو بیوی نے سب سے پہلے یہی بات کی۔

"ایک بزرگ آئے تھے۔ کچھ دیر وہ ہمارے بارے میں پوچھتے رہے۔ پھر یہ کہہ کر واپس چلے گئے کہ اپنے شوہر سے کہنا اپنی چوکھٹ بدل لے۔"

"جانتی ہو وہ کون تھے؟ وہ میرے والد محترم تھے۔ چوکھٹ بدلنے سے مراد یہ ہے کہ وہ مجھے حکم کر گئے ہیں کہ میں تجھے خود سے جدا کردوں لہٰذا تو اپنے گھر والوں میں چلی جا۔"

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے اسے طلاق دے دی۔ بعد میں آپ نے بنی جرہم کی ایک اور خاتون سے شادی کرلی۔

کچھ عرصے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام دوبارہ تشریف لائے۔ اس مرتبہ بھی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو گھر پر موجود نہ پایا۔

اس مرتبہ اس نئی بہو کو خوش اخلاق اور شکر گزار پایا تو فرمایا۔ "جب تیرا شوہر آجائے تو اس سے میرا سلام کہنا اور میری طرف سے حکم دینا کہ اپنے دروازے کی چوکھٹ کو برقرار رکھے۔"

☆☆☆

حضرت اسحٰق علیہ السلام کی خوش خبری کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا سے گزارش کی تھی۔ "کاش! اسمٰعیل بھی تیرے حضور اسی طرح جیتا رہے۔" یعنی اس پر بھی برکتوں کی بارش ہو۔

خدا نے جواب دیا تھا۔ "اسمٰعیل کے لیے میں آپ کی دعا قبول کرتا ہوں اور اس پر برکتوں کی بارش کرتا ہوں۔"

اس برکت کا ظہور اس طرح ہوا کہ زمین پر پہلا گھر جو خدا نے اپنی عبادت کے لیے مقرر کیا (خانہ کعبہ) اس کی تعمیر میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو شامل کیا گیا۔

اس وقت تک بتوں اور ستاروں کی پرستش کے لیے ہیکل اور مندر موجود تھے۔ جہاں جہاں آبادی تھی ان بتوں کے نام پر بڑی بڑی تعمیرات کی جاتی تھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام توحید کا درس دے رہے تھے لیکن زمین کے کسی حصے پر آپؑ کے ماننے والوں کے لیے کوئی گھر تعمیر نہیں ہوا تھا اور نہ آپؑ کو کبھی خیال آیا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ زمین والوں کے لیے خدا کی عبادت کے لیے ایک گھر زمین پر بناؤ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حکمِ الٰہی سن لیا لیکن آپؑ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ گھر کس جگہ تعمیر کیا جائے۔

"اے اللہ! میں تیرا گھر کہاں بناؤں؟ میں بے خبر ہوں۔"

خدا نے یہ پکار بھی سن لی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیت اللہ کی جگہ کا ٹھکانا بتا دیا۔

بعض اہلِ علم کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؑ کی راہنمائی کے لیے سکینہ (ایک ہوا) نازل فرمائی جو مجسم تھی۔ اس سے مذکورہ جگہ دکھانے میں آپؑ کی راہنمائی ہوئی۔ وہ اس کے اشارے پر چل پڑے۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس راہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کو بھیجا تھا اور انہوں نے یہ بتایا کہ کام کس طرح کرنا ہے۔

ایک روایت کے مطابق حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ فرمایا کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام مکہ پہنچے تو وہاں موجود بیت اللہ کے مقام پر سر کے برابر ایک پرندہ دیکھا۔ اس پرندے نے کہا کہ میرے سائے کے نیچے تعمیر کیجیے اور اس میں

کمی بیشی نہ کیجیے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام مقامِ تعمیر کی تلاش میں گھر سے نکلے تو سکینہ (ایک ہوا) آپؑ کی راہنمائی کرتی ہوئی آپؑ کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ جب اس کا رخ مکہ کی طرف ہوا تو آپؑ بے حد خوش ہوئے۔ انہیں اللہ تعالیٰ کا فرمان یاد آگیا کہ میں اسمٰعیل (علیہ السلام) کو برکت دوں گا۔ ہوا اس بستی تک آگئی جہاں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تھے۔ اس ہوا نے ایک ابھرے ہوئے ٹیلے کے گرد چکر کاٹنا شروع کر دیے۔ پھر ہوا چلنا بند ہوگئی۔ نشاندہی ہوگئی تھی کہ تعمیر یہاں کرنی ہے۔

نشاندہی ہو جانے کے بعد آپؑ نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے ملاقات کی۔

"اسمٰعیل، تیرے رب نے اس زمین پر اپنا گھر تعمیر کرنے کا حکم دیا ہے۔"

"اس کی اطاعت کیجیے۔"

"اس نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ تم میرے ساتھ تعاون کرو گے۔"

"آپ نہ بھی کہتے تو یہ سعادت میں اپنے حصے میں لیتا۔ میرے پاس کھدائی کے لیے اوزار بھی ہیں اور تجربہ بھی۔"

پھر بنی جرہم کے لوگوں نے ایک روح پرور منظر دیکھا۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام قریب کے پہاڑوں سے پتھر لا رہے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام بنیادیں بھر رہے تھے اور زبان پر یہ دعا تھی۔

"اے پروردگار! ہمارا یہ عمل قبول ہو۔ بلاشبہ تو ہی ہے جو دعاؤں کو سننے والا ہے، جاننے والا ہے۔ اے پروردگار ہمیں ایسی توفیق دے کہ ہم سچے مسلم ہو جائیں اور ہماری نسل سے بھی ایک ایسی امت پیدا کردے جو تیرے حکم کی فرماں بردار ہو۔ خدایا! ہماری عبادت کے طور طریقے بتا دے اور ہمارے قصوروں کو درگزر کر بلاشبہ تیری ہی ذات ہے جو درگزر کرنے والی ہے اور جس کی رحیمانہ درگزر کی کوئی انتہا نہیں اور خدایا! ایسا کیجیو کہ اس بستی کے بسنے والوں میں تیرا ایک رسول مبعوث ہو جو انہی میں سے ہو۔ وہ تیری آیتیں پڑھ کر لوگوں کو سنائے۔" (البقرہ)

ایک معمار تھا، ایک مزدور۔ دیواریں بلند ہونے لگیں۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام پتھر اٹھا کر دیتے جاتے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ...... انہیں اوپر تلے رکھتے جاتے تھے۔

اس مقام کو جہاں ایک بڑے پتھر پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام دیواریں اٹھا رہے تھے "مقام ابراہیم" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس مقام ابراہیم میں پتھر پر اللہ کے دوست حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نشانات قدم اوّل اسلام سے اب تک موجود ہیں۔

جب تعمیر اس حد پر پہنچی جہاں آج حجر اسود نصب ہے تو جبرئیل علیہ السلام نے ان کی راہنمائی کی اور حجر اسود کو ان کے سامنے ایک پہاڑی سے محفوظ نکال کر دیا جس کو جنت کا لایا ہوا پتھر کہا جاتا ہے۔

"ابا جان! یہ پتھر کون آپ کے پاس لایا؟" حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے کہا۔

"وہ جس نے تجھ پر بھروسا نہ کیا۔ یہ پتھر جبریل علیہ السلام لے کر آئے ہیں۔"

جب کعبے کی تعمیر مکمل ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بتایا کہ یہ ملت ابراہیمی کے لیے (قبلہ) اور ہمارے سامنے سجدے کا نشان ہے اس لیے توحید کا مرکز قرار دیا جاتا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام تعمیر سے فارغ ہوئے تو حکم دیا کہ حج کے لیے لوگوں کو آواز دو۔ عرض کیا۔ "اے میرے ربّ میری آواز کہاں تک پہنچے گی؟"

فرمایا۔ "تمہارے ذمے آواز دینا ہے اور ہمارے ذمے اس کا پہنچانا۔" چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آواز دی۔

"اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تم پر حج بیت اللہ فرض کیا ہے۔"

زمین و آسمان کی تمام مخلوقات نے یہ آواز سنی۔

حضور اکرم ﷺ اور بعض صحابہؓ سے مروی ہے کہ جبرئیل علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مناسکِ حج سکھاتے رہے۔

بنی اسرائیل کی روایات کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام نے اس جگہ پر ایک گنبد سا بنایا تھا اور فرشتوں نے ان سے

کہا تھا کہ ہم آپ سے پہلے اس کا طواف کر چکے ہیں اور کشتی نوح نے بھی چالیس دن تک اس کا طواف کیا تھا۔

اس کے برعکس قرآن مجید نے بیت اللہ کی تعمیر کا معاملہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی سے شروع کیا ہے اور اس سے پہلی حالت کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔

"بلاشبہ پہلا گھر جو انسان کے لیے بنایا گیا وہ یہی ہے جو مکہ میں ہے۔"

صحیح یہ ہے کہ اس سے پہلے یہاں کوئی عمارت نہیں تھی بلکہ یہ جگہ باقی جگہ سے کچھ ابھری ہوئی تھی۔ اس کے ابھرے ہونے کی وجہ یہ تھی کہ خدا کے علم اور ارادے سے وہ جگہ بیت اللہ کے لیے مقرر ہوئی تھی۔

حضور اکرم ﷺ سے بھی کہیں مروی نہیں کہ بیت اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بنانے سے پہلے تعمیر شدہ تھا۔

یہ اعزاز حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ملنا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو کعبۃ اللہ کا پہلا متولی مقرر فرمایا اور خود واپس چلے آئے۔

☆☆☆

وقت کی جیب سے چالیس قیمتی سکے گر چکے تھے یعنی حضرت اسحٰق علیہ السلام چالیس سال کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی ابھی زندہ تھے اور حضرت سارہ بھی۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نبوت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے وعدے کے مطابق آپ کو کثرت اولاد سے نوازا تھا۔ انہی اولادوں سے آگے چل کر خاتم الانبیا حضرت محمد ﷺ کا ظہور میں آنا مقدر ہو چکا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے سال خوردہ خانہ زاد کو اپنے پاس بلایا۔

"تو اپنا ہاتھ میری ران کے نیچے رکھ کہ میں تجھ سے قسم لوں۔"

قسم لینے کا یہی طریقہ اس وقت رائج تھا۔ خانہ زاد نے جس کا نام الیعزر دمشقی تھا، اپنا ہاتھ آپ کی ران کے نیچے رکھا اور سوال طلب نگاہوں سے آپؑ کی طرف دیکھنے لگا کہ دیکھو کیا قسم لیتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہنا شروع کیا۔ "میں یہ طے کر چکا ہوں کہ اسحٰق (علیہ السلام) کی شادی فلسطین کے ان کنعانی خاندانوں میں ہرگز نہیں کروں گا، بلکہ میری یہ خواہش ہے کہ اپنے خاندان اور باپ دادا کی نسل میں اس کا رشتہ کروں۔"

"آقا ایسا ہی ہوگا۔"

"وعدہ کر کہ تو میرے وطن فدان آرام میں میرے رشتے داروں کے پاس جا کر میرے بیٹے اسحٰق کے لیے بیوی لائے گا۔"

"ہوسکتا ہے وہ عورت میرے ساتھ نہ آنا چاہے۔ تو کیا میں اسحٰق کو اپنے ساتھ لے جاؤں؟"

"میرے خدا نے مجھے وہاں سے نکالا ہے اور یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ میری نسل کو یہ ملک دے گا۔ اب اسی خدا کا منشا یہ ہے کہ اسحٰق وہاں نہ جائے۔ خدا نے چاہا تو وہ عورت تیرے ساتھ چلی آئے گی۔ بس تو وہاں بیتوایل (آپ کے بھتیجے کا نام) کے گھر جا اور اس کی بیٹی ربقہ کا رشتہ مانگ۔"

الیعزر نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اونٹوں میں سے دس اونٹ ساتھ لیے اور ان پر بیش بہا تحائف لاد کر روانہ ہوا۔ جب وہ اس شہر میں پہنچا تو ایک کنوئیں کے سامنے اپنے اونٹوں کو بٹھا دیا اور خدا سے یوں دعا گو ہوا۔

"اے خدا! میں تیری منت کرتا ہوں کہ آج تو میرا کام بنا دے۔ دیکھ میں پانی کے چشمے پر کھڑا ہوں۔ یہاں اس شہر کی بیٹیاں پانی بھرنے کو آتی ہیں۔ تیرا کرم ہو تو ایسا ہو کہ جس لڑکی سے میں کہوں کہ مجھے پانی پلا دے اور وہ کہے لے پی۔ لے اور میرے اونٹوں کو بھی پلا دے تو وہ وہی ہو جسے تو نے اپنے بندے اسحٰق کے لیے ٹھہرایا ہے۔"

خدا کو کرم کرنا مقصود تھا کہ اسی وقت ربقہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھائی نحور کی بیوی ملکاہ کے بیٹے بیتوایل سے پیدا ہوئی تھی، اپنا گھڑا کندھے پر رکھ کر نکلی۔

الیعزر نے اسے دیکھا تو اس کی طرف لپکا۔ وہ گھڑے میں پانی بھر چکی تھی کہ الیعزر نے اس سے کہا۔ "کیا تو مجھے پانی پلائے گی؟"

حکایت

شیخ ابوسعید عبداللہ بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "میری ایک سولہ سالہ لڑکی تھی۔ ایک روز چھت پر گئی اور گم ہوگئی۔ ہر چند تلاش کی نہ ملی۔ حضرت غوث الثقلین کی خدمت میں حاضر ہو کر سارا واقعہ بیان کیا۔ فرمایا "تم آج رات بغداد کے محلے خرابہ کرخ میں جا کر زمین پر ایک دائرہ کھینچو اور اس میں بیٹھ کر بسم اللہ علی نیت عبدالقادر پڑھتے رہو۔ رات کی تاریکی میں جنات کی ایک جماعت کا اس طرف سے گزر ہوگا، جن کی صورتیں مختلف ہوں گی۔ تم ان سے خوف نہ کھانا۔ صبح کے وقت جنات کا بادشاہ اپنے لشکر کے ساتھ وہاں سے گزرے گا۔ وہ تجھ سے کہے گا۔ بتاؤ کیا کام ہے؟ تم کہنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے ہمیں تمہاری خدمت میں بھیجا ہے اور اپنی لڑکی کے گم ہونے کا واقعہ کہہ سنانا۔" پس اس نے ایسا ہی کیا جیسا کہ آپ نے فرمایا تھا۔ جنات گروہ در گروہ مختلف شکلوں میں اس طرف سے گزرتے لیکن اس دائرے کے پاس کوئی نہیں آتا تھا۔ حتیٰ کہ ان کا بادشاہ گھوڑے پر سوار ایک بڑے لشکر کے ساتھ ظاہر ہوا اور دائرے کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور کہا "تیرا کیا کام ہے؟" میں نے کہا۔ "شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے مجھے تیرے پاس بھیجا ہے۔ یہ سنتے ہی وہ گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔ زمین چومی اور دائرے کے باہر بیٹھ گیا اور پوچھنے لگا۔ "کیوں بھیجا ہے؟" میں نے لڑکی کے غائب ہو جانے کا واقعہ سنایا۔ "اس نے حکم دیا۔ "اس کی لڑکی کو جو جن اٹھا کر لے گیا ہے وہ فوراً حاضر کیا جائے۔" تھوڑی ہی دیر میں وہ جن مع لڑکی کے حاضر کیا گیا۔ یہ جن چین کے جنات میں سے تھا۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا۔ "کیا وجہ ہے کہ تو نے اس لڑکی کو حضرت غوث الاعظم کے حلقے سے اٹھالیا؟" اس نے کہا۔ "مجھے اچھی لگی تھی۔" شاہ جنات نے حکم دیا کہ اس کا سر اڑا دیا جائے اور لڑکی کو میرے حوالے کر دیا۔ میں نے بادشاہ جنات سے پوچھا۔ "تجھ سے زیادہ میں نے فرمانبردار شیخ کا کسی اور کو نہیں پایا، کیا وجہ ہے؟" اس نے جواب دیا۔ "ہم ان کے فرمانبردار کس طرح سے نہ ہوں۔ جب وہ گھر میں بیٹھ کر تمام دنیا کے جنات پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو ان کی ہیبت سے جنات تھرا اٹھتے ہیں۔"

☆......☆......☆

"کیوں نہیں۔" اس نے کہا اور گھڑا جھکا دیا۔

جب وہ خوب سیر ہو کر پی چکا تو لڑکی نے کہا۔ "تیرے اونٹ بھی تو پیاسے ہوں گے۔ میں تیرے اونٹوں کے لیے بھی پانی بھر لاؤں گی۔ جب تک وہ پی نہ چکیں۔"

وہ گھڑے بھر بھر کر حوض میں ڈالتی رہی اور اونٹ پیتے رہے۔

وہ نشانیاں ظاہر ہو چکی تھیں جو الیعزر نے اپنے خدا سے چاہی تھیں۔ اسے یقین ہو گیا کہ یہی وہ لڑکی ہے جو اسحٰقؑ کے لیے خدا نے منتخب کی ہے۔

"لڑکی تیرا نام کیا ہے؟"

"میرا نام ربقہ ہے اور میں بیتوایل کی بیٹی ہوں۔"

"خدا تجھے یہ نام مبارک کرے۔ کیا تیرے باپ کے گھر میں مجھے اور میرے اونٹوں کو جگہ مل جائے گی؟"

"وہ ضرور تجھے مہمان بنائے گا۔ تو یہیں ٹھہر کر انتظار کر میں اپنی ماں کو خبر کرتی ہوں۔" ربقہ دوڑی ہوئی گئی اور اپنی ماں کے سامنے تمام باتیں دہرا دیں۔

"وہ بہت مالدار آدمی معلوم ہوتا ہے۔ یہ دیکھ یہ سونے کے کڑے بھی اس نے مجھے دیے ہیں۔"

ربقہ کی ماں نے ربقہ کے بھائی لابن کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ چشمے پر جو آدمی کھڑا ہے اسے لے کر آ اور اس کے اونٹوں کے لیے بھوسے اور چارے کا انتظام کر۔

لابن گیا اور الیعزر کو لے کر آ گیا۔ گھر کے ساتھ ہی جانوروں کا باڑا تھا۔ اونٹوں کو وہاں باندھ دیا گیا۔ الیعزر ہاتھ منہ دھو کر تازہ دم ہو گیا تو لابن کے نوکر اس کے لیے کھانا لے کر آ گئے۔
الیعزر نے کھانے میں ہاتھ ڈالنے سے انکار کر دیا۔
''میں اس وقت تک کھانا نہیں کھاؤں گا جب تک وہ مطلب بیان نہ کر لوں جس کے لیے میں یہاں آیا ہوں۔''
''اے شخص! تیرا کیا مطلب ہے؟''
''بہتر ہوگا کہ اپنے باپ بیتوایل کو بھی یہاں بلا لو کیونکہ جو بات میں کہنے والا ہوں اس کا تعلق بیتوایل سے ہے۔''
وہ سب پریشان تھے کہ آخر ایسی کیا بات ہے جو وہ کہنے والا ہے۔ بہرحال لابن نے اپنے والد بیتوایل کو بھی بلا لیا اور الیعزر نے کہنا شروع کیا۔
''میں تمہارے رشتے دار ابراہیم (علیہ السلام) کا نوکر ہوں۔ اس کو خدا نے بڑی برکت دی ہے اور وہ بہت بڑا آدمی ہو گیا ہے۔ اس کو خدا نے بھیڑ بکریاں، گائے بیل، سونا چاندی سب کچھ بخشا ہے۔ اس کی بیوی سارہ کا ایک بیٹا اسحٰق ہے۔ اسی کو اس نے سب کچھ دے دیا ہے اور اب اس کی شادی کی فکر ہے۔ میرا آقا چاہتا ہے کہ اسحٰق کی شادی ان کے رشتے داروں میں ہو۔ آپ کی بیٹی ربقہ اس لائق ہے کہ اسحٰق سے اس کی شادی ہو۔ خدا نے مجھے یہاں تک پہنچا دیا ہے۔ اگر آپ اس شادی کے لیے تیار ہیں تو مجھے بتا دیں ورنہ میں کسی اور طرف چلا جاؤں۔''
لابن اور بیتوایل نے جواب دیا۔ ''اے الیعزر، تجھے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ بات خداوند کی طرف سے ہوئی ہے، ہم تجھے کچھ برا یا بھلا نہیں کہہ سکتے۔ ہمیں یہ رشتہ منظور ہے۔ ابراہیم ہمارے خاندان کا ہے ہم اس کی بات نہیں ٹھکرا سکتے۔ ربقہ تیرے سامنے موجود ہے۔ اسے لے جا اور اپنے آقا کے بیٹے سے اسے بیاہ دے۔''
الیعزر نے اس خوشی میں چاندی اور سونے کے زیور اور لباس نکال کر ربقہ کو دیے اور اس کے بھائی اور اس کی ماں کو بھی قیمتی چیزیں دیں۔
یہ رات الیعزر نے اسی گھر میں گزاری اور صبح ہوتے ہی وہ چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔
''اب مجھے اجازت دو کہ میں ربقہ کو لے کر اپنے آقا کے پاس جاؤں۔''
''لڑکی کو کچھ روز کم سے کم دس روز ہمارے پاس رہنے دو۔ اس کے بعد وہ چلی جائے گی۔''
''نہیں۔ یہ خوش خبری ایسی نہیں ہے کہ زیادہ دن اپنے آقا سے چھپاؤں۔ اب مجھے جانے دو تو اچھا ہے۔''
''ہم لڑکی کو بلا کر پوچھتے ہیں۔ دیکھو وہ کیا کہتی ہے۔ اگر وہ کہے گی تو ہمیں بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''
ربقہ سے پوچھا گیا تو اس نے جانے کی ہامی بھر لی۔ تب لابن نے اپنی بہن کو دعا دی۔
اے ہماری بہن! تو لاکھوں کی ماں ہو۔
اور تیری نسل اپنے کینہ رکھنے والوں کے پھاٹک کی مالک ہو۔
ربقہ اپنی دایہ کے ساتھ اونٹ پر سوار ہوئی۔ اس کی سہیلیاں اسے رخصت کرنے کچھ دور تک آئیں۔
ایک طویل سفر کے بعد جب یہ مقدس سواریاں کنعان کے علاقے میں داخل ہوئیں تو ربقہ کی نظر ایک نہایت حسین مرد پر پڑی جو بظاہر انہی کی طرف آ رہا تھا۔
''یہ شخص کون ہے جو بظاہر ہم سے ملنے میدان کی طرف چلا آ رہا ہے؟'' ربقہ نے الیعزر سے پوچھا۔
''یہی تو ہیں حضرت اسحٰق علیہ السلام جو یہ دیکھنے آ رہے ہیں کہ تم میرے ساتھ ہو یا نہیں۔''
ربقہ نے یہ سن کر ایک چادر سے اپنا منہ ڈھانپ لیا۔ حضرت اسحٰق علیہ السلام کو اشارہ مل گیا کہ الیعزر ناکام نہیں لوٹا ہے۔ گوہر مقصود ساتھ لے کر آیا ہے۔ آپ نے آگے بڑھ کر اونٹ کی رسی تھام لی اور چلتے ہوئے حضرت سارہ کے خیمے تک آئے۔ کیسا مبارک جوڑا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے باہر نکل کر استقبال کیا۔
حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ربقہ کو حضرت اسحٰق علیہ السلام کی زوجیت میں دے دیا۔

☆☆☆

طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ ربقہ کے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی بلکہ اسے بانجھ قرار دے دیا گیا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام

اور حضرت سارہ کو اللہ نے طویل عمر دی تھی لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ ہمیشہ زندہ رہتے۔ اسی لیے یہ فکر روز بروز بڑھتی جا رہی تھی کہ وہ اپنی زندگیوں میں حضرت اسحٰق علیہ السلام کی اولاد کو نہیں دیکھ سکیں گے۔ جب اکیلے بیٹھتے تھے یہی باتیں ہوتی تھیں۔
اس رات بھی چراغ بجھانے کا وقت گزر چکا تھا مگر آپ ابھی تک جاگ رہے تھے۔ وہ کسی سوچ میں گم تھے کہ انہیں احساس ہوا، ان کی شریکِ حیات بھی ابھی تک جاگ رہی تھیں۔
''کیا تم بھی وہی سوچ رہی ہو جو میں سوچ رہا ہوں؟''
''اللہ کے نبی آپ کیا سوچ رہے ہیں؟''
''میں سوچ رہا ہوں میں کتنے شوق سے بیتوایل کی بیٹی کو اسحٰق کے خیمے میں لایا تھا اور وہ بانجھ نکلی۔''
''سوچنے کا کیا فائدہ۔ جو اللہ کو منظور ہوگا وہی ہوگا۔''
''اللہ کی بندی میں اس وقت یہی سوچ رہا ہوں کہ اللہ کا وعدہ کیسے بدل سکتا ہے۔''
''کیا اللہ نے کوئی وعدہ کیا تھا؟''
''کیا تمہیں وہ دن یاد ہے جب اللہ کے محترم فرشتے ہمارے پاس آئے تھے اور تمہیں اسحٰق کی خوش خبری دی تھی؟''
''اللہ کے نبی وہ دن میں کیسے بھول سکتی ہوں۔''
''پھر تو تمہیں وہ بھی یاد ہوگا کہ فرشتوں نے صرف اسحٰق کی نہیں اس کے بیٹے یعقوب کی بھی خوش خبری سنائی تھی۔''
حضرت سارہ نے کمبل دور پھینک دیا اور اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ''میں تو اسے بھول گئی تھی اور پریشان تھی۔ اب میرا دل مطمئن ہے۔ اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔''
''سارہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اسحٰق دوسری شادی کر لیں اور بیٹا دوسری بیوی سے ہو؟ اگر ایسا ہوا تو بیتوایل کو کتنا دکھ ہوگا۔''
''مجھے تو اس سے زیادہ یہ فکر ہے کہ ہماری عمریں اس وقت کا انتظار کریں گی بھی؟ اللہ کے وعدے میں یہ تو نہیں کہا گیا تھا کہ اسحٰق کے بیٹوں کو دیکھنے کے لیے ہم زندہ بھی رہیں گے۔''
وہ رات انہی باتوں میں گزر گئی۔ صبح ہوئی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحٰق علیہ السلام کے خیمے کی طرف گئے اور انہیں اللہ کا وعدہ یاد دلایا۔ یہ سن کر انہوں نے بھی یہی کہا کہ ہو سکتا ہے میری اولاد دوسری بیوی سے ہو۔ کیوں نہ میں دوسری شادی کر لوں۔
''ایسا ہرگز نہ کرنا۔ میں یہی کہنے آیا تھا۔ ربقہ کا باپ بیتوایل میرا بھتیجا ہے۔ اسے تکلیف ہوگی۔ ہاں اگر میں نہ رہوں تو تم آزاد ہو گے۔ اس کے بعد دوسری شادی کر لینا۔''
حضرت سارہ کا اندیشہ درست تھا۔ اپنی گود میں حضرت اسحٰق کی اولاد کو دیکھے بغیر آپ انتقال فرما گئیں۔ توریت کے مطابق انتقال کے وقت آپ کی عمر مبارک ایک سو ستائیس سال تھی۔
پھر آگے پیچھے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی وفات پائی۔
ایک قول کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وفات اچانک ہوئی تھی۔ جبکہ اہلِ کتاب نے جو ذکر کیا ہے وہ اس کے خلاف ہے۔
اہلِ کتاب اپنے قصوں میں کہتے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام بیمار پڑ گئے اور 175 سال کی عمر میں وفات پا گئے اور حضرت سارہ کے پہلو میں دفن ہوئے۔
''ابراہام کی کل عمر جب تک کہ وہ جیتا رہا ایک سو پچھتر برس کی ہوئی۔ تب ابراہام نے دم چھوڑ دیا اور خوب بڑھاپے میں نہایت ضعیف اور پوری عمر کا ہو کر وفات پائی اور اپنے لوگوں میں جا ملا۔''
یہ روایت بھی ملتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام دو سو سال حیات رہے۔
آپ کی وفات 1755 ق م میں ہوئی اور بیت المقدس سے ایک منزل کے فاصلے پر الخلیل میں دفن ہوئے۔
تحقیق کے ساتھ معلوم ہوا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قبر خلیل شہر میں ہے البتہ اس شہر میں کون سی جگہ وہ قبر ہے اس کے تعین میں کوئی محفوظ صحیح مستند خبر نہیں ہے لہٰذا اس پورے علاقے کا لحاظ کرنا چاہیے اور پورا پورا احترام کرنا چاہیے۔ کیا خبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قبر اس زمین کے نیچے ہو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی چار بیویاں تھیں۔ پہلی بیوی حضرت سارہؓ تھیں جن کے بطن سے حضرت اسحٰق پیدا ہوئے جنہوں نے حکمران ابی مالک کے زمانے میں ملک جرار جو موجودہ لبنان کے جنوب میں بحیرۂ روم کے کنارے واقع تھا، ہجرت کی اور سو برس تک دعوتِ حق دیتے رہے۔

دوسری بیوی حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہ تھیں جن کے بطن سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام پیدا ہوئے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ مل کر خانہ کعبہ تعمیر کیا۔

تیسری بیوی حضرت قطورہ رضی اللہ عنہ بنتِ مقطور تھیں۔ ان کے بطن سے چھ بیٹے پیدا ہوئے۔ توریت کے مطابق ان کے نام زمران، یقسان، مدان، مدیان، اسباق اور سوخ تھے۔

چوتھی بیوی حضرت حجورہ رضی اللہ عنہ تھیں جن کے بطن سے پانچ بیٹے نافس، لوطان، امیم، شورخ اور کیسان پیدا ہوئے۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اکرم ﷺ نے فرمایا، میں نے عیسیٰ ابن مریم کو دیکھا اور موسیٰ اور ابراہیم کو دیکھا۔ عیسیٰ تو سرخ رنگ، گھنگریالے بال اور چوڑے سینے والے تھے اور موسیٰ آدم کی طرح قد آور اور بڑے جسم والے تھے۔ پھر لوگوں نے پوچھا۔ حضرت ابراہیم؟ فرمایا اپنے ساتھی کو دیکھ لو (یعنی مجھے)

بخاری شریف میں حضرت مجاہد سے بھی مروی ہے۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا، میں نے حضور ﷺ سے سنا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو دیکھنا ہے تو اپنے ساتھی کو دیکھ لو (یعنی مجھ کو)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا جنت میں ایک محل ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ شاید حضور ﷺ نے فرمایا تھا وہ موتی کا ہے۔ آگے حضور ﷺ نے فرمایا اس میں کوئی جوڑ نہیں ہے اور وہ صرف اللہ عزوجل نے اپنے دوست حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے بطور مہمان نوازی بنایا ہے۔

اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا دوست کہہ کر مخاطب کیا۔

جب حضور اکرم ﷺ معراج پر تشریف لے گئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ ساتویں آسمان پر فرشتوں کے بیت اللہ یعنی بیت معمور کے ساتھ ٹیک لگائے استراحت فرما رہے ہیں۔

سبحان اللہ! وہ بیت معمور جس میں ہر روز ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں (اور اس کا طواف کرتے ہیں) لیکن پھر بھی کبھی قیامت تک کسی فرشتے کی دوبارہ طواف کرنے کی باری نہیں آئے گی۔

آپؑ کی اسی عظمت کی شان ہے کہ قرآن مجید نے آپؑ کے واقعات کو مختلف اسلوب کے ساتھ جگہ جگہ بیان کیا ہے۔ ایک جگہ اگر اختصار سے ذکر ہے تو دوسری جگہ تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

ایسی جگہیں 35 ہیں۔ ان میں سے پندرہ تو صرف سورۂ بقرہ میں ہیں اور اس کے علاوہ یہ پانچ اولوالعزم پیغمبران میں سے ایک ہیں جن کو تمام انبیا میں بطورِ خاص فضیلت عطا فرمائی گئی ہے اور ان کا نام بھی علیٰحدہ سے واضح طور پر اللہ نے اپنے کلام مقدس میں سورۂ احزاب اور شوریٰ کے اندر ذکر فرمایا ہے۔

حضرت عبید بن عمیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام لوگوں کی مہمان نوازی بہت فرماتے تھے۔ ایک دن اسی غرض سے کسی کی تلاش میں نکلے لیکن کوئی ایسا نہ ملا تو واپس گھر لوٹے۔ وہاں ایک اجنبی کو کھڑا پایا۔ آپ نے پوچھا۔ ”اے اللہ کے بندے میری اجازت کے بغیر کیسے میرے گھر میں داخل ہوئے؟“ اس شخص نے جواب دیا ”میں اس گھر کے مالک (پروردگار) کے حکم سے آیا ہوں۔“ آپ نے پوچھا تو کون ہے۔ جواب دیا ”میں ملک الموت ہوں۔ مجھے اس شخص کے پاس بھیجا گیا ہے جسے اللہ نے اپنا دوست منتخب کرلیا ہے۔“ آپ بے چین ہوگئے۔ ”وہ کون ہے۔ اگر تو مجھے اس کا پتا بتا دے تو میں اس کے پاس پہنچوں پھر ہمیشہ کے لیے اس کا پڑوسی بن کر رہوں۔“

فرشتے نے کہا۔ ”وہ بندے آپ ہی ہیں۔“

(ختم شد)

ماخذات قصص القرآن۔ قصص الانبیأ۔ توریت۔ حضرت ابراہیم از علامہ عباس محمود

منظر امام

جنگل کا آدمی

معاشرہ چاہے کتنا ہی مہذب اور قانون سازی سے مزین ہو لیکن در حقیقت اندرونِ خانہ ہر مقام پر جنگل کا قانون رائج نظر آتا ہے جہاں ہر جانور صرف اپنا پیٹ بھرنے کے لیے دوسرے کا شکار کرتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی دائرے میں قید تھا لیکن اس کے باوجود وہ شکار کرنا سیکھ نہ سکا... البتہ اسے جانور کے روپ میں زندگی گزارنے کا سلیقہ ضرور آگیا اور اسی روپ میں اسے انسانیت کی معراج بھی حاصل ہوگئی کیونکہ اسے دوسروں کے غم بانٹنے اور ہونٹوں پر ہنسی سجانے کا فن جو مل گیا تھا۔

در بدر روزگار کی تلاش اور دربدر ہو کر منزل پالینے کا عبرت اثر انداز

سہیل کا دوست حامد، اسے مولانا چنگیزی کے پاس لے گیا۔ مولانا چنگیزی، چنگیز خان کی نسل کے دکھائی دے رہے تھے۔ زبردست توند جو اس کے جسم کا حصہ تھی۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں جنہیں کھینچ کر بڑی بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ سر پر ایک عمامہ، بدن پر ایک دھاری دار کرتہ اور کھڑکھڑاتی ہوئی شلوار۔ مولانا کے حجرے میں دو آدمی پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ حامد نے مولانا کی طرف دیکھتے ہوئے سہیل کا تعارف کرایا۔ ”جناب، سہیل میرا دوست ہے۔ بہت پاٹ دار آواز ہے اس کی۔ بے چارہ... بے روزگار ہے۔“

مولانا نے سہیل کو ٹٹولنے والی نگاہوں سے دیکھا پھر ایک زوردار ہنکاری لی۔ ”نوجوان، تمہاری پریشانی کا سن کر بہت افسوس ہوا۔“

”لیکن میں نے تو ابھی کوئی پریشانی بتائی ہی نہیں ہے۔“ سہیل جلدی سے بولا۔ مولانا کے ماتھے پر ناگواری کی شکنیں نمودار ہوگئیں۔

”بے وقوف، تمہارے فاقہ زدہ منحوس چہرے پر لکھی ہوئی ہے پریشانی۔“ سہیل کو بہت برا لگا۔ اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن حامد نے جلدی سے اس کا ہاتھ دبا کر اسے خاموش کردیا۔

”جناب، آپ اسے آزما کر دیکھ لیں۔“ حامد نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ تم لے کر آئے ہو تو خیال کرنا ہی پڑے گا۔“ مولانا نے اپنی موٹی گردن ہلائی پھر سہیل سے مخاطب ہوئے۔ ”چلو، اپنی پاٹ دار آواز کا نمونہ دکھاؤ۔“

”میں سمجھا نہیں جناب۔“ سہیل سٹپٹا گیا۔ ”کیا دکھاؤں؟“

”کوئی نعرہ لگا کر دکھاؤ۔“

سہیل نے زوردار ہانک لگائی۔ ”سات سمندر پار سے۔ گڑیوں کے بازار سے۔ گڑیا چاہے نہ لانا۔ پاپا جلدی آجانا۔ پاپا جلدی آجانا۔“

اس نے یہ بول اتنی بلند آواز میں ادا کیے کہ ایک بار خود مولانا چنگیزی تھرا کر رہ گئے۔ کمرے میں موجود دونوں آدمیوں نے جزاک اللہ کے نعرے بلند کرنے شروع کردیے۔ مولانا چنگیزی نے خود بھی ہنکارا بھرا ...... اور حامد کی طرف دیکھا۔ ”ٹھیک ہے۔ تمہارا یہ بندہ کام کا ہے۔ مین آدمی یہی ہوگا۔ دوسرے اس کے بعد شروع ہوں گے۔“

”لیکن جناب مجھے کرنا کیا ہوگا؟“ سہیل نے پوچھا۔

”کیوں، تم نے اسے ابھی سمجھایا نہیں ہے کیا؟“ مولانا نے حامد سے پوچھا۔

”نہیں جناب، یہ مجھے راستے میں مل گیا تھا۔ میں اسے لے کر یہیں چلا آیا۔“

”دیکھو جوان، ہم اندر والے لوگ ہیں۔“ مولانا چنگیزی نے سمجھانا شروع کیا۔ ”ہم اس کے نام اور اس کے ذکر کو بلند کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بڑے بڑے جلسے ہوتے ہیں۔ میں ان میں تقریریں کرتا ہوں اور لوگوں کو صحیح راستے پر لانے کی کوشش کرتا ہوں لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ لوگ بہت بے حس ہوچکے ہیں۔ ان کو جوش دلانے کی ضرورت ہوتی ہے۔“

”اور وہ جوش میں کیسے آتے ہیں جناب؟“ سہیل نے پوچھا۔

”میں بتا رہا ہوں۔“ مولانا چنگیزی اس مداخلت پر کچھ ناراض ہوگئے۔ ”مختلف نعروں کے ذریعے۔ یہ نعرے تم کو سکھا دیے جائیں گے۔ ہفتے میں دو دن ہمارا جلسہ ہوتا ہے جس میں تم کو نعرے لگانے ہیں اور تمہارا ساتھ یہ دونوں دیں گے۔“ انہوں نے دونوں بندوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”ہر جلسے کے پانچ سو روپے ملیں گے۔ سمجھ گئے......“

”میں سمجھ گیا۔“ سہیل نے گردن ہلائی۔ ”یعنی ہفتے کے ہزار روپے۔“

”ہاں...... اور آنے جانے اور رات کے کھانے کے پیسے الگ ہوں گے۔“

”میں تیار ہوں جناب۔ آپ نعرے بتائیں۔“

نعرے کچھ یوں تھے۔ ”بھاڑ میں جائیں انگریز۔ جیوے شاہ چنگیز۔ دم دمادم۔ شاہ جی ایٹم بم۔“

سہیل نے اپنی پاٹ دار آواز میں ان نعروں کی پریکٹس کرکے سماں سا باندھ دیا۔ خود مولانا چنگیزی بھی آنکھیں بند کرکے جھومنے لگے۔ ایڈوانس کے طور پر سہیل کو اسی وقت تین سو روپے دے دیے گئے۔ پھر اسے بتایا گیا کہ یہ جلسہ کہاں اور کس وقت ہونا ہے۔

وہ دونوں مولانا چنگیزی سے اجازت لے کر باہر آگئے۔ سہیل حامد کو ایک چھوٹے سے ہوٹل میں لے آیا۔ چائے کا آرڈر دینے کے بعد اس نے حامد سے پوچھا۔ ”ہاں اب بتا، یہ سب کیا چکر ہے؟“

”سیاست کا چکر ہے، اپنی دکانداری چمکانے کا چکر ہے۔“ حامد نے بتایا۔ ”مولانا چنگیزی کی بہت دھوم ہے۔ لوگ ان کو ایسا مذہبی رہنما سمجھتے ہیں جو بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھانے کے لیے آسمان سے اتارا گیا ہے۔ ایسی زبردست تقریریں ہوتی ہیں کہ بس مزہ آجائے۔“

”صرف تقریریں ہوتی ہیں یا اندر بھی کچھ ہوتا ہے۔“

”تم اندر کے چکر میں نہ پڑو۔ باہر ہی باہر دیکھو۔ دو دو گاڑیاں ہیں ان کے پاس۔“

”اور مجھے ان کے لیے نعرے لگانے ہیں؟ کیونکہ میں نعرہ بازوں کا لیڈر ہوں۔“

”ہاں، تمہاری یہی پوسٹ ہے۔“ حامد نے کہا۔ ”اب رات کے لیے تیاری کرکے یہیں آجاؤ ٹھیک آٹھ بجے۔ یہیں سے جلوس روانہ ہوگا اور ہاں راستے میں نعرے لگاتے ہوئے جانا ہے۔“

حامد کو روانہ کرنے کے بعد سہیل اپنے فلیٹ میں آگیا۔ دو کمروں کا چھوٹا سا فلیٹ، جس کا کرایہ بہت زیادہ تھا اور فلیٹ کا مالک بہت ہی چیپ قسم کا انسان تھا۔ وہ جب آتا دھرنا دے کر بیٹھ جاتا۔ اپنے اصولوں کے بارے میں تقریریں کرتا کہ اس نے زندگی کتنی ایمانداری سے گزاری ہے۔ ایک بااختیار سرکاری افسر ہونے کے باوجود اس کے پاس صرف چھ فلیٹس اور سات دکانیں ہیں جن کے کرایوں سے وہ زندگی بسر کر رہا ہے۔

سہیل کو اس کے سامنے مؤدب بیٹھ کر اس کی بکواس اس لیے سننی پڑتی تھی کہ وہ کرایہ تاخیر سے دیتا تھا اور کبھی کبھی تو دو دو مہینوں کے کرایے اس پر چڑھ جاتے۔

بہرحال فلیٹ پہنچا تو فلیٹ کا مالک موجود تھا۔ اس وقت سہیل کو اس کی آمد کھل گئی کیونکہ اس کے پاس نہ تو چینی تھی اور نہ چائے کی پتی۔ دکاندار نے بھی ادھار دینے سے منع کردیا تھا۔

”کیوں میاں، میں بے وقت تو نہیں آگیا؟“ فلیٹ کے مالک نے پوچھا۔ ”کیونکہ تم جانتے ہو کہ میں بااصول آدمی ہوں۔ کسی کو پریشان نہیں کرتا۔ چاہے وہ اپنا کرایے دار ہی کیوں نہ ہو۔“

”جی جناب، اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس لیے تو آپ کا احترام کرتا ہوں۔ ورنہ فلیٹ کے مالکان تو ہزاروں ہوتے ہیں۔ میں کسی اور کا احترام کیوں نہیں کرتا۔“

”خوش رہو میاں، اندر چلو۔ میں تمہیں اپنی سرکاری نوکری کے زمانے کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔“

سہیل کو اس وقت کوفت ہونے لگی۔ اسے جلسے کی تیاری کرنی تھی۔ اسے تاکید کی گئی تھی کہ سفید کرتا شلوار پہنے گا اور جالی والی ٹوپی بھی سر پر ہوگی۔ اگر ہاتھ میں تسبیح بھی ہو تو پھر بات ہی اور ہے۔

بہرحال حکم مالک مرگ مفاجات۔ وہ دلدار (فلیٹ کے مالک) کو اندر لے آیا۔ دلدار نے بے تکلفی کے ساتھ چائے کی فرمائش کرتے ہوئے کہا۔ ”میاں تم جو چائے بناتے ہو اس کا جواب نہیں ہوتا۔ اس لیے میں صرف تمہارے ہاتھ کی چائے پیتا ہوں۔“

”لیکن آج میں آپ کی کوئی خدمت نہیں کرسکوں گا۔“ سہیل نے ہمت کرکے کہہ دیا۔

”وہ کیوں؟“

”میں نے پارٹ ٹائم... جاب بھی کرلی ہے۔“ سہیل نے بتایا۔ ”بس تیار ہوکر وہیں جا رہا ہوں۔“

”چلو۔ یہ تو بہت خوشی کی بات ہوئی۔“ دلدار نے کہا۔ ”یعنی اب کرایہ وقت پر مل جائے گا؟“

”جی ہاں۔“

”بس تو جاؤ۔“ دلدار صاحب نے جلد ہی جان چھوڑ دی۔ سہیل رکشا پکڑ کر مولانا چنگیزی کے گھر پہنچا۔ جلوس چلنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ مولانا اپنی پجارو میں تھے جبکہ دوسروں کے لیے سوزوکی اور ویگنس کا بندوبست کیا گیا تھا۔

سہیل نے وہاں پہنچتے ہی اپنی ڈیوٹی دینی شروع کردی۔ ”بھاڑ میں جائیں انگریز۔ جیوے شاہ چنگیز۔“ ہمنواؤں نے اس کی آواز میں آواز ملانا شروع کردی۔ ذرا سی دیر میں ماحول گرم ہوگیا۔ پھر یہ قافلہ جلسہ گاہ کی طرف روانہ ہوگیا۔

جلسہ گاہ میں جیسے دن نکلا ہوا تھا۔ اتنے بلب لگائے گئے تھے کہ ہر طرف روشنی ہی روشنی ہو رہی تھی۔ سہیل کو یہ دیکھ کر دکھ ہوا تھا کہ یہ ساری روشنی کنڈوں کی وجہ سے تھی۔ نہ جانے اس متبرک اور مبارک جلسے کے لیے کتنے کنڈے لگائے گئے تھے۔

مولانا چنگیزی کو اسٹیج پر پہنچایا گیا۔ یہ موقع نعرے بازی کا تھا۔ سہیل نے اپنی کڑک دار آواز میں نعرہ بلند کیا۔ ”دیکھیے سرکار۔ کنڈوں کی بہار۔ کتنا مبارک جلسہ ہے۔ کنڈا روشنی دیتا ہے۔“

وہ یہ سارے نعرے خود ہی لگا رہا تھا کیونکہ وہاں اس کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں تھا۔ ان نعروں کو سن کر لوگوں نے زور زور سے ہنسنا شروع کردیا جبکہ مولانا چنگیزی کے بندوں کو سانپ سونگھ گیا پھر انہوں نے ہوش اور جوش میں آکر سہیل کی ٹھکائی شروع کردی۔ سب کا یہ خیال تھا کہ یہ مخالف کیمپ کا بندہ ہے جو کسی سازش کے تحت مولانا چنگیزی کے کیمپ میں آکر شامل ہوا ہے۔ اس ہجوم میں دو چار معقول قسم کے لوگ بھی تھے۔ انہوں نے سہیل کو فرار ہونے کا موقع فراہم کیا تو سہیل نے بھاگنے میں دیر نہیں لگائی۔ پنڈال کے باہر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ اندھیرے میں گم ہوگیا۔

اپنے فلیٹ میں پہنچا تو سیڑھیاں چڑھنا اس کے لیے عذاب ہوگیا تھا۔ جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ کچھ لوگوں نے بہت خشوع و خضوع کے ساتھ اس کو مارا تھا جو مولانا چنگیزی جیسے فرشتہ صفت انسان کے جلسے کو خراب کرنے آگیا تھا۔

سہیل نے اپنی چوٹوں کی خود ہی سنکائی کی اور مولانا چنگیزی کو برا بھلا کہتے کہتے سوگیا۔

دوسری صبح اس کا دوست حامد اسے برا بھلا کہتا ہوا اس کے پاس آیا۔ ”خدا کے بندے۔ تیری وجہ سے میری بھی نوکری چلی گئی۔ آخر تجھے اتنی بکواس کی ضرورت ہی کیا تھی؟“

”حامد تم ایمانداری سے بتاؤ۔ کیا میں نے غلط نعرہ لگایا تھا؟ کیا وہاں کنڈا سسٹم نہیں چل رہا تھا؟“

”چل تو رہا تھا لیکن تمہیں کیا ضرورت تھی واویلا کرنے کی؟“

”اس لیے کہ میں ایک فرض شناس شہری ہوں۔“ سہیل نے کراہتے ہوئے کہا۔ ”اور میں اپنا فرض پورا کرتا رہوں گا۔ لے کے رہیں گے پاکستان۔ بٹ کے رہے گا ہندوستان۔“

”اس وقت کون سا موقع تھا یہ سب بولنے کا؟“

”اب موقع دیکھنے کے لیے میں ۱۹۴۷ء میں تو واپس نہیں جا سکتا تھا۔ اس لیے جو منہ میں آیا بول دیا۔“ سہیل نے کہا۔ ”اب یہ بتاؤ مولانا صاحب مجھے رکھیں گے یا نہیں؟“

”کیا پاگل ہوگئے ہو۔ وہ تو تمہیں دیکھتے ہی تمہارا گلا دبا دیں گے۔“

”تو پھر مجھے کوئی اور کام دلاؤ۔“ سہیل نے کہا۔ ”ورنہ یاد رکھو۔ میں تمہارے مولانا چنگیزی کے جلسوں کو اسی طرح خراب کرتا رہوں گا۔“

”اور ان کے عقیدت مند تمہیں جان سے مار دیں گے۔“

”تو کیا کروں۔ بے روزگار بھی تو نہیں رہ سکتا۔“

”اچھا اچھا۔ میں تمہارے لیے کوئی اور کام ڈھونڈتا ہوں۔“

حامد نے اسے دوسرا کام بتایا۔ وہ ایک میڈیکل اسٹور میں ملازمت کا کام تھا۔ آب حیات میڈیکل اسٹور۔ جس کا مالک ایک کمزور دبلا پتلا ایسا شخص تھا جو کھانسی کا دائمی مریض دکھائی دے رہا تھا۔ میڈیکل اسٹور چلانے کے باوجود سدا کا روگی دکھائی دے رہا تھا۔ حامد نے اس کا نام دیانت حسین بتایا تھا۔

”بندہ تو بھروسے کا ہے نا؟“ دیانت حسین نے سرسراتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں ہاں بہت بھروسے کا ہے۔“ حامد نے کہا۔ ”یہ سمجھ لو کہ اس کی آنکھیں بند ہیں۔ صرف کام کرنا جانتا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ دیانت حسین نے اطمینان کے انداز میں گردن ہلا دی پھر سہیل کی طرف دیکھا۔ ”دیکھ بھائی، تیرا کام ہے مریضوں کو پکڑنا۔“

”مریضوں کو کس طرح پکڑوں؟“ سہیل نے حیران ہو کر پوچھا۔

”ارے بابا۔ یہ سب گُر کی باتیں ہیں۔ تم کو ڈاکٹرز کے پاس جانا ہے۔ ان سے کمیشن کی بات کرنی ہے۔ اپنے تحفے پہنچانے ہیں پھر ڈاکٹر مریضوں سے کہیں گے کہ دوا لینی ہو تو آب حیات میڈیکل اسٹور سے لو۔ ان کے یہاں ہر دوا ملتی ہے۔ بس یہ ہے ساری کہانی۔“

”آپ کے یہاں کی دوائیں کیسی ہوتی ہیں؟“

”اب سارے راز ایک دن میں تو نہیں بتا سکتا۔“ دیانت صاحب نے برا سا منہ بنایا۔

”لیکن مجھ سے کام لینا ہے تو بتانا پڑے گا۔“

دیانت حسین بڑی مشکلوں سے راز بتانے پر راضی ہوئے اور وہ راز یہ تھا کہ ان کے تعلقات مختلف اسپتالوں کی فارمیسیز اور ڈسپنسریز سے تھے اور وہاں کی ایکسپائرڈ دوائیں آب حیات میڈیکل اسٹور خرید لیتا تھا۔

”دیانت صاحب، داؤں کی بوتلوں یا ڈبوں پر تو ایکسپائری ڈیٹ لکھی ہوتی ہے۔“

اس پر دیانت صاحب نے اپنا سر پیٹ لیا اور باقاعدہ واویلا کرتے ہوئے بولے۔ ”ارے بابا۔ یہاں ایک کاریگر موجود ہے جو ان تاریخوں کو اتنی ہوشیاری سے بدل دیتا ہے کہ کسی کا باپ بھی نہیں پکڑ سکتا۔“

”آپ اپنا نام دیانت سے بددیانت رکھ لیں۔ وہ زیادہ اچھا ہوگا۔“ سہیل نے جل کر کہا پھر اپنی پاٹ دار آواز میں نعرے لگانے لگا۔ ”بٹ کے رہے گا ہندوستان۔ لے کے رہیں گے پاکستان۔“

”کیا اس آدمی کا دماغ خراب ہے؟“ دیانت صاحب نے حیرت اور غصے سے پوچھا۔

”کبھی کبھی خراب ہو جاتا ہے۔“ حامد گڑبڑا کر بولا پھر اس نے سہیل کی طرف دیکھا۔ ”اب چلو یہاں سے۔ ورنہ دیانت صاحب کو غصہ آ جائے گا۔“

”یار تم کیسے آدمی ہو۔“ حامد اس پر برس پڑا۔ ”کیوں اپنے پیروں پر کلہاڑی مار رہے ہو۔“

”یار کیا بتاؤں۔ مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہوتا۔“

”تو پھر بھوکے مر جاؤ گے اور یہ تم نعرہ کس ٹائپ کا لگاتے ہو۔ کیا مطلب ہے اس نعرے کا؟“

”اس نعرے کا مطلب ہمارے بزرگوں کی سمجھ میں نہیں آسکا تو میں کیا سمجھاؤں گا۔“ سہیل نے کہا اور اس کے ساتھ ہی... ہوا میں قلابازی کھاتا ہوا ایک طرف جا گرا۔ بہت زور کی چوٹ آئی تھی۔ آنکھوں کے آگے ستارے سے جھلملانے لگے تھے۔

اس حادثے کی وجہ وہ بائیک تھی جو سہیل کو ٹکر مارنے کے بعد خود بخود بند ہوگئی تھی اور سوار اسے اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دو چار ناکام کوششوں کے بعد وہ سہیل پر پلٹ پڑا۔ ”اندھے ہو تم لوگ دیکھ کر کھڑے نہیں ہوسکتے۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو؟“ سہیل کراہتا ہوا کھڑا ہوگیا۔ ”ایک تو تم نے ٹکر ماردی پھر باتیں بھی مجھے ہی سنا رہے ہو۔“

اس حادثے کے دوران میں حامد نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ اس لیے سہیل کو اکیلے ہی اس پہلوان قسم کے بائیک سوار سے نمٹنا پڑ رہا تھا۔ ”جب تم یہ جانتے ہو کہ بائیک والے سگنل توڑ کر تیزی سے بائیک آگے بڑھا لے جاتے ہیں تو پھر تمہیں راستے میں کھڑے ہونے کی کیا ضرورت تھی۔“

”ارے بھئی، میں تو ایک کنارے بس کے انتظار میں کھڑا ہوا تھا۔“

”اچھا اچھا بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لاؤ تین سو روپے نکالو۔“

”تین سو روپے...... وہ کیوں؟“

”تم نے خود کو میری بائیک سے ٹکرا کر میری بائیک بند کروا دی ہے۔“ پہلوان نے کہا۔ ”اب اس کی مرمت پر سو روپے خرچ ہوں گے۔ لاؤ جلدی دو۔“

”میرے پاس تو ایک پیسا نہیں ہے۔“ اس پر بائیک والا اسے غصے سے گھورتا ہوا بائیک کو گھسیٹتے ہوئے ایک طرف چلا گیا۔ پھر حامد بھی نہ جانے کس طرف سے نمودار ہوگیا۔ سہیل اسی پر برس پڑا۔ ”خدا کے بندے تم مجھے چھوڑ کر کہاں بھاگ گئے تھے۔ بائیک والے نے میری اچھی خاصی ٹھکائی کر دی ہے۔“

”میں تمہارے لیے مدد لینے گیا تھا۔“

”کیسی مدد لینے گئے تھے؟“

”اپنے ایک دوست سے جو قریب ہی رہتا ہے۔ وہ نہیں ملا تو میں یہ سوچ کر جلدی واپس آگیا کہ خدا جانے تم زندہ بھی ہو یا نہیں۔“

”میں زندہ نہیں ہوں، مر چکا ہوں۔“ سہیل نے غصے سے کہا۔ ”لعنت ہے ایسے معاشرے پر۔ کسی نے مجھے سہارا تک نہیں دیا۔ خود ہی رو پیٹ کر کھڑا ہو گیا ہوں۔“

”چلو کسی ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔“ حامد نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

”رہنے دو اپنی ہمدردی۔“ سہیل نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

وہ حامد سے ناراض ہو کر ایک طرف چل دیا۔ اس کی چال میں لنگڑاہٹ آگئی تھی۔ کپڑے تو پہلے ہی مٹی سے اٹے ہوئے تھے کہ اچانک کسی نے اس کا بازو تھام لیا۔ یہ ایک پولیس والا تھا۔ جو ٹٹولنے والی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”جناب عالی! میں اس طرح تو آپ کو نہیں جانے دوں گا۔“ پولیس والے نے حیران کن نرمی سے کہا۔ ”میں آپ کو گھر تک پہنچا دیتا ہوں۔“

سہیل کافی خوش ہوگیا۔ چوٹ کا احساس ہی ختم ہو کر رہ گیا۔ ”نہیں بھائی۔ میں خود ہی چلا جاؤں گا۔“

”یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔“ پولیس والے نے کہا۔ ”یہ تو میری ڈیوٹی ہے جناب۔ فرض ہے میرا۔“

پولیس والے نے اسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ سامنے ہی پولیس کی ایک موبائل کھڑی تھی۔ اس کے اشارے پر موبائل قریب آگئی۔ ”تشریف رکھیں جناب، اگلی سیٹ پر۔“ اس نے کہا۔ ”آپ کو پیچھے بٹھایا تو لوگ سمجھیں گے کہ پولیس نے آپ کو پکڑ لیا ہے۔ اس لیے آگے بیٹھیں۔ پوری شان کے ساتھ۔“

”کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں کہاں رہتا ہوں؟“

”ارے جناب عالی، ہم پولیس والے ہیں۔ ہمیں کیا نہیں معلوم۔ آپ بیٹھیں تو سہی۔“

سہیل مونچھوں والے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کے ساتھ پاکستانی پولیس اتنا عمدہ برتاؤ کر رہی ہے۔ اس نے سوچنا شروع کر دیا کہ پہلی فرصت میں وہ اپنی پولیس کی تعریف میں ایک زبردست مضمون لکھے گا۔ جس میں کہا گیا ہوگا کہ بے وقوفو۔ تم نے اپنی پولیس کو پہچانا نہیں ہے۔ ان کے قریب جا کر دیکھو۔ تمہیں ایسا لگے گا جیسے خوشی اور اطمینان کے پہاڑ کے پاس آ کر کھڑے ہوگئے ہو۔

وہ اپنے خیالوں سے اس وقت چونکا جب وہ موبائل ایک تھانے کے احاطے میں داخل ہو کر رک گئی۔

”یہ تم مجھے کہاں لے آئے؟“ سہیل نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”یہ میرا گھر تو نہیں ہے۔“

”اگر نہیں ہے تو بن جائے گا سرکار۔“ پولیس والے نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”آپ آئیں میرے ساتھ تشریف لائیں۔“

نہ چاہتے ہوئے بھی سہیل کو اس کے ساتھ جانا پڑا۔ وہ اسے ایس ایچ او کے کمرے میں لے آیا۔ ”جناب عالی!

یہ ہیں اپنے ڈی آئی جی صاحب کے بہنوئی جن کی تلاش پورے شہر کی پولیس کر رہی ہے۔“

”گل محمد! تم نے یہ بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔“ ایس ایچ او اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ ”میں تجھے انعام دلواؤں گا۔“

”جناب عالی! میں کسی کا بہنوئی نہیں ہوں۔“ سہیل نے بتایا۔ ”آپ لوگ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔“

”ہم سب جانتے ہیں جناب۔“ ایس ایچ او خوشامدانہ انداز میں ہنستے ہوئے بولا۔ ”آپ کبھی نہیں بتاؤ گے کیونکہ آپ پورے حالات سے بے زار ہو کر گھر سے نکلے ہو لیکن آپ کو کیا معلوم جناب عالی کہ آپ کی وجہ سے ڈی آئی جی صاحب کی ہمشیرہ کتنی پریشان ہیں اور ہمشیرہ کی وجہ سے ڈی آئی جی صاحب پریشان ہیں اور ان کی وجہ سے ہم پولیس والے پریشان ہیں......“

اتنا کہہ کر اس نے ایک کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔ ”اب کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ جاؤ فاقت صاحب کے لیے چائے اور کیک لے کر آؤ۔ جلدی۔“

”میں کیک کھا لوں گا اور چائے بھی پی لوں گا لیکن میں آپ کے ڈی آئی جی صاحب کا بہنوئی نہیں ہوں بلکہ کسی کا بھی بہنوئی نہیں ہوں۔ میری شکل بہنوئیوں والی ہے ہی نہیں۔“

”ہمیں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ آپ کبھی مان کر نہیں دیں گے۔“ ایس ایچ او نے کہا۔ ”بلکہ اپنا نام بھی غلط بتائیں گے۔ اچھا یہ بتائیں کیا نام ہے آپ کا؟“

”سہیل...... سہیل صفدر۔“

”دیکھا۔“ ایس ایچ او نے فاتحانہ انداز میں چاروں طرف دیکھا۔ ”میں نے کیا کہا تھا کہ آپ نام بھی غلط بتائیں گے جبکہ آپ کا اصل نام عبدالعزیز ہے۔“

”ارے بھائی کیا ہو گیا ہے آپ لوگوں کو۔ میں عبدالعزیز نہیں ہوں۔ سہیل ہوں اور میرے پاس شناختی کارڈ موجود ہے۔“

”اس سے بھی کچھ نہیں ہوتا جناب عالی کیونکہ آپ کی پلاننگ تو بہت پرانی ہے۔ آپ نے جعلی شناختی کارڈ بنوا لیا ہوگا۔“

”کیسے بنوا لیا ہوگا۔ کیا مجھے بھی کوئی ایم این اے یا ایم پی اے سمجھ رکھا ہے۔“

”جناب عالی، آپ ڈی آئی جی صاحب کے بہنوئی ہیں۔ آپ کے لیے کیا مشکل ہے۔“ اس دوران میں کیک اور چائے بھی آ گئی تھی۔ سہیل نے چائے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بھائی صاحب، آپ یقین کیوں نہیں کرتے کہ میں کوئی اور ہوں۔ آپ لوگ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔“

”اچھا چلیں کر لیا یقین۔“ ایس ایچ او اس طرح بولا جیسے کسی بچے کو بہلا رہا ہو۔ ”آپ کیک تو کھائیں۔ سامنے والی بیکری کا کیک بہت زبردست ہوتا ہے۔ پہلے کچھ کھا پی لیں پھر آپ سے بات ہوتی رہے گی۔“

سہیل نے گہری سانس لیتے ہوئے کیک کا ٹکڑا اپنے منہ میں رکھ لیا۔ اسی وقت ایک اور پولیس آفیسر کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ایس ایچ او کے رینک کا ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے آتے ہی بڑی بے تکلفی سے کیک کا ٹکڑا اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”اوہو، آج تو بڑی خاطریں ہو رہی ہیں۔“

”یہ سب ڈی آئی جی صاحب کے بہنوئی کی وجہ سے ہے۔“ ایس ایچ او نے سہیل کی طرف اشارہ کیا۔

”کون بہنوئی...... وہی جو گھر سے بھاگے ہوئے ہیں؟“

”ہاں بھئی۔“

”لیکن یہ تو کوئی اور بندہ ہے۔“ دوسرے پولیس آفیسر نے بتایا۔ ”ڈی آئی جی صاحب کے بہنوئی کو تو میں خود دیکھ چکا ہوں یہ تو کوئی اور آدمی ہے۔“

اتنا بتا کر وہ پولیس والا کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی ایس ایچ او نے پلیٹ سہیل کے سامنے سے کھینچ لی۔ ”شرم نہیں آتی تجھے۔ مفت کا مال توڑ رہا ہے۔“

”جناب عالی، اس میں میرا کیا قصور ہے۔“ سہیل جلدی سے بولا۔ ”میں تو کب سے بتا رہا ہوں کہ میں عبدالعزیز نہیں ہوں۔“

سہیل کرسی سے کھڑا ہوا اور اسی وقت ایک اور پولیس والا کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے سہیل کی طرف دیکھتے ہوئے ہانک لگائی۔ ”ارے عبدالعزیز صاحب، آپ یہاں کہاں؟“

”کیا تم ان کو جانتے ہو؟“ ایس ایچ او نے پوچھا۔

”جی جناب، یہ اپنے ڈی آئی جی صاحب کے بہنوئی ہیں۔“

”لیکن ملک ریاض تو کہہ رہا تھا کہ یہ کوئی اور ہے۔“

”ملک ریاض کو کیا معلوم۔ میں نے تین برس تک ڈی آئی جی صاحب کی کوٹھی پر ڈیوٹی دی ہے۔ مجھ سے زیادہ کون جانتا ہوگا۔“

”وہی تو میں کہہ رہا تھا کہ اتنا رعب والا چہرہ ایسے ہی

عام خاندان کے لوگوں کا ہو سکتا ہے۔“ ایس ایچ او نے کہا پھر کیک کی پلیٹ اٹھا کر سہیل کے سامنے آ گیا۔ ”جناب! میرا دل رکھنے کے لیے بس دو پیس اور اٹھا لیں۔ میں زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوں گا۔ مجھ سے جو گستاخی ہوئی ہے وہ درگزر فرما دیں۔ آخر میں بھی بندہ بشر ہوں۔“

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں؟“ سہیل نے اپنے بال نوچ لیے۔ ”خدا کے بندے میں عبدالعزیز نہیں ہوں۔“

اس دوران میں ایک اور پولیس والا کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے بھی سہیل کے بیان کی تصدیق کر دی۔ ”جی جناب، یہ بندہ ٹھیک بول رہا ہے۔ یہ اپنے صاحب جی کا بہنوئی نہیں ہے۔ یہ کوئی دھوکے باز ہے جو خود کو ان کا بہنوئی بتا رہا ہے۔“

”ارے خدا کا خوف کرو۔“ سہیل بلبلانے لگا۔ ”میں نے کب بتایا ہے۔ تم لوگ زبردستی میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔“

”اس کو دھکے دے کر باہر نکال دو۔“ ایس ایچ او نے فیصلہ سنا دیا۔

دو پولیس والے اسے نہ صرف دھکے دیتے ہوئے بلکہ سہیل کو مارتے ہوئے تھانے کے گیٹ تک لے آئے اور گیٹ سے دھکے دے کر اسے باہر کر دیا گیا۔

اچانک سہیل کو کچھ یاد آ گیا۔ وہ تیزی سے واپس مڑا اور ایس ایچ او کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ ایس ایچ او اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”کیوں بھائی اب کیوں آیا ہے؟“

”سر! آپ سے ایک بات کہنی ہے۔“

”بول۔“

”بٹ کے رہے گا ہندوستان۔ لے کے رہیں گے پاکستان۔“ سہیل نے کہا۔

”اوئے کیا مطلب ہوا اس کا؟“

”یہ آپ سمجھتے رہیں۔“ سہیل اتنا بول کر تھانے سے باہر آ گیا۔

جو کچھ بھی ہو رہا تھا اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ اگر وہ ڈی آئی جی صاحب کا بہنوئی ہے پھر تو بہت بڑی بات ہے۔ اس کا احترام کرنا چاہیے۔ اس کی عزت کرنی چاہیے اور اگر بہنوئی نہیں ہے تو پھر اسے دھکے دے کر نکال دینا چاہیے۔

اسے انتہائی کوفت ہو رہی تھی۔ اس کی چال میں ابھی تک لنگڑاہٹ تھی۔ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے فلیٹ تک پہنچ ہی گیا۔ بستر پر لیٹ جانے کے بعد اسے ہوش نہیں رہا کہ وہ سو رہا ہے یا مر چکا ہے۔ دوسری صبح وہ بیدار ہوا...... اور وہ بھی دروازے پر ہونے والی دستک سے۔ دروازے پر حامد کھڑا تھا۔ ”یار کل سے کہاں غائب تھے۔ میں تو چکر لگا لگا کر تھک گیا۔“

”یہ مت پوچھو یار۔“ سہیل نے کہا۔ ”تم بیٹھو۔ میں نہا کر فریش ہو جاؤں پھر تمہیں اپنی کہانی سناؤں گا جب تک تم ہوٹل سے میرے لیے چائے بنوا لاؤ اور واپسی میں بسکٹ بھی لیتے آنا۔“

”اور پیسے کون دے گا؟“

”یہ مہربانی بھی تم ہی کو کرنی ہوگی۔“ سہیل نے کہا۔ ”میرے پاس تو زہر کھانے کے بھی پیسے نہیں ہیں۔“

”خیر، زہر تو تم کھا بھی نہیں سکتے۔ یہ بہت مہنگا شوق ہے۔“ حامد نے کہا۔ ”میں چائے اور بسکٹ لے آتا ہوں۔“

چائے پینے کے دوران میں سہیل نے حامد کو ساری کہانی سنا دی۔ وہ اس کی حالت پر افسوس کرنے کے بجائے ہنسنے لگا۔ ”عجیب آدمی ہو تم ہنس کیوں رہے ہو؟“

”اس لیے کہ ایسی خراب قسمت شاید ہی کسی اور کی ہوگی۔“

”اچھا بکواس مت کرو۔ مجھے ایک جگہ انٹرویو کے لیے جانا ہے۔“ سہیل نے کہا۔ ”کوئی اسٹیٹ ایجنسی ہے۔ ان کو فیلڈ میں کام کرنے والے کسی بندے کی ضرورت ہے۔“

”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

”میں نے اخبار میں پڑھا تھا۔“

”یار، ان چکروں میں نہ پڑو۔ میں نے تمہارے لیے ایک جاب تلاش کر لی ہے۔“ حامد نے بتایا۔ ”تم کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے ہی آیا ہوں۔“

”جاب کیا ہے؟“

”قوالوں کی پارٹی کے ساتھ کام کرنا ہے۔“ حامد نے کہا۔ ”آج کل قوالیوں کا سیزن چل رہا ہے۔ شوکت علی اینڈ پارٹی کی بہت ڈیمانڈ ہے۔ تم ہر رات مصروف رہو گے۔ پانچ سو روپے ملیں گے۔“

حامد نے بتایا۔ سہیل نے غصے سے اس کا گریبان پکڑ لیا۔

”بے وقوف انسان۔ تو میرے لیے اسی قسم کے کام ڈھونڈ کر لاتا ہے۔ اب میں اسی لیے رہ گیا ہوں کہ تالیاں

بجاتا پھروں۔"

"اچھا یار پھر ایک کام اور ہے۔"

"وہ بھی ایسا ہی ہوگا۔"

"نہیں۔ وہ ڈھنگ کا کام ہے۔" حامد نے کہا۔ "تمہیں ایک ہوٹل کے باہر اچھل کود کرنی ہے۔"

"کس قسم کی اچھل کود؟"

"وہ تمہیں گوریلے کی کھال پہنا دیں گے۔" حامد نے بتایا۔ "تم ہوٹل کے گیٹ پر گاہکوں اور بچوں کو خوش کرنے کے لیے اچھل کود کرتے رہو گے۔ اس میں بھی پانچ سو روپے روز ہیں۔"

"تم کیوں میری عزت کا جلوس نکلوا رہے ہو۔"

"اس میں کون سی عزت جا رہی ہے۔ کسی کے باپ کو بھی پتا نہیں چلے گا کہ اس کھال کے اندر کون ہے۔ ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد کھال اتار دینا۔"

"اور ڈیوٹی کتنی دیر کی ہوگی؟"

"چھ بجے سے رات بارہ بجے تک۔" سہیل نے کچھ دیر سوچنے کے بعد ہامی بھر لی۔

حامد اسے اسی وقت ہوٹل کے منیجر کے پاس لے آیا۔ یہ شہر کا ایک بہت مشہور ریستوران تھا۔ اس کا منیجر ایک ادھیڑ عمر کا گنجا انسان تھا۔

"منیجر صاحب! میں آپ کے لیے ایک بندر لے آیا ہوں۔" حامد نے سہیل کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں بابا۔ تمہارا لایا ہوا مال بالکل تھرڈ کلاس ہوتا ہے۔"

"منیجر صاحب، میں اس کی گارنٹی لیتا ہوں۔ یہ بہت اچھا بندر ہے۔ اس کے باپ دادا بھی بندر تھے۔"

"پھر تو برو بر ہے۔" منیجر نے مسکین ہو کر اپنی گردن ہلا دی۔ "تم آج سے ڈیوٹی پر آ جاؤ اور ہاں..... رات کا کھانا بھی ملے گا لیکن کھال اتارنے کے بعد اور کھال کا حفاظت کرنا ہے۔ جان چلی جائے لیکن کھال نہ جائے۔ بہت قیمتی کھال ہے۔ افریقا سے آیا ہے۔"

"آپ بے فکر رہیں۔ کھال کی حفاظت کروں گا۔"

ریسٹورنٹ سے باہر آ کر حامد نے سہیل سے پوچھا۔ "یار! تو اتنی آسانی سے اس کام کے لیے تیار کیوں ہو گیا؟"

"اس لیے کہ میں نے یہ اندازہ لگا لیا ہے کہ ہمارے یہاں انسانوں کی قدر نہیں ہے۔ جانوروں سے پیار کیا جاتا ہے۔ اگر میں انسان ہی رہتا تو مجھے نوکری نہیں ملتی لیکن بندر بنتے ہی مل گئی۔ بٹ کے رہے گا ہندوستان۔ لے کے رہیں گے پاکستان۔"

"یار تو یہ نعرہ ہر وقت کیوں لگاتا رہتا ہے۔"

"یہ تم نہیں سمجھو گے پیارے۔"

سہیل ٹھیک پانچ بجے ریسٹورنٹ پہنچ گیا۔ منیجر نے اسے دو ملازمین کے سپرد کر دیا۔ ملازمین اسے ایک کمرے میں لے آئے اور اس کے جسم پر بندر کی کھال چڑھا دی گئی۔

کھال ایسی تھی جیسے تنور سے نکال کر چڑھائی گئی ہو۔ گرمی سے سہیل کا برا حال ہو گیا۔ "اس میں تو بہت گرمی ہے منیجر صاحب۔" اس نے منیجر سے شکایت کی۔

"ارے بابا۔ اس میں اے سی تو نہیں لگ سکتا نا۔" منیجر برا سا منہ بنا کر بولا۔ "اب تم جاؤ گیٹ پر جا کر کھڑے ہو جاؤ۔" سہیل ریسٹورنٹ کے گیٹ پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ اب وہ ایک جانور کی نگاہوں سے اس دنیا کو دیکھ رہا تھا۔ لوگ اسے دیکھ کر خوش ہوتے خوفزدہ ہوتے۔ بچے سہم کر ماؤں سے لپٹ جاتے۔ وہ اچھل کود کرتا رہتا۔ اس نے اپنی طرف سے اس ایکٹ میں کچھ تبدیلیاں بھی کی تھیں۔ جیسے اسٹول پر بیٹھنا، کولڈ ڈرنک پینا، بسکٹ کھانا اور سگریٹ پینا۔ وہ کسی تربیت یافتہ بڑے بندر کی حرکتیں کر رہا تھا۔ اس کی وجہ سے ریسٹورنٹ والوں کے مزے آ گئے۔ گاہکوں کی لائن لگ گئی۔ سہیل دل کھول کر حماقتیں کر رہا تھا۔ اس نے اپنے ایک جاننے والے کو بھی دیکھا جو بڑی دلچسپی سے بندر کے اس تماشے کو دیکھ رہا تھا۔

اسے اب کسی کی پروا نہیں تھی کیونکہ اسے پہچاننے والا ہی کوئی نہیں تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کھال کے اندر ایک بے روزگار نوجوان اچھل کود کر رہا ہے۔

ٹھیک بارہ بجے اس کی ڈیوٹی ختم ہو گئی تو ہوٹل والے اسے اندر لے آئے۔ اس نے اپنی کھال اتار دی۔ اپنے کپڑے پہنے اور وہ بہترین کھانے کھا کر پانچ سو روپے جیب میں رکھ کر گھر واپس آ گیا۔ ہوٹل والے اس کی پرفارمنس سے بہت مطمئن تھے۔

ایک شام خود حامد اس کا تماشا دیکھنے اس کے پاس آن کھڑا ہوا۔ وہ اپنے ساتھ اپنی بہن کو بھی لے آیا تھا جو بہت خوبصورت اور تیکھے نقوش والی لڑکی تھی۔

وہ دونوں زور زور سے ہنس رہے تھے۔ سہیل کو ان کی بہن روزینہ بہت اچھی لگی۔ اس نے بندر کے روپ میں اسے کئی سلام بھی کر دیے جس کی وہ انسان کے روپ میں کبھی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ روزینہ کو بہت پسند کرتا تھا

لیکن دل کی بات اس نے دل ہی میں رکھی تھی کیونکہ وہ حامد کی بہن بھی جو اس کا سب سے قریبی دوست تھا۔ اس رات گھر واپس آنے کے بعد وہ بہت دیر تک روزینہ ہی کے بارے میں سوچتا رہا۔

دوسری صبح وہ خود ہی حامد کے گھر پہنچ گیا۔ روزینہ گھر پر تھی جبکہ حامد سودا لینے گیا ہوا تھا۔ روزینہ نے معمول کے مطابق اس کا استقبال کیا۔ وہ سہیل کو اچھی طرح جانتی تھی۔ روزینہ نے خود ہی ذکر کیا۔ "سہیل صاحب، کل میں اور حامد بھائی بندر کا تماشا دیکھنے گئے تھے۔"

"اچھا۔" سہیل مسکرا دیا۔ "کس بندر کا؟"

"یہ لیں..... آپ کو تو معلوم ہی نہیں ہے۔ وہ جو بلیو مون ریستوران ہے۔ ان لوگوں نے کہیں سے ایک بندر حاصل کیا ہے۔ بہت بڑا ہے گوریلا سمجھ لیں۔ مزے مزے کی حرکتیں کرتا ہے۔ آپ بھی جا کر دیکھیں۔" اس وقت سہیل کو پتا چلا کہ حامد نے اس بندر کا راز اپنی بہن کو نہیں بتایا ہے۔ اس نے سوچا کہ وہ بتا دے کہ وہ بندر خود وہی تھا لیکن مصلحت کے خلاف ہوتا۔ اس نے روزینہ سے محبت کرنے کا فیصلہ کر لیا اور کوئی لڑکی کسی بندر سے محبت کرنا کبھی پسند نہیں کرتی۔ ویسے بھی یہ شرم کی بات تھی کہ جب نوکری نہیں ملی تو بندر بن گئے۔

حامد سبزیاں لے کر واپس آ گیا۔ اس نے سہیل کو گلے لگا لیا..... "واہ میرے یار، تو نے تو کمال کر دیا۔ کوئی بندر بھی اتنا شاندار بندر نہیں بن سکتا۔"

"ہاں میں نے کل تمہیں اور روزینہ کو دیکھا تھا۔" سہیل نے کہا۔ "تم نے روزینہ کو تو نہیں بتایا۔"

"نہیں بھائی۔ اسے کیسے بتا سکتا ہوں کہ تم بندر بن گئے ہو۔" حامد نے کہا۔ "یہ تو ہم دونوں کی عزت کا سوال ہے۔"

"تمہارا شکریہ۔"

"روزینہ تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہو رہی تھی۔ میرا مطلب ہے کہ بندر کو دیکھ کر۔ اسے بندر شروع سے اچھے لگتے ہیں۔"

"اور انسانوں کے بارے میں کیا خیال ہے اس کا؟"

"انسانوں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" حامد نے کہا۔ روزینہ اس دوران میں چائے لے کر آ گئی۔ چائے رکھ کر وہ اندر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد حامد نے کہا۔ "یار! میں اس کے رشتے کے لیے بہت پریشان ہو رہا

خواب

خواب کیسے آتے ہیں؟ ایک ایسا سوال ہے جس کا آج تک کوئی قطعی جواب سامنے نہیں آیا۔ بہرحال ان تمام نظریات میں سے بعض ایسے ہیں، جو عقل سے قریب تر ہیں۔ ان میں سے ایک نظریہ یہ ہے کہ انسان کے ذہن کی تین حالتیں ہیں۔ ایک شعوری، جو جاگنے کی حالت میں ہوتی ہے۔ دوسری لاشعوری، جو کبھی بھی سامنے نہیں آتی اور ایک تیسری حالت تحت الشعور کی ہے، وہ یہ حالت ہے جس کے اندر انسان کے جذبات، احساسات اور خیالات راکھ میں چنگاری کی طرح دبے رہتے ہیں اور رات کو جب وہ سوتا ہے تو خوابوں کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ تحقیق کے مطابق خواب کی حالت میں انسان ایک مخصوص کیفیت سے دوچار ہوتا ہے۔ اس کی آنکھیں تیزی سے حرکت کرنے لگتی ہیں اور دماغ کا ایک خاص حصہ جاگ جاتا ہے۔ نیند کی اس کیفیت کو نفسیات دانوں نے Rem.sleep کا نام دیا ہے، ہماری نیند کے تمام عرصے میں یہ کیفیت تقریباً ہر نوے منٹ کے بعد آتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق 10 سے 60 سال تک کی عمر کے لوگوں میں ان کی پوری نیند کا ایک چوتھائی حصہ Rem.sleep کی حالت میں ہو یا بعض ادویات کے استعمال سے یہ عرصہ کم کر دیا جائے تو نارمل حالت میں آتے ہی وہ اس کمی کو ضرور پورا کرے گا۔ مشہور ماہر نفسیات اور فلسفی فرائیڈ کے نظریے کے تحت خواب ہماری ان خواہشات کا اظہار ہوتے ہیں۔ جنہیں ہم جاگنے کی حالت میں زبردستی یا لاشعوری طور پر دبائے رکھتے ہیں۔ لیکن یہ محض خوابوں کی وجہ سے ہے۔

اللہ کے آخری نبیؐ کے ایک فرمان کے مطابق خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے خوشخبری بھی ہوتے ہیں، ایسے خواب سچے ہوتے ہیں۔ خود نبیوں کو بھی خواب آتے تھے جو بالکل سچے ہوتے تھے۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ خواب انسان کی پریشانیوں کا اظہار بھی ہوتے ہیں اور ان کی نیکیوں کی جزا بھی، یہی خواب اچھے خواب ہوتے ہیں......

مرسلہ: احسان سحر، میانوالی

ہوں۔ تم تو جانتے ہو کہ باپ کا سایہ نہیں ہے۔ صرف ماں ہے۔ وہ بے چاری کہاں تک تلاش کرے گی۔"

"کیا ابھی تک کوئی رشتہ نہیں آیا؟"

"آیا ہے یار، ابھی حال ہی میں ایک رشتہ آیا ہے۔" حامد نے بتایا۔ "میں تو اس لڑکے کو دیکھ چکا ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک نظر تم بھی دیکھ لو۔"

"کیسا لڑکا ہے؟"

"بس تمہاری طرح ہی ہے۔" حامد نے کہا۔ "مجھے شروع سے تم جیسے نوجوان پسند آتے ہیں...... لاابالی اور نرم مزاج کے۔"

سہیل نے سوچا کہ خدا کے بندے جب تجھے مجھ جیسا بندہ پسند ہے تو پھر خود میں ہی کیوں نہیں تیرے دھیان میں آرہا ہوں لیکن وہ یہ بات کہہ نہیں سکا۔

اس دوران میں حامد نے ایک کاغذ پر اس لڑکے کا نام پتا اور فون نمبر لکھ کر دے دیا۔ "اس سے ضرور ملنا۔"

"کس وقت ملوں۔ شام کے وقت تو میں بندر بنا رہتا ہوں۔"

"میں نے اس کے دفتر کا پتا بھی لکھ کر دے دیا ہے۔ دن کے وقت چلے جانا۔"

اس شام سہیل بہت بجھا بجھا سا تھا۔ ڈیوٹی کے دوران بھی اس سے انسانوں جیسی حرکتیں سرزد ہوتی رہیں یعنی چپ چاپ رہنا، اداسی سے ایک طرف بیٹھ جانا اور ناکام عاشق کی طرح آہیں بھرنا۔ منیجر کو اس کی یہ حرکتیں پسند نہیں آئیں۔ ڈیوٹی ختم ہوجانے کے بعد اس نے کہا۔ "دیکھو بھائی، ہم نے تمہیں انسان بننے کے لیے نہیں بندر بننے کے لیے جاب دی ہے۔ آج تو تم دیوداس بنے بیٹھے تھے۔"

"منیجر صاحب، میں بھی انسان ہوں۔ کبھی کچھ پریشانیاں گھیر لیتی ہیں۔"

"یہی تو مسئلہ ہے انسان کے ساتھ کہ وہ پریشانیوں میں گھرا رہتا ہے۔ جانوروں کے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ تم نے کبھی کسی جانور کو بجلی کے بل بھرتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا یا وہ مکان کے کرایے کے لیے پریشان رہتا ہو۔ اس کے لیے جعلی پولیس مقابلہ بھی نہیں ہوتا۔"

"ٹھیک کہتے ہیں منیجر صاحب۔ آج کا جانور زیادہ فائدے میں ہے۔"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ تمہیں انسان نہیں بندر بننا چاہیے۔ کم از کم پانچ بجے شام سے رات بارہ بجے تک۔ اس کے بعد چاہے انسان رہو یا نہ رہو۔ ہوٹل کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

اس رات اس سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔ دوسری صبح اسے حامد کا بتایا ہوا کام یاد آگیا۔ اس لڑکے کو دیکھنے کے لیے جانا تھا۔ اس لڑکے کا نام ذیشان تھا۔ ایک خستہ بلڈنگ کی چھٹی منزل پر کلیرنگ فارورڈنگ کا کوئی آفس تھا۔ ذیشان اس میں کام کرتا تھا۔ زینوں کے پاس ایک لفٹ بھی تھی۔ لفٹ میں داخل ہوکر اس نے چھٹی منزل کا بٹن دبایا اور وہ لفٹ چھٹی منزل پر پھنس گئی۔ سہیل کو لفٹ سے عام طور پر وحشت ہوتی تھی۔ عام طور پر وہ زینے ہی استعمال کرتا تھا۔ اس دن نہ جانے کیوں اس نے لفٹ استعمال کرلی تھی اور لفٹ میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ اس نے گھبرا کر زور زور سے دروازے پر ہاتھ مارنا شروع کردیے۔ ایمرجنسی بٹن دبائے۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر شور مچانے لگا۔ لفٹ کے اندر کی ہوا بھی آہستہ آہستہ کم ہوتی جارہی تھی۔ کچھ دیر بعد باہر سے کسی نے آواز لگائی۔ "کیا لفٹ میں پھنس گئے ہو؟"

"ہاں، بھئی خدا کے لیے جلدی نکالو۔"

"خاموش۔" باہر سے کچھ کھٹ پٹ کی آوازیں آنے لگیں اور فرنٹ کا دروازہ کسی طرح کھول لیا گیا۔ باہر آتے وقت اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں اور پورا جسم پسینے پسینے ہورہا تھا۔ کچھ لوگوں نے سہارا دے کر اسے ایک طرف بٹھادیا۔ بہت دیر بعد اس کے اوسان بحال ہوئے تو اس نے اپنے قریب کھڑے ہوئے ایک آدمی سے پوچھا۔

"بھائی مجھے ذیشان صاحب سے ملنا ہے۔"

"جی فرمائیں، ذیشان میں ہی ہوں۔" اسی آدمی نے بتایا جس نے اسے سہارا دے کر لفٹ سے باہر نکالا تھا۔

"میں حامد کا دوست ہوں۔" سہیل نے بتایا۔

"اوہ...... حامد صاحب کا۔" ذیشان مسکرا دیا۔ "آئیں میرے ساتھ آجائیں۔" وہ اسے اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے آیا۔ حامد کے بیان کے مطابق وہ واقعی ایک خوش اخلاق اور نفیس کچھ قسم کا انسان تھا۔ "تو آپ حامد صاحب کے دوست ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"شاید آپ کو یہ بھی معلوم ہو کہ آپ کو میرے پاس کیوں بھیجا گیا ہے۔"

"جی ہاں، آپ کو پسند کرنے کے لیے۔"

"لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ میرے لیے ناپسندیدگی بیان کردیں۔" ذیشان نے کہا۔ "روزینہ بہت اچھی لڑکی

ہے۔ اس لیے میں اس سے شادی نہیں کرسکتا۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ جب وہ اچھی ہے تو اس سے شادی کرلو۔"

"نہیں...... یہ نہیں ہوسکتا۔" اس نے کہا۔ "میں ایک بیمار انسان ہوں...... کینسر کا مریض۔"

"کیا......" سہیل اچھل پڑا تھا۔ "تمہیں کینسر ہے؟"

"ہاں۔" اس کی آواز غمگین ہوگئی۔ "اب کیا بتاؤں۔ ویسے تو میں صحت مند دکھائی دے رہا ہوں لیکن اندر سے بہت کمزور انسان ہوں اور کوئی ایسی بیماری نہیں ہے جس سے یہ شادی رک جائے۔ اس لیے خود کو کینسر کا مریض کہتا ہوں۔"

"خدا کے بندے۔ یہ تم کیا الٹی سیدھی باتیں کرنے لگے۔"

"دیکھو بھائی، کہانی کچھ یوں ہے کہ حامد کے والد نے کسی زمانے میں میرے والد کو قرض دیا تھا...... حامد کے والد تو چل بسے۔ میرے والد زندہ ہیں۔ اسی لیے انہوں نے مجھ پر زور دینا شروع کیا ہے کہ میں حامد کی بہن سے شادی کرلوں تاکہ قرض کا چکر ختم ہوجائے۔"

"سمجھ گیا اور تم شادی نہیں کرنا چاہتے۔"

"ہاں، اس لیے میں خود کو کینسر کا مریض ظاہر کررہا ہوں۔" ذیشان نے کہا۔ "تم حامد سے جاکر یہ کہہ سکتے ہو۔"

"اے شریف نوجوان، کیا تم کسی اور سے محبت کرتے ہو اس لیے حامد کی بہن سے شادی نہیں کررہے؟"

"ہاں بھائی، یہی بات ہے۔"

"اور وہ لڑکی کون ہے جس سے تم محبت کرتے ہو؟"

"حامد کی بہن روزینہ۔" ذیشان نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

"کیا" اس بار سہیل کرسی سے گرتے گرتے بچا۔ "تم اس سے محبت کرتے ہو اور اسی سے شادی نہیں کرنا چاہتے۔ تمہاری یہ منطق سمجھ میں نہیں آئی۔"

"بہت آسان منطق ہے بھائی۔ ہم دونوں نے یہ قسم کھائی ہے کہ ہم عام روٹین کے تحت شادی نہیں کریں گے یعنی یہ نہیں ہوگا کہ رشتہ آیا، قبول ہوا، تاریخ طے ہوئی اور شادی ہوگئی۔ ایسی شادیاں تو ہوتی رہتی ہیں۔ اس میں کیا خاص بات ہے۔"

"تو کیا تم اسے لٹک کر شادی کرنا چاہتے ہو؟"

"نہیں، گھر سے بھاگ کر۔ کورٹ میرج۔"

"خدا کے بندے۔ جب سیدھے سادے انداز میں شادی ہورہی ہے تو پھر کورٹ میرج کی کیا ضرورت ہے؟"

"یہی تو مسئلہ ہے جو میں روزینہ کو سمجھا سمجھا کر تھک چکا ہوں۔" اس نے کہا۔ "اس کے سر پر انڈین فلموں کا بھوت سوار ہے۔ وہ اسی طرح کی حرکت کرنا چاہتی ہے جو جوہی چاؤلہ نے کی تھی۔ اس نے مجھے کورٹ میرج کے درجنوں فوائد بتائے ہیں اور اب میں بھی وہی چاہتا ہوں جو اس کی خواہش ہے۔ اسی لیے آپ سے کہہ رہا ہوں کہ آپ حامد سے جاکر یہ کہہ دیں کہ لڑکا کینسر کا مریض ہے۔ یہ کہنے سے باقاعدہ شادی کی ضد ختم ہوجائے گی۔ بعد میں ہم دونوں بھاگ کر کورٹ میرج کرلیں گے۔"

"اے شریف نوجوان، تمہاری ان بے تکی باتوں سے میرا سر چکرا کر رہ گیا ہے۔" سہیل نے کہا۔ "میں نے ایسی بات پہلے کبھی نہیں سنی۔ تم جو کچھ بھی کہہ رہے ہو وہ سوائے حماقت کے اور کچھ نہیں ہے۔ خود سوچو...... تمہاری کورٹ میرج کے بعد کیا یہ بھید نہیں کھلے گا کہ تم کینسر کے مریض ور یض نہیں ہو؟"

"کھلنے دیں۔ اس وقت تک ہم ایک ہوچکے ہوں گے۔" ذیشان مسکرا کر بولا۔ "پھر کون پوچھتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں حامد سے یہی کہہ دیتا ہوں۔"

سہیل نے اس بار لفٹ استعمال نہیں کی۔ ذرا سی دیر میں وہ چکرا کر رہ گیا۔ ایسی الٹی سیدھی باتیں اس نے پہلے کبھی نہیں سنی ہوں گی۔ اپنے گھر جانے سے پہلے وہ حامد کے پاس آگیا۔ "یار، میں تمہارے ذیشان سے مل کر آرہا ہوں۔ لڑکا تو اچھا ہے لیکن جو کچھ اس نے بتایا۔ وہ حیرت انگیز ہے۔ اس نے کہا ہے کہ میں تم سے یہ کہہ دوں کہ وہ کینسر کا مریض ہے۔"

"ارے چھوڑو کینسر کو۔ یہ بتاؤ لڑکا کیسا ہے؟"

"کمال کے آدمی ہو۔ کہہ رہا ہوں کہ ویسے بہت اچھا ہے لیکن باقاعدہ شادی نہیں کرے گا۔ گھما پھرا کر یعنی کورٹ میرج کرے گا۔"

"میں نے کہا نا کہ تم جہنم میں ڈالو کورٹ میرج کو۔ یہ بتاؤ وہ ہے کیسا؟"

"ابے تم پاگل تو نہیں ہوگئے؟" سہیل نے اپنے بال نوچ لیے۔ "کیا رٹ لگا رکھی ہے اور یہ بھی سن لو کہ اسے کورٹ میرج کا مشورہ تمہاری بہن نے دیا ہے۔"

"تم پھر ان باتوں میں پڑ گئے۔ تم تو صرف یہ بتاؤ کہ وہ کیسا ہے؟"

"جہنم میں گئے سب کے سب۔" سہیل چیخنے لگا۔

تمہیں پاس بٹھا رکھا ہے۔ دس دفعہ بتا چکا ہوں پھر بھی بلاوجہ اس کیے جارہے ہو۔"

"یار ناراض کیوں ہوتے ہو۔" حامد نے کہا۔ "اصل بات یہ ہے کہ کورٹ میرج سے شادی کا مشورہ میں نے ہی روزینہ کو دیا تھا اور وہ اس کے کہنے پر کورٹ میرج کررہا ہے۔"

"لیکن کیوں؟"

"یار سمجھا کرو۔ یہ ہے بغیر جہیز کے شادی کا آسان طریقہ۔ مجھے روزینہ کو جہیز میں کچھ نہیں دینا پڑے گا۔ اب بتاؤ.....اب کیا کہتے ہو؟"

"صرف ایک بات۔"

"وہ کیا......؟"

"بٹ کے رہے گا ہندوستان اور لے کے رہیں گے پاکستان۔" سہیل حامد کو حیران چھوڑ کر اپنے فلیٹ میں واپس آگیا۔ اب اس کا دل اچاٹ ہونے لگا۔ زندگی میں پہلی بار کوئی لڑکی پسند بھی آئی تو اس کے ساتھ عجیب کہانی وابستہ تھی۔

اس شام جب وہ اپنی ڈیوٹی پر ہوٹل پہنچا تو منیجر نے اس سے کہا۔ "مبارک ہو۔ تمہاری ترقی ہوگئی ہے۔"

"کیا مطلب۔ کیا اب مجھے ہاتھی کی کھال پہناؤ گے؟"

"ارے نہیں بابا! تمہیں چڑیا گھر والوں نے پسند کرلیا ہے۔" منیجر نے بتایا۔

"چڑیا گھر والوں نے؟"

"ہاں' ہزار روپے روز دیں گے۔ ان کے پاس تمہارے سائز کا کوئی بندر نہیں ہے۔ تم کو خاص پنجرے میں رکھا جائے گا۔"

"ابے او منیجر کی اولاد۔ میں انسان ہوں۔ دل بہلانے والا بندر نہیں ہوں۔"

"بے وقوف انسان۔ تم یہاں بھی تو دل بہلاتے ہو۔ اب چڑیا گھر چلے جاؤ گے۔ کھانا پینا الگ اور رہنے کے لیے الگ پنجرہ۔ اس کے علاوہ ہزار روپے روز۔"

"کیا میری یہی حیثیت رہ گئی ہے؟" سہیل بہت دکھ سے بولا۔

"یہ تو بہت زیادہ حیثیت ہے۔ ورنہ ہزار روپے روز آج کل کس کو ملتے ہیں۔ بڑے بڑے جوتیاں چٹخا رہے ہیں۔ تمہارے تو مزے آجائیں گے۔"

"اور کھال کون سی ہوگی؟"

"جو تم نے پہن رکھی ہے۔ اس کا سودا پچاس ہزار میں ہوگیا ہے۔" منیجر نے کہا۔ "اب تمہاری مرضی ہے۔ اگر بولو تو منع کردیں؟"

"نہیں منع مت کرو۔ میں تیار ہوں۔"

"مبارک ہو۔ ترقی اسی کو کہتے ہیں۔ پندرہ ہزار سے ایک دم تیس ہزار۔"

سہیل کو ایک پنجرے میں بند کر کے چڑیا گھر لے جایا گیا۔ راستے میں لوگ اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہورہے تھے۔ دو چار بچوں نے اسے پتھر بھی مارے۔ اس وقت اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔

چڑیا گھر میں اسے پنجرے سے اتار کر ڈائریکٹر کے سامنے پہنچا دیا گیا جو اسے مسکرا کر دیکھے جارہا تھا۔ "خوش قسمت ہو نوجوان کہ تمہیں ایک ڈھنگ کی ملازمت مل گئی ہے۔"

"آپ اسے ڈھنگ کی ملازمت کہتے ہیں۔" سہیل جھنجلایا۔ "مجھے تو خود پر رونا آرہا ہے۔ میں نے ایم اے کررکھا ہے اور مجھے نوکری کیا ملی ہے۔"

"صرف ایم اے۔" ڈائریکٹر ہنس پڑا۔ "ہیلو... میں تمہیں اس شخص سے ملواؤں جو فرسٹ کلاس سول انجینئر ہے اور وہ یہاں کیا کررہا ہے۔ وہ یہاں بھالو کی کھال میں ہے۔" ڈائریکٹر نے بتایا۔ "اب بتاؤ... کیا کہتے ہو؟"

"اب تو صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ بٹ کے رہے گا ہندوستان اور لے کے رہیں گے پاکستان۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"یہ آپ نہیں سمجھیں گے۔ آپ جلدی سے میرے کپڑے بھجوا دیں۔ میں انسانوں کی صورت نہیں دیکھ سکتا۔" سہیل کو گوریلے والے اسپیشل کپڑوں میں پہنچا دیا گیا۔

اس وقت وہاں بہت سے دیکھنے والے بھی تھے جو اسے دیکھ کر زور زور سے تالیاں بجانے لگے۔ پنجرے میں ایک بڑا سا جھولا بھی تھا۔ اسے جھولے پر بیٹھ کر اپنے کھیل دکھانے تھے تاکہ آنے والے خوش ہوکر جائیں اور چڑیا گھر کی تعریف ہو کہ انہوں نے ایسا نایاب گوریلا حاصل کرلیا ہے۔

یہ بہت سخت ڈیوٹی تھی۔ صبح دس بجے شروع ہوتی اور مغرب تک جاری رہتی۔ اندھیرا ہونے کے بعد وہ اپنی کھال اتار کر پنجرے سے باہر آجاتا۔

ادھر ادھر کی سیر کرتا۔ پرانے دوستوں سے ملتا۔ حامد کے پاس چلا جاتا اور کسی ہوٹل میں رات کا کھانا کھا کر چڑیا

گھر واپس آجاتا۔

اس کی کارکردگی یہاں بھی بے مثال رہی۔ اسے دیکھ کر احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ انسان ہے بلکہ اب تو وہ خود کو ایک بندر ہی سمجھنے لگا تھا۔

ایک ہفتے بعد ڈائریکٹر نے چپکے سے اسے اپنے دفتر میں طلب کرلیا۔ "نوجوان، تمہاری قسمت تو بہت زوروں پر جارہی ہے۔"

"وہ کیوں جناب؟"

"کل ایک وزیر صاحب کی فیملی چڑیا گھر کی سیر کے لیے آئی تھی۔ وہ تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی ہے اور تمہیں اپنی کوٹھی میں رکھنا چاہتی ہے۔"

"کیا اس فیملی کو یہ نہیں معلوم کہ میں ایک انسان ہوں؟"

"معلوم ہے۔ میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔" ڈائریکٹر نے کہا۔ "اس کے باوجود وہ تمہیں لے جانا چاہتے ہیں۔ تنخواہ پچاس ہزار دیں گے۔ خود سوچو ہر مہینے پچاس ہزار۔ میں بوڑھا ہوگیا ہوں۔ ورنہ میں خود کھال اوڑھ کر تمہاری جگہ چلا جاتا۔ اس ملک میں پچاس ہزار کہاں ملتے ہیں۔"

"اور آپ کا چڑیا گھر جو خالی ہوجائے گا؟"

"اس کی فکر مت کرو۔ تمہاری جگہ دو چار اور جنگل بندر لا کر رکھ دیے جائیں گے۔ ویسے تم چلے جاؤ تو یہ مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا۔"

"کیوں.. آپ پر کیوں احسان ہوگا؟"

"وہ میرے بیٹے کی ترقی کا معاملہ ہے۔ فائل اس وزیر کے پاس ہے۔ ہم سب ایک دوسرے کو خوش کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ وزیر کی فیملی مجھ سے خوش ہوگی۔ وزیر میرے بیٹے کو ترقی دے گا۔"

"اور میری خوشی کا کیا ہوگا؟"

"کیا تمہاری خوشی کے لیے یہ کم ہے کہ تمہیں پچاس ہزار روپے ملیں گے۔" ڈائریکٹر نے کہا۔ "ویسے اب تم وہ ہندوستان اور پاکستان والا نعرہ نہیں لگاتا۔"

"نہیں...... میں نہیں لگاؤں گا۔ آپ مجھے وزیر صاحب کے یہاں بھیج دیں۔"

سہیل کا پنجرہ جس وقت وزیر صاحب کی کوٹھی کے احاطے میں اتارا گیا اس وقت وہاں بہت سے اخبار اور چینل کے نمائندے بھی تھے۔ وزیر صاحب نے اپنے کئی دوستوں اور ان کے گھر والوں کو مدعو کررکھا تھا۔

اجلی وردیوں میں ملبوس بیرے ادھر سے ادھر دوڑتے پھر رہے تھے۔ ہر طرف سے طرح طرح کے کھانوں کی خوشبوئیں آرہی تھیں جبکہ سہیل کے پنجرے میں کیلوں اور مونگ پھلی کا انبار لگا ہوا تھا۔ وزیر صاحب کے اشارے پر اس نے کیلے کھا کر دکھائے۔ دو بوتلیں کھول کر پی لیں۔ اور سگریٹ پی کر دکھایا، لوگ تالیاں بجاتے رہے۔

بے شمار تصویریں کھینچی گئیں۔ چینل والوں نے اس کی وڈیو بنائی۔ ہر وڈیو میں وزیر صاحب بھی شامل تھے۔

اس موقع پر وزیر صاحب کی تقریر بھی بہت دلچسپ تھی۔ انہوں نے فرمایا۔ "میرے بھائیو اور بہنو! جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہمارا ملک ہماری پالیسیوں کی وجہ سے ترقی کررہا ہے۔ اس ترقی کا اثر جانوروں پر بھی ہورہا ہے (تالیاں) آپ خود دیکھ لیں کہ ہماری پالیسیوں کی وجہ سے یہ جانور کتنا خوش حال ہے۔ (تالیاں) جبکہ اپوزیشن ہمارے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ہم صرف کرپشن میں ترقی کررہے ہیں۔ میرے بھائیو، یہ ایک غلط الزام ہے۔ اب انہیں کوئی سمجھائے کہ ترقی ترقی ہوتی ہے۔ جیسے ڈگری ڈگری ہوتی ہے۔ (تالیاں) میں تو کہتا ہوں کہ پوری دنیا کو آکر اس جانور کو دیکھنا چاہیے اور یہ جان لینا چاہیے کہ ہمارے یہاں کا جانور بھی ہماری پالیسیوں کی وجہ سے ترقی کررہا ہے۔"

خوب تالیاں بجیں۔ اس کے بعد کھانا شروع ہوا۔ بچے اپنی اپنی پلیٹیں لے کر اس کے پنجرے کے پاس آگئے۔ ایک بچے نے قریب کھڑی ہوئی اپنی ماں سے پوچھا۔ "ماما، بندر کو بروسٹ دے دوں؟"

"نہیں بیٹا۔ یہ بے چارہ یہ سب نہیں کھاتا۔ یہ صرف کیلے کھاتا ہے۔" بھوک سے سہیل کی حالت بری ہورہی تھی۔ کیلے کھا کھا کر اس کا دماغ الٹا جارہا تھا۔ آخر کب تک کیلے کھاتا رہتا۔ اس کے علاوہ اسے کرتب بھی دکھانے پڑ رہے تھے۔

مہمانوں کا ہنگامہ رات گئے تک جاری رہا۔ پھر رات کے وقت اس کے پنجرے کو ایک بڑے سے ہال میں پہنچا دیا گیا۔ اس ہال میں ہر طرف قالین بچھے ہوئے تھے جس پر سفید چاندنیاں تھیں۔ ایک طرف دیواروں کے ساتھ گاؤ تکیے بھی لگے ہوئے تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ سازندے بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر سہیل کو پتا چلا کہ اس کے آنے کی خوشی میں مجرے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس مجرے

میں ملک کی مشہور فلمی اداکارائیں حصہ لے رہی تھیں۔ سہیل کو بندر ہونے کے باوجود بڑا مزہ آرہا تھا۔ وہ حسینائیں جنہیں وہ صرف پردے پر دیکھ سکتا تھا، اس کے سامنے ڈانس کررہی تھیں اور ڈانس بھی ایسا کہ بندر ہونے کے باوجود سہیل پسینے پسینے ہونے لگا۔ ہال میں بیٹھے ہوئے لوگ بڑے سرکاری افسران تھے۔ صرف رقص ہی نہیں ہورہا تھا بلکہ شراب اور کباب کا دور بھی چل رہا تھا۔

رات گئے تک یہ محفل جاری رہی۔ دوسری صبح سہیل کے پنجرے کو ایک اور بڑے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ یہ ملاقاتیوں کا کمرا تھا اور غنیمت یہ تھا کہ اس کمرے میں اسپلٹ لگے ہوئے تھے۔ اس لیے سہیل کے لیے کھال کی گرمی برداشت کے قابل ہورہی تھی۔

صبح دس بجے کے قریب چند عالموں کا گروپ وزیر صاحب سے ملنے کے لیے آیا۔ وزیر صاحب نے اس موقع پر بہت ہی درد بھرے لہجے میں فرمایا۔ ''سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم فرقہ وارانہ فسادات کیوں کررہے ہیں۔ پیدا کرنے والے نے تو سب کو ایک بنایا ہے۔''

تقریر وہ صاحب کررہے تھے جو رات بھر مجرا دیکھتے رہے تھے اور شراب پی کر اتنے مدہوش ہوگئے تھے کہ انہیں سہارا دے کر مجرے والے کمرے سے باہر لے جایا گیا تھا۔

سہیل سے اس وقت برداشت نہیں ہوسکا۔ اس نے زور سے نعرہ لگایا۔ ''بٹ کے رہے گا ہندوستان۔ لے کے رہیں گے پاکستان۔''

اس نعرے کو سن کر علما کا وفد گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔ ان سب کی سٹی گم ہوگئی۔ ''یہ...... یہ کیا چکر ہے...... یہ نعرہ کس نے لگایا؟''

''اس بندر نے۔'' وزیر صاحب نے سہیل کی طرف اشارہ کردیا۔

''یہ انسانوں کی طرح بولتا ہے؟''

''بولتا نہیں ہے۔ صرف یہ نعرہ لگاتا ہے۔'' وزیر صاحب نے فرمایا۔ ''اس کی اسی کرامت کو دیکھ کر تو میں اسے اپنے پاس لے آیا ہوں۔ یہ کہیں اور رہتا تو اس کی قدر نہیں ہوتی۔ میں اسے اپنے بچوں کی طرح رکھتا ہوں۔ مجھے اس سے بہت پیار ہے اور ویسے بھی یہ ایک اچھی نسل کا بندر ہے۔''

''سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔'' ایک صاحب نے آگے بڑھ کر وزیر صاحب کا ہاتھ چوم لیا۔ ''جناب عالی آپ ہی کی طرح آپ کا بندر بھی اعلیٰ خاندان سے معلوم ہوتا ہے۔''

وزیر صاحب جزبز ہوکر رہ گئے۔ خدا جانے یہ ان کی تعریف تھی یا توہین کی جارہی تھی۔

وفد کے جانے کے بعد وزیر صاحب سہیل کے پاس آکر کھڑے ہوگئے۔ ''بے وقوف، تم نے یہ کیا کیا۔ تمہیں نعرے لگانے کی کیا ضرورت تھی؟''

''جناب عالی، یہ تو دیکھیں کہ میرے نعرے کی وجہ سے آپ کی کتنی عزت ہوئی ہے۔''

''یہ تو ہے۔'' وزیر نے گردن ہلائی۔ ''لیکن اس کے علاوہ کچھ اور مت بولنا اور نعرے بھی اس وقت لگانا جب میں اشارہ کروں اور دوسری بات یہ ہے کہ کیا تم کوئی اور نعرہ نہیں لگا سکتے؟''

نہیں جناب، جانور بن جانے کے بعد میری آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں۔ اس لحاظ سے سب سے بہتر نعرہ یہی ہے کہ بٹ کے رہے گا ہندوستان اور لے کے رہیں گے پاکستان۔''

''اس نعرے کا مطلب کیا ہے؟''

''اس کا مطلب نہ پوچھیں۔''

''خیر یہ تمہارا اپنا معاملہ ہے۔'' وزیر صاحب نے کہا۔ ''اب تم آرام کرو۔ کل تمہیں منسٹر صاحب کے پاس لے جایا جائے گا۔ انہوں نے تمہیں دیکھنے کی خواہش کی ہے۔''

''اب تو میں جانور ہوں۔ جہاں جی چاہے لے جائیں۔''

دوسری صبح سہیل کے پنجرے کو منسٹر ہاؤس پہنچا دیا گیا۔ یہاں بھی سہیل نے اپنی حرکتوں سے منسٹر کا دل خوش کردیا۔ انہوں نے وزیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب تم اس بندر کو میرے پاس رہنے دو۔''

''جی سر، میں تو یہی سوچ کر اسے آپ کے پاس لایا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ یہ آپ کو بہت پسند آئے گا۔''

''ہاں، اچھا لگا ہے مجھے۔''

''سر، میں نے آپ سے گزارش کی تھی کہ آپ میرا محکمہ بدل دیں۔ میں آج کل جس محکمے کا وزیر ہوں، اس میں مزہ نہیں آرہا ہے۔''

''سمجھ گیا۔'' منسٹر صاحب ہنس دیے۔ ''بہت شیطان ہو تم۔ موقع سے فائدہ اٹھالیا۔ چلو کل ہی آرڈر جاری ہوجائے گا۔'' سہیل اب منسٹر ہاؤس میں تھا۔

اس سے پہلے یعنی جب وہ انسان تھا، اس شاندار

عمارت کو دور سے دیکھتے ہوئے گزرتا تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک دن وہ خود اس شاندار عمارت میں رہنے لگے گا۔

ایسی عظیم الشان ترقی وہ انسان ہوتے ہوئے کبھی کر بھی نہیں سکتا تھا۔ یہاں بھی اس کا پنجرہ اس بڑے کمرے میں رکھا گیا جہاں ملاقاتی آتے تھے۔

سہیل کو پہلی مرتبہ ایسے لوگوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔ بڑے بڑے وزیر سیاست دان، سوشل ورکرز، مختلف ملکوں کے سفیر، بیوروکریٹس اور نہ جانے کون کون۔ وہ سب مختلف مسائل لے کر آتے تھے۔

ایک بار ایک مشہور وزیر منسٹر کے پاس آکر منہ بسور نے لگا۔ ''سر جی، مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی ہے۔''

''ایسی کون سی غلطی ہوگئی؟''

''سر جی، میں نے ایم اے پہلے کرلیا۔ میٹرک بعد میں کیا ہے۔''

''تو اس سے کیا ہوا؟''

''سر جی، یہ ٹیکنیکل غلطی ہے۔ پہلے میٹرک ہوتا ہے، پھر انٹر اور بی اے۔ اس کے بعد ایم اے۔ بس ڈگریاں بنانے کے جوش میں یاد ہی نہیں رہا۔''

''تم لوگ کیوں ہمیں بدنام کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ ذرا سوچ سمجھ کر ایسی حرکتیں کیا کرو۔''

''آپ تو سنبھال لیں گے نا۔''

''ہاں، تمہارے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔''

اسی وقت سہیل نے نعرہ لگا دیا۔ ''بٹ کے رہے گا ہندوستان۔ لے کے رہیں گے پاکستان۔''

''سر جی۔ یہ بندر نعرہ لگاتا ہے؟'' وزیر نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، بس یہی نعرہ لگاتا رہتا ہے۔''

''لیکن یہ تو بہت اوکھا نعرہ ہے سر جی۔ اس کا کوئی بندوبست کریں۔''

''لگانے دو۔ ہمارا کیا جاتا ہے۔''

''سر جی، یہ دو کوڑی کا بندر ہمیں یہ احساس دلانے کی کوشش کررہا ہے کہ کیا ہم نے اس دن کے لیے ایسے نعرے لگائے تھے۔ بٹ کے رہے گا ہندوستان۔ لے کے رہیں گے پاکستان۔''

''فرض کرو اس کے احساس دلانے سے تمہیں اس نعرے کے خطرناک ہونے کا احساس ہوگیا تو کیا اس کے بعد تم کو احساس ہوجائے گا؟''

سپرہٹ بے عزتی

میتھ ٹیچر۔ ''جب میں تمہارے جتنا تھا میرے میتھس میں 100 مارکس آتے تھے۔''

اسٹوڈنٹ۔ ''او بھائی آتے ہوں گے، کوئی اچھا ٹیچر پڑھاتا ہوگا۔''

****

شک

بیوی۔ ''مجھے اپنے شوہر پہ شک ہے وہ روز چھپ کر کسی لڑکی سے ملتے ہیں۔''

سہیلی۔ ''اب تم کیا کرو گی؟''

بیوی۔ ''کل ہی ان کے پیچھے اپنے بوائے فرینڈ کو لگا دوں گی۔''

****

اصل وجہ

ڈاکٹر۔ ''آپ کے 3 دانت کیسے ٹوٹے؟''

مریض۔ ''جی وہ بیوی نے بہت سخت روٹی بنائی تھی۔''

ڈاکٹر۔ ''تو کھانے سے انکار کردیتے۔''

مریض۔ ''جی وہی تو کیا تھا۔''

****

شرافت

لڑکی۔ ''آپ مجھے لفٹ دیں گے تو میں آپ کو اپنا موبائل نمبر دوں گی۔''

لڑکا۔ ''جہاں چاہو وہیں چھوڑ دوں گا، نمبر وِمبر رہنے دو، بس 100 کا پیٹرول ڈلوا دینا باجی۔''

سبق: مہنگائی نے لڑکوں کو شریف بنا دیا ہے۔

****

دعا

ایک کشتی طوفان میں پھنس گئی۔

کیپٹن۔ ''کسی کو طوفان سے بچنے کی دعا یاد ہے؟''

مولوی۔ ''مجھے یاد ہے۔''

کیپٹن۔ ''تم دعا مانگو کیونکہ ہمارے پاس ایک لائف جیکٹ کم ہے۔''

مرسلہ: رضوان تنولی کریڈوی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

”نہیں سر جی، وہ اب کہاں ہوش سے ہوتا ہے۔“ وزیر نے اپنی گردن جھکالی۔

”تو بس لگانے دو نعرہ۔ خود ہی تھک ہار کر چپ ہوجائے گا۔“ اس دن سہیل بہت دکھی ہوگیا۔ نہ جانے اس کے اردگرد یہ سب کیا ہورہا تھا اور کیوں ہورہا تھا اور اس کا دل چاہا کہ وہ اس پنجرے سے نکل کر بھاگ جائے لیکن اس کے لیے اب بھاگنا بھی مشکل ہوگیا تھا۔ چیف منسٹر ہاؤس میں پہرے لگے ہوئے تھے۔ وہ کہیں نہیں بھاگ سکتا تھا۔ بھاگ نکلنے کا صرف ایک راستہ تھا کہ وہ بیمار پڑ جائے۔ اس نے یہی کیا۔ اپنا پیٹ دبا کر زور زور سے اچھلنا شروع کردیا۔ اس نے بیماری میں بھی اپنے بندر ہونے کا خیال رکھا تھا کیونکہ یہ راز سوائے منسٹر صاحب کے اور کسی کو معلوم نہیں تھا۔

خود منسٹر صاحب اس کے پاس دوڑے چلے آئے۔

”کیا ہوا... یہ کیا شور کررہے ہو؟“

”تکلیف جناب۔“ وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ”پیٹ میں بہت ہی زبردست درد ہورہا ہے۔“

”اوہ، تمہیں تو اسپتال بھیجنا پڑے گا۔“ وہاں کس بات کی دیر تھی۔ ایک ایئر کنڈیشنڈ ایمبولینس اس کے لیے آگئی... جس میں اسے لٹادیا گیا۔ ایک خوبصورت نرس اس کے پاس بیٹھ گئی۔ جو اس کے پاس بیٹھنے سے خوف زدہ ہورہی تھی۔

وہ بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سہیل کو دنیا بھر کی روشنیاں بکھری ہوئی دکھائی دے رہی تھیں پھر اس نے فوری طور پر ایک فیصلہ کرتے ہوئے نرس کا ہاتھ تھام لیا۔ بے چاری نرس بری طرح چیخ اٹھی۔ ”نہیں...... نہیں۔ تم گھبراؤ نہیں۔ میں انسان ہوں۔“ سہیل نے کہا۔

”کیا......؟“ نرس حیرت زدہ رہ گئی۔ ”تم انسان ہو۔“

”ہاں، یہ ایک لمبی کہانی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں تمہیں سب بتادوں گا۔ تم بس میرا ساتھ دو۔“

”کیسے ساتھ دوں؟“

”مجھے اسپتال سے فرار کرادینا پھر میں تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتادوں گا۔“ سہیل نے کہا۔ ”پلیز...... میرے لیے بس ایک عدد کرتہ شلوار کا بندوبست کردینا کیونکہ میں اس کھال میں فرار نہیں ہوسکتا۔“

”ٹھیک ہے، اب تم چپ ہوجاؤ۔ اسپتال آگیا ہے۔“ نرس نے کہا۔ ”بلکہ ایسا کرو کہ آنکھیں بند کرلو جیسے گہری نیند میں ہو۔“ ایمبولینس رک گئی۔ سہیل کو اسٹریچر پر لٹایا گیا۔ اس نے نرس کو کہتے ہوئے سنا۔ ”سر، میرا خیال ہے کہ یہ ابھی گہری نیند سو رہا ہے۔ اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ دوسری آواز شاید کسی ڈاکٹر کی تھی۔ ”تم ہی اس کے ساتھ رہو گی کیونکہ یہ تم سے مانوس ہوگیا ہے۔“

”یس سر۔“ سہیل کو ایک کمرے میں پہنچادیا گیا۔

کچھ دیر بعد اس نے نرس کی آواز سنی۔ ”اٹھ جاؤ۔ کمرے میں کوئی نہیں ہے۔“

سہیل نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔ بہت بڑا اور خوبصورت کمرا تھا۔ ایک طرف ایک بڑا سا فریج، قالین، وارڈ روب، اے سی، کسی فائیو اسٹار ہوٹل کے کمرے کی طرح۔ اس نے باہر سے کچھ لوگوں کے رونے دھونے کی آوازیں سنیں۔ ”یہ کیسی آوازیں ہیں؟“

”یہ ان لوگوں کی آوازیں ہیں جن بے چاروں کے لیے اسپتال میں جگہ نہیں ہے۔“ نرس نے بتایا۔

”لیکن میرے لیے تو یہ شاندار روم ہے۔“

”تمہاری بات الگ ہے۔“ وہ ہنس دی۔ ”کیونکہ تم منسٹر صاحب کے بندر ہو۔ تمہارا خیال رکھنا تو ضروری ہے۔“

”تمہارا نام کیا ہے۔“

”ایمن۔“ نرس نے بتایا۔

”ایمن، میرے پاس اس وقت پیسے نہیں ہیں۔ پلیز...... تم میرے لیے کسی طرح ایک سوٹ کا بندوبست کردو تاکہ میں اس کھال سے نجات پاؤں۔“

”میں جارہی ہوں۔ تم اسی طرح آنکھیں بند کرکے لیٹے رہنا۔ کوئی تمہیں ڈسٹرب نہیں کرے گا۔“

نرس کے باہر جانے کے بعد سہیل آنکھیں بند کرکے بستر پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد اسے واقعی نیند آگئی۔ اس کی آنکھیں ایمن کی آواز سے کھلیں۔ وہ اس کے لیے سوٹ لے آئی تھی۔

سہیل جوڑا لے کر جلدی سے غسل خانے میں داخل ہوگیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا تو ایمن اسے دیکھتی رہ گئی۔ ”واہ تم تو اچھے خاصے انسان ہو۔“

”ہاں لیکن زندگی نے مجھے بندر بنادیا تھا۔ ایمن میں اپنی کھال لے کر یہاں سے فرار ہورہا ہوں۔“

”کیا لوگ تمہیں پکڑیں گے نہیں۔“

”نہیں۔ لوگ تو بندر کو تلاش کرتے رہیں گے۔“ سہیل نے کہا۔ ”اور کسی کو میری صورت بھی نہیں معلوم۔ اس لیے میرے پکڑے جانے کا کوئی خدشہ نہیں ہے۔ ہاں تم مجھ سے ملنا چاہتی ہو تو میرا پتا یاد کرلو۔“ سہیل نے جلدی جلدی اپنا پتا بتادیا۔

”اوکے، مجھے یاد رہے گا۔“ ایمن نے کہا۔ ”اور اب میں ڈاکٹر کو بلانے ڈیوٹی روم میں جارہی ہوں۔ اس دوران میں تم نکل کر بھاگ جاؤ۔“ ایمن باہر گئی۔ اس کے جاتے ہی سہیل بھی کمرے سے باہر آگیا۔

اسے اسپتال سے نکلنے میں بھی کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے فلیٹ میں تھا۔ شاید وہ صدیوں کا سفر طے کرتا ہوا اپنے فلیٹ میں پہنچا تھا۔

اس دوران میں اس نے جو کچھ دیکھا وہ اس کے لیے انتہائی حیرت انگیز تھا۔ یہ کیسے لوگ تھے۔ کہاں کہاں ناانصافیاں کی تھیں۔

بہرحال بندر بنے رہنے کا ایک فائدہ یہ ہوا تھا کہ اس کے پاس ہوٹل کی ملازمت سے اچھے خاصے پیسے جمع ہوچکے تھے۔

اس نے اپنی بندر والی کھال اپنے فلیٹ میں چھپا کر رکھ دی۔

کچھ دیر بعد حامد اسے تلاش کرتا ہوا آگیا۔ ”مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ تم بھاگ کر یہیں آؤ گے۔“

”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں فرار ہوگیا ہوں۔“

”یار، پورے شہر میں تمہاری تلاش ہورہی ہے۔“ حامد نے بتایا۔ ”لیکن وہ سب ایک بندر کو تلاش کررہے ہیں۔ تمہاری طرف تو کسی کا دھیان بھی نہیں جائے گا۔“

”یار، میری صورت ہوٹل والے نے دیکھ رکھی تھی۔ وہ کہیں بتا نہ دے۔“

”اس کی فکر مت کرو۔ اس نے بھی بیان دے دیا ہے کہ اس نے تمہاری صورت نہیں دیکھی ہے۔“ حامد نے اسے اطمینان دلایا۔ ”لیکن...... تم بھاگ کیوں گئے؟ اچھی خاصی زندگی گزر رہی تھی۔“

”کمال کرتے ہو۔ تم ایسی زندگی گزار سکتے ہو۔ ایک بندر کی طرح۔“

”اب بتاؤ، اب کیا کرنا ہے؟“

”اب میں نے ایک فیصلہ کرلیا ہے۔“ سہیل نے کہا۔ ”مجھے جانور بنے رہنے کی پریکٹس ہوگئی ہے۔ اس لیے میں اپنی بقیہ زندگی کسی جنگل میں ہی گزاروں گا۔“

”لیکن جنگل ہیں کہاں۔ ٹھیکیداروں نے تو سارے درخت کاٹ دیے ہیں۔“

”خیر ایسا بھی نہیں ہے۔ ابھی بھی تھوڑے بہت رہ گئے ہیں۔ کیا عیش کی زندگی ہوتی ہے جنگل میں۔ نہ بجلی کا بل، نہ گیس کی شکایت، نہ پولیس کا ڈر، نہ فرقہ پرستی، نہ کوئی زبان کچھ بھی نہیں۔ بس کھاؤ پیو اور گھومتے رہو۔“

”لیکن جنگل میں جانور تو ہوتے ہیں نا۔“

”انسانوں سے زیادہ خطرناک نہیں ہوتے۔ میں نے جان لیا ہے کہ جانور بن کر کس طرح رہا جاتا ہے۔“

”چلو مرضی ہے تمہاری۔“ حامد نے کہا۔ ”لیکن تم انسانوں سے کٹ کر رہ جاؤ گے۔“

”میرے اردگرد جو لوگ ہیں اگر وہ انسان ہیں تو پھر ایسے انسانوں سے دوری بہتر ہوگی۔“

حامد کے واپس جانے کے بعد سہیل نے سامان کی فہرست بنانی شروع کردی۔ اسے کیا کیا اپنے ساتھ لے جانا تھا۔ فرسٹ ایڈ بکس، موم بتیاں، ایمرجنسی لائٹ، ماچس کے ڈبے، آٹا، دال، چاول، نمک اور چائے کا سامان، ایک کلہاڑی، چاقو اور اسی قسم کی بے شمار چیزیں جن کی جنگل میں ضرورت پڑ سکتی تھی۔

وہ رات گئے تک سامان کی خریداری میں مصروف رہا۔ اس نے چار پانچ جینز اور شرٹس بھی خرید لی تھیں۔

دوسری صبح دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ نرس ایمن اپنی خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ اس کے سامنے کھڑی تھی۔

”ارے تم۔“ سہیل بوکھلا گیا۔ ”تم کیسے آگئیں؟“

”بھول گئے تم ہی نے تو مجھے اپنا پتا دیا تھا۔“ ایمن نے بتایا۔

”ہاں یاد آگیا۔“ ایمن کمرے میں آکر بیٹھ گئی۔

”تم پر تو کوئی الزام نہیں آیا؟“ سہیل نے پوچھا۔

”نہیں۔ بس پوچھ گچھ ہوئی تھی۔“ ایمن نے کہا۔ ”لیکن یہ کیا کہانی ہے؟“

سہیل نے اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتادیا۔

”بس یہ ہے میری زندگی۔ انسان سے بندر بن گیا اور اب جنگل ہی میں بسیرا کرنے کا ارادہ کرلیا ہے۔“

”تمہاری کہانی سن کر بہت افسوس ہوا۔ واقعی یہ دنیا رہنے کے قابل نہیں ہے لیکن مجھے یہ سب سن کر اس لیے زیادہ حیرت نہیں ہوئی کہ میرے بھی حالات کچھ ایسے ہی رہے ہیں۔ میں نے بھی بہت ٹھوکریں کھائی ہیں اور

پریشانیاں برداشت کی ہیں۔ اگر تم کہو تو میں تمہیں اپنی داستان سنا دوں؟''

''نہیں تمہارا اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ تمہارے ساتھ بھی یہی سب ہوتا رہا ہے۔''

''اسی لیے میں یہ کہہ رہی ہوں کہ تم اکیلے جنگل کی طرف نہیں جاؤ گے بلکہ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔''

''کیا......؟'' سہیل نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ ''تم میرے ساتھ کس طرح جا سکتی ہو' ہمارے درمیان...... میرا مطلب ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے بالکل اجنبی ہیں۔ تمہیں کیا معلوم کہ میں کیسا آدمی ہوں؟''

''دیکھو جس وقت تم بندر کے روپ میں مجھے ملے تھے' میں نے اسی وقت ایک کشش سی محسوس کی تھی۔'' ایمن نے بتایا۔ ''میں نے تمہارے بندر میں چھپے ہوئے انسان کو محسوس کر لیا تھا۔''

''ایمن' یہ سب درست ہے لیکن ہمارا معاشرہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔''

''کمال کرتے ہو جنگل میں معاشرہ ہی کہاں ہوگا؟''

''پھر بھی میں اتنی فوری محبت برداشت نہیں کر سکتا۔''

''سہیل' تمہیں میرے لیے کوئی نہ کوئی جگہ نکالنا ہی ہوگی۔'' ایمن نے کہا۔

''چلو اگر تم اتنی ہی ضد کر رہی ہو تو ایک کام کرتے ہیں۔'' سہیل نے سمجھایا۔ ''میں جنگل میں جا کر پہلے وہاں کے حالات کا جائزہ لیتا ہوں پھر ایک جھونپڑی بناتا ہوں۔ پانی کا انتظام کرتا ہوں' اس کے بعد شہر واپس آ کر تم سے شادی کر کے تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔''

''ہاں بالکل ٹھیک۔'' ایمن خوش ہو گئی۔ ''اب بتاؤ تم جنگل میں کیا کیا چیزیں لے کر جا رہے ہو؟''

سہیل نے اپنی بنائی ہوئی فہرست اس کے سامنے کر دی۔ ایمن نے اپنے حساب سے اس میں کچھ اور چیزوں کا اضافہ بھی کر دیا پھر ایمن ہی نے سہیل کے لیے مزیدار کھانے بنائے اور اس سے دنیا بھر کی باتیں کرتی رہی۔

سہیل کو بالکل گھریلو زندگی کا مزہ آنے لگا۔ جیسے اس کی بیوی نے اس کے لیے کھانے بنائے ہوں اور سامنے بیٹھ کر دنیا بھر کی باتیں کر رہی ہو لیکن ایمن سے جدا ہو کر اسے جنگل کی طرف جانا تھا البتہ اس خیال سے اسے تقویت مل رہی تھی کہ واپس آ کر وہ ایمن سے شادی کر لے گا۔ اس وقت ایک خیال نے سہیل کو پریشان کر دیا۔ ''یار ایمن' ایک بات تو بتاؤ۔ ہمارے بچوں کا کیا ہوگا؟''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ جنگل میں ان کی لکھائی پڑھائی کہاں سے ہوگی۔ وہ تو جاہل رہ جائیں گے۔''

''اوہو' یہ سب ابھی سے کیوں سوچ رہے ہو۔'' ایمن نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے اس وقت کوئی راستہ نکل آئے۔''

پھر ایمن نے سہیل کو اپنے گھر کا پتا اور فون نمبر دیتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں اس دنیا میں بالکل اکیلی ہوں۔ میری پھوپی نے میری پرورش کی تھی۔ ان کا بھی انتقال ہو چکا ہے' یہ پتا میری ایک جاننے والی مہربان خاتون کا ہے۔''

ایمن نے سہیل کا سامان باندھنے میں اس کی مدد کی۔ سامان اچھا خاصا ہو گیا تھا۔ ''یہ تو اتنا سامان ہے کہ باقاعدہ سوزوکی کرنی پڑے گی۔'' ایمن نے کہا۔

''وہی میں بھی سوچ رہا ہوں کہ میں نے خوامخواہ اتنی چیزیں خرید لیں۔''

''پھر کیا کرو گے؟''

''ایک راستہ ہے میرے ذہن میں۔ کسی بس یا ریل میں سفر نہیں کروں گا بلکہ ایک ٹرک کرائے پر لے لوں گا اور جہاں سے جنگل شروع ہوتا ہے' وہاں سامان اتار کر ٹرک کو واپس کر دوں گا۔''

''نہیں اس طرح تم پھنس جاؤ گے۔'' ایمن نے کہا۔ ''میری بات مانو صرف ایک بیگ لو اس میں ضرورت کی دو چار چیزیں رکھو اور روانہ ہو جاؤ۔''

''ہاں یہ سب سے بہتر رہے گا۔''

''جاؤ' فی امان اللہ۔'' ایمن جاتے جاتے اس کے سینے سے لگ گئی۔ ''دیکھو جنگل میں جا کر مجھے بھولنا نہیں۔''

سہیل نے جنگل جانے کے لیے لانگ روٹ کی بس پکڑی تھی۔ اس نے ٹکٹ ملتان کا لیا تھا اسے معلوم تھا کہ اگر کسی کو ضرورت پیش آئے تو وہ بس رکوا بھی سکتا ہے پھر کئی مسافر اپنی ضرورت رفع کرنے کے لیے بس سے اتر جاتے ہیں اور اندھیرے میں رینگ جاتے ہیں۔ بس والا آوازیں دے دے کر انہیں بلاتا ہے اور گنتی پوری ہونے کے بعد بس آگے روانہ ہو جاتی ہے۔

سہیل نے بھی یہی کیا۔ ایک ویران مقام پر آواز دے کر اس نے بس رکوائی اور اپنا بیگ اٹھا کر نیچے اتر آیا۔ اس کے ساتھ دو چار مسافر اور بھی اترے تھے۔ سہیل اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر بہت دور تک چلا آیا اور ایک بڑے سے پتھر کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد بس

والوں نے آوازیں دینی شروع کر دیں۔ وہ سب اس کو تلاش کرتے رہے۔ وہ چھپا بیٹھا رہا پھر بس والے اس سے مایوس ہو گئے۔ بس کا انجن جاگ اٹھا۔ اس وقت سہیل کا دل چاہا کہ وہ دوڑتا ہوا بس تک پہنچ جائے۔

آخر وہ کیا کر رہا تھا... کیا اس کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ بس رینگنے لگی اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ اب صرف گہرا اندھیرا تھا اور پہلی دفعہ اسے احساس ہوا کہ وہ کیا حماقت کر گزرا ہے۔ یہاں تو دور دور تک سوائے اندھیرے اور سائیں سائیں کرتے ہوئے جنگل کے کچھ بھی نہیں تھا۔ ممکن تھا کہ دن کی روشنی میں یہ سب کچھ خوبصورت دکھائی دیتا ہو لیکن اس وقت تو ایسا بھیانک محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اچانک بھوتوں کی نگری میں پہنچ گیا ہو۔

وہ بہت دیر تک وہیں کھڑا سوچتا رہا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہیں سڑک کے آس پاس رہے یا جنگل کی طرف سفر شروع کر دے۔

اس نے اپنے بیگ میں ایک بڑی سی ٹارچ رکھ لی تھی۔ اس نے ٹارچ جلائی اور اس کی روشنی میں آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ وہ جھاڑیوں اور جنگلی پودوں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ سہیل کو اس وقت بہت خوف محسوس ہو رہا تھا۔

وہ بہت دور تک چلتا رہا۔ نہ جانے کون سی جگہ تھی۔ پودوں اور جھاڑیوں کے سلسلے ختم ہو گئے تھے۔ اب اونچے اونچے درخت تھے۔ وہ دل ہی دل میں آیتیں پڑھتا ہوا ان درختوں کے درمیان سفر کر رہا تھا۔ اب اسے تکان بھی ہونے لگی تھی۔

اس نے عقل مندی یہ کی تھی کہ پانی کی ایک بڑی بوتل اور بسکٹ کے پیکٹ بھی ساتھ رکھ لیے تھے۔ اس نے پانی کی بوتل نکال کر دو چار گھونٹ لیے اور تازہ دم ہو کر پھر آگے بڑھ گیا۔

ٹارچ کی روشنی میں اسے ایک بڑے درخت کا کتنا دیو قامت دکھائی دے گیا۔ اب اس سے آگے بڑھنا محال ہو رہا تھا۔ وہ اس تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور نہ جانے کس وقت اس کو نیند آ گئی۔

دوسری صبح کسی کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس کے سامنے دو آدمی کھڑے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں کلہاڑیاں تھیں اور دونوں ہی قد آور تھے۔ ان میں سے ایک نے سہیل کو مخاطب کیا۔ ''اوئے کون ہے تو، یہاں کیسے آیا ہے؟''

''بھائی میں ایک مسافر ہوں۔'' سہیل نے جواب دیا۔ ''راستہ بھول کر اس طرف آ گیا ہوں۔''

''راستہ کیسے بھول گیا' یہ تو جنگل ہے۔ جنگل میں راستہ بھول کر کیسے آ نکلا؟ سچ سچ بتا ورنہ گردن اڑا دیں گے۔''

''سچ یہ ہے بھائیو کہ اس دنیا سے اکتا کر جنگل کی طرف آیا ہوں۔'' سہیل نے بتایا۔ ''دنیا میں سوائے دھوکے اور جھوٹ کے کچھ بھی نہیں رکھا۔''

''تیرے بیگ میں کیا ہے؟''

''خود دیکھ لو۔'' سہیل نے اپنا بیگ سامنے رکھ دیا۔

''ایک دو جوڑے کپڑے ہیں اور بسکٹوں کے پیکٹ ہیں۔''

''کیوں نہ اسے سرکار کے پاس لے چلیں۔'' ایک نے دوسرے سے کہا۔

''کون سرکار؟''

''اوئے تو ہمارے سرکار کو نہیں جانتا۔ پیر کرامت شاہ بہت پہنچے ہوئے ہیں۔''

''میں ایسے ہی لوگوں سے تو گھبرا کر بھاگا ہوں بھائی۔ تم پھر ایسے ہی بندے کے پاس لے جا رہے ہو۔''

''بکواس مت کر' ہمارے سرکار بہت بڑے آدمی ہیں۔'' ایک نے کہا۔ ''چل ہمارے ساتھ۔''

وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی' جس میں ایک چھوٹا سا غار تھا۔ پیر کرامت شاہ نے اسی غار میں اپنا ڈیرا ڈال رکھا تھا۔

اس غار میں ایک دری، ایک جا نماز، ایک عدد لوٹے کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ پیر کرامت شاہ واقعی ایک پہنچے ہوئے بزرگ دکھائی دے رہے تھے۔ ان دونوں نے سہیل کو ان کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔

''تم دونوں کیوں واپس آ گئے؟'' پیر کرامت شاہ نے ان دونوں سے دریافت کیا پھر سہیل کی طرف دیکھا۔ ''اور تم کون ہو؟''

''جناب عالی' میں اس معاشرے کا ستایا ہوا ایک انسان ہوں۔'' سہیل نے کہا۔ ''اگر اجازت ہو تو میں اپنی داستان سنا دوں؟''

''ضرور سناؤ۔'' پیر صاحب نے کہا۔ پھر ان دونوں کو حکم دیا۔ ''تم بھی بیٹھ جاؤ۔''

سہیل نے اپنی پوری داستان سنا دی' پیر کرامت شاہ نے استغفار پڑھنا شروع کر دیا۔ ''توبہ توبہ کیا زمانہ آ گیا ہے۔ کیسے لوگ ہیں، کس پر بھروسا کیا جائے۔''

''جناب عالی میں اسی لیے اکتا کر اور بے زار ہو کر جنگل کی طرف نکل آیا ہوں۔'' سہیل نے کہا۔ ''اور آپ

جیسے بزرگ کو یہاں دیکھ کر حیران ہو رہا ہوں۔"

"برخوردار! ویسے تو میرا آستانہ شہر میں ہے۔" پیر صاحب نے بتایا۔ "لیکن میں ایک سال میں چالیس دن کے لیے چلے کاٹنے کے لیے یہاں آجاتا ہوں۔ دنیا سے الگ۔"

"واقعی آپ ہی جیسے لوگوں کے دم سے یہ دنیا سلامت ہے۔"

"اب تم نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

"جو آپ حکم دیں۔"

"میرا تو مشورہ ہے کہ تم یہیں میرے پاس رہ جاؤ۔"

"جی سرکار اس بندے کو اپنے پاس ہی رکھ لیں یہ آپ کی خدمت کرے گا۔"

"ارے نہیں بھائی میں کیا اور میری خدمت کیا۔" پیر کرامت شاہ جلدی سے بولے۔ "بس اس کو میرے ساتھ رہ کر مجاہدے کرنے ہوں گے، ریاضت کرنی ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ اس کو منزل مل جائے اور اس کے طفیل مجھے بھی کچھ حاصل ہوجائے۔"

سہیل جھوم اٹھا۔ اس دنیا میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں، اتنی بلندی اور ایسی انکساری۔ "جناب اب میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا مجھے میری منزل مل گئی ہے۔" اس نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"ٹھیک ہے۔" پیر صاحب نے اپنی گردن ہلا دی۔ "یہ زمین خدا کی ہے۔ میں کون ہوتا ہوں تمہیں بھگانے والا تم بھی یہیں رہ جاؤ۔" ان دونوں نے آگے بڑھ کر سہیل کے ہاتھ چوم لیے کیونکہ اب وہ بھی پیر صاحب کے طفیل بابرکت ہوگیا تھا پھر وہ دونوں اجازت لے کر رخصت ہوگئے۔

ان کے جانے کے بعد پیر صاحب نے کہا۔ "دیکھو جوان میں یہاں ہر سال انتہائی سخت مجاہدے کے لیے آتا ہوں۔ اپنے نفس کو مارنے کی کوشش کرتا ہوں کیونکہ یہ نفس بڑا ہی ظالم ہوتا ہے۔ اسی لیے تمہاری آنکھیں جو کچھ دیکھیں ان کو سچ مت سمجھ لینا کیونکہ یہ آزمائشوں کے مرحلے ہیں۔"

"سمجھتا ہوں سرکار۔"

"اور دوسری بات یہ کہ جو بھی مشاہدہ ہو اس کا ڈھنڈورا نہیں پیٹنا اور کسی کو نہیں بتانا کہ تم نے یہاں کیا دیکھا ہے اور نہ ہی مجھ سے کوئی سوال کرنا۔"

سہیل نے کہا۔ "میری کیا مجال ہے۔"

"بس اب کچھ مت کہنا۔" پیر کرامت نے اسے مزید کچھ بولنے سے منع کر دیا۔ "اور ہاں شام کے وقت کچھ مہمان آئیں گے ان کے لیے تمہیں انتظام کرنا ہے۔"

"جو حکم سرکار۔"

"اس غار کے برابر میں ایک دوسرا غار ہے تم وہاں جا کر آرام کرو۔" سہیل دوسرے غار میں آگیا۔ یہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ اس وقت اسے اپنی قسمت پر ناز ہو رہا تھا۔ تقدیر اسے کہاں سے کہاں لے آئی تھی۔

غار میں آرام کے لیے گدے بچھے ہوئے تھے۔ وہ گدے پر لیٹا اور کچھ دیر کے بعد اسے نیند آگئی۔ آرام اور سکون کی گہری نیند۔

اس کی آنکھ کچھ آوازوں سے کھلی تھی۔ اندھیرا ہو گیا تھا غار میں کسی نے پیٹرومکس روشن کر دیا تھا جب کہ غار کے باہر کچھ چہل پہل ہو رہی تھی۔

وہ جلدی سے غار سے باہر آگیا۔ دو جیپیں کھڑی تھیں۔ دریاں اور گاؤ تکیے اتارے جا رہے تھے۔ ایک جیپ میں کچھ لڑکیاں بھی تھیں اور کچھ لوگ تھے جو جلدی جلدی دریاں بچھا رہے تھے۔ ہر طرف پیٹرومکس روشن تھے جنگل میں منگل کا سماں ہو رہا تھا پھر پیر کرامت شاہ دو لڑکیوں کا سہارا لیے ہوئے اپنے غار سے برآمد ہوئے ان کے پاؤں اس طرح لڑکھڑا رہے تھے جیسے نشے میں ہوں۔ لڑکیوں نے انہیں ایک طرف لے جا کر بٹھا دیا۔ سہیل بہت حیران ہو کر یہ سب دیکھتا رہا۔ اس نے دیکھا ایک طرف بریانی کی دو دیگیں بھی تھیں جن کی خوشبو۔۔۔ سے پوری فضا مہکی ہوئی تھی۔

خدمت کرنے والوں میں سے ایک سہیل کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔

"چھوٹے سرکار۔" وہ بڑے ادب سے بولا۔ "آپ ہاتھ منہ دھولیں آپ کے لیے کھانا لگا دیا گیا ہے۔"

گویا وہ چھوٹے سرکار ہوگیا تھا پتا نہیں یہ کس طرح ہوا تھا۔ شاید پیر صاحب نے ہی اس پر اتنی توجہ فرما دی تھی۔ بہرحال اس نے منہ ہاتھ دھویا اس کے بعد دسترخوان پر بیٹھ گیا۔ طرح طرح کی چیزیں دسترخوان پر تھیں۔ بریانی، کباب، زردہ، پھل اور نہ جانے کیا کیا۔

اس نے اپنی حیرت دور کرنے کے لیے پیر صاحب سے کچھ پوچھنا چاہا لیکن وہ بالکل ٹن ہو رہے تھے۔ ایک جیپ سے ایک بڑا سا ریکارڈ پلیئر اتار لیا گیا۔ اس کے بعد تیز موسیقی کے ساتھ رقص کا دور شروع ہوگیا۔ دو لڑکیاں بہت ہی خطرناک قسم کا رقص کر رہی تھیں اور پیر صاحب ان لڑکیوں پر نوٹ نچھاور کر رہے تھے۔ کافی رات تک یہ سلسلہ چلتا رہا پھر پیر صاحب دو لڑکیوں کو لے کر اپنے غار میں

چلے گئے۔ سہیل دل ہی دل میں حیران ہوتا ہوا اپنے غار میں واپس آگیا۔

جو کچھ بھی اس نے دیکھا وہ اسے پاگل کر دینے کے لیے کافی تھا۔ کہاں تو پیر کرامت شاہ کی ایسی باتیں اور کہاں یہ حرکتیں۔ انسان پر سے اس کا اعتماد ہی ختم ہوگیا۔

وہ قافلہ صبح سویرے سارا سامان سمیٹ کر واپس چلا گیا۔ اب کوئی یہ کہہ بھی نہیں سکتا تھا کہ رات بھر یہاں کیا ہوا ہوگا۔ دس گیارہ بجے کے قریب پیر صاحب نے اسے آواز دی۔ وہ اپنے غار سے نکل کر پیر صاحب کے پاس آگیا۔ پیر صاحب اسے دیکھ کر مسکرائے۔ "اب تمہیں پتا چلا کہ ضبط نفس کیا ہوتا ہے؟"

"نہیں سرکار کچھ نہیں پتا چلا۔" سہیل نے کہا۔ "میں تو حیران ہو رہا ہوں۔"

"بے وقوف ہو تم۔" پیر صاحب مسکرا دیے۔ "یہ سب نفس کو کچلنے کے مرحلے ہیں۔ میں ہر سال اس کم بخت کو کچلنے کے لیے اس ویرانے میں آجاتا ہوں۔"

"تم نے دیکھا ہوگا کہ میں دو لڑکیوں کو اپنے غار میں لے گیا تھا۔"

"جی جناب اب آپ کا مقابلہ کون کرسکتا ہے۔"

پیر صاحب شفقت بھرے انداز میں مسکرا دیے۔ "تم چالیس دن تک یہاں یہی سب دیکھو گے اور تمہیں کسی بات پر حیرت نہیں ہونی چاہیے۔"

"نہیں جناب اب مجھے کوئی حیرت نہیں ہوگی۔"

"شاباش لگتا ہے تم بہت جلد سارے مرحلے طے کر لو گے۔" پیر صاحب نے کہا۔ "بس یہ یاد رکھو کہ تم سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں دیکھ رہے۔ سنتے ہوئے بھی کچھ نہیں سن رہے۔"

"جی سرکار، اب تو میرے ساتھ ایسا ہی ہوگیا ہے۔"

"شاباش جاؤ آرام کرو۔" پیر صاحب اپنے غار کی طرف چلے گئے۔ سہیل اپنے غار میں آگیا۔ پیر صاحب نے جو کچھ فرمایا تھا وہ اس سے ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ نشے میں دھت تھے۔ لڑکیاں رقص کر رہی تھیں اور فرمایا جا رہا تھا کہ یہ سب نفس کو کچلنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ پتا نہیں کیسا نفس تھا جس کو کچلنے کے لیے اتنے ساز و سامان کی ضرورت پیش آگئی تھی۔

بہرحال دوسری رات پھر یہی سب کچھ ہوا۔ اس رات سہیل پر کچھ اور انکشافات بھی ہوئے۔ مثال کے طور پر مجرے کے لیے لڑکیاں بھاری معاوضوں پر لاہور سے لائی جاتیں۔ شراب کی بوتلوں کا اسٹاک موجود ہے اور پیر صاحب ڈاکوؤں کے سرپرست بھی ہیں۔

ایک رات ان لڑکیوں میں سے ایک لڑکی سہیل کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ وہ بھی ایک جوان اور خوبصورت لڑکی تھی۔ اس وقت دو لڑکیاں رقص کر رہی تھیں اور سب کے سب رقص دیکھنے میں محو تھے۔ اس لڑکی نے سہیل کا ہاتھ تھاما اور آہستہ آہستہ اسے لے کر اس مجمع سے باہر آگئی۔ یہاں پیٹرومکس کی روشنیاں نہیں تھیں۔

"سنو تم شریف آدمی معلوم ہوتے ہو۔" اس لڑکی نے سہیل سے کہا۔ "تم اس بدذن پرست پیر کے ساتھ کیا کر رہے ہو؟"

"یہ بہت پہنچے ہوئے انسان ہیں۔"

"لعنت ہے ایسے پہنچے ہوئے پر۔" لڑکی نے کہا۔ "تم اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ کر بھی بے وقوف بن رہے ہو۔"

"اتفاق سے پورے معاشرے میں ایسا ہی ہو رہا ہے۔"

"ہاں..... ہو تو رہا ہے لیکن یہ شخص تو مذہب اور روحانیت کی آڑ میں یہ سب کچھ کر رہا ہے۔" لڑکی نے کہا۔ "اور تم اس کا ساتھ دے رہے ہو۔ یہ انتہائی درجے کا عیاش اور بدمعاش انسان ہے۔ مجھے تو اس سے نفرت ہے لیکن میری ماں پیسوں کے لالچ میں مجھے زبردستی یہاں بھیج دیتی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ یہ شخص سب کو بے وقوف بنا رہا ہے؟"

"ہاں یہ دوہرے کردار کا انسان ہے۔" لڑکی نے بتایا۔ "مذہب کے نام پر سیدھے سادے لوگوں کو تباہ کر رہا ہے اسی لیے تمہیں دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی ہے۔ اب یہاں سے بھاگ سکتے ہو تو بھاگ جاؤ۔ چھوڑ دو اس آدمی کا ساتھ۔"

"میں اسی وقت اس پر لعنت بھیج کر جا رہا ہوں۔" سہیل نے کہا۔ "میں اس کا غلام تو ہوں نہیں۔ آزاد بندہ ہوں اور جنگل میں اپنی مرضی سے آیا تھا۔"

"لیکن تم آئے کیوں تھے؟ کیا پریشانی ہوگئی تھی تمہیں؟" سہیل نے اس لڑکی کو بھی اپنی کہانی سنا دی۔ اس وقت لوگ رقص دیکھنے اور شراب پینے میں مصروف تھے۔ اسی لیے کسی کا دھیان ان دونوں کی طرف نہیں تھا۔

اس کی داستان سن کر لڑکی ہنسنے لگی۔ "تم بھی عجیب بے وقوف آدمی ہو۔ یہ سب کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ بہرحال اب ایسا کرو یہاں سے نکل لو۔"

"لیکن جاؤں کہاں؟"

"ماچھی کے پاس چلے جاؤ۔"

"کون ماچھی......؟"

"اس علاقے کا سب سے خطرناک ڈاکو۔"

"تمہیں کیا مجھ سے دشمنی ہوگئی ہے جو کسی خطرناک ڈاکو کے پاس بھیج رہی ہو؟"

"تمہاری بھلائی کے لیے بھیج رہی ہوں۔ وہ تمہیں کچھ نہیں کہے گا بلکہ میرا حوالہ دو گے تو وہ تمہیں اپنے ساتھ رکھ لے گا۔ یاد رکھنا میرا نام دل نشین ہے۔ دل نشین دوپٹے والی۔"

"یہ دوپٹے والی کیا چیز ہوئی؟"

"اس لیے کہ میں دوپٹا اوڑھ کر ڈانس کرتی ہوں۔ ذرا سی دیر کے لیے بھی دوپٹا نہیں گرنے دیتی۔ آخر شرم و حیا بھی تو کوئی چیز ہے۔"

"ٹھیک کہا تم نے۔" سہیل نے نعرہ لگایا۔ "بٹ کے رہے گا ہندوستان لے کے رہیں گے پاکستان۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟" دل نشین نے پوچھا۔

"خود میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں یہ کیوں کہتا ہوں۔ خیر میں جا رہا ہوں ماچھی ڈاکو کے پاس۔"

"تم اس سے مل کر بہت خوش ہوگے۔ وہ بہت ایماندار ڈاکو ہے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو اب اس ملک میں ایمانداری صرف ڈاکوؤں ہی کے پاس رہ گئی ہے۔"

"تم اس طرف چلنا شروع کر دو۔" لڑکی نے اشارہ کیا۔ "درختوں کے بیچ سے چلتے جاؤ۔ آدھے گھنٹے کے بعد تمہیں ایک میدان ملے گا۔ جب تم اس میدان میں پہنچو گے تو کچھ لوگ تمہیں گھیر لیں گے۔"

"اور مجھے گولی مار دیں گے؟"

"ہاں اگر تم نے ان کے سوالوں کے جواب نہیں دیے تو گولی مار دیں گے۔"

"اور وہ سوال کیا ہیں؟"

"تین سوال کریں گے جن کے صحیح جواب دینے ہیں۔ پہلا سوال پاکستان کا دارالخلافہ کیا ہے؟ تم کو بتانا ہے دبئی۔"

"لیکن دبئی تو نہیں ہے۔"

"تم کو یہی بتانا ہے۔" لڑکی نے کہا۔ "دوسرا سوال ہوگا جعلی ڈگری لے کر کیا کرو گے؟ تمہارا جواب ہوگا الیکشن میں کھڑا ہو جاؤں گا۔ تیسرا سوال ہوگا وہ کون ہے جس کو لوگ نوٹ تو دیتے ہیں لیکن ووٹ نہیں دیتے؟"

"یہ تو بہت آسان جواب ہے عبدالستار ایدھی۔"

"شاباش اس کا یہی جواب ہے۔ اس کے بعد وہ لوگ تمہیں ماچھی ڈاکو کے پاس لے جائیں گے۔ تم اسے میرے بارے میں بتاؤ گے تو وہ ہر طرح تمہارا ساتھ دے گا۔"

"تم سے کیسے ملاقات ہوا کرے گی؟"

"اسی ماچھی ڈاکو کے اڈے پر۔" لڑکی نے بتایا۔ "میں ہفتے میں ایک بار اس کے پاس بھی جاتی ہوں۔ وہ میرا بڑا بھائی ہے۔"

"کیا ماچھی ڈاکو تمہارا بھائی ہے؟"

"ہاں، ابا کے نقشِ قدم پہ چل رہا ہے۔" لڑکی نے فخریہ طور پر بتایا۔ "لیکن اماں کو یہ کام پسند نہیں ہے اسی لیے انہوں نے اپنی لائن الگ کر لی۔"

"اور اماں کی لائن کیا ہے؟"

"یہی مجھ سے ڈانس کروانا۔" لڑکی نے بتایا۔ "وہ نہیں چاہتیں کہ میں غلط کاموں میں پڑوں۔"

"میرا خیال ہے کہ میں اب تمہارے ماچھی ڈاکو کی طرف چل ہی دوں۔" سہیل نے کہا۔

"ہاں جاؤ۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ تم کھسک لیے ہو۔" لڑکی ان لوگوں کی طرف چلی گئی اور سہیل غار سے اپنا بیگ اٹھا کر باہر آ گیا۔ کسی نے بھی اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ سب اپنے حال میں مست ہو رہے تھے۔

سہیل پیر کرامت شاہ پر الوداعی نگاہیں ڈالتا ہوا وہاں سے رخصت ہو گیا۔ پیر صاحب اس وقت بھی دو لڑکیوں کو گھیرے ہوئے اپنے کم بخت نفس کو کچلنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔

وہ ایک بار پھر اندھیرے جنگل میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ آگے جا کر اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ لڑکی نے تو بڑے اعتماد سے کہا تھا کہ ماچھی ڈاکو لڑکی کا نام سنتے ہی اسے اپنے کیمپ میں شامل کر لے گا۔

اچانک کچھ لوگوں نے اسے گھیر لیا۔ اس پر کئی طرف سے ٹارچ کی روشنیاں پڑنے لگیں۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ کن لوگوں کے درمیان گھر گیا ہے۔

"بھائیو! میں دوست ہوں۔" اس نے پکار کر کہا۔ "میں تمہارے ہر سوال کا جواب دے سکتا ہوں۔"

"اچھا یہ بتا پاکستان کا دارالخلافہ کیا ہے؟"

"دبئی۔" اس نے جواب دیا۔

"بالکل غلط۔" کسی کی آواز آئی۔ "پاکستان کا کیپٹل ہے پرائے منسٹر ہاؤس۔"

"لیکن مجھے تو دبئی بتایا گیا تھا۔"

"چل اب دوسرے سوال کا جواب دے۔ جعلی ڈگری لے کر کیا کرے گا؟"

"الیکشن میں کھڑا ہو جاؤں گا۔"

"یہ بھی غلط۔ اس کا جواب ہے ورلڈ ریکارڈ قائم کروں گا۔"

"سردار لگتا ہے یہ ماچھی گروپ کا بندہ ہے۔" کسی نے کسی سے کہا۔

"ہاں۔" جس کو بتایا گیا تھا اس نے ایک ہنکاری لی۔ "لگتا تو یہی ہے پھر اس نے سہیل کی طرف دیکھا۔ "سچ سچ بتا تو کون ہے، کہاں جا رہا ہے؟"

"بھائیو، میں اپنی کہانی شروع سے سناؤں یا وہاں سے شروع کروں جہاں سے پیر کرامت شاہ میری زندگی میں شامل ہوا ہے۔"

"او تو تم پیر سائیں کے آدمی ہو۔"

"ہاں بھائی ان کا خاص آدمی ہوں۔"

"یاد آ گیا سردار، یہ بندہ پیر صاحب کی خدمت کرتا ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے۔ پیر سائیں اس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔"

"نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔" وہ آدمی زور سے دہاڑا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پیر سائیں کا یہ تحفہ ماچھی کے پاس چلا جائے۔ اس بندے کو برکت کے لیے ہم اپنے پاس رکھیں گے۔ احترام کریں گے اس کا۔ ان کی ہر بات مانیں گے لیکن یہ ہمارے اڈے سے باہر نہیں جا سکے گا۔"

"ارے بھائی تم لوگ کیوں میرے پیچھے پڑ رہے ہو۔ میں ایک سیدھا سادہ شریف آدمی ہوں۔" سہیل نے کہا۔ "مجھے کسی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"لیکن ہمیں تم سے تو دلچسپی ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پیر سائیں جس کا احترام کریں، جس کا خیال رکھیں، ہم اس کو ماچھی کے پاس جانے دیں، ماچھی سے تو ہماری ویسے ہی لگی رہتی ہے۔"

"یہ تمہارا آپس کا معاملہ ہے میں نے تو کوئی گناہ نہیں کیا۔"

"اوئے بکواس کی ضرورت نہیں ہے۔" وہی آدمی دہاڑا۔ "ہم پیر سائیں کی وجہ سے تیرا احترام کر رہے ہیں۔ ورنہ کس کی مجال ہے کہ بادل ڈاکو کے سامنے کچھ بول سکے۔"

"سائیں لگتا ہے یہ آدمی ہمارے قابو میں نہیں آئے گا۔ اس کے لیے وہی کریں جو آپ کے ابا سائیں نے سید صاحب کے ساتھ کیا تھا؟"

"ہاں، یہ اچھا مشورہ ہے۔" بادل ڈاکو نے سہیل کی طرف دیکھا۔ "دیکھو بھائی معاملہ کچھ یوں ہے کہ ہمارے دلوں میں تمہاری بہت عزت ہو گئی ہے کیونکہ تم سائیں کرامت علی شاہ کے آدمی ہو۔ ویسے تمہارا نام کیا ہے؟"

"سہیل۔" سہیل نے بتایا۔

"پورا نام بتاؤ سائیں؟"

"سہیل اعظم۔"

"دیکھا۔" سب کے سب اس کا نام سن کر خوشی سے اچھل گئے۔ وہ ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے اور گلے مل رہے تھے۔

"بھائیو! مجھے تو بتاؤ یہ کیا تماشا ہو رہا ہے؟"

"سید صاحب! آپ ہمارے لیے خیر و برکت لے کر آئے ہیں۔" بادل ڈاکو نے کہا۔ "ہم آپ کو اب کہیں نہیں جانے دیں گے۔ آپ سید ہیں۔ آپ کے قدموں کی بدولت ہماری چاندی ہو جائے گی۔ ہمارا ہر ڈاکا کامیاب ہو گا۔ اسی لیے ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آپ کو مار دیا جائے۔"

"مار دیا جائے؟" سہیل کے ہوش اڑ گئے۔ "وہ کیوں اور کس خوشی میں مار دیا جائے؟"

"ہمیشہ کی خیر و برکت کے لیے۔" بادل ڈاکو نے کہا۔ "آپ کی لاش کو ہم یہیں دفن کر دیں گے۔ آپ تڑپنے کی پروا نہ کریں۔ آپ کا مزار اتنا زبردست ہوگا کہ پورے صوبے میں ایسا کوئی مزار نہ ہوگا۔ ہر سال قوالیاں ہوں گی، چادریں چڑھائی جائیں گی اور......" لیکن سہیل اس ...... سے آگے کچھ نہیں سن سکا۔ اس نے اندھیرے میں ایک طرف چھلانگ لگا دی اور دوڑتا ہی چلا گیا...... دوڑتا ہی چلا گیا۔

اب آپ اگر بلیو مون ہوٹل کے سامنے سے گزریں تو آپ کو اس گیٹ پر ایک بڑا سا بندر اچھلتا کودتا ہوا دکھائی دے گا۔

یہ وہی سہیل ہے جس نے شہر میں آکر اپنے فلیٹ سے بندر والی کھال اٹھائی اور اسی ہوٹل کے منیجر کے پاس اپنی ڈیوٹی جوائن کرنے کے لیے پہنچ گیا۔

بندر بنتے بنتے وہ انسانوں کی طرح بولنا بھی بھول گیا ہے۔ ہاں اگر آپ اس کے پاس جا کر اسے بولنے کے لیے اکسائیں تو وہ صرف ایک نعرہ لگاتا ہے۔ "بٹ کے رہے گا ہندوستان لے کے رہیں گے پاکستان۔"

ڈاکٹر ساجد امجد

آنکھ بند کرو تو چند لمحوں کے لیے ایک خوب صورت دنیا ہمیں اپنے حصار میں قید کرلیتی ہے اور پھر جب تک ہمارا من اس دنیا میں رہنے پر اکساتا ہے ہم آنکھ نہیں کھولتے... اس دوران چاہے ہم خود کو تاج محل میں لے جائیں یا کسی ویرانے میں کچھ تلاش کرتے پھریں... لیکن آنکھ کھلتے ہی یہ بساط کچھ اس طرح بکھرتی ہے کہ کرچیاں اٹھاتے اٹھاتے ہاتھ زخمی اور دل بوجھل ہو جاتا ہے... ایسا صرف اسی وقت ہوتا ہے جب ہم پوری شدتوں سے اس ماحول میں گم ہو جائیں۔ وہ بھی اس خواب کی کیفیت سے نکلنا نہیں چاہتی تھی مگر اسے نکلنا تھا، نہ صرف خوابوں سے بلکہ کسی کے دل سے بھی اور... اپنے گھر سے بھی... ورنہ موت کا رقص اس کے آس پاس ہی جاری تھا گویا وہ مفاد پرمتی اور وفا پرستی کے درمیان پس رہی تھی اور رفتہ رفتہ رشتوں کی پہچان بھولتی جارہی تھی کہ اچانک ایک ایسا تعلق استوار ہوا کہ دل کی دنیا میں ہلچل مچ گئی لیکن مفاد پرست رشتوں نے اس خوب صورت ہلچل کو تباہ کن بھونچال میں بدل دیا اور اس طوفان میں اس کے دل سے ہر جذبے کو مٹا دیا۔ جب ریت کے مانند تمام سنہرے پل اس کے ہاتھ سے پھسل گئے تو اچانک جیون کے تپتے صحرا میں برسات ہوگئی اور اس جل تھل میں سب کے اصل چہرے سامنے آتے گئے اور اسے حیران کرتے گئے... یہی زندگی ہے کون، کب، کیا روپ دھار لے کچھ خبر نہیں ہوتی۔

اپنوں کے دھوکے میں زندگی تمام کرنے والی ایک اجنبی حسینہ کی

داستان رنگارنگ

کرم نواز کے پیشے کا تقاضا تھا کہ شہر بھر کے نامی گرامی غنڈے اس کی دہلیز پر پڑے رہیں۔ شریف بدمعاش بھی اور بدمعاشوں کے بدمعاش بھی۔

وہ دنیا کی نظروں میں بہت بڑا بزنس مین تھا لیکن اس نے بڑی ہوشیاری سے بزنس اور اسمگلنگ کے درمیانی فاصلے ختم کردیے تھے۔ اس کے کالے کرتوت بہت دیر سے دنیا کی نظروں میں آئے تھے۔ اس وقت تک اس کی جڑیں اتنی مضبوط ہوگئی تھیں کہ اس پر ہاتھ ڈالنا ممکن نہ رہا تھا۔ اس نے رشوتوں کا جال اتنی دور تک پھیلا دیا تھا کہ اس پر ہاتھ ڈالنے والا خود پھنس کر رہ جاتا تھا۔ اعجاز احمد پر بھی اس کی حقیقت بہت بعد میں کھلی ورنہ وہ اس کی بیٹی سے شادی ہی کیوں کرتا۔ حقیقت کھل جانے کے بعد اس نے کرم نواز سے فاصلے بڑھا دیے تھے لیکن کرم نواز اپنی بیٹی سے غافل نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ خود وہاں نہیں جاسکتا تھا لیکن اپنے آدمی اعجاز احمد کے گھر تک پھیلا دیے تھے۔ یہ چوکسی اتنی مضبوط تھی کہ اعجاز احمد اگر کچھ سوچتا بھی تھا تو اس کی خبر کرم نواز کو ہو جاتی تھی۔ اعجاز احمد بھی اتنا گھاگ تھا کہ دیواروں تک کے کان کٹوا دیے تھے۔ کسی کے آگے مشورے تک کے لیے زبان نہیں کھولتا تھا۔ صرف اس کا منیجر رضوان تھا جس کے سامنے وہ دل کی بات کہہ لیتا تھا۔ وہ بھی اس لیے کہ وہ اس کے ساتھ اس وقت سے تھا جب والد کے انتقال کے بعد اعجاز نے بزنس اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔ اس کی والدہ کی طرف سے اس کی کچھ رشتہ داری بھی تھی۔ اس لیے اس پر شک کیا ہی نہیں جاسکتا تھا۔

اتنی احتیاط کے باوجود اعجاز احمد نے منہ کھولا اور سانس کی گرمی کرم نواز تک پہنچ گئی۔ اس کا داماد اس کی بیٹی پر سوکن لانے کے ارادے باندھ رہا ہو اور وہ اس جلتی ہوئی آگ پر ہاتھ تاپتا رہ جائے۔ وہ دولت میں اپنے داماد کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا لیکن اپنے کاروبار کی نوعیت کے حوالے سے اپنے

لوگ اس کی مٹھی میں ضرور تھے جو اس کا دماغ درست کر سکتے تھے۔ ایک فون کرنے کی دیر تھی اور اعجاز احمد کے پاؤں زمین میں دھنس جاتے۔ اس نے فون تھما دیا۔

اعجاز احمد کے ذہن میں اس وقت زلزلے کی گڑگڑاہٹ سنائی دی جب اس نے عام انسانوں سے ہٹ کر کسی مخلوق کو اپنے سامنے دیکھا۔ وہ آدمی ہی تھا لیکن یہ معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ کر یہاں آ گیا ہے۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد، چوڑا سینہ، چہرے پر خباثت کے ساتھ ساتھ کسی گہرے زخم کا نشان جو اس کی آنکھ کے نیچے سے ہوتا ہوا اوپر کے ہونٹ تک چلا گیا تھا۔ بھدی اور موٹی انگلیاں، رنگ البتہ سرخ سپید تھا جس نے اس کی بدہیتی کو کچھ کم کر دیا تھا۔

اس سے پہلے کہ اعجاز احمد اس سے کچھ پوچھتا وہ سامنے پڑے صوفے میں دھنس گیا اور نہایت بے ہودگی سے اپنی دونوں ٹانگیں جوتوں سمیت اس کی میز پر رکھ دیں۔

''ام ظالم خان ہے۔ ہسٹری شیٹر ظالم خان، تم ابی پولیس کو فون کرو تو تمہیں پانچ لاکھ کا انعام ملے گا۔''

''خان صاحب کیوں مذاق کرتے ہو، کام کی بات کرو کس لیے آئے ہو۔''

''خنزیر کا بچہ! تم امارا ابا کا بھائی ہے جو ہم تم سے مذاق کرے گا۔''

''میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ کتنے پیسے تمہیں چاہییں؟''

''ام ظالم خان ہے کوئی فقیر نہیں ہے۔''

''پھر کیا بات ہے خان صاحب۔ آپ کے آنے کا مقصد کیا ہے؟''

''ام تم کو بولنے آیا ہے تم تیسرا شادی نہیں کرے گا۔''

''تیسری شادی میرا ذاتی معاملہ ہے، تمہارا اس سے کیا تعلق؟''

''ام نے جو بول دیا بول دیا۔ تم تیسرا شادی نہیں کرے گا۔''

''میں سمجھ گیا تمہیں کس نے بھیجا ہے۔ تم اس معاملے سے ہٹ جاؤ۔ شادی کرنا گناہ نہیں ہے جو تم روکنے آئے ہو۔''

''قسم بخدا۔ تم اگر کرم نواز کا رشتہ دار نہ ہوتا تو تمہارا گردن چٹکی سے مسل دیتا۔ ظالم خان سے کوئی اس طرح بولے اور زندہ رہ جائے۔ ابی تم وعدہ کرتا ہے یا نہیں۔''

''کیسا وعدہ؟''

''تم تیسرا شادی نہیں کرے گا۔''

''میری مرضی میں کروں یا نہ کروں۔''

''پھر ام اپنا مرضی کرے گا۔ ام تمہارا بیٹی کو اسکول جاتے ہوئے دیکھ چکا ہے۔ کیا تمہیں یہ برداشت ہوگا کہ وہ اسکول سے نہ آئے۔''

''تم اتنے بڑے غنڈے ہو کر بچی کو اغوا کرنے کی دھمکی دے رہے ہو۔ کیسے ہسٹری شیٹر ہو؟''

''کرم نواز کا یہی حکم ہے۔'' اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ٹھہرو ظالم خان۔''

''ام تمہارے باپ کا نوکر ہے جو تمہارے کہنے سے رک جائے گا۔''

''میں کرم نواز سے بات کرلوں، اس کے بعد کوئی قدم اٹھانا۔''

ظالم خان نے اس کی آواز سنی ضرور ہوگی لیکن پلٹ کر دیکھنا تک گوارا نہیں کیا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ اعجاز اس کے پیچھے دوڑا ضرور تھا لیکن دفتر کے لوگوں کے سامنے وہ کوئی تماشا کھڑا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اسے آواز دیے بغیر اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر جیسے اسے ہوش آ گیا۔ اتنا خطرناک آدمی باہر نکلتے ہی کوئی بھی قدم اٹھا سکتا ہے۔ میں اس کا ہاتھ نہیں روک سکتا لیکن اس کے اٹھتے ہوئے قدم تو روک سکتا ہوں۔ اس نے اپنے کمرے میں آتے ہی اپنی بیٹی لائبہ کے اسکول فون کر دیا کہ وہ لائبہ کو اس وقت تک اسکول میں روکے رکھیں جب تک اسے لینے وہ خود اسکول نہیں آ جاتا۔ دوسرا فون اس نے کرم نواز کو ملایا۔ کرم نواز جیسا چالاک آدمی فون اٹھاتے ہی سمجھ گیا کہ اعجاز پر کیا گزری ہے۔

''کہو اعجاز، کیا ظالم خان سے ملاقات ہوگئی؟''

''مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی کہ ایسا گھٹیا حربہ استعمال کرو گے۔''

''گھٹیا آدمی کے لیے گھٹیا حربہ ہی استعمال کرنا پڑتا ہے۔ میری بات تو تمہاری سمجھ میں آئی نہیں۔ اس لیے میں نے ظالم خان کو بھیجنا ضروری سمجھا۔''

''میں تمہارا داماد ہوں۔ تم نے اس کا خیال بھی نہیں کیا۔''

''وہ غالباً تمہیں یہی سمجھانے آیا تھا کہ تم صرف میرے داماد بنے رہو، کسی اور کے داماد نہ بنو۔''

''یہ میرا اور تمہارا معاملہ تھا مگر وہ میری بیٹی کو اغوا کرنے کی دھمکی دے کر گیا ہے۔''

''بھئی وہ تمہاری پہلی بیوی کی بیٹی ہے۔ میری بیٹی کی

بیٹی تو ہے نہیں کہ میں سن کر پریشان ہو جاؤں۔ ہمت ہے تو اسے روک لو۔''

''مجھے معلوم ہے وہ تمہاری زبان بول رہا ہے۔ تم اس سے کہو وہ ایسی حرکت نہ کرے۔''

''میرے حکم کے بغیر وہ کچھ نہیں کرے گا لیکن تمہیں بھی وہ کرنا پڑے گا جو میں کہہ رہا ہوں۔ اگر تم وعدہ کرو کہ شادی نہیں کرو گے تو وہ تمہاری بیٹی کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں لیکن میری بیٹی......''

''جب تک میری بیٹی تمہارے پاس ہے تمہاری بیٹی بھی تمہارے پاس رہے گی۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں مگر آپ بھی اپنے وعدے پر قائم رہیں گے۔''

کرم نواز نے کوئی جواب دیے بغیر فون رکھ دیا اور اعجاز احمد یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کرم نواز نے کوئی واضح جواب نہیں دیا۔ اس کے دل میں ضرور کوئی چور ہے۔ وقتی طور پر خطرہ ٹل گیا ہے لیکن اس کا کوئی بھروسا نہیں۔ جو وقت مجھے مل گیا ہے اس میں کوئی انتظام کرنا پڑے گا۔

پھولوں کی پتیوں سے بنی ہوئی گڑیا کا نام لائبہ تھا۔ حسن کے جتنے رنگ ہو سکتے ہیں وہ ان سب کا مجموعہ تھی وہ اکلوتی تھی، اس کی کوئی دوسری مثال اس لیے بھی نہیں ہو سکتی تھی کہ اس کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ اعجاز احمد کو اپنی بے پناہ دولت سنبھالنے کے لیے بیٹے کی ضرورت تھی۔ اپنا یہی خواب پورا کرنے کے لیے اس نے کرم نواز کی بیٹی راحیلہ سے دوسری شادی کر لی تھی۔ اس شادی کے بعد بھی وہ بیٹے سے محروم رہا۔ ڈاکٹروں نے صاف کہہ دیا کہ راحیلہ بانجھ ہے۔ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں۔ اعجاز نے جلد بازی پھر بھی نہیں کی۔ لائبہ تین سال کی تھی جب اس نے راحیلہ سے شادی کی تھی اور اب لائبہ آٹھ سال کی ہو گئی تھی۔ خواب کو تعبیر بنتے دیکھنے کے لیے پانچ سال بہت ہوتے ہیں۔ اب اس نے تیسری شادی کا ارادہ کیا تھا۔ شاید کسی کے سامنے اس نے اس کا اظہار بھی کیا ہو لیکن اب اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس نے شاید یہ بھی کہا تھا کہ دولت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ راحیلہ کا باپ کتنا ہی بااثر ہو اسے میرے فیصلے کے خلاف بولنے کی ہمت نہیں ہو سکے گی۔ دوسری یا تیسری شادی پر آنسو تو وہ عورتیں بہاتی ہیں جن کی روٹی چھن رہی ہو۔ راحیلہ کو میں نے سب کچھ دے دیا ہے۔ وہ اگر کہے گی تو اور بہت کچھ اس کے نام کر دوں گا۔ پھر بھی نہیں مانی تو طلاق کا راستہ کھلا ہے۔ وہ بہت آسان سمجھ رہا تھا لیکن اب نئی صورتِ حال سامنے آئی تو اسے مشکل کا اندازہ ہوا۔ اب اسے اس خطرے سے نمٹنا تھا اس کے بعد کوئی قدم اٹھانا تھا۔ لائبہ درمیان میں نہ ہوتی تو وہ کسی ہسٹری شیٹر سے ڈرنے والا نہیں تھا۔

لائبہ کے اسکول کی چھٹی کا وقت ہو گیا تھا۔ کرم نواز سے اس کی بات ہو چکی تھی لیکن اس نے پھر بھی یہ مناسب نہ سمجھا کہ وہ اسے لینے ہمیشہ کی طرح ڈرائیور کو بھیجے۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ خود بھی بیٹھا اور لائبہ کے اسکول پہنچ گیا۔ وہ لائبہ کو پرنسپل کے روم میں بیٹھا دیکھ کر اس طرح پریشان ہو گیا جیسے برسوں بعد اسے دیکھا ہو۔ آگے بڑھا اور لائبہ کو گود میں اٹھا لیا۔

''ڈیڈی، میں اب بچی نہیں ہوں جو مجھے گود میں اٹھا رہے ہیں اور وہ بھی میڈم کے سامنے۔''

''میری بچی تم ٹھیک تو ہو نا؟''

''ڈیڈی آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بخار تو آپ کو ہو رہا ہے۔ آپ کے ہاتھ کتنے گرم ہو رہے ہیں۔''

''ہاں مجھے کچھ ٹمپریچر ہو رہا ہے۔''

''آپ کیوں آ گئے۔ ڈرائیور انکل مجھے لے جاتے۔''

''بس کچھ ایسی بات تھی کہ مجھے آنا پڑا۔''

پرنسپل دونوں کی گفتگو سن رہی تھی اور لطف اندوز ہو رہی تھی۔

''آپ کی بیٹی اتنی ہی پیاری باتیں کرتی ہے جتنی پیاری یہ خود ہے۔''

''اس کی باتیں ہی تو اسے نظر لگا دیتی ہیں۔''

''سر، میں آپ سے ایک بات پوچھوں۔''

''پوچھیے۔''

''آپ کچھ گھبرائے ہوئے لگ رہے ہیں۔ اسے لینے بھی خود آئے ہیں، کوئی خاص بات؟''

''نہیں کوئی خاص بات نہیں، آئندہ بھی اسے لینے میں خود آؤں گا۔''

''جی بہتر۔''

وہ پرنسپل کو کیا بتاتا کہ اس کے ساتھ کیا گزر گئی ہے۔ اس نے لائبہ کو ساتھ لیا اور گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ لائبہ کو لے کر کہیں دور چلا جائے۔ راحیلہ کا کیا بھروسا۔ وہ اس کی سوتیلی ماں ہے اور کیا خبر اپنے باپ کے ساتھ ملی ہوئی ہو۔ جو کام ظالم خان نہ کر سکا وہ کر گزرے، مجھے لائبہ کے سائے کو بھی اس سے بچانا چاہیے۔ کرم نواز کو میری کمزوری کا علم ہو گیا ہے۔ اسے آئندہ جو بات بھی منوانی ہوگی وہ یہی حربہ استعمال کرے گا۔

وہ گھر تک پہنچا نہیں تھا کہ لائبہ کو ملک سے باہر بھیجنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ گھر پہنچ کر اس نے کرم نواز کو ایک مرتبہ پھر فون کیا اور اسے بتایا کہ وہ تیسری شادی کا ارادہ ترک کر چکا ہے لہٰذا اس کی بیٹی کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ کرم نواز نے بھی اسے یقین دلایا کہ جب تک وہ اپنے وعدے پر قائم ہے اپنی بیٹی کو محفوظ سمجھے۔

اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ سوچنے بیٹھ گیا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ آئندہ کا لائحہ عمل کس طرح ترتیب دینا ہے۔ وہ لائبہ کو ایک پل کے لیے بھی خود سے جدا کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن زندہ رہنے کے لیے اسے دور بھیجنا ضروری تھا۔ لائبہ ان بھیڑیوں کے ہاتھوں سے دور چلی جائے گی تو وہ کتنا طاقتور ہو جائے گا۔

وہ دوسرے دن لائبہ کو اسکول چھوڑتے ہوئے اپنے دفتر پہنچا تو رات بھر کے سوچے ہوئے خیالات اس کے ذہن میں تھے۔ اس نے منیجر کو اپنے کمرے میں بلوایا۔

''رضوان صاحب، میں جو بات آپ سے کہنے والا ہوں اسے راز میں رکھنا ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونا چاہیے۔''

''سر، آپ سے جو بھی تبادلۂ خیال ہوتا ہے وہ اپنے تک ہی رکھتا ہوں اور اب تو آپ نے تاکید کر دی ہے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ایک لفظ بھی باہر نکلے۔''

''میں لائبہ کو امریکا بھیجنا چاہتا ہوں۔ آپ وہاں کے مختلف اسکولوں سے خط کتابت کر کے معلومات حاصل کریں تاکہ میں یہ فیصلہ کر سکوں کہ اسے کس اسکول میں داخل کرانا ہے۔ بورڈنگ وغیرہ کے اخراجات کا بھی علم ہو جائے گا۔ جب یہ معلومات مجھے مل جائیں گی تو میں خود امریکا جاؤں گا اور لائبہ کو داخل کرا کے واپس آجاؤں گا۔ یاد رہے کہ یہ سفر میں بہ ظاہر بزنس کے لیے کروں گا۔''

''آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن لائبہ بی بی ابھی بہت چھوٹی ہیں۔''

''تم سے جتنا کہا جا رہا ہے صرف اتنا کرو۔''

''جی بہتر، میں آج ہی سے کام شروع کیے دیتا ہوں۔''

اس نے اپنے فیصلے کے اظہار میں حد درجہ رازداری برتی تھی۔ منیجر رضوان کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا لیکن تقریباً ایک ہفتہ بعد ہی راحیلہ کی زبان پر اس کے الفاظ آگئے۔

''میں نے سنا ہے آپ لائبہ کو ملک سے باہر بھیج رہے ہیں۔''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا۔'' وہ بوکھلاہٹ میں انکار کرنا بھول گیا۔

''اس کا مطلب ہے جو میں نے سنا ہے وہ درست ہے ورنہ آپ انکار کر سکتے تھے۔''

''اگر یہ درست بھی ہے تو تمہیں کسی نے تو بتایا ہوگا۔''

''مجھے کسی نے بھی بتایا، کیا یہ حقیقت نہیں کہ آپ اسے مجھ سے دور کر رہے ہیں۔''

''وہ وہاں تفریح کرنے نہیں جا رہی ہے۔ میں اسے تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیج رہا ہوں۔ وہ میری بیٹی ہے۔ اس کے حق میں جو بہتر سمجھ رہا ہوں وہ کر رہا ہوں۔''

''میں نے اسے پیدا نہیں کیا لیکن پالا تو ہے۔ مجھے اس سے محبت تو ہے۔ میری اپنی تو کوئی اولاد ہے نہیں۔ ایک لائبہ ہے اسے بھی آپ مجھ سے دور کیے دے رہے ہیں۔''

''میں جو بھی کروں، تم دخل دینے والی کون ہوتی ہو۔''

''میں آج تک آپ سے کسی بات پر نہیں لڑی لیکن اب لڑوں گی۔ جس طرح بھی ہوا اسے روکوں گی۔ ایک ماں سے آپ اس کی اولاد نہیں چھین سکتے۔ وہ میری اولاد ہے وہ بھی میرے بغیر نہیں رہ سکتی۔''

راحیلہ جیسی مضبوط اعصاب کی عورت کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ اعجاز احمد کے آگے ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔ گڑگڑا رہی تھی، لائبہ کی بھیک مانگ رہی تھی۔

اعجاز احمد حیران تھا۔ وہ ابھی تک راحیلہ کی مکاری پر ہنس رہا تھا لیکن اس کے آنسو کوئی اور ہی تصویر پیش کرنے لگے تھے۔ وہ رونے جیسی شکل بنا سکتی تھی لیکن اتنی بڑی اداکارہ نہیں تھی کہ آنکھوں میں آنسو بھی لے آتی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ پس منظر سے واقف نہیں اور لائبہ سے واقعی محبت کرتی ہے۔ یہی وہ وقت تھا کہ اعجاز احمد حقیقت حال بتا کر اسے باپ کے خلاف بھڑکا سکتا تھا۔ اس نے اپنی محبت جتانے کے لیے اس کے آنسو پونچھے اور اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔

''مجھے معلوم ہے اس وقت تمہارے جذبات کیا ہیں لیکن جو حالات ہو گئے ہیں اس میں یہی راستہ بچا ہے کہ میں لائبہ کو دشمنوں کی دسترس سے باہر بھیج دوں۔ اس کی جان کو خطرہ ہے۔ اس کے اغوا کی دھمکی دی گئی ہے۔ دھمکی دینے والا کوئی اور نہیں تمہارا باپ کرم نواز ہے۔''

''آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ڈیڈی ایسا کیوں کریں گے۔''

''انہوں نے ایسا کیا ہے۔ انہوں نے اپنا پالتو غنڈا میرے پاس بھیجا تھا جو مجھے دھمکا کر گیا ہے۔''

''ہو سکتا ہے اس غنڈے کی آپ سے کوئی دشمنی ہو اور اس نے ڈیڈی کا نام لے دیا ہو۔''

''پہلے میں نے بھی یہی سوچا تھا لیکن جب میں نے کرم نواز کو فون کیا تو تصدیق ہو گئی کہ یہ گھٹیا حرکت انہی کی ہے۔''

''اف میرے خدا!'' اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ ''ڈیڈی کو یہ سب کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ آپ نے وجہ تو معلوم کی ہوتی، وہ لائبہ کو نقصان پہنچانے کے کیوں درپے ہیں۔''

''تمہیں معلوم ہے میری کتنی خواہش ہے کہ میں ایک بیٹے کا باپ بنوں اور تم یہ بھی جانتی ہو کہ تم اولاد پیدا نہیں کر سکتیں۔ اسی لیے میں ایک شادی اور کرنے کے حق میں ہوں۔ لائبہ لڑکی ہے، ایک لڑکا ہونا ضروری ہے تاکہ وہ میرے بڑھاپے تک اس قابل ہو جائے کہ کاروبار سنبھال سکے۔ میرے اس ارادے کی خبر نہ جانے کیسے تمہارے باپ کو ہو گئی۔ انہوں نے مجھے اس شادی سے روکنے کے لیے یہ گھٹیا قدم اٹھایا ہے۔ میں اگر شادی کر رہا ہوں تو گناہ نہیں کر رہا۔ میرے پاس اتنی دولت ہے کہ ایک کیا کئی شادیوں کا بوجھ اٹھا سکتا ہوں۔''

''آپ ڈیڈی ہی کو کیوں قصوروار ٹھہرا رہے ہیں۔ ایک باپ کی حیثیت سے اس خبر کا ان پر منفی اثر ہوا ہوگا۔ انہوں نے محض آپ کو دھمکانے کے لیے آپ کے پاس کسی کو بھیجا ہوگا۔''

''میں ان کا دیا ہوا نہیں کھاتا۔ انہیں کیا حق ہے کہ وہ میرے ذاتی معاملات میں دخل دیں۔''

''آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ یہ صرف آپ کا معاملہ نہیں، ان کی بیٹی یعنی میرا معاملہ بھی ہے۔''

''اگر وہ شریف آدمی ہوتے تو بیٹھ کر مجھ سے بات کرتے۔ یہ کیا طریقہ ہے۔''

''ہاں اتنی بات آپ کی درست ہے۔ میں ان سے بات کروں گی۔ وہ آپ سے معذرت کریں گے ورنہ میں ان سے قطع تعلق کر لوں گی۔''

''انہوں نے جن لوگوں کا سہارا لیا ہے ان کی نفسیات کو تم نہیں جانتیں۔ آج وہ کرم نواز کے کہنے پر آئے تھے کل وہ خود آئیں گے۔ جب تک لائبہ یہاں رہے گی وہ مجھے بلیک میل کرتے رہیں گے۔ اب لائبہ کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔''

''اگر اب آپ نے لائبہ کو باہر بھیجنے کی بات کی تو کوئی غنڈا نہیں میں آپ کے راستے میں کھڑی ہو جاؤں گی۔''

''اب یہ تمہارے اوپر ہے تم مجھے شادی کی اجازت دے دو۔ لائبہ کو میں باہر نہیں بھیجوں گا۔ تمہارا باپ دخل اندازی نہ کرے۔''

''شادی کا معاملہ میرا اور تمہارا ہے۔ اس سے ہم بعد میں نمٹ لیں گے فی الحال تو لائبہ کا معاملہ سامنے ہے۔ آپ مجھے اجازت دیں کہ ڈیڈی سے مل کر انہیں مجبور کروں کہ وہ آپ سے اپنے رویے پر معذرت کریں۔''

اعجاز احمد نے بھی بات کو یہیں ختم کرنا مناسب سمجھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کرم نواز کا طرز عمل کیا ہوتا ہے۔ اسے یہ خوشی ہو رہی تھی کہ وہ راحیلہ کو اس کے باپ کے خلاف بھڑکانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

اس کی خوشی نے اس کے دل میں ابھی روشنی اتاری ہی تھی کہ گھپ اندھیرا پھیل گیا۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ راحیلہ تک یہ خبر پہنچی کیسے؟ میں نے صرف رضوان کے سامنے اس منصوبے کا ذکر کیا تھا۔ تو کیا رضوان، راحیلہ سے ملا ہوا ہے؟ اس نے اگر راحیلہ سے ہمدردی جتائی ہے تو بھی وہ بھروسے کے لائق نہیں۔ اس سے پہلے شادی کا منصوبہ بھی کرم نواز تک پہنچ گیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کوئی اندر کی خبریں باہر پہنچاتا ہے۔ کرم نواز نے میرے کچھ لوگ خریدے ہوئے ہیں۔ یہ دو واقعات تو میرے علم میں آگئے اور نہ جانے کیا کیا باتیں راحیلہ اور کرم نواز تک پہنچی ہوں گی۔ میرے تو کاروباری راز بھی میں سمجھتا ہوں محفوظ نہیں۔ رضوان اکیلا ہے یا کچھ اور لوگ بھی ہیں۔ کسی اور کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن رضوان تو اس وقت رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔ پرانے لوگوں میں وہی ایک ہے جسے میں نے اب تک نہیں نکالا۔ اس سے پوچھ گچھ ضروری ہے۔

دوسرے دن وہ لائبہ کو اسکول چھوڑتے ہوئے دفتر پہنچا تو سب سے پہلا کام یہی کیا کہ رضوان کو اپنے کمرے میں بلوایا۔

''مسٹر رضوان، کیسے کچھ کام آگے بڑھا؟''

''کس سلسلے میں سر؟''

''میں نے لائبہ کے داخلے کے سلسلے میں آپ سے کچھ کہا تھا۔''

''سر، میں نے خط لکھ دیے ہیں۔ جونہی وہاں سے لٹریچر آیا میں آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔''

''اچھا یہ بتائیے، آپ نے کسی سے اس کا ذکر تو نہیں کیا۔''

''میری کیا مجال جب آپ نے منع فرما دیا تھا۔''

''میں نے آپ کے سوا کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا تھا لیکن مجھے حیرت ہوئی جب میرے بتائے بغیر اس کا علم راحیلہ کو ہو گیا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کے بتائے بغیر اسے کس طرح علم ہو گیا۔''

''آپ قسم لے لیں۔ میں نے ایک لفظ بھی کسی سے نہیں کہا۔''

''لکھ کر دیا ہوگا۔''

''میں اپنی تحریر کیوں چھوڑوں گا۔'' اس کی آواز میں لرزش تھی۔ ''ہوسکتا ہے میرے علاوہ بھی اس وقت آپ کے کمرے میں کوئی موجود ہو۔''

''اور آپ نے کہا جو چھو سن رہا ہے تو سننے دو۔ جب آپ اتنے بے خبر ہیں تو میرے ساتھ رہنے کی ضرورت نہیں۔ آپ اکاؤنٹس مین جا کر اپنا حساب کر لیں۔''

''تو کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ نے مجھے نوکری سے نکال دیا ہے؟''

''آپ کو اب بھی کچھ سمجھنے کی ضرورت ہے؟''

''سر! مجھ پہ ظلم نہ کریں۔''

''مجھے خوشامد سے نفرت ہے۔ چلے جائیے۔''

رضوان کچھ دیر سر جھکائے کھڑا رہا اور پھر کمرے سے نکل گیا۔

☆☆☆

کرم نواز کی وسیع و عریض کوٹھی کے انڈر گراؤنڈ کمروں میں سے ایک میں کرم نواز، رضوان اور ظالم خان جمع تھے۔ اس وقت چونکہ کرم نواز گھر پر تھا اس لیے اس کے گارڈ غیر معمولی نگرانی کا فرض انجام دے رہے تھے۔ ابھی ابھی انسپکٹر فیاض یہ خبر پہنچا کر گیا تھا کہ ظالم خان کی گرفتاری کے لیے جگہ جگہ چھاپے مارے جا رہے ہیں۔ وہ جب تک یہاں پناہ لیے رہے گا محفوظ رہے گا۔ اس وقت ظالم خان ہی موضوع بحث بنا ہوا تھا۔ اسے یہ یقین دلایا جا رہا تھا کہ موقع ملتے ہی اسے شہر سے باہر فرار کرا دیا جائے گا۔

کمرے میں لگا اطلاعی بلب روشن ہوگیا۔ اس کا مطلب تھا کہ کوئی آیا ہے۔ خودکار دروازے کو جنبش ہوئی اور توقع کے مطابق راحیلہ اندر داخل ہوئی۔ دروازہ بند ہوگیا۔

''راحیلہ ان کاموں میں کوئی اتنی دیر لگاتا ہے۔ کب سے تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔''

''میں آپ کا فون سنتے ہی روانہ ہوگئی تھی۔ راستے میں ٹریفک اتنا تھا کہ بس نہ پوچھیے۔''

''تمہیں کچھ معلوم ہوا؟''

''کس بارے میں؟''

''مسٹر رضوان کو تمہارے میاں نے نوکری سے نکال دیا ہے۔''

''نہیں مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں لیکن جو اطلاع انہوں نے ہمیں فراہم کی ہے اس کا نتیجہ یہی ہونا تھا۔ بہر حال ان کی نوکری سے اہم وہ اطلاع ہے ورنہ ہمیں معلوم بھی نہیں ہوتا اور لائبہ باہر جا چکی ہوتی۔ اب ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم ان کی نوکری کا بندوبست کریں۔''

''میں نے ان سے کہہ دیا ہے۔ کل ہی میں ان کے لیے کچھ کرتا ہوں۔'' کرم نواز نے کہا۔ ''میں پریشان تو اس لیے ہوں کہ اب اندر کی باتیں ہمیں کون پہنچائے گا۔''

''اس کی آپ فکر نہ کریں بکنے والے بہت ہوتے ہیں۔ کسی کو بھی خرید لیں گے۔ اس وقت تو ہمیں یہ سوچنا ہے کہ اعجاز کو اس کے ارادے سے کیسے باز رکھا جائے۔ میں نے اپنے آنسوؤں سے اسے وقتی طور پر روک تو لیا ہے لیکن وہ ابھی تک آپ کی طرف سے خطرہ محسوس کر رہا ہے۔ کسی وقت بھی لائبہ کو باہر بھیج دے گا۔''

''بھیجتا ہے تو بھیج دے۔ میرے پاس اسے بلیک میل کرنے کے لیے اور بہت کچھ ہے۔ اس کے لیے ظالم خان کی دہشت ہی بہت ہے۔''

''سچی بات تو یہ ہے کہ میں نہیں چاہتی کہ لائبہ مجھ سے دور ہو۔ میں اسے اپنے پاس رکھنا چاہتی ہوں۔ میری ممتا کو تسکین ملتی ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں کسی کو بھیج کر اسے کہلوا دیتا ہوں کہ وہ لائبہ کو باہر بھیجنے کی غلطی نہ کرے۔''

''ڈیڈی آپ ہر وقت طاقت کے استعمال کا کیوں سوچتے ہیں۔ اس وقت مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اس سے ملاقات کریں اور اپنے رویے پر معذرت کریں۔''

''اس سے کیا ہوگا۔''

''اس سے یہ ہوگا کہ اس کے دل سے خوف نکل جائے گا۔ میری اور آپ کی طرف سے اس کا دل بھی صاف ہوجائے گا۔ دشمن کو غافل کر کے آسانی سے مارا جاتا ہے۔ میں آہستہ آہستہ اس کی دولت پر ہاتھ صاف کر رہی ہوں۔ دولت ہی اس کی بڑی طاقت ہے۔ اگر اس کے بعد اس نے شادی کر بھی لی تو وہ کمزور ہو چکا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے، میں تمہاری خاطر یہ ذلت بھی برداشت کیے لیتا ہوں لیکن اگر اس نے ملنے سے انکار کر دیا تو یہ توہین میں برداشت نہ کرسکوں گا۔''

''وہ اتنا خوف زدہ ہے کہ ملاقات ہی میں عافیت سمجھے گا۔''

''میں یہ کبھی نہیں چاہوں گا کہ وہ تم پر سوکن لائے اور تمہاری دولت کا بٹوارہ ہو۔''

''یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ اوّل تو میں اسے شادی

کرنے نہیں دوں گی اور اگر کر بھی لی تو اس وقت تک اس کی آدھی دولت ہتھیا چکی ہوں گی۔''

''ٹھیک ہے، تم ملاقات کا انتظام کرو۔ میں اس ناپسندیدہ آدمی سے ملنے کو تیار ہوں۔''

''میں اس سے بات کر کے آپ کو فون کر دوں گی۔''

ظالم اب تک خاموش بیٹھا تھا لیکن اب خاموش نہ رہ سکا۔

''آپ لوگ اپنا عقل لڑا چکا اب ام کچھ بولتا ہے۔''

''کہو خان تم کیا کہتے ہو۔''

''جب تک بچی نہیں اٹھے گا وہ آپ لوگوں کو پاگل بناتا رہے گا۔ آپ بولو تو شیر و کو بھیج کر بچی اٹھوالوں۔''

''وہ آج کل لائبہ کو اسکول چھوڑنے اور لینے خود جاتا ہے۔'' راحیلہ نے کہا۔

''شیر و زنخا نہیں ہے جو ڈر جائے گا۔ آپ حکم بولو، بچی کو اسکول کے اندر سے اٹھا کر لے آئے گا۔ پولیس کا باپ بھی بچی کو ڈھونڈ نہیں سکے گا۔''

''نہیں خان نہیں۔ راحیلہ ٹھیک کہتی ہے۔ جب سیدھی انگلیوں سے گھی نکل رہا ہے تو انگلی ٹیڑھی کیوں کی جائے۔''

ظالم خان اس فیصلے سے خوش نہیں تھا لیکن کرم نواز کے فیصلے کی زیادہ مخالفت بھی نہیں کرسکتا تھا۔

☆☆☆

کرم نواز اس کا خسر ہونے کے باوجود کچھ نہیں تو دو سال بعد اس کے گھر آیا تھا۔ جب سے اعجاز احمد کو یہ معلوم ہوا تھا کہ کرم نواز غیر قانونی دھندوں میں ملوث ہے اس نے کرم نواز سے ملنا جلنا بند کر دیا تھا۔ کرم نواز کے پاس بھی اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اس کے گھر کے چکر کاٹتا پھرنے۔ اس کے لیے یہی بہت تھا کہ اس کی بیٹی خوش ہے۔ اس نے بیٹی کے گھر آنا بند کر دیا تھا لیکن ایسا انتظام ضرور کر دیا تھا کہ ایک ایک پل کی خبر اس تک پہنچتی رہے۔ اس کی غیرت اب بھی یہ گوارا نہیں کر رہی تھی کہ وہ معذرت کرنے اعجاز کے گھر جائے لیکن مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ کچھ دیر کے لیے غیرت کی آنکھیں بند رکھے۔ اپنی آنکھوں سے نکلنے والے شعلوں کو بجھا دے۔ اعجاز احمد کی آنکھوں میں البتہ ابھی تک نفرت کے چراغ جل رہے تھے۔ یہ چراغ کرم نواز نے معذرت کی ہوا سے بجھا دیے۔

''اعجاز احمد مجھے معلوم ہے تم مجھ سے خفا ہو۔ تمہیں ہونا بھی چاہیے۔ مجھے اگر تمہاری شادی پر اعتراض بھی تھا، تو تم سے خود بات کرنی چاہیے تھی۔ کسی کو بھیج کر میں نے بہت بڑی غلطی کی۔ اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔''

''آپ کے بھیجے ہوئے دو کوڑی کے غنڈے نے میری جو بے عزتی کی ہے اس کا کوئی ازالہ ہوسکتا ہے؟ اسے آپ کی حمایت حاصل نہ ہوتی تو اس کی اتنی ہمت ہوتی؟''

''میں نے کہا نہ میں سخت شرمسار ہوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں تمہاری بیٹی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ راحیلہ تمہاری بیٹی سے بہت پیار کرتی ہے اسے لائبہ سے جدا مت کرو۔''

''تو اب مجھے یہ وعدہ کرنے کی ضرورت نہیں کہ میں تیسری شادی نہیں کروں گا۔''

''دیکھو اعجاز احمد، میں ایک باپ کی حیثیت سے یہ نہیں چاہوں گا کہ تم میری بیٹی پر سوکن لاؤ لیکن یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں آپس کے اختلافات میں تمہاری بیٹی کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ ویسے بھی یہ مجھ سے زیادہ راحیلہ کا معاملہ ہے۔ تم اس سے بات کرو، اگر تم یہ چاہو کہ میں خوشی سے اجازت دے دوں تو یہ کیسے ہوگا۔''

اعجاز احمد نے بھی سوچا کہ لائبہ کی حفاظت کا معاملہ زیادہ اہم ہے۔ اس وقت اسی پر تکیہ کیا جائے۔ میں راحیلہ کو منانے کی کوشش کروں گا۔ کرم نواز خود چل کر میرے پاس آیا ہے۔ اس وقت اس کی معذرت قبول کر لینی چاہیے۔

یہ معاملہ اتنے احسن طریقے سے نمٹ جائے گا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ یہاں تک پہنچنے میں راحیلہ کا کردار بھی نظر انداز نہیں کرسکتا تھا۔ وہ لائبہ کو بہت چاہتی ہے۔ اسی لیے تو اس نے اپنے باپ کا سر میرے سامنے جھکا دیا۔ میں اگر شادی نہ کروں تو وہ مجھ سے بہت خوش رہے گی لیکن ایک بیٹے کی آرزو کا کیا ہوگا؟

وہ دو کشتیوں میں سوار ہوگیا تھا۔ ایک طرف راحیلہ کی محبت اس کے دل میں پیدا ہوگئی تھی۔ دوسری طرف بیٹے کا سوال تھا جو وہ اسے نہیں دے سکتی تھی۔

اس نے اس وقت یہی سوچا کہ کچھ دنوں کے لیے شادی کا خیال دل سے نکال دے۔ یہ دیکھے کہ کرم نواز کس حد تک اپنے وعدے پر قائم رہتا ہے۔ اس عرصے میں راحیلہ پر نوازشوں کی بارش کرتا رہے شاید وہ خوش ہو کر شادی کی اجازت دیدے۔

وہ کرم نواز کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد راحیلہ کو مٹھی میں لینے کی کوشش کرنے لگا۔ لائبہ کے اسکول کی چھٹیاں ہوگئیں تو وہ راحیلہ اور لائبہ کو لے کر ورلڈ ٹور پر نکل گیا۔ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ لائبہ کو خوش کر رہا ہے یا راحیلہ کو۔ وہ کسی کو بھی خوش کر رہا ہو لیکن خوش راحیلہ ہو رہی تھی۔ اعجاز سے شادی کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب وہ اس

کے ساتھ سفر پر نکلی تھی۔

سفر سے واپس آئی تو اس میں بہت سی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ اعجاز کی طرف سے اس کے دل میں ایسا نرم گوشہ پیدا ہو گیا تھا جس کا اظہار بار بار ہو رہا تھا۔ اعجاز اس جنت کو اجاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ شادی کا نام سنتے ہی وہ بھڑک اٹھے گی۔ اس لیے وہ اس سے شادی کے متعلق بات کرتے ہوئے جھجکتا رہا۔

لائبہ اپنے باپ کی الجھنوں سے بے خبر عمر کی منزلیں طے کرتی ہوئی ہائی اسکول تک آگئی۔ اب اعجاز احمد کو محسوس ہوا کہ وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنا دے۔ اس نے طے کر لیا کہ اب وہ راحیلہ سے دو ٹوک بات کرے گا۔

وہ اس وقت راحیلہ کے ساتھ بیڈ روم میں تھا۔ لائبہ اپنے کمرے میں تھی۔ اسے ابھی ابھی فون پر ایک بڑی ڈیل کی خبر ملی تھی۔ اس ڈیل سے اسے لاکھوں کا منافع ہو سکتا تھا۔ راحیلہ بھی سن رہی تھی۔ اعجاز نے جیسے ہی فون رکھا، راحیلہ نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"کتنے دنوں سے میں ڈائمنڈ کے سیٹ کی ضد کر رہی ہوں۔ اب آپ کو میری ضد پوری کرنی پڑے گی۔ اب یہ مت کہہ دینا کہ کاروبار میں گھاٹا ہو رہا ہے۔"

"میں تمہاری فرمائش ضرور پوری کروں گا لیکن تمہیں بھی میری ایک بات ماننی ہوگی۔"

"میں نے آپ کی کوئی بات کبھی ٹالی ہے؟"

"ایک بات ایسی ہے جو تم ہمیشہ ٹالتی رہی ہو۔"

"میں آپ کو شادی تو ہرگز نہیں کرنے دوں گی۔"

"دیکھو راحیلہ، میں شادی اس لیے نہیں کرنا چاہتا کہ تم مجھے پسند نہیں ہو بلکہ اس کی وجہ تم جانتی ہو، مجھے بیٹے کی خواہش ہے۔ اگر تم سے اولاد ہو سکتی تو میں یہ قدم ہرگز نہ اٹھاتا۔"

"میں کوئی دلیل سننے کی روادار نہیں ہوں۔ اگر آپ نے شادی کی تو میں ڈیڈی کو روک نہیں سکوں گی۔"

"وہ مجھ سے معاہدہ کر چکے ہیں۔ لائبہ کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔"

"معاہدہ آپ توڑ رہے ہیں۔"

"اجازت میں تم سے مانگ رہا ہوں۔ ڈیڈی درمیان میں کہاں سے آگئے۔"

"میں اجازت نہیں دوں گی۔ اگر آپ نے شادی کی تو میں نے آپ سے کوئی معاہدہ نہیں کیا ہے۔ لائبہ کو اغوا میں بھی کرا سکتی ہوں۔"

اس کے بعد دونوں طرف خاموشی ہو گئی۔ راحیلہ کو جو کچھ کہنا تھا اس نے کہہ دیا۔ اعجاز کو جو کچھ سننا تھا اس نے سن لیا۔

دو چار مرتبہ اعجاز نے ہمت کر کے پھر بات چھیڑی لیکن وہی ڈھاک کے تین پات۔ پہلے سے بھی سخت جواب ملا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ راحیلہ موم کی بنی گڑیا نہیں۔ اگر اس کے ساتھ زبردستی کی گئی تو وہ بپھری ہوئی ناگن بن جائے گی۔ عدالت سے تو میں نمٹ لوں گا لیکن کرم نواز کے غنڈوں سے کون نمٹے گا۔ سب کہتے ہیں جان ہے تو جہان ہے۔ وہ کہہ رہا تھا لائبہ ہے تو جہان ہے۔ اب وہ سیانی ہو گئی ہے۔ اغوا ہوئی تو عمر بھر کی بدنامی کا داغ لگ جائے گا۔ اس نے شادی کا خیال دل سے نکال دیا۔ اب لائبہ ہی اس کا بیٹا تھی۔

راحیلہ کی طرف سے اس کے دل میں پھر گرہ پڑ گئی تھی۔ راحیلہ بھی اس سے کھنچی کھنچی رہنے لگی تھی۔ یہ عورت کسی بھی وقت اسے تباہ کر سکتی ہے۔ ایک دولت ہی ہے جو میری طاقت ہے۔ یہ عورت مجھے کمزور کرنے میں دیر نہیں لگائے گی۔ یہ خیال اسے اس لیے آیا کہ کچھ دنوں سے راحیلہ کی فضول خرچیاں بڑھ گئی تھیں۔ اسے یقین اس وقت آیا جب روبی جیولرز کا مالک اس کے آفس آیا اور اسے بتایا کہ راحیلہ نے اس کی دکان سے ڈائمنڈ کا سیٹ خریدا ہے۔

"انہوں نے فرمایا تھا کہ پے منٹ آپ کر دیں گے۔"

بات عزت کی تھی۔ وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ تم نے میری اجازت کے بغیر سیٹ کیوں اسے فروخت کیا۔ پے منٹ سے انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آئندہ وہ اس کے ہاتھوں کوئی چیز فروخت نہ کرے۔ بس دبے لفظوں میں اتنا کہہ سکا کہ عورتوں کو تو تم جانتے ہی ہو۔ کاروبار کے اتار چڑھاؤ کو تو دیکھتی نہیں ہیں اور فرمائشیں کرتی رہتی ہیں۔ آئندہ فون پر مجھے بتا دیا کرنا۔ چیک کاٹ کے جیولر کو دے دیا۔

گھر پہنچ کر ہلکی سی تکرار ہوئی لیکن جب لائبہ بھی ماں کی حمایت میں بولنے لگی تو اسے ہنس کر چپ ہو جانا پڑا۔ لائبہ کو راحیلہ نے اپنی مٹھی میں کر لیا تھا۔ اس لیے اعجاز کو دبنا پڑتا تھا۔

☆☆☆

"ڈیڈی میں راحیلہ بول رہی ہوں۔"

"ہاں بیٹا بولو۔ کیا بات ہے۔"

"ڈیڈی وہ کنجوس آدمی اب بہت ہاتھ پاؤں چلانے لگا ہے۔ میرے اخراجات پر نظر رکھتا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ بالکل ہی دامن سمیٹ لے اس کا کچھ انتظام کیجیے۔"

"تم ہی نے کہا تھا میں اسے نہ چھیڑوں۔"

"اب نہیں کہہ رہی ہوں۔ اس سے پہلے کہ وہ میری سائٹ والی فیکٹری کے دوسرے کاغذات بنوا کر بیچ دے۔ آپ اسے بچنے کا بندوبست کریں۔"

"ایک فیکٹری کیا میں تو ایسا بندوبست کر رہا ہوں کہ ایک ایک کر کے اس کی ساری فیکٹریوں پر تالے ڈلوا دوں گا۔"

"وہ میری فیکٹری کی تاک میں لگا ہوا ہے۔"

"تم اسے میرے ہاتھوں بیچ دو۔ میں اپنے آدمی وہاں بٹھا دوں گا۔ پھر اعجاز کی کیا مجال جو ان سے الجھے، کسی اور کے ہاتھ بیچی تو وہ انہیں ڈرا دھمکا کر قبضہ چھڑا لے گا یا عدالت میں جائے گا کیونکہ اس نے جب یہ فیکٹری تمہارے نام کی تھی تو کاغذات میں ایک شق یہ بھی تھی کہ اس کی رضامندی کے بغیر اسے نہیں بیچ سکو گی۔ میرے خلاف وہ عدالت میں نہیں جائے گا اور گیا تو صرف جائے گا، واپس نہیں آئے گا۔"

دونوں میں سودا طے ہو گیا۔ رقم راحیلہ کے اکاؤنٹ میں منتقل ہو گئی۔

فیکٹری ہاتھ سے چلی گئی ہے اس کا علم اعجاز کو ایک مہینے بعد ہوا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ خریدنے والا کرم نواز ہے۔ اس نے کیوں خریدی ہے یہ سمجھنے میں اسے دیر نہیں لگی کیونکہ جب وہ راحیلہ سے الجھا تو اسی دن ایک گمنام فون اسے موصول ہو گیا۔ کہنے والا کہہ رہا تھا کہ اگر وہ عدالت گیا تو اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ یہ فون کس کے کہنے پر کیا جا رہا ہے۔

راحیلہ کی نیت اس پر ظاہر ہو گئی تھی۔ وہ اتنی خودسر ہو گئی ہے کہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ وہ کرم نواز کے زور پر کود رہی تھی اور وہ اس سے لڑ نہیں سکتا تھا۔ جنگ کے دو ہی طریقے ہوتے ہیں یا تو حملہ کیا جاتا ہے یا اپنا دفاع کیا جاتا ہے۔ اس نے دفاع کا راستہ اختیار کیا اور اپنی دولت آہستہ آہستہ ملک سے باہر منتقل کرنی شروع کر دی لیکن اس رازداری کے ساتھ کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔

اس رازداری کے باوجود عین ممکن تھا کہ کرم نواز کو اس کی بھنک پڑ جاتی لیکن وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا۔ خود آپ اپنے دام میں صیاد آگیا والا معاملہ ہو گیا۔ کرم نواز اور ظالم خان کے ایک ساتھی کے درمیان چیونٹ کے لین دین پر جھگڑا ہوا۔ جس نے اس کے سینے میں ایک ساتھ کئی گولیاں اتار دیں۔

یہ اطلاع اسے دفتر پہنچتے ہی اخبار کے ذریعے ملی تھی، کسی کی موت پر خوش ہونا نہیں چاہیے لیکن اسے خوشی ہوئی تھی۔ اس کا ایک بڑا دشمن راستے سے ہٹ گیا تھا۔ خبر پڑھتے ہی اسے راحیلہ کا خیال آیا۔ وہ تو ابھی سو رہی ہوگی۔ اس تک یہ خبر کہاں پہنچی ہوگی۔ اس نے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن پھر ہاتھ کھینچ لیا۔ فون پر یہ خبر سناتا ہوا کیا اچھا لگوں گا۔ کرم نواز جیسا بھی تھا اس کا باپ تھا، مجھے اس سے تعزیت کرنی چاہیے۔ اس نے ڈرائیور کو بلایا اور دوبارہ گھر پہنچ گیا۔ راحیلہ ابھی تک سو رہی تھی۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ کمرے میں آہٹ ہوتے ہی راحیلہ کی آنکھ کھل گئی ورنہ اسے جگانا مشکل ہو جاتا۔

"آپ ابھی تک گئے نہیں؟"

"آج جی چاہ رہا تھا کہ تمہارے ساتھ ناشتا کروں۔ اس کے بعد جاؤں۔"

"آپ جائیں، ابھی مجھے ناشتے کی ٹیبل تک پہنچنے میں آدھا گھنٹا لگ جائے گا۔"

"میں انتظار کر لوں گا۔"

وہ بستر سے اٹھی اور واش روم کی طرف چلی گئی۔ تیار ہو کر نکلی تو واقعی آدھا گھنٹا سے زیادہ ہو چکا تھا۔ وہ ناشتے کے دوران کوئی بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ناشتے کے دوران بھی وہ یہی سوچتا رہا کہ وہ راحیلہ کو یہ اندوہناک خبر کیسے سنائے۔ اس کی یہ مشکل ٹیلی فون کی گھنٹی نے حل کر دی۔ شیف ناشتا لگانے کے بعد ٹیبل کے قریب ہی ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا تھا کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو وہ فوراً حاضر کر دے۔ فون کی آواز سنتے ہی وہ فون اٹھانے کے لیے بڑھا لیکن راحیلہ نے اسے روک دیا۔ یہ شاید وہی وقت تھا جب اعجاز کے چلے جانے کے بعد کرم نواز راحیلہ کو فون کر لیتا تھا۔ اس لیے راحیلہ نے مناسب سمجھا کہ وہ فون خود اٹھائے۔ اس نے فون اٹھایا۔ ادھر سے کوئی ایسی اطلاع ملی تھی کہ فون اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اعجاز بھی اٹھ کر بھاگا اور راحیلہ کو گرنے سے بچا لیا۔

"ڈیڈی کو کسی نے گولی مار دی ہے۔" وہ اتنا کہہ سکی اور قریب پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"مجھے معلوم ہو گیا تھا۔ اسی لیے میں آفس سے واپس آگیا تھا۔ ناشتے کے بعد تمہیں بتانے والا تھا۔ صبر کرو۔ ہم ابھی چلیں گے، جا کر صورتِ حال معلوم ہوگی۔"

☆☆☆

منظر تبدیل ہو گیا تھا۔ اس کا سب سے بڑا دشمن راستے سے ہٹ گیا تھا۔ اب اسے روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ اب وہ شادی کر سکتا تھا لیکن راحیلہ اپنی الجھنوں میں گھری ہوئی تھی۔ اس وقت اس سے بات کرنا مناسب نہیں تھا۔ وہ اب تک یہی سمجھ رہی تھی کہ باپ کے مرنے کے بعد تمام دولت اس کے

ہاتھ آ جائے گی لیکن نئی صورت حال یہ پیدا ہوگئی تھی کہ اس کے دونوں بھائی امریکا سے آ گئے تھے۔ برسوں سے انہوں نے خبر نہیں لی تھی لیکن اب کرم نواز کی جائداد ہتھیانے کی فکر میں تھے۔ کرم نواز کی بدبختی تھی کہ اس نے زندگی میں کوئی وصیت نہیں کی تھی جس کا نتیجہ اب راحیلہ کو بھگتنا پڑ رہا تھا۔ اس کے بھائی اسے ایک دھیلا دینے کو تیار نہیں تھے۔ اس نے بھائیوں کے خلاف عدالت میں جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اعجاز احمد کو معلوم تھا کہ ایسے مقدمات کا اتنی جلدی فیصلہ نہیں ہوتا۔ اس لیے اسے خود اس کے بھائیوں سے ملنا پڑا تاکہ وہ انہیں راحیلہ کا حصہ دینے پر راضی کر سکے۔ راحیلہ بضد تھی کہ وہ عدالت میں یہ ثابت کرے گی کہ کرم نواز نے اپنے بیٹوں کو عاق کر دیا تھا، اس لیے جائداد پر ان کا حق نہیں۔ اعجاز احمد اسے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ عاق کر دینے کے بعد بھی بیٹوں کو ان کا حق دینا پڑتا ہے۔ اگر کرم نواز اپنی زندگی میں کوئی وصیت کر جاتے یا جائداد کا کچھ حصہ تمہارے نام کر جاتے تو وہ الگ بات تھی اب تو جو کچھ ملے اسی پر اکتفا کرو، تم کہو تو میں تمہارے بھائیوں سے بات کروں۔

راحیلہ کو راضی کرنے میں اسے کئی مہینے لگ گئے۔ پھر بھائیوں کا مسئلہ تھا۔ راحیلہ کا حق کروڑوں میں بنتا تھا۔ اس کے بھائی تیار نہیں ہو رہے تھے بڑی مشکل سے انہیں تیار کیا۔ اس میں بھی چند مہینے لگ گئے۔

لائبہ کا رزلٹ آ چکا تھا۔ اس نے میٹرک میں فرسٹ ڈویژن لی تھی۔ اب اسے کسی اچھے کالج میں داخل کرانے کا مرحلہ تھا۔ نمبر اتنے اچھے تھے کہ اسے کسی بھی کالج میں داخلہ مل سکتا تھا۔ اعجاز احمد کا اصرار تھا کہ وہ آئی کام کرے۔ کامرس پڑھے گی تو اسے بزنس کا شعور آئے گا۔ اس کے بزنس کی دیکھ بھال کر سکے گی لیکن لائبہ کا مزاج شاعرانہ تھا۔ چھپ چھپ کر شاعری بھی کرتی رہی تھی۔ اعجاز احمد نے اسے لاکھ سمجھایا کہ شوق اپنی جگہ ہے کاروبار اپنی جگہ۔

"بیٹا تمہارا کوئی بھائی نہیں ہے۔ میرے بعد میرے کاروبار کو تمہیں سنبھالنا ہے۔ تم بی کام کرو تاکہ تمہیں آسانی ہو۔"

"اگر میں بھی نہ ہوتی تو بھی آپ کے کاروبار کو کوئی سنبھالتا یا نہیں۔ آپ سمجھیں میں نہیں ہوں۔"

"لائبہ بیٹی! ایسا نہیں کہتے، تمہیں کیا خبر میں نے تمہیں کس طرح پال پوس کر بڑا کیا ہے۔ تمہیں محسوس نہیں ہونے دیا کہ تم سوتیلی ماں کے ساتھ رہ رہی ہو۔"

"ڈیڈی مجھے آپ کو ہرٹ کرنا مقصود نہیں تھا۔ میں تو صرف یہ چاہتی تھی کہ مجھے آپ آرٹس کے مضامین پڑھنے دیں۔ اگر میں نے زبردستی کامرس کے مضامین لے بھی لیے تو میں شوق سے نہیں پڑھ سکوں گی۔ آج فرسٹ آئی ہوں پھر تھرڈ بھی نہیں آؤں گی۔"

بات اعجاز کی سمجھ میں بھی آ گئی۔ زبردستی کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

راحیلہ جب باپ کے صدمے سے باہر آئی اور اس کا حصہ اس کے اکاؤنٹ میں منتقل ہو چکا تو اعجاز احمد کے دل میں تیسری شادی کے خیال نے پھر کروٹ لی۔ راحیلہ کے بھائی امریکا جا چکے تھے لہٰذا میدان صاف تھا۔ اس نے سوچا وہ آخری مرتبہ راحیلہ سے بات کرے مانتی ہے تو نا مانے بہرحال وہ شادی کرے گا۔

بہت دن بعد اس نے لان میں کرسیاں ڈلوائی تھیں۔ وہ راحیلہ کے ساتھ وہاں بیٹھ کر چائے پینا چاہتا تھا۔ ہلکی ہلکی سردی پڑنے لگی تھی لیکن ایسی نہیں تھی کہ ناگوار ہو۔ اس نے ملازم سے کہا کہ وہ کافی بنائے اور خود راحیلہ کے ساتھ لان میں جا کر بیٹھ گیا۔

ابھی ادھر اُدھر کی باتیں ختم نہیں ہوئی تھیں کہ لائبہ لان کی طرف آتی دکھائی دی، اس کے ساتھ دو لڑکیاں اور بھی تھیں۔

"واؤ، آپ لوگ یہاں بیٹھے ہیں، اس کا مطلب ہے میں اچھے موقع پر آ گئی۔ گرم گرم کافی کا آسرا ہو گیا۔"

"یہ کیا خود غرضی ہے۔" اعجاز احمد نے کہا۔ "تعارف نہیں کراؤ گی۔" اس نے اس کے ساتھ آئی ہوئی لڑکیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اوہ سوری ڈیڈی! میں تو بھول ہی گئی۔ یہ دونوں میرے ساتھ کالج میں پڑھتی ہیں۔ یہ تانیہ ہے اور یہ نیلوفر!"

"بیٹھو۔ کافی آتی ہی ہوگی۔" راحیلہ نے کہا اور وہ تینوں بیٹھ گئیں۔

اعجاز احمد نے ان دونوں لڑکیوں کی طرف ایک سرسری نظر سے دیکھا۔ وہ دونوں جوان تھیں۔ پھر اس نے لائبہ کی طرف دیکھا۔ وہ اسے چھوٹی بچی ہی معلوم ہوتی تھی۔ اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ وہ جوان ہو چکی ہے۔ لائبہ کے قہقہے لان میں پھول کھلا رہے تھے۔ دونوں لڑکیاں بھی کبھی کبھی کھلکھلا کر ہنس پڑتی تھیں۔ کافی آ گئی تھی۔ تینوں لڑکیوں نے کافی ختم کی اور اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

"ڈیڈی، میں اپنی دوستوں کو اپنا کمرا دکھانے لائی تھی۔"

"ہاں بیٹا جاؤ، انہیں کمرا دکھاؤ۔ گپ شپ کرو، مجھے تمہاری امی سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

"وِش یو گڈ لک۔ آپ باتیں کریں۔"

وہ دور تک انہیں جاتے دیکھتا رہا۔ اس کے دل میں خیالوں کا طوفان امڈ رہا تھا۔ وقت کتنی تیزی سے گزر گیا۔ مجھے احساس ہی نہ ہوا اور لائبہ جوان ہو گئی۔ کیا میں اب شادی کرتے ہوئے اچھا لگوں گا۔ اسے اپنی دوستوں کے سامنے کتنی شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔ نئی آنے والی عورت کو وہ برداشت کرے گی؟ اب مجھے اپنی نہیں لائبہ کی شادی کی فکر ہونی چاہیے۔

"آپ کچھ کہنے والے تھے۔"

"میں، مجھے کیا کہنا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں۔"

"آپ ابھی لائبہ سے کہہ تو رہے تھے کہ مجھے تمہاری امی سے کوئی بات کرنی ہے۔"

"اچھا وہ، وہ تو میں نے اس لیے کہہ دیا تھا کہ کہیں لائبہ یہ نہ سمجھ لے کہ ہمارے تمہارے درمیان بات چیت ہی نہیں ہے۔"

"آپ کے انداز سے پتا چل رہا ہے کہ آپ کچھ کہنے والے تھے جواب نہیں کہنا چاہتے۔"

"ارے کچھ نہیں۔ اب ہمیں یہاں سے اٹھ جانا چاہیے۔ سردی بڑھنے لگی ہے۔ بیمار پڑ جاؤ گی۔" اس نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ راحیلہ بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ حیران تھی کہ اچانک اعجاز کو ہو کیا گیا۔ وہ اسے لے کر لان میں آیا تھا اور اب اس طرح منہ پھیر کر چل دیا جیسے اسے جانتا ہی نہ ہو۔

اعجاز احمد کو معلوم تھا کہ وہ اس کا پیچھا کرتی ہوئی بیڈ روم تک آئے گی اور وہ اس وقت کسی سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ بیڈ روم میں جانے کے بجائے ریڈنگ روم میں چلا گیا اور کمرا اندر سے بند کر لیا۔ وہ اس وقت یہاں پڑھنے نہیں آیا تھا بلکہ اپنی اس کیفیت کو چھپانے آیا تھا۔ جس سے وہ ابھی ابھی دوچار ہوا تھا۔ اگر اس نے شادی کی تو لائبہ کیا سوچے گی۔ راحیلہ نے اگر مزاحمت کی تو وہ لائبہ کے سامنے تماشا بن کر رہ جائے گا۔ لائبہ اور راحیلہ کے درمیان اگر ان بن ہوتی تو بھی کوئی بات تھی۔ راحیلہ نے اسے اس طرح مٹھی میں جکڑ لیا ہے کہ وہ میری نہیں اسی کی حمایت کرے گی۔ مجھے کرم نواز کی پروا کیے بغیر اسی وقت شادی کر لینی چاہیے تھی مگر اس وقت لائبہ کی زندگی کا سوال تھا۔ اگر میں لائبہ کی شادی کر دوں تو؟

وہ اس کے کمرے میں گیا بھی تھا۔ اس سے بات بھی کی تھی لیکن اس نے نہایت سختی سے انکار کر دیا تھا۔ وہ ابھی پڑھنا چاہتی تھی۔ اس نے دیدہ دلیری سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ جب بھی شادی کرے گی اپنی پسند سے کرے گی۔ اس کی شادی کے لیے انہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

اعجاز احمد کو اس سے اس گستاخی کی امید نہیں تھی۔ وہ سر جھکا کر چلا تو آیا لیکن لائبہ کی اس گستاخی کا سبب اس نے راحیلہ کو ٹھہرایا۔ سوتیلی ماں ہے۔ اس نے یہ تربیت ہی نہیں دی ہوگی کہ باپ کا ادب کیسے کیا جاتا ہے۔ راحیلہ مجھ سے کس طرح بات کرتی ہے، لائبہ یہ بھی دیکھتی ہوگی۔

راحیلہ کی طرف سے اس کے دل میں مزید نفرت پیدا ہو گئی۔

اس دن کے بعد سے وہ راحیلہ سے صرف اتنی ہی بات کرتا تھا جتنی ضروری ہوتی۔ راحیلہ نے بھی اس کی سردمہری کو دیکھتے ہوئے اپنا راستہ الگ کر لیا تھا۔ زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہتی تھی۔ نئے نئے دوست بنا لیے تھے۔ اس کے پاس اس کی ذاتی دولت اتنی ہو گئی تھی کہ اعجاز احمد کی محتاج نہیں تھی۔ اپنی دولت دونوں ہاتھوں سے دوستوں پر نچھاور کر رہی تھی۔ اس کی سرگرمیاں بے راہ روی کی حد تک پہنچ گئی تھیں مگر اعجاز کو اس کی پروا نہیں تھی۔

ایک دو مرتبہ اس نے لائبہ سے راحیلہ کی شکایت کرنے کی کوشش کی لیکن جب اس نے راحیلہ کی حمایت کی تو اعجاز احمد کو اپنی زبان بند کرنی پڑی۔

☆☆☆

راحیلہ کی اعجاز سے بات چیت کم ہی تھی لیکن وہ کبھی کبھی اس کے آفس کا چکر لگا لیا کرتی تھی تاکہ اس کے ملازمین کے لیے وہ اجنبی بن کر نہ رہ جائے۔ اعجاز کے کمرے میں بھی اس طرح چلی جاتی تھی جیسے پہلے جاتی تھی اور اس طرح مسکرا کر نکلتی تھی جیسے اندر بڑی خوشگوار باتیں ہوئی ہوں حالانکہ وہ ہمیشہ یہ سن کر آتی تھی کہ وہ یہاں نہ آیا کرے۔

اس دن بھی وہ ملازمین پر اپنا رعب جھاڑتی انہیں ڈانٹ پلاتی اعجاز کے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ اس نے اعجاز کے کمرے سے ایک نوجوان آدمی کو نکلتے ہوئے دیکھا۔ یہ شخص اتنا وجیہہ اور خوب صورت تھا کہ کسی عورت کو بھی متاثر کر سکتا تھا جبکہ راحیلہ کچھ دنوں سے اس راہ پر چل پڑی تھی۔ نئے نئے مردوں سے دوستی کرنا اس کا شیوہ بن گیا تھا۔ اس شخص کی خوب صورتی کو دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ کون تھا یہ۔ اعجاز کا دوست تو ہو نہیں سکتا کیونکہ اس کی عمر تیس سال

سے زیادہ نہیں تھی۔ ہاتھ میں کچھ فائلیں بھی پکڑی ہوئی تھیں۔ یقینا کوئی ملازم ہوگا۔ وہ یہی سوچتی ہوئی اعجاز کے کمرے میں چلی گئی۔

''ابھی میں آرہی تھی تو ایک لڑکے کو کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ کون تھا؟'' اس نے لڑکا جان بوجھ کر کہا تھا۔ یہ کہتے ہوئے اسے انجانی سی خوشی ہوئی تھی۔

''میرا سیکریٹری ہے جمال۔''

''اس سے پہلے تو کبھی نہیں دیکھا۔''

''ابھی اس نے پرسوں جوائن کیا ہے اور ہاں میرے ملازمین کے بارے میں زیادہ تجسس کی ضرورت نہیں۔ میں جس کو چاہوں نکالوں جس کو چاہوں رکھوں۔ پچھلے سیکریٹری کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ وہ میرے دشمنوں کے لیے کام کر رہا ہے۔ میں نے اسے نکال دیا۔'' اعجاز احمد نے راحیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

راحیلہ اتنی بچی نہیں تھی کہ اس اشارے کو نہ سمجھتی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ دشمن کسے کہہ رہا ہے۔

''اچھا میں چلتی ہوں۔ کچھ خاص لوگ ہیں جن سے مجھے ملنا ہے۔'' اس نے کہا اور پرس اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔

اسے جمال کے کمرے تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی کیونکہ اعجاز کے کمرے سے ملحق ہی اس کا کمرا تھا۔

''میں راحیلہ ہوں، مسز اعجاز، تمہارے مالک کی بیگم۔''

تعارف سنتے ہی جمال کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

''وہ...... بیگم صاحبہ، آپ نے مجھے بلوالیا ہوتا، خود کیوں تشریف لے آئیں۔''

''یہ بتانے کے لیے کہ یہ آفس اعجاز احمد کا ضرور ہے لیکن یہاں حکم میرا چلتا ہے، جیسا میں کہوں ویسا کرنا ہے۔''

''میں آپ کے حکم سے باہر تھوڑی ہوں۔''

''اس وقت میں زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتی۔ میرا نمبر نوٹ کرو۔ یہ میں کسی کسی خوش قسمت کو دیتی ہوں۔ یہ فون میرے بیڈروم میں ہے۔ آج کل میں اور اعجاز صاحب الگ الگ کمروں میں سوتے ہیں۔ تم مجھے رات میں فون کرنا۔ اطمینان سے باتیں ہوں گی۔''

وہ جا چکی تھی اور جمال حق دق دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا کمرا ابھی تک خوشبو میں بسا ہوا تھا۔ یہ محترمہ ایک ہی دن میں اتنی بے تکلف ہوگئیں کہ اپنے بیڈروم کا نمبر دے ڈالا۔ وہ ایسے کئی قصے سن چکا تھا جن کے مطابق بڑی عمر کی عیاش عورتیں کم عمر مردوں سے دوستی گانٹھ لیتی ہیں۔ یہ سوچتے ہی اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ ہر شخص اپنی ترقی کے لیے سہارے ڈھونڈتا ہے۔ یہ سہارا تو خودبخود اس کے پاس چل کر آگیا تھا۔ اس نے سوچ لیا کہ وہ اس موقع کا بھرپور فائدہ اٹھائے گا۔ اس کے اور اعجاز صاحب کے بیڈروم الگ الگ ہیں۔ اس کا مطلب ہے دونوں کے تعلقات کشیدہ ہیں۔ اس کے باوجود وہ آفس آتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے یہاں کے سیاہ سفید میں اس کا دخل ہے۔ ایسی عورتوں کو ایک مخبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ بھی مجھ سے کچھ اطلاعات چاہتی ہوگی۔ اس لیے مجھ سے بے تکلف ہورہی ہے۔ میں اپنی ترقی کے لیے اس کا پورا ساتھ دوں گا۔

اس کے ان خیالات کی شام سے پہلے پہلے تصدیق بھی ہوگئی۔ دفتر ہی کے ایک صاحب اس کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ انہیں یہ جرأت اس لیے ہوگئی تھی کہ اعجاز دفتر سے جاچکا تھا۔

''جمال صاحب! سنا ہے بیگم اعجاز آپ کے پاس آئی تھیں۔''

''آئی تو تھیں۔''

''کیا کہہ رہی تھیں۔''

''کچھ بھی نہیں۔ مجھے ڈانٹ ڈپٹ رہی تھیں کہ میں وقت کی پابندی کروں اور کام ٹھیک کروں۔ اعجاز صاحب تو کسی کو کچھ کہتے ہی نہیں ہیں لیکن میں تمہاری نگرانی کرتی رہوں گی۔''

''بھائی بڑی مرد مار عورت ہے۔ اس سے ڈرتے رہنا۔ اس آفس میں اعجاز صاحب کی نہیں اس کی چلتی ہے اعجاز صاحب کو خوش رکھو نہ رکھو، اسے خوش رکھنا۔''

''یہ تو بڑی غلط بات ہے۔ آفس اعجاز صاحب کا ہے۔ انہیں منع کرنا چاہیے کہ وہ دخل اندازی نہ کرے۔''

''صاحبزادے، ہم برسوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اعجاز صاحب اس کے سامنے دم نہیں مار سکتے۔ شریف آدمی ہیں اپنی عزت سے ڈرتے ہیں۔ جانتے بھی ہو وہ کس کی بیٹی ہے۔''

''کس کی بیٹی ہے۔''

''مشہور اسمگلر کرم نواز کی بیٹی ہے۔ سنا ہے شہر کے مشہور غنڈوں سے بھی اس کی دوستی ہے۔ جب ٹیڑھی انگلیوں سے کام لینا ہوتا ہے وہ انہیں کام میں لاتی ہے۔''

یہ اطلاعات فراہم کرکے وہ صاحب چلے گئے اور جمال کے لیے سوچنے کو بہت سا مواد چھوڑ گئے۔ سوچتے سوچتے وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ابھی کچھ بھی کہنا قبل از وقت ہوگا۔ پہلے میں اسے فون کرلوں اس کے بعد سوچوں گا کہ کیا کرنا ہے۔

وہ گھر پہنچ کر رات ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ وہ چاہتا تھا

رات میں دیر سے فون کرے یعنی اس وقت جب وہ سونے کے لیے بیڈروم میں پہنچ چکی ہو۔ اسے ایسی ہی بے چینی تھی جیسے رزلٹ آنے کے انتظار میں ہوتی ہے۔ جب آدھی رات گزر گئی تو اسے یہ خوف ہونے لگا کہ کہیں وہ سو نہ گئی ہو۔ اس نے ڈرتے ڈرتے نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے نیم غنودہ آواز سنائی دی۔

''ہیلو۔''

''بیگم صاحبہ میں جمال بول رہا ہوں۔ اعجاز صاحب کا سیکریٹری۔''

''اس بے ہودہ انسان کا نام مت لو۔ تم اس کے نہیں میرے سیکریٹری ہو صرف میرے بلکہ میرے جمال۔''

''بیگم صاحبہ لیکن تنخواہ تو وہی دیتے ہیں مجھے۔''

''میں تمہیں تنخواہ سے زیادہ دوں گی اور یہ بیگم صاحبہ کیا ہوتا ہے، تم اکیلے میں مجھے راحیلہ کہہ سکتے ہو۔ تم سے زیادہ بڑی نہیں ہوں۔''

''جی راحیلہ، اب بتایئے آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟''

''تم خوب صورت ہو لیکن بے وقوف بھی ہو۔ اتنا کچھ کہنے کے بعد بھی تم پوچھ رہے ہو، میں کیا کہنا چاہتی تھی۔ جمال کے بچے کل شام کو میرے لیے کچھ وقت نکالو۔''

''آپ کہاں ملیں گی۔''

راحیلہ نے اسے اس ہوٹل کا بتا دیا جہاں اسے آفس سے نکلتے ہی پہنچنا تھا۔ راحیلہ وہاں پہلے سے موجود ہوگی۔ اس کی آواز سے صاف ظاہر ہورہا تھا کہ وہ نیند میں نہیں نشے میں ہے۔ یہ بھی ایک روپ تھا جو جمال کے سامنے آیا تھا البتہ وہ یہ سوچ کر ڈر گیا تھا کہ اگر اس نے بھی اسے شراب پیش کی تو وہ انکار کیسے کرے گا۔

اس نے جس طرح بے تکلفی سے اس کا نام لیا تھا اس کے بعد یہ سمجھنے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا کہ بات صرف مخبری کی نہیں ہے بلکہ وہ اس پر عاشق ہوگئی ہے۔ یہ زیادہ امید افزا صورتِ حال تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اس کی دولت لوٹ سکتا تھا۔

وہ دوسرے دن خوب تیار ہوکر دفتر پہنچا اور دفتر سے اٹھتے ہی اپنی موٹر سائیکل پر اس ہوٹل پہنچ گیا جہاں اسے راحیلہ سے ملنا تھا۔ اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس کے سامنے رکھی ایش ٹرے میں سگریٹ کے دو ٹوٹے پڑے ہوئے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس کے انتظار میں دو سگریٹ پھونک چکی ہے۔ یہ انکشاف بھی ہوا کہ محترمہ اسموکنگ بھی کرتی ہیں۔

''جمال تم پر سوٹ بہت جچتا ہے۔ کتنے سوٹ ہیں تمہارے پاس۔''

''صرف دو سوٹ ہیں جو خاص خاص مواقع پر پہن لیتا ہوں۔ اس سے خاص موقع کیا ہوسکتا تھا کہ میں آپ سے ملنے آرہا تھا۔ ان میں سے ایک پہن کر آگیا ہوں۔''

''تمہارے پاس سوٹ صرف دو ہیں، تیسری ملاقات میں کیا پہنو گے۔''

وہ کیا جواب دیتا۔ ایک خفیف سی ہنسی ہنس کر چپ ہوگیا۔

''آپ مذاق اچھا کرلیتی ہیں۔''

''یہاں سے اٹھ کر ہم ابھی طارق روڈ چلیں گے۔ تم ہر ملاقات میں نیا سوٹ پہنو گے۔''

''میری اتنی آمدنی کہاں ہے کہ ہر ملاقات میں نیا سوٹ پہنوں۔''

''جمال تمہاری ضرورتوں کا خیال رکھنا اب میری ذمے داری ہے اور تم سوٹ پہنو یہ تمہاری نہیں میری ضرورت ہے۔ سوٹ میں تمہیں دلواؤں گی۔''

''جی بیگم صاحبہ میرا مطلب ہے راحیلہ۔''

''شاباش مجھے اسی نام سے پکارا کرو۔ کسی چاہنے والے کی زبان سے یہ نام سننے کو میرے کان ترس گئے ہیں۔ ہر شخص مجھے مسز اعجاز کہہ کر پکارتا ہے۔ تم مجھے راحیلہ کہو گے۔''

''جی راحیلہ۔''

''کیا پیو گے چائے یا کافی؟''

''کافی۔''

کافی پینے کے بعد انہیں طارق روڈ جانا تھا۔ ہوٹل سے نکلتے ہی وہ اپنی موٹر سائیکل کی طرف بڑھا۔ اس کا خیال یہی تھا کہ وہ اپنی موٹر سائیکل پر طارق روڈ جائے گا اور راحیلہ اپنی گاڑی میں وہاں پہنچے گی۔

''تمہارے پاس کون سی گاڑی ہے جمال۔''

''میں تو بائیک پر آیا ہوں۔''

''گاڑی کیوں نہیں لائے۔''

''میرے پاس گاڑی نہیں ہے۔''

''ایں...... گاڑی کے بغیر کراچی میں گھومتے ہو۔ خیر ایسا کرو۔ اپنی بائیک یہیں رہنے دو۔ میرے ساتھ گاڑی میں چلو۔ واپسی میں اپنی بائیک اٹھا لینا۔''

وہ اس کی گاڑی میں اس کے ساتھ طارق روڈ پہنچ گیا۔

''ابھی میں تمہیں چھ سوٹ دلوائی ہوں۔ اس کے بعد دیکھنا ہوگا کہ تم مجھ سے کتنی ملاقاتیں کرتے ہو۔''

سوٹ دلوانے کے بعد وہ اسے جوتوں کی دکان پر لے گئی۔

”ہر سوٹ کے بعد جوتا بھی نیا پہنو گے۔“

شاپنگ ختم ہوئی تو پچھلی سیٹ پر سامان ہی سامان تھا۔

”تم اتنا سامان اپنی بائیک پر نہیں لے جاسکو گے۔ میں ایسا کرتی ہوں تمہارے گھر چلتی ہوں۔ تم سامان گھر میں پہنچا کر میرے ساتھ ہوٹل چلو گے اور وہاں سے اپنی بائیک اٹھا لو گے۔“

”جی راحیلہ۔“

”آج تمہاری شاپنگ ہوگئی کل مجھے اپنی شاپنگ کرنی ہے۔ تم میرے ساتھ چلو گے۔ کل تم بائیک پر مت آنا۔ میں تمہیں دفتر سے لے لوں گی۔“

”ایسا غضب مت کرنا۔ کسی کی بھی نظر پڑ سکتی ہے۔“

”تم آفس سے نکل کر چورنگی تک آجانا۔ میری گاڑی وہاں کھڑی ہوگی۔“

وہ اتنی شاپنگ کے بعد گھر میں داخل ہوا تو اس کی ماں اور دونوں بھائیوں کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔

”بھائی، تمہیں تو ابھی تنخواہ بھی نہیں ملی۔ اتنی شاپنگ کہاں سے کرلی۔“

”یار قدرت جس کا ہاتھ پکڑ لے۔ میرے باس مجھ پر اتنے مہربان ہوئے ہیں کہ انہوں نے اپنے ساتھ لے جا کر شاپنگ کرائی ہے۔ شاید چند مہینوں بعد گاڑی بھی دلادیں۔ کہہ رہے تھے تم میرے سیکریٹری ہو۔ ہر دوسرے تیسرے دن نیا سوٹ پہن کر آیا کرو۔“

اس کی والدہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر اس کے باس کو دعائیں دینے لگیں۔ وہ دل ہی دل میں ہنسنے لگا کہ مہربانیاں کس کی ہیں، دعائیں کسے مل رہی ہیں۔

وہ اگلے دن آفس پہنچا تو اس کی شان ہی دوسری تھی۔ سیکریٹری کم آفس کا مالک زیادہ لگ رہا تھا۔ وہ کسی کام سے اعجاز احمد کے کمرے میں گیا تو وہ بھی اس کی طرف تجسس بھری نظروں سے دیکھے بغیر نہ رہ سکے۔

☆☆☆

دن کا وقت تھا۔ راحیلہ ابھی سوکر اٹھی تھی۔ اعجاز آفس جاچکا تھا۔ ملازم نے اسے انٹرکام پر اطلاع دی کہ کوئی صمدانی صاحب آئے ہیں اور اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ ”اس بڈھے کو بھی چین نہیں ہے۔“ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

”اسے بٹھاؤ اور خوب انتظار کرنے دو۔ چائے وغیرہ پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

وہ کچھ دیر اور بستر پر لیٹی رہی۔ پھر بے دلی سے اٹھی۔ غسل وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد ناشتے کی میز پر آگئی۔ ناشتا کرنے کے بعد دوستوں کو فون کرنے میں مشغول ہوگئی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ صمدانی کو بھول گئی ہو۔ وہ جان بوجھ کر انہیں انتظار کرارہی تھی تاکہ وہ اس کی طرف سے زیادہ توقعات نہ باندھ لیں۔

وہ اچھی طرح ہر کام سے نمٹنے کے بعد ڈرائنگ روم میں پہنچی تو صمدانی صاحب تقریباً اونگھ رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی ہڑبڑا کر کھڑے ہوگئے۔

”کیسے ہیں صمدانی صاحب، کیسے آنا ہوا۔“

”آپ کو معلوم تو ہوگیا ہوگا کہ اعجاز صاحب نے مجھے نوکری سے فارغ کردیا ہے۔“

”ہاں معلوم تو ہوا تھا۔ وہ اپنی مرضی کے مالک ہیں جو جی چاہیں کریں، میں کیا کرسکتی ہوں۔“

”بیگم صاحبہ، جتانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن بات نکلی ہے تو کہہ رہا ہوں۔ میں آپ کے کتنے کام آیا ہوں۔ ایک ایک پل کی خبریں آپ کو پہنچاتا رہا ہوں بلکہ میری نوکری اسی جرم میں گئی ہے۔“

”میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ آپ اندھوں کی طرح مجھے خبریں پہنچاتے رہیں۔ آپ کو ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرنا چاہیے تھا۔ آپ کی بے احتیاطی نے مجھے ان کی نظروں میں گرادیا۔“

”بیگم صاحبہ، میرا کچھ خیال کریں۔ دو جوان لڑکیاں شادی کے لیے بیٹھی ہیں، آپ اعجاز صاحب سے میری سفارش کردیں۔“

”اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ انہوں نے نیا آدمی رکھ لیا ہے۔“

”آفس میں کوئی اور کام ہی مجھے دے دیں۔“

”آپ بدنام ہوگئے ہیں، اب وہ آپ کو نہیں رکھیں گے۔ آپ کوئی اور نوکری تلاش کرلیں۔“

”آپ نے مجھ سے کہا تھا آپ برے وقت میں میرا ساتھ دیں گی۔ مجھے اکیلا نہیں چھوڑیں گی۔“

”میں نے کہا ضرور تھا لیکن اب حالات بدل گئے ہیں۔ اعجاز سے اب میری بات چیت ہی نہیں ہے۔ میں اس سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔“

”آپ کے اتنے تعلقات ہیں، کسی اور جگہ میری نوکری کا بندوبست کردیں۔“

”اگر کوئی بندوبست ہوگیا تو میں آپ کو اطلاع کردوں گی اور پلیز یہاں آنے کی دوبارہ کوشش مت کیجیے گا۔ اعجاز کو معلوم ہوگیا تو غضب ہوجائے گا۔ مجھے ایک جگہ

جانے کے لیے تیار ہونا ہے لہٰذا اب آپ جائیں۔“

اس نے صمدانی کے اٹھنے کا انتظار بھی نہیں کیا اور کمرے سے نکل گئی۔

اگر جمال سے اس کی ملاقات نہ ہوئی ہوتی تو ممکن ہے وہ صمدانی کی مدد کرتی۔ اعجاز سے کہہ کر اسے دوبارہ ملازمت پر رکھواتی یا کوئی اور بندوبست کرتی مگر اب تو وہ اس کے لیے ناکارہ تھے۔

☆☆☆

جمال سے اس کے تعلقات روز بہ روز بڑھتے جارہے تھے۔ وہ اس پر بے دریغ پیسے لٹارہی تھی۔ اسے نئی گاڑی بھی خرید کردے دی تھی۔ جمال آفس سے اٹھنے کے بعد کہیں نہ کہیں اس سے مل جاتا تھا اور پھر وہ رات گئے گھر لوٹتی تھی۔ گھر میں لائبہ موجود تھی لیکن اسے اس کی بھی پروا نہیں تھی، کبھی کبھی جمال کو گھر بھی لے آتی تھی۔ لائبہ کو محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کی ماں اس شخص میں دلچسپی لینے لگی ہے۔ یہ رشتہ ہرگز ایسا نہیں ہے جو مالک اور نوکر کے درمیان ہوتا ہے۔

یہ شک اس وقت حقیقت میں بدل گیا جب اعجاز احمد بزنس ٹور پر ایک ہفتے کے لیے ملک سے باہر گیا۔ لائبہ کو شک ہوا کہ اس کے کمرے میں جانے کے بعد راحیلہ کے بیڈروم میں کوئی آیا تھا۔ اس نے دوسری رات چھپ کر دیکھا تو یہ جمال تھا جو اس کے بیڈروم میں آیا تھا۔ وہ بچی ہی تو تھی، اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ ماں کو رنگے ہاتھوں پکڑلی لیکن ماں کی طرف سے اس کے رویے میں ایسی تبدیلی آگئی جسے راحیلہ نظرانداز نہیں کرسکتی تھی۔ اسے اس نتیجے پر پہنچنے میں بھی دیر نہیں لگی کہ لائبہ کے کانوں میں اس کے اور جمال کے تعلقات کی بھنک پڑ گئی ہے۔ اسے یہ ڈر ضرور ہوا تھا کہ وہ اپنے باپ کو باخبر نہ کردے۔ اگر ایسا ہوا تو اس کے لیے وہ ذہنی طور پر تیار تھی۔

اعجاز احمد کے آنے تک یہ کھیل جاری رہا لیکن جب وہ آگیا تو راحیلہ نے جمال کو رات کے وقت بلانا چھوڑ دیا۔ اب اگر اعجاز نے پوچھا بھی تو وہ صاف انکار کردے گی۔ اب وہ دونوں پہلے کی طرح باہر ملتے تھے۔ لائبہ نے جو کچھ دیکھ لیا تھا اس کے بعد اس کا رویہ ناقابل برداشت ہوگیا تھا ماں کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چنگاریاں برسانے لگتی تھیں۔ اس نے کئی مرتبہ سوچا کہ باپ کو اعتماد میں لے لیکن اس کی ہمت نہ ہوئی۔ اسے ڈر تھا کہ اعجاز احمد بیوی کو تو کچھ کہہ نہیں سکے گا اپنا ہی کوئی نقصان کر بیٹھے گا۔

جب اعجاز کی طرف سے کوئی بات سامنے نہ آئی تو راحیلہ کی ہمت بڑھ گئی۔ وہ جمال کے ساتھ سیر سپاٹوں میں مشغول ہوگئی لیکن لائبہ کا کوئی انتظام کرنے کی فکر میں تھی کیونکہ اس کا وجود اب اسے کھلنے لگا تھا۔

☆☆☆

لائبہ اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ یونیورسٹی پہنچی تو ہر لڑکا اس کا عاشق نظر آنے لگا۔ اس کے حسن کے چرچے یونیورسٹی میں پھیلے ہوئے تھے۔ لڑکیاں اسے گھیرے ہوئی تھیں، لڑکے اس کے قریب آنے کے بہانے ڈھونڈ رہے تھے لیکن اس کا غرور حسن یہ گوارا نہیں کرتا تھا کہ کسی کو قریب آنے کا موقع دے۔

بڑے گھرانوں کی لڑکیاں عام طور پر آزاد خیال ہوتی ہیں۔ وہ جس کلاس سے تعلق رکھتی تھی اس میں لڑکوں سے دوستی کوئی بری بات نہیں سمجھی جاتی تھی لیکن الگ تھلگ رہنا اس کی فطرت میں شامل تھا۔ یونیورسٹی سے باہر بھی اس کی دوستیاں لڑکیوں تک محدود تھیں۔ کلب بھی جاتی تو چند لڑکیاں تھیں جن کے سامنے وہ خوب چہکتی۔ لڑکیوں کو تعجب ہوتا تھا کہ اب تک وہ کسی کے دام محبت میں گرفتار کیوں نہیں ہوئی۔ اس کی ماں راحیلہ کو البتہ یقین تھا کہ یونیورسٹی میں اس کی کسی نہ کسی لڑکے سے دوستی ضرور ہوئی ہوگی لیکن اس کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں تھا جسے کام میں لاکر وہ اس کے بارے میں معلومات حاصل کرتی یا کسی کو اس کی نگرانی پر مامور کرتی۔ دراصل وہ چاہتی یہ تھی کہ لائبہ کی کوئی کمزوری اس کے ہاتھ آجائے تاکہ اگر کسی وقت وہ اسے جمال کا طعنہ دے تو وہ اس کا منہ بند کرسکے۔ دونوں کے درمیان ایک خاموش معاہدہ ہوجائے۔ وہ جمال کے ساتھ مگن رہے اور لائبہ اس لڑکے کے ساتھ۔

وہ اس کی کمزوری ہاتھ میں لینے کے لیے بے چین تھی۔ پہلے اس کا دھیان جمال کی طرف گیا کہ وہ اسے لائبہ کی نگرانی کے لیے مقرر کرے لیکن فوراً ہی اس خیال کی تردید بھی کردی۔ لائبہ چونکہ جمال کو جانتی تھی اس لیے وہ نگرانی نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ صبح کے وقت آفس میں ہوتا تھا۔ اسے تو کسی ایسے لڑکے کی تلاش تھی جو پابندی سے یونیورسٹی جائے اور عمرانی ہو کہ طالب علم لگے۔

یہ انتظام اس نے جلد کر بھی لیا۔

یونیورسٹی میں مشاعرہ تھا۔ کئی دن سے وہ اس کے چرچے سن رہی تھی۔ خود بھی تھوڑی بہت شاعری کرلیتی تھی لیکن شاعری پڑھنے اور سننے کا تو جنون کی حد تک شوق تھا۔ یہ مشاعرہ رات کے بجائے دن کے وقت ہورہا تھا اس لیے لائبہ اس میں آسانی سے شرکت کرسکتی تھی۔

وہ بے چینی سے مشاعرے والے دن کا انتظار کر رہی تھی لیکن نہ جانے کیا ہوا کہ جس دن مشاعرہ تھا اسی دن اس کی آنکھ دیر سے کھلی۔ مشاعرے کا وقت دس بجے تھا اور وہ ساڑھے نو بجے سو کر اٹھی۔ آدھے گھنٹے میں اسے تیار بھی ہونا تھا اور یونیورسٹی تک پہنچنا بھی تھا۔ وہ جلدی جلدی تیار ہوئی اور ناشتا کیے بغیر ہی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اس نے رسٹ واچ میں ٹائم دیکھا۔ سوا دس ہو رہے تھے۔ وہ کم سے کم ساڑھے دس بجے یونیورسٹی پہنچ سکتی تھی۔

گاڑی پارک کرتے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ مشاعرہ شروع ہو چکا ہے۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی مشاعرہ گاہ میں پہنچی تو یہ دیکھ کر پریشان ہو گئی کہ تمام کرسیاں بھر چکی ہیں۔ اسی وقت ایک آواز اس کے کانوں میں آئی۔ کوئی اس کا نام لے رہا تھا۔

"لائبہ۔"

اس نے پلٹ کر دیکھا۔

"لائبہ، کوئی نشست خالی نہیں ہے۔ آیئے میرے ساتھ آیئے۔ میں آپ کو ان نشستوں پر بٹھا دوں جو شعرا کے لیے مخصوص ہیں۔" اس وقت انکار کرنے یا سوچنے کا موقع نہیں تھا۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی شعرا کی نشستوں کے قریب پہنچ گئی۔ اس کی خوشی کا اس وقت ٹھکانا نہیں تھا جب وہ اپنے پسندیدہ شعرا کو اتنے قریب سے دیکھ رہی تھی۔ ان میں سے بہت سوں کی اس نے صرف تصویریں دیکھی تھیں۔

یہاں دو کرسیاں خالی تھیں اور اتفاق سے برابر برابر کی تھیں۔ ایک پر وہ بیٹھ گئی دوسرے پر وہ لڑکا۔

"معاف کیجیے گا کوئی اور کرسی خالی نہیں اس لیے مجھے یہاں بیٹھنا پڑ رہا ہے۔" اس لڑکے نے نہایت مہذب انداز میں کہا۔ اس لڑکے کا لہجہ نہایت مہذب تھا لیکن اس کے باوجود وہ دل ہی دل میں ہنس پڑی۔ "ہے کتنا ہوشیار، اس نے پہلے ہی دیکھ لیا ہوگا کہ یہ دو کرسیاں خالی ہیں۔ میرے قریب بیٹھنے کے لیے مجھے یہاں لے آیا۔"

"آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا۔" لائبہ نے اپنا تجسس ختم کرنے کے لیے اس سے پوچھا۔

"میں اس یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے مجھے آپ کا نام معلوم نہ ہو۔ فیکلٹی دوسری ہے تو کیا ہوا۔ ہوں تو یہیں کا طالب علم۔ میرا ایک دوست آرٹس ڈیپارٹمنٹ میں ہے اس لیے میں وہاں جاتا رہتا ہوں۔"

"آپ کچھ زیادہ باتونی نہیں ہیں؟ میں نے ایک بات پوچھی تھی آپ نے تقریر کر ڈالی۔"

"مشاعرے کے بعد تو آپ سے بات کرنے کا موقع ملے گا نہیں۔ سوچا ساری انرجی ابھی خرچ کر دوں۔"

"اچھا اب آپ مشاعرہ سننے دیں گے؟"

"ان شعرا کا کیا سننا۔ ایک شاعر ابھی آنے والا ہے۔ اسے سننے کا دھیان سے۔"

"کیوں اس میں کیا خاص بات ہوگی۔"

"وہ آپ کے بہت قریب ہوگا۔"

"میرے قریب؟"

"جی ہاں، آپ کو افسوس ہوگا کہ میں اب تک اسے پہچانی کیوں نہیں تھی۔"

وہ سمجھ گئی کہ اور کچھ نہیں وہ اسے باتوں میں الجھا رہا ہے تاکہ میں اس سے بولتی رہوں۔ اس نے اب کوئی سوال کرنا مناسب نہ سمجھا اور ایک طرف دیکھنے لگی۔ ذرا فاصلے پر ایک لڑکا کھڑا تھا جو مسلسل اسے دیکھ رہا تھا۔ لائبہ نے اس کی طرف سے گردن گھمائی۔ کچھ دیر بعد اس نے پھر اس طرف دیکھا۔ لڑکا اب بھی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یونیورسٹی میں ایسے سیکڑوں آوارہ لڑکے ہیں، اس نے سوچا، یہ بھی انہی میں سے ایک ہوگا۔ جانتا ہے کہ میں یہاں سے اٹھ کر نہیں جا سکتی۔ اس لیے اس طرف دیکھے جا رہا ہے۔ اس نے اس کی شکل اچھی طرح ذہن نشین کر لی تاکہ پھر کبھی نظر آئے تو وہ اسے اچھی طرح دیکھ لے۔

وہ شاید اس آنکھ مچولی سے مزید لطف اندوز ہوتی کہ اسٹیج سے ہونے والی اناؤنسمنٹ نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔

"اب ہم ایک ایسے شاعر کو دعوت کلام دیتے ہیں جو اس یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن پورے ملک میں پہچانا جاتا ہے۔ اس کے باکمال اشعار اردو شاعری میں ایک خاص مقام حاصل کرنے جا رہے ہیں۔ اس باکمال شاعر کا نام نامی ہے دانش کمال۔"

اسے محسوس ہوا کہ اس کے برابر بیٹھا ہوا لڑکا اپنی جگہ سے کھڑا ہوا ہے۔ وہ بھی کسی کام سے جا رہا ہوگا لیکن وہ اسٹیج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر وہ اسٹیج پر پہنچ گیا۔ یہ ہے دانش کمال!

دانش کمال اس کا پسندیدہ شاعر تھا۔ اس کے پاس اس کا مجموعۂ کلام بھی تھا۔ کئی شعر زبانی یاد تھے۔ یہ دانش کمال ہے۔ اف میرے خدا! میں اتنی دیر اس عظیم شاعر کے پاس بیٹھی رہی اور میں اسے جانتی ہی نہیں تھی۔

اس نے غزل پڑھنے سے پہلے لائبہ کی طرف اس طرح دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو اجازت ہے۔ لائبہ کی ایک

مسکراہٹ نے اسے اجازت دے دی۔

ایک ایک شعر موتیوں میں تولنے کے لائق تھا۔ طلبہ و طالبات تالیوں کی گونج میں ان موتیوں کو بٹور رہے تھے۔ اتنی داد کسی شاعر کے حصے میں نہیں آئی تھی جتنی وہ وصول کر رہا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ہوم گراؤنڈ پر کھیل رہا تھا۔

اس نے مسلسل تین غزلیں پڑھیں۔ اس کے بعد بھی اصرار جاری تھا لیکن وہ یہ کہہ کر اسٹیج سے نیچے اتر آیا کہ ابھی بہت سے شعرا باقی ہیں آپ انہیں ملاحظہ فرمائیں۔

وہ جب اسٹیج سے اتر کر اس کی طرف آنے لگا تو اسے خود پر غرور ہونے لگا۔ اتنا بڑا شاعر میرے قریب آکر بیٹھے گا۔ اسے افسوس بھی ہو رہا تھا کہ وہ اسے پہچانی ہی نہیں حالانکہ اس کے مجموعہ کلام پر اس کی تصویر دیکھ چکی تھی۔

"اچھا تو دانش کمال آپ ہیں۔"

"جی ہاں یہ بندہ ہی ہے۔ مجھے آج احساس ہوا کہ میں کتنا گمنام ہوں۔ میری پڑوسن بھی مجھے نہیں جانتی۔"

"اب آپ شرمندہ نہ کریں۔ میں آپ کو پہچانی نہیں یہ الگ بات ہے ورنہ آپ کے بہت سے اشعار مجھے زبانی یاد ہیں، کہیں تو سناؤں۔"

"اگر اشعار بھی آج سن لیے تو اگلی ملاقات میں کیا کریں گے۔"

وہ اس کی ہوشیاری کی ایک مرتبہ پھر قائل ہو گئی۔ کس خوب صورتی سے اس نے اگلی ملاقات پکی کر لی۔ سچی بات یہ ہے کہ وہ خود بھی اس سے متاثر ہوئی تھی، اس لیے ہنس کر چپ ہو گئی۔

باتیں کرتے کرتے اس کی نظر پھر ایک طرف اٹھی۔ وہ آنکھیں پھر اسے گھور رہی تھیں۔ وہ لڑکا اب بھی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کیا مصیبت ہے، کون ہے یہ۔ آج سے پہلے میں نے اسے دیکھا بھی نہیں۔ یونیورسٹی میں اتنے لڑکے ہیں میں کس کس کو نظر میں رکھوں گی۔

"ارے باتوں باتوں میں ہم نے کسی کو سنا ہی نہیں۔ صدر مشاعرہ کلام پڑھ رہے ہیں۔ مشاعرہ ختم ہونے والا ہے۔"

"میں نے کہا تھا نا کہ ایک شاعر آنے والا ہے اسے سننے کا دھیان سے۔ اسے آپ نے دھیان سے سن لیا۔ کافی ہے۔"

"سچ کہا ہے کسی نے، شاعروں سے کوئی نہیں جیت سکتا۔ ان سے جیتنا آسان نہیں۔"

"حسینوں کو جیتنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔"

"کبھی کوشش کی ہے؟"

"کر تو رہا ہوں۔" اس نے لائبہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"کوشش بے کار ہی جائے گی۔"

"کوئی بات نہیں۔ یہ تو وہ بازی ہے کہ ہار کے بھی جیت لی جاتی ہے۔"

مشاعرے کے اختتام کا اعلان ہو رہا تھا۔ انہیں بھی اٹھنا پڑا۔ وہ دونوں چلتے ہوئے کار پارکنگ تک آگئے۔

"آپ چاہیں تو میں آپ کو آپ کے گھر ڈراپ کر سکتی ہوں۔ میرے پاس گاڑی ہے۔"

"میں اپنی عادت خراب کرنا نہیں چاہتا لیکن اس لالچ میں بیٹھے جاتا ہوں کہ کچھ دیر آپ سے باتیں کرنے کا موقع مل جائے گا۔"

"آپ ہر چیز میں اپنا فائدہ ہی کیوں دیکھتے ہیں؟"

"یہ میرا نہیں میرے اندر چھپے ہوئے شاعر کا فائدہ ہے۔ بہت دن سے کوئی اچھی غزل نہیں ہوئی ہے۔ رات میں کوئی اچھی غزل کہہ لوں گا۔"

"اچھا ابھی تو بیٹھیے شاعر صاحب۔"

اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر برابر والا دروازہ کھول دیا۔ وہ اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"اب بتایئے آپ کا شیش محل کہاں واقع ہے۔ تاکہ میں گاڑی اسی طرف لے چلوں۔"

دانش کمال نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ لائبہ نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"بائیک پر دو لڑکے ہیں جو ہمارا پیچھا کر رہے ہیں۔ ذرا سائڈ مرر میں دیکھو۔"

"ابھی سوچ رہے ہوں گے یہ لڑکی اتنے مشہور آدمی کے ساتھ کیوں ہے۔ جل گئے ہوں گے بے چارے۔"

"کمال، سنجیدہ ہو جاؤ، ان لڑکوں کی نیت اچھی نہیں لگتی۔ میں گاڑی آہستہ کرتی ہوں تو وہ بھی سلو ہو جاتے ہیں۔ میں تیز چلاتی ہوں تو وہ بھی اسپیڈ پکڑ لیتے ہیں۔"

"یونیورسٹی ہی کے لڑکے ہوں گے۔ مجھے جانتے ہوں گے، تمہارا نہیں میرا پیچھا کر رہے ہوں گے۔"

"ان میں سے جو بائیک چلا رہا ہے اسے میں نے مشاعرے میں بھی دیکھا تھا۔ بڑی بے ہودگی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ شکل سے اسٹوڈنٹ بالکل نہیں لگتا۔"

"کسی جگہ گاڑی روک لو۔ انہیں قریب آنے دو۔ پھر میں ان سے پوچھوں گا کہ تعاقب کیوں کر رہے ہو۔"

"نہیں کمال، ان سے کچھ بعید نہیں۔"

دونوں بائیک والے گاڑی کے بالکل قریب آگئے

تھے اور گاڑی کے ساتھ چل رہے تھے۔ لائبہ نے گاڑی صرف اس لیے آہستہ کرلی تھی کہ ان لڑکوں کو قریب سے دیکھ سکے۔ وہ بھی شاید اسی لیے قریب آئے تھے۔ لائبہ نے گاڑی کو فورتھ گیئر میں ڈالا اور ان سے دور نکل گئی۔ اب ان لڑکوں کا کہیں پتا نہیں تھا لیکن لائبہ بری طرح نروس ہوگئی تھی۔

''تم اتنی خوف زدہ کیوں ہو۔ بعض لڑکے چھیڑ خانی کے لیے ایسی حرکت کرتے ہیں۔ اگر انہیں کوئی واردات کرنی ہوتی تو اب تک کر چکے ہوتے۔''

''یہ مجھے عام لڑکے معلوم نہیں ہوتے۔ میرا اندازہ کچھ اور کہہ رہا ہے لیکن ابھی میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔''

''بھئی تم بڑے لوگوں کے ذہن مسائل ہوتے ہیں۔ مجھے تو اس میں کوئی انہونی بات معلوم نہیں ہوتی۔''

''آپ نے بتایا نہیں کہ آپ کا دولت خانہ کہاں ہے۔ میں کس طرف چلوں۔''

''میں ابھی گھر نہیں جاؤں گا۔ آپ مجھے کہیں بھی اتار سکتی ہیں۔''

''پھر بھی کوئی جگہ تو ہوگی۔ میں کہاں روکوں گاڑی۔''

''بس یہیں روک دیجیے۔''

لائبہ نے گاڑی روک دی۔

''میں ایک شرط پر اتروں گا وعدہ کیجیے کل آپ مجھ سے ملیں گی۔''

''کہاں ملیں گے۔''

''آپ کیفے ٹیریا میں مل جایئے گا۔ پھر ہم وہاں سے کہیں اور چلیں گے۔''

''یونیورسٹی تک ٹھیک ہے ہمیں کہیں اور نہیں جانا چاہیے۔ مجھے لگتا ہے ہماری نگرانی کی جارہی ہے۔''

''یار، یونیورسٹی میں مجھے سب جانتے ہیں۔ خوامخواہ باتیں بنیں گی۔ رہی نگرانی تو نگرانی کرنے والے وہاں بھی آسکتے ہیں۔''

''آسکتے ہیں مگر وہاں نقصان نہیں پہنچا سکتے۔''

''اچھا تم ملو تو پھر دیکھا جائے گا۔''

دانش گاڑی سے اتر گیا۔ لائبہ اب زیادہ خوف محسوس کررہی تھی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر اچھی طرح اندازہ کرلیا کہ کوئی اس کا پیچھا تو نہیں کررہا ہے۔ اچھی طرح اطمینان کرنے کے بعد اس نے ایکسی لریٹر پر پاؤں رکھ دیا۔

وہ گھر پہنچی تو اس کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ وہ گزرے ہوئے واقعے پر غور کررہی تھی۔ یہ اتفاقی حادثہ نہیں ہوسکتا۔ یہ کسی کے بھیجے ہوئے آدمی تھے جنہیں صرف یہ معلوم کرنا تھا کہ میں کس کے ساتھ جارہی ہوں اور کہاں جارہی ہوں۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ دانش راستے میں اتر گیا۔ اگر وہ لوگ اس کا گھر دیکھ لیتے تو اس کی مصیبت آجاتی۔ کسی وقت وہ لوگ اس کے گھر بھی پہنچ سکتے تھے۔ میری خاطر وہ کیوں کسی مصیبت میں گرفتار ہو۔ یہ میں خود سے زیادہ اس کے بارے میں کیوں سوچ رہی ہوں؟ وہ خود سے شرما گئی۔ ایک ہی ملاقات میں کسی کے میں اتنے قریب جاسکتی ہوں، یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس میں میرا قصور نہیں، وہ ہے ہی ایسا کہ اسے چاہا جائے۔ دوسرے لڑکوں سے کتنا مختلف ہے۔ شاعر ہے اس لیے گفتگو کرنے کا سلیقہ بھی آتا ہے، کس خوب صورتی سے اس نے کل کی ملاقات طے کرلی، اس نے ایک بھرپور انگڑائی لی۔ انٹرکام پر ملازم سے کافی لانے کو کہا اور خود غسل کرنے چلی گئی۔ وہ واش روم سے نکلی ہی تھی کہ ملازم کافی لے کر آ گیا۔

''بیگم صاحبہ گھر پر ہیں؟'' لائبہ نے ملازم سے پوچھا۔

''وہ تو آج صبح ہی کہیں چلی گئی تھیں۔''

''کچھ معلوم ہے کہاں گئی ہیں۔''

''کچھ کہہ کر تو نہیں گئیں۔ جمال صاحب آئے تھے ان کے ساتھ گئی ہیں۔''

جمال کا نام سنتے ہی لائبہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ''تم جاؤ۔''

کافی کے چند گھونٹ حلق سے اتارنے کے بعد وہ گزرے ہوئے واقعات پر پھر غور کرنے لگی۔ ان لڑکوں کو کس نے بھیجا ہوگا۔ اس کا دھیان راحیلہ کی طرف گیا۔ میں ان کی رنگ رلیوں میں حائل ہورہی ہوں۔ وہ مجھے راستے سے ہٹانا چاہتی ہیں یا پھر مجھے خوف زدہ کرکے بتانا چاہتی ہیں کہ میں خاموش رہوں لیکن اب میں خاموش نہیں رہ سکتی۔ ڈیڈی کو بتانا ہی پڑے گا کہ ان کے گھر میں کیا کھیل کھیلا جارہا ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اب میری ہی نہیں دانش کی جان کو بھی خطرہ ہے، اسے میرے ساتھ دیکھ لیا گیا ہے۔

☆☆☆

راحیلہ سیٹھ بدرالدین کے سامنے بیٹھی تھی۔ جمال ابھی ابھی اٹھ کر گیا تھا کیونکہ وہ زیادہ دیر آفس سے غائب نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ دن میں نہیں پیتی تھی بلکہ رات میں بھی کبھی کبھی ہی پیتی تھی لیکن اس وقت سیٹھ بدرالدین کے اصرار پر اس نے بھی اپنے لیے گلاس بنالیا تھا۔

''تم بہت آہستہ چل رہی ہو۔ اعجاز احمد بڑی تیزی سے اپنی دولت باہر منتقل کررہا ہے اور تم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہو۔''

''میں آہستہ ہی تو نہیں چلی۔ یہی تو غلطی ہوئی۔ میں اتنی تیز چلی کہ اپنا اعتماد کھو بیٹھی۔ وہ کیا کررہا ہے، کیا سوچ رہا ہے مجھے کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ میں نے ایک گھر میں رہتے ہوئے اس سے قطع تعلق کرلیا۔ وہ باتوں باتوں میں کچھ بتا جاتا تھا۔ اب میں اس سے بھی گئی۔''

''یہ جمال کس مرض کی دوا ہے۔''

''مجھے لگتا ہے لائبہ نے باپ کے کان بھر دیے ہیں۔ میری اور جمال کی دوستی کو غلط رنگ میں پیش کرکے اعجاز کو ہوشیار کردیا ہے اب وہ جمال کو بھی کچھ نہیں بتاتا۔''

''پھر تو تمہیں اعجاز سے زیادہ لائبہ پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ میں تو کہتا ہوں اسے راستے سے ہٹاؤ۔''

''اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اعجاز کو اپنی عزت بہت عزیز ہے میں اس کی عزت خاک میں ملاؤں گی۔''

''کیا اغوا کا پروگرام ہے؟''

''اگر اس کی ضرورت ہوئی تو یہ بھی کر گزروں گی۔ ابھی تو کچھ اور سوچا ہے۔''

''کچھ بھی سوچو، میں اعجاز کو قلاش دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس سے ایک پرانا حساب چکانا ہے۔ میں تمہاری ہر طرح کی مدد کے لیے تیار ہوں۔''

''میں اس مدد ہی کا تو شکریہ ادا کرنے آئی ہوں۔ آپ نے جو دو لڑکے مجھے دیے تھے انہوں نے مجھے فون کرکے نہایت اہم معلومات دی ہیں۔ لائبہ کو انہوں نے کسی لڑکے کے ساتھ دیکھا ہے۔ بس مجھے یہ اطمینان کرنا ہے کہ وہ لڑکا محض اس لیے اس کی گاڑی میں بیٹھا تھا کہ اس کے ساتھ پڑھتا ہے یا وہ دونوں دوستی کے مراحل سے گزر رہے ہیں۔ بات ذرا صاف ہوجائے تو پھر دیکھو میں کیا کرتی ہوں۔ ان لڑکوں نے بس ایک غلطی کی ہے کہ لائبہ کو اپنا چہرہ دکھا دیا۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ آئندہ نگرانی کریں لیکن سامنے نہ آئیں۔''

☆☆☆

لائبہ کو یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں بیٹھنا پسند نہیں تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق یہ کیفے اس کے معیار کا نہیں۔ یہ کیفے ہی کیا، اسے تو یونیورسٹی میں کوئی بھی معیار کا نہیں لگتا تھا۔ ایک دانش ہی تھا جو اس کے معیار پر پورا اترا تھا۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ مڈل کلاس سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اسے اچھا لگا تھا۔

وہ اس کی خاطر اپنی ناپسندیدگی کے باوجود کیفے ٹیریا میں آکر بیٹھ گئی تھی۔ وہ اس کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتی تھی۔ اسی لیے دوبارہ ملاقات پر تیار ہوگئی تھی اور اب اس کا انتظار کررہی تھی۔ یہاں بیٹھ کر اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ وہ گھبرا کر باہر نکل آئی۔ باہر نکلتے ہی اس کی نظر اس لڑکے پر پڑ گئی۔ وہ اسے کیسے بھول سکتی تھی۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ وہ لڑکا اسے دیکھتے ہی ایک درخت کے پیچھے چھپ گیا۔ اسی وقت اسے دانش آتا دکھائی دیا۔ اس نے اس کی طرف دیکھا۔ اتنی دیر میں اس لڑکے کو موقع مل گیا۔ وہ کہیں غائب ہوگیا۔ لائبہ نے دانش کو کچھ نہیں بتایا لیکن خود سوچ میں پڑ گئی۔ میری نگرانی کی جارہی ہے، آج وہ لڑکا سامنے نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے کام لینے والے نے چھپ کر نگرانی کرنے کا حکم دیا ہے۔ اب وہ خوف زدہ نہیں تھی کیونکہ اسے یقین ہوگیا تھا کہ وہ جو کوئی بھی ہے اسے نقصان پہنچانا نہیں چاہتا۔ صرف یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ میں کس کے ساتھ ہوں اور کیا کررہی ہوں۔

''دانش ہم یہاں نہیں بیٹھیں گے۔''

''کیوں اندر سانپ نکل آیا ہے۔''

''میں تمہارے ساتھ بیٹھ کر تماشا بننا نہیں چاہتی۔ یہ چابی لو اور میری گاڑی میں جاکر بیٹھ جاؤ۔ میں بعد میں آتی ہوں۔''

''یاالٰہی ماجرا کیا ہے۔ کل سے اب تک مجھے تو یہی لگ رہا ہے کہ میں جاسوسی فلم دیکھ رہا ہوں۔''

''جو میں کہہ رہی ہوں وہ کرو۔ میں گاڑی میں بیٹھ کر بتاؤں گی کہ بات کیا ہے۔''

دانش نے چابی لی اور پارکنگ کی طرف چل دیا جبکہ اس نے بھی اپنی نشست چھوڑ دی۔ جو آنکھ ابھی اسے دیکھ رہی تھی اسے دکھانے کے لیے وہ پارکنگ کی مخالف سمت چل دی پھر اپنے ڈیپارٹمنٹ کا چکر کاٹتی ہوئی پارکنگ میں آگئی۔ گاڑی نکالی اور جوبلی گیٹ سے ہوتی ہوئی سڑک پر آگئی۔

''آپ اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہیں۔''

''اس لیے کہ وہ لڑکا مجھے پھر نظر آیا تھا۔''

''کون لڑکا۔ میرے علاوہ بھی کوئی لڑکا ہے اس یونیورسٹی میں؟''

''وہی لڑکا جو کل ایک اور لڑکے کے ہمراہ میرا پیچھا کررہا تھا۔''

''اس میں حیرانی کی کون سی بات ہے۔ میں نے تم سے کل ہی کہا تھا کہ وہ یونیورسٹی ہی کا کوئی لڑکا ہوگا۔''

''ہاں شاید ایسا ہی ہو۔'' لائبہ نے کہا۔

لائبہ نے اس لڑکے کا ذکر ختم کردینا ہی ضروری سمجھا۔

اس نے سوچا کہیں ایسا نہ ہو کہ دانش ڈر جائے اور اس سے ملنا ہی چھوڑ دے۔

”بائی دی وے یہ ہم جا کہاں رہے ہیں؟“

”اگر کہیں نہ جائیں گاڑی میں ہی گھومتے رہیں تو کیسا ہے۔“

”آئیڈیا تو اچھا ہے لیکن اگر آپ کے نگراں محافظ آ گئے تو کیا ہوگا۔“

”کوئی نہیں آتا۔ خوامخواہ کا میرا وہم تھا۔ کسی کو آنا ہوتا تو اب تک آ چکا ہوتا۔“

”یہ ہوئی نا بات۔ تو پھر چلو کہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔“

”چلیے میں آپ کو اپنے من پسند ریسٹورنٹ میں چائنیز کھلاتی ہوں۔“

اس نے گاڑی ڈیفنس کی طرف موڑ دی۔

☆☆☆

دانش کوئی عام لڑکا نہیں تھا۔ اس کی شاعری کی بدولت یونیورسٹی میں اسے سبھی جانتے تھے۔ دو چار بار اسے لائبہ کے ساتھ دیکھا گیا تو ہر طرف چرچے ہو گئے۔ اب لائبہ اور دانش دونوں فائنل ایئر میں آ گئے تھے۔ تقریباً ایک سال کے تعلقات نے دونوں کو اتنا قریب کر دیا تھا کہ دونوں شادی کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ وہ خفیہ آنکھیں برابر ان کی نگرانی کر رہی تھیں۔

راحیلہ کی نئی حکمت عملی نے انہیں یہ فرصت دے دی تھی کہ وہ آرام سے ایک دوسرے کے قریب آتے چلے جائیں۔ پہلے اس نے یہ سوچا تھا کہ لائبہ کو راستے سے ہٹا دے۔ اعجاز کے لیے یہ صدمہ اتنا بھیانک ہوگا کہ شاید وہ اپنے ہوش ہی کھو بیٹھے لیکن پھر اس نے سوچا تھا کہ جلد بازیوں نے پہلے بھی اسے نقصان پہنچایا ہے۔ اسے موقع دیکھ کر وار کرنا چاہیے۔ دراصل سوتیلی ماں ہونے کی وجہ سے اس کی پوزیشن بھی کمزور تھی۔ اعجاز نے اگر الزام اس پر رکھ دیا تو دنیا کو یقین آ جائے گا۔ جو رپورٹیں اسے مل رہی تھیں وہ بھی حوصلہ افزا تھیں۔

ان رپورٹوں کی روشنی میں اس نے نئی حکمت عملی یہ مرتب کی کہ باپ بیٹی کے درمیان جنگ کرا دی جائے۔ اس لڑکے کے حوالے سے اعجاز احمد کو اتنا بھڑکا دیا جائے کہ وہ لائبہ کی صورت دیکھنے کا روادار نہ رہے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ لائبہ کے دل میں جگہ پیدا کرے۔ ان منفی جذبات کو ٹھنڈا کرے جو اس کے منفی رویوں کی وجہ سے لائبہ کے دل میں بھڑک اٹھے ہیں۔ وہ لائبہ کو یقین دلائے کہ وہ سوتیلی ضرور ہے لیکن اس کی دشمن نہیں۔ وہ اس کا بھلا چاہتی ہے۔

راحیلہ کے بھیجے ہوئے لڑکوں نے ابھی ابھی اسے اطلاع دی تھی کہ لائبہ اپنے بوائے فرینڈ کو اعجاز احمد سے ملوانے کا پروگرام بنا رہی ہے۔

راحیلہ کے لیے یہ خبر کسی دھماکے سے کم نہیں تھی۔ اگر کسی وجہ سے اعجاز احمد اس لڑکے سے متاثر ہو گیا اور شادی پر رضامند ہو گیا تو میری ساری پلاننگ فیل ہو جائے گی۔ اگر ایسا نہیں بھی ہوا تو مجھ پر یہ الزام آئے گا کہ میں سوتیلی ہوں اس لیے لائبہ کی نگرانی نہ کر سکی۔ اس سے پہلے کہ یہ سب ہو میں اعجاز کے سامنے اس انداز سے باتیں پہنچاؤں کہ وہ بھڑک جائے۔ میں اچھی بھی بنی رہوں اور اپنا مطلب بھی نکال لوں۔

لائبہ ابھی تک یونیورسٹی سے واپس نہیں آئی تھی۔ اس نے جیسے ہی گھر میں قدم رکھا راحیلہ اس کے کمرے میں پہنچ گئی۔ بہت دن بعد ایسا ہوا تھا کہ وہ اس کے کمرے میں آئی تھی اور وہ بھی اس قدر خوشگوار موڈ میں جیسے منہ سے پھول جھڑ رہے ہوں۔ لائبہ حیران ضرور ہوئی تھی۔ اس کا آنا ناگوار بھی لگا تھا لیکن نکال بھی نہیں سکتی تھی۔

”لائبہ پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟“

”آج آپ کو میرا خیال کیسے آ گیا؟“

”تمہارا خیال مجھے کب نہیں آتا۔ میں تو ہر وقت تمہارے ہی بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔“

”اسی لیے میری نگرانی پر لوگ مامور کیے ہوئے ہیں۔“

”تو تمہیں معلوم ہو گیا۔ چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ بات یہ ہے لائبہ کہ ماؤں کو بیٹیوں کی فکر ہوتی ہے۔ میں کسی دشمنی میں نہیں تمہاری بھلائی کے لیے نگرانی کر رہی تھی۔ زمانہ بہت خراب ہے۔ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچے اس لیے ہر وقت ایک آدمی تمہارے ساتھ رکھتی ہوں۔“

”یہ میری پرائیویسی میں دخل دینے کے مترادف نہیں ہے؟“

”ماں بیٹی کے درمیان کیسی پرائیویسی میری بچی۔ یہ بتاؤ ان لوگوں نے تمہیں کوئی نقصان پہنچایا؟ تمہارے ڈیڈی تک کوئی بات پہنچی؟“

”کوئی بات ہے ہی نہیں تو پہنچتی کیا۔“

”بیٹا یہ میری غلطی ہو سکتی ہے لیکن میری نیت میں فتور نہیں تھا۔ تم اپنا دل میری طرف سے صاف کر لو۔“ یہ کہتے ہوئے راحیلہ کی آواز بھرا گئی۔ پھر اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔

”ممی، میں آپ کو معاف کرتی ہوں لیکن آپ کو ایسا کرنا نہیں چاہیے تھا۔“

”مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے۔ اچھا یہ بتاؤ وہ لڑکا کون ہے۔“

”کون سا لڑکا ممی۔“

”جس کے ساتھ آج کل تم دیکھی جا رہی ہو۔ مجھے سب معلوم ہو چکا ہے۔ اپنی ماں کو نہیں بتاؤ گی تو کسے بتاؤ گی۔ ایسی باتیں باپ کو نہیں ماں کو بتائی جاتی ہیں۔ اگر تمہاری سگی ماں ہوتی تو اسے ضرور بتاتیں۔ میں سوتیلی ہوں اس لیے مجھے بتانا مناسب نہیں سمجھتیں مگر یاد رکھو، بڑوں کا تجربہ بچوں کو غلط راہ پر جانے سے بچاتا ہے۔ مجھے اپنی پسند کے بارے میں بتاؤ اور اگر اس سے شادی کرنا چاہتی ہو تو بھی بتاؤ تاکہ میں تمہارے ڈیڈی سے بات کروں۔“

”آپ نے صحیح اندازہ لگایا ممی۔“

”میری بچی، میں ایک مرتبہ پھر تجھ سے معافی مانگتی ہوں کہ میں نے تیرے راز جاننے کی کوشش کی لیکن یہ بڑا ضروری تھا۔ تمہاری کوئی بہن بھی نہیں ہے جو تم اس سے کہہ لیتیں۔ نادانستگی میں کوئی قدم اٹھا لیتیں تو کتنا برا ہوتا۔“

لائبہ پگھل گئی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ راحیلہ کے بارے میں غلط سوچتی رہی تھی۔ اس کی ماں کا اپنے شوہر کے ساتھ کوئی بھی سلوک ہو لیکن وہ اس سے محبت کرتی ہیں۔ اس کا بھلا چاہتی ہیں۔

”ممی، وہ میرے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتا ہے۔“

”اور تم اس سے شادی کرنا چاہتی ہو۔“

”ہم نے یہی فیصلہ کیا ہے لیکن ڈیڈی اور آپ کی مرضی ضروری ہے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم کسی کو پسند کرو اور ہم تمہاری پسند کا خیال نہ رکھیں۔“

”ممی، آپ کتنی اچھی ہیں۔ میں خوامخواہ آپ کو غلط سمجھتی رہی۔“

”بچوں سے ایسی غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ اچھا یہ بتاؤ اس لڑکے کا فیملی بیک گراؤنڈ کیا ہے۔“

”میں اس کے گھر تو کبھی نہیں گئی لیکن وہ لڑکا ہماری طرح امیر نہیں۔“

”تم کہو تو میں تمہارے ڈیڈی سے بات کروں؟“

”ممی، آپ نہیں تو اور کون بات کرے گا۔“

”بس ایک مشکل ہے، تم جس لڑکے کا بتا رہی ہو وہ غریب ہے۔ ابھی کہیں نوکری تک نہیں کرتا۔ تم اپنے ڈیڈی کو جانتی ہو۔ وہ کسی بڑے بزنس مین کے بیٹے سے تمہاری شادی کرانا چاہیں گے۔ اس رشتے پر اتنی آسانی سے تیار نہیں ہوں گے۔ خیر تم فکر مت کرو میں کچھ کرتی ہوں۔“

اس نے لائبہ کا دل جیت لیا۔ اب اسے اعجاز سے بات کرکے اس کے دل میں لائبہ کی طرف سے گرہ ڈالنی تھی۔ اس نے اپنی اسکیم کے بارے میں جمال سے بھی مشورہ کیا۔ کبھی اس کی بھی تو ضرورت پڑ سکتی تھی۔ جمال نے بھی اس کی حوصلہ افزائی کی۔

”کوشش یہ کرنا کہ شادی ہونے نہ پائے۔ لائبہ اپنی ضد پر اڑی رہے گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لائبہ اس لڑکے سے کورٹ میرج کر لے یا اعجاز صاحب اس لڑکے کو مروا دیں۔ دونوں حالتوں میں لائبہ ان سے باغی ہو جائے گی۔ یہی آپ کے لیے فائدہ مند ہوگا۔“

راحیلہ کی اعجاز سے بات چیت بالکل بند ہو چکی تھی لیکن اس وقت اس کے لیے اپنی قسم توڑنا ضروری تھا۔

”میں آپ کے پاس کبھی نہ آتی لیکن جب گھر میں آگ لگی ہو تو مدد کے لیے دشمن کو بھی پکار لیا جاتا ہے اور یہ آگ تو آپ کے گھر میں لگی ہوئی ہے، میں تو صرف آپ کو اطلاع دینے آئی ہوں کہ مناسب سمجھیں تو اسے بجھا لیں۔“

”اب کوئی نئی چال سوجھی ہے تمہیں؟“

”آپ اسے میری چال ہی سمجھ لیں لیکن میں آپ کو یہ اطلاع دینے آئی ہوں کہ بہت جلد آپ کی بیٹی آپ کا نام اچھالنے والی ہے۔“

”خبردار جو لائبہ کے نام پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی۔ انسان کی شکل اچھی نہ ہو تو بات ہی اچھی کر لیا کرے۔“

”آپ یقین کریں یا نہ کریں۔ میں نے جو کچھ دیکھا اور سنا ہے اسے آپ کے علم میں لے آئی۔ لڑکا کسی امیر گھرانے کا ہوتا تو کوئی بات بھی تھی۔ وہ جس کی محبت کا دم بھر رہی ہے وہ غریب لڑکا ہے۔ آپ نے اگر مجھ سے شادی کی تھی تو میں ایک امیر باپ کی بیٹی تھی۔ میری آپ نے قدر نہیں کی۔ اب وہ آپ کی عزت اچھالے گی۔“

”تم طنز کر رہی ہو یا ماں کا کردار ادا کر رہی ہو۔“

”آپ کو خطرے کا احساس دلا رہی ہوں۔“

”تمہیں یہ زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر اسے شادی کرنی ہوگی تو مجھ سے بات کرے گی۔“

راحیلہ کو اس کے جذبات کو بھڑکانا تھا۔ وہ اس میں کامیاب رہی تھی۔ اب اسے پینترا بدلنا تھا۔

”اعجاز احمد، جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تو صرف یہ کہہ رہی تھی کہ لڑکا نہ صرف غریب ہے بلکہ سنا ہے شاعر بھی ہے۔“

''اگر وہ شاعر ہے تو میں ہرگز لائبہ کی شادی اس سے نہیں کروں گا۔ شاعروں کی زندگی کیسی گزرتی ہے مجھے معلوم ہے۔''

''اتنے پریشان مت ہو اعجاز احمد۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا اب تو ہمیں یہ سوچنا ہے کہ اس مسئلے کو سلجھایا کیسے جائے۔ سختی سے کام نہیں چلے گا۔ یہ تو ہے کہ اس لڑکے نے لائبہ کی دولت کو دیکھ کر اسے پھانسا ہے لیکن کیا کریں۔ کچھ دنوں میں لائبہ کو خود احساس ہو جائے گا کہ وہ غلطی پر تھی۔''

''میں لائبہ کی یہ بے جا ضد بھی پوری نہیں ہونے دوں گا۔ میں نے اس کی ہر خواہش پوری کی ہے لیکن اب نہیں۔ میں نے دولت اس لیے جمع نہیں کی ہے کہ وہ دوسروں پر لٹاتی پھرے۔ اگر اسے شادی ہی کرنی ہے تو جہاں میں چاہوں گا وہاں کرے گی۔''

''یہ اتنا آسان نہیں ہوگا۔ وہ ایسی نہیں ہے کہ آپ کی ہر بات مان لے۔ اس کی نظروں میں میری عزت آپ نے رہنے نہیں دی کہ میری بات مان لے گی۔''

''اسے ماننا پڑے گا ورنہ میں اسے ایک پھوٹی کوڑی دیے بغیر رخصت کروں گا۔''

''ایک مشورہ میں آپ کو دوں۔ اس وقت آپ کو اس کی پسند کا خیال رکھنا چاہیے۔ اگر آپ نے اپنی پسند سے اس کی شادی کر بھی دی تو وہ بھی خوش نہیں رہے گی۔''

''مجھے اس کی پروا نہیں۔ تم تو یہی چاہو گی کہ وہ غریب گھرانے میں بیاہ کر جائے۔ اپنا مشورہ اپنے پاس رکھو۔''

''آپ کہیں تو لائبہ کو آپ کے پاس بھیج دوں۔ آپ خود اس سے بات کرلیں۔''

''ہاں بھیجو، میں خود اس سے بات کروں گا۔''

راحیلہ اپنا ہنر دکھا چکی تھی۔ نفرت کے شعلے بھڑکا دیے تھے۔ وہ اسی وقت لائبہ کو اس کے پاس بھیجنا چاہتی تھی تاکہ غصے میں بھرا ہوا اعجاز احمد اس پر برس پڑے۔

اب اسے دوسری طرف شعلے بھڑکانے تھے۔ اس نے اپنے چہرے پر مصنوعی افسردگی طاری کی اور لائبہ کے پاس پہنچ گئی۔

''کیا ہوا ممی، ڈیڈی سے بات ہوئی؟''

''بیٹی میرا قصور یہ ہے کہ میں سوتیلی ہوں۔ تمہاری سگی ماں آج زندہ ہوتی تو اپنا اختیار استعمال کر کے تمہاری شادی کرا دیتی۔ میں سوتیلی ہوں اس لیے اعجاز کے انکار کو اقرار میں نہیں بدل سکتی۔''

''انہوں نے انکار کر دیا؟''

''ہاں، مگر تم ان سے مذمت کرنا۔ قسمت کا فیصلہ سمجھ کر قبول کر لینا۔ اگر تم نے ان کی بات نہ مانی تو نہ جانے وہ کیا قدم اٹھا بیٹھیں۔''

''آخر انہیں اعتراض کیا ہے؟''

''انہیں اس لڑکے کی غربت پر سخت اعتراض ہے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ لڑکا تمہاری دولت کی وجہ سے تم سے شادی کر رہا ہے۔''

''غریب کیا انسان نہیں ہوتے؟''

''یہ تو تم انہی سے پوچھنا۔ میں تو یہ سوچ سوچ کر ہول رہی ہوں کہ وہ تمہاری طرف سے مایوس ہو کر کہیں اس لڑکے کو نقصان نہ پہنچا دیں۔''

''ان کی کیا مجال جو وہ اسے کوئی نقصان پہنچائیں۔''

''تم ان سے لڑ نہیں سکتیں۔ اس لڑکے کو نقصان پہنچانے کے لیے ان کے پاس بہت سے ذرائع ہیں۔ کئی غنڈے ہیں جو ان سے باقاعدہ تنخواہ لیتے ہیں۔ جمال مجھے سب بتا چکا ہے۔''

''میں بھی انہی کی بیٹی ہوں۔ دیکھتی ہوں وہ کیا کرتے ہیں۔ میں ابھی ان کے پاس جاتی ہوں۔''

''میرا تو خیال ہے ابھی ان کے سامنے مت جاؤ۔ اس وقت وہ بھی غصے میں ہیں اور تم بھی۔ ان کا غصہ اتر لے دو پھر ان سے بات کرنا۔''

''نہیں، میں ان سے ابھی بات کروں گی۔''

''تم کہو تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں۔ میں ہوں گی تو معاملہ سنبھال لوں گی۔''

اعجاز احمد نے لائبہ کو اس لیے بلایا تھا کہ وہ اسے اونچ نیچ سمجھائے گا لیکن راحیلہ نے لائبہ کو اتنا بھڑکا دیا تھا کہ سمجھنا تو درکنار وہ کوئی بات سننے کو بھی تیار نہیں تھی۔ آتے ہی باپ سے الجھ پڑی۔ دونوں کے درمیان خوب تکرار ہوئی۔ اعجاز احمد نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ کبھی ان سے اس انداز میں بات کرے گی۔ انہوں نے اس کو پھولوں میں تولا تھا، پلکوں کے سائے میں رکھا تھا، سر آنکھوں پر بٹھایا تھا اور اب اس کی زبان سے نکلے ہوئے تیروں سے چھلنی ہو رہے تھے۔

''میں نے تمہیں اس لیے پال پوس کر بڑا نہیں کیا تھا کہ تم میری عزت بازاروں میں اچھالتی پھرو۔ غریب فقیروں کو میرا داماد بناتی پھرو۔ میں تمہیں ہرگز یہ اجازت نہیں دوں گا کہ تم اس نادار لڑکے کو میرا داماد بنا دو۔''

''میں نے یہ کب کہا کہ آپ اسے داماد تسلیم کریں۔ میں تو آپ سے صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ میں اس سے شادی کرنے والی ہوں۔''

''میری مرضی کے بغیر۔''

''آپ اگر میری بات مان لیں تو آپ کی مرضی بھی شامل ہو جائے گی۔''

''وہ تمہاری دولت کے لیے تم سے شادی کر رہا ہے۔ ذرا اس سے یہ کہہ کر دیکھو کہ تمہارا باپ تمہیں ایک پائی بھی دینے کو تیار نہیں۔ پھر دیکھو وہ تم سے شادی کرتا ہے یا نہیں۔''

''اگر آپ کو اپنی دولت پر گھمنڈ ہے تو میں یہ بھی کر کے دیکھ لوں گی۔ وہ آپ کی دولت پر ٹھوکر مار کر مجھ سے شادی کرے گا۔''

''تم یہ شوق پورا کر کے دیکھ لو وہ کبھی تیار نہیں ہوگا۔''

''مجھے آپ دو تین دن کا وقت دیں۔ میں اسے آپ کے پاس لے آؤں گی۔ اس سے جو پوچھنا ہے آپ پوچھ لیجیے گا۔''

اس وقت راحیلہ نے بھی اس کی تائید کی تھی بلکہ اعجاز احمد سے یہ بھی کہا تھا کہ جب وہ لڑکا آئے تو ذرا نرمی سے بات کیجیے گا۔

دوسرے دن وہ یونیورسٹی گئی تو اپنی کلاس میں جانے سے پہلے دانش کے ڈیپارٹمنٹ میں پہنچی۔ وہ آرٹس ڈیپارٹمنٹ میں تھی جبکہ دانش شاعر ہوتے ہوئے کامرس کا طالب علم تھا۔

''کیا بات ہے لائبہ، تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟''

''ابھی میرے ساتھ چلو، تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔''

''یار اب تو یونیورسٹی آ گئی ہو۔ کچھ دیر بعد مل لیں گے۔ کلاس تو ختم ہونے دو۔''

''نہیں میں اتنا انتظار نہیں کروں گی۔ تمہیں ابھی چلنا ہوگا۔''

''اچھا چلتا ہوں بابا۔ میں سر سے کہہ کر آتا ہوں کہ میرے گھر میں کسی کی طبیعت خراب ہے۔ میں کلاس نہیں لے سکتا۔''

''کہنے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ بس چلو۔''

''میری کتابیں اندر پڑی ہوئی ہیں۔''

''اچھا جاؤ لے آؤ مگر جلدی آنا۔''

وہ اسے لے کر آئی تو اس کے قدم پارکنگ کی طرف اٹھ رہے تھے۔ دانش حیران تھا کہ ابھی تو وہ آئی ہے ابھی واپس کیوں جا رہی ہے اور وہ بھی اسے ساتھ لے کر۔

''یہ تم مجھے کہاں لے جا رہی ہو؟''

''مجھے فوراً تمہارے گھر جانا ہے۔''

''میرے گھر؟ مگر کیوں؟''

''ہمیں ملتے ہوئے ایک سال سے زیادہ ہو گیا ہے اور میں ایک مرتبہ بھی تمہارے گھر نہیں گئی۔''

''اس کی کوئی وجہ ہے جو میں تمہیں وقت آنے پر بتاؤں گا۔''

''اس لیے لے کر جانا نہیں چاہتے تاکہ تم غریب ہو میں تمہیں غربت کا طعنہ نہ دے دوں۔''

''یہی سمجھ لو۔''

''جہاں اعتماد نہ ہو وہاں محبت نہیں ہوتی۔ تمہیں مجھ پر اعتماد ہی نہیں۔ تم سمجھتے ہو تمہاری غربت دیکھ کر میں تمہیں چھوڑ دوں گی۔ اگر ایسا ہوتا تو میں پہلے دن ہی تم سے پوچھتی کہ تم کس سیٹھ کے بیٹے ہو۔ اگر میں امیر باپ کی بیٹی ہوں تو اس میں میری بڑائی نہیں اور اگر تم غریب ہو تو اس سے تم کم نہیں ہو جاؤ گے۔ یہ تم نے سوچا بھی کیسے کہ میں تمہاری غربت جانچنے تمہارے گھر جانا چاہتی ہوں۔''

''تم اتنی سنجیدہ ہو جاؤ گی، یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ اب سچ سچ بتاؤ تمہیں میرے گھر جانے کا اچانک خیال کیوں آ گیا؟''

''پھر تم سچ سچ سنو، میرے گھر والوں کو معلوم ہو گیا ہے کہ میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔ میرے والد نے تمہارے بارے میں مجھ سے معلوم کیا۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ تم مڈل کلاس سے تعلق رکھتے ہو تو انہیں تمہارے خلوص پر شک ہوا۔ ان کا کہنا ہے کہ تم میری دولت کی وجہ سے مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ اب تمہیں نہ صرف انہیں مطمئن کرنا ہے کہ تم میری دولت سے نہیں مجھ سے محبت کرتے ہو بلکہ مجھے بھی اطمینان دلانا ہے کیونکہ اس موضوع پر آج تک ہماری کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔''

''میں تمہارے والد سے ملنے کو تیار ہوں اور تمہیں بھی یقین دلاتا ہوں کہ میری نظر تمہاری دولت پر نہیں۔ مجھے تم سے ملاقات کے چند روز بعد ہی معلوم ہو گیا تھا کہ تم سیٹھ اعجاز احمد کی اکلوتی صاحبزادی ہو لیکن سچ بتاؤ میں نے تمہاری حیثیت سے کبھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی؟ تمہیں گھر نہیں لے جا رہا ہوں اس کی بھی کوئی وجہ ہے جو میں تمہارے والد سے ملنے کے بعد بتا بھی دوں گا۔''

''میرے والد تم سے ملنے کے بعد ضرور یہ چاہیں گے کہ تمہارے گھر والے بھی ان سے ملیں۔ اس وقت کیا کرو گے؟''

''اس وقت کی اس وقت دیکھی جائے گی۔''

''تم ڈیڈی سے ملنے کب آ رہے ہو؟''

''کل کا دن تم مجھے دے دو۔ پرسوں پانچ بجے شام

میں تمہارے گھر پر ہوں گا۔“

لائبہ نے گھر پہنچتے ہی یہ خوش خبری راحیلہ کو سنا دی۔ اس کے بعد وہ اعجاز احمد کے پاس گئی۔ انہیں بھی بتا دیا کہ دانش ان سے ملنے آرہا ہے۔

راحیلہ نے ظاہر نہیں ہونے دیا تھا لیکن یہ خبر اس پر بجلی بن کر گری تھی۔

☆☆☆

جس روز دانش کمال کو لائبہ کے گھر جانا تھا اسی دن دوپہر کے وقت وہ کسی کام سے گھر سے باہر نکلا۔ ابھی وہ گلی سے نکل کر سڑک تک پہنچا تھا کہ دو آدمی اس کے پاس آئے۔

”آپ کا نام دانش کمال ہے؟“

”جی ہاں۔“

”تم لائبہ کو جانتے ہو؟“

”جی ہاں۔“

”اور اس کے والد سیٹھ اعجاز احمد کو؟“

”میں نے ان کا نام سنا ہے مگر دیکھا نہیں ہے۔“

”وہ جو سامنے گاڑی کھڑی ہے وہ اس میں بیٹھے ہیں اور تمہیں بلا رہے ہیں۔“

”مجھے ان سے ملنا ضرور تھا مگر انہوں نے تو مجھے شام پانچ بجے بلایا تھا اور وہ بھی اپنے گھر۔ پھر وہ یہاں کیوں آگئے۔“

”ہم تو جی ان کے نوکر ہیں۔ ہمیں کیا معلوم وہ یہاں کیوں آگئے۔ آپ خود چل کر ان سے پوچھ لیں۔“

”چلو بھائی پوچھ لیتے ہیں۔“

اس نے سوچا شاید سیٹھ صاحب لائبہ کی موجودگی میں اس سے ملنا نہ چاہتے ہوں۔ اسی لیے یہاں آگئے۔ شاید انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا ہو کہ میں کس کا بھائی ہوں اس لیے گھر ڈھونڈنے میں بھی دشواری نہ ہوئی ہو۔ گاڑی کو گلی میں لانا مناسب نہ سمجھا ہو۔ اپنے آدمیوں کو میرے گھر کی طرف بھیجا ہو۔ اتفاق یہ ہوا کہ میں انہیں راستے ہی میں مل گیا۔

یہی سوچتا ہوا وہ گاڑی تک پہنچ گیا۔ ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر ادھیڑ عمر کا ایک آدمی بیٹھا تھا۔ وہ سمجھا یہی اعجاز احمد ہے۔ اسے دیکھ کر اسے سخت مایوسی ہوئی تھی کیونکہ وہ شخص شکل سے غنڈا معلوم ہو رہا تھا۔ اتنی حسین بیٹی کا ایسا باپ اس نے سوچا اور اس سے بات کرنے کے لیے اس کے دروازے کی طرف بڑھا۔

”گاڑی میں بیٹھ جاؤ آرام سے بات کرلینا۔“ ان دو آدمیوں نے کہا جو اسے لے کر آئے تھے۔

دانش کو شک بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ آرام سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ دونوں آدمی اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ ان کے بیٹھتے ہی گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔

”جی اعجاز احمد صاحب، میں حاضر ہوں کہیے کیا بات کرنی ہے۔“

اس کا یہ کہنا تھا کہ اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی کی بے ہنگم آواز نے پیچھے بیٹھے ہوئے دونوں آدمیوں کو للکارا۔

”ارے، تم لوگوں نے ابھی تک اسے سمجھایا نہیں۔“

ان لوگوں نے اسے اس طرح سمجھایا کہ ایک نے اس کی پسلیوں پر پستول رکھ دیا اور دوسرے نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ اب اسے احساس ہوا کہ وہ پھنس چکا ہے۔ یہاں کوئی اعجاز احمد نہیں۔ اسے دھوکا دیا گیا ہے۔ مزاحمت کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس نے دو تین بار پوچھنے کی کوشش کی کہ اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ جواب یہی ملا کہ جہاں ہمارے سیٹھ اعجاز نے تمہیں لے جانے کو کہا ہے وہاں لے جا رہے ہیں۔“

”انہوں نے تو مجھے اپنے گھر بلایا تھا۔“

”ان کے کئی گھر ہیں۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ان میں سے کسی گھر میں لے جا کر تمہاری خوب خاطر تواضع کریں۔“

گاڑی میں ایک ساتھ کئی قہقہے گونجے۔ وہ خاموش ہو گیا لیکن سوچ ضرور رہا تھا کہ سرمایہ دار کی ذہنیت نے کام دکھا دیا ہے۔ لائبہ کے باپ نے اس کے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ لائبہ کو یہ تاثر دیا کہ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے اور اب اس سے یہ کہے گا کہ لڑکا جھوٹا تھا۔ جب میں شادی پر تیار ہوا تو وہ غائب ہو گیا۔ لائبہ تو یہی سمجھے گی کہ میں نے بے وفائی کی ہے۔ ”سیٹھ کے بچے میں تجھے چھوڑوں گا نہیں۔“ وہ بے اختیار چیخ پڑا۔ قہقہے پھر گونجنے لگے۔

گاڑی پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ شیشے چڑھے ہوئے تھے اس لیے باہر کا شور اندر نہیں آرہا تھا لیکن اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ شہر سے باہر آگیا ہے یا کم از کم ایسی جگہ ہے جہاں ٹریفک نہیں ہے کیونکہ گاڑی ایک ہی رفتار سے چلی جا رہی تھی۔ پھر گاڑی کی رفتار ٹوٹی اور اس نے ایک موڑ کاٹا۔ کچھ دور چل کر ایک جھٹکے سے رک گئی۔ اس کی آنکھوں پر پٹی اب بھی بندھی ہوئی تھی لیکن دروازہ کھلتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ وہ کسی ایسی جگہ ہے جہاں ٹریفک بالکل نہیں۔ چیخنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کوئی اس کی مدد کو نہیں آئے گا۔ اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے دونوں آدمیوں نے اسے نیچے اتارا اور پستول کی نوک پر اسے آگے چلنے کا حکم دیا۔ اسے محسوس ہوا

کہ وہ کسی عمارت میں داخل ہوگیا ہے۔

"آگے سیڑھیاں ہیں آرام سے اترتے جاؤ۔"

نیچے اترنے کے بعد اس کی آنکھوں سے پٹی اتار دی گئی۔ یہ ایک ہال نما کمرا تھا بلکہ اسے کمرا نہیں ہال ہی کہنا چاہیے۔ لوہے کا ایک پلنگ اور ایک صوفہ پڑا تھا۔ ایک طرف ایک کرسی پڑی تھی جس کی ایک ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی۔ ایک طرف چھوٹا فریج رکھا تھا۔ چھت پر کچھ فاصلہ دے کر دو پنکھے لٹک رہے تھے۔ روشن دان تھا جسے لوہے کی سریوں سے بند کر دیا گیا تھا۔

"ہر دو گھنٹے بعد ایک آدمی آئے گا۔ کوئی ضرورت ہو تو اس سے کہہ دیا کرنا۔"

"جو آدمی مجھے یہاں اغوا کر کے لایا ہے اسے بلاؤ۔ میں اس سے بات تو کروں۔"

"چپ چاپ پڑے رہو۔ کوئی تمہارے باپ کا نوکر نہیں ہے جو تم سے بات کرنے آئے گا۔"

"اعجاز احمد کو بلاؤ۔ میں اس سے اپنا جرم تو پوچھوں۔"

"جب وہ کہے گا، تمہیں اس کے پاس بھیج دیا جائے گا۔"

وہ دونوں آدمی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلے گئے۔ سیڑھیوں کا دروازہ بند ہوگیا۔

اس نے کوئی مشقت نہیں کی تھی لیکن اس کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ یہ اس کے اعصاب تھے جو چیخ رہے تھے۔ وہ لوہے کے پلنگ پر پڑے ہوئے گدے پر لیٹ گیا۔ تنہائی میں سوچنے کے سوا کیا رہ جاتا ہے۔ وہ بھی سوچنے لگا۔ سوچنا کیا تھا۔ اس کا خیال گھر کی طرف چلا گیا تھا۔ میں جب گھر نہیں پہنچوں گا تو میری ماں پر کیا گزر جائے گی۔ بہنیں تو رو رو کر برا حال کر دیں گی۔ اس وقت میرا بھائی میرے کام آ سکتا تھا مگر اسے کیا معلوم کہ میں کہاں ہوں۔ وہ سیٹھ اعجاز کا سیکریٹری ہے۔ سیٹھ اعجاز اس سے خوش بھی بہت ہیں۔ انہیں معلوم نہیں ہوگا کہ میں ان کے سیکریٹری کا بھائی ہوں ورنہ وہ یہ حرکت کبھی نہ کرتے۔ میرا بھائی ان سے کہے گا تو مجھے ضرور رہائی مل جائے گی مگر رہائی ملے گی کہاں سے۔ غلطی تو میری ہے، میں نے گھر میں کسی سے بھی ذکر نہیں کیا تھا کہ اعجاز احمد کی بیٹی سے میری دوستی ہے اور ہم دونوں شادی کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ میں سمجھ رہا تھا ابھی وقت نہیں آیا۔ بھائی کو اچانک بتاؤں گا تو انہیں زیادہ خوشی ہوگی۔ اب وہ اندھیرے میں ہوں گے زیادہ سے زیادہ وہ یہ کریں گے کہ پولیس کے پاس جائیں گے لیکن پولیس اگر اہل ہوتی تو یہ تہ خانہ سلامت ہی کیوں ہوتا۔ پھر وہ یہ سوچنے لگا کہ یہ لوگ مجھے کب تک یہاں رکھیں گے۔ یقیناً اس وقت تک جب تک کہ لائبہ کو میری بے وفائی کا یقین نہیں آجاتا۔ کوئی بات نہیں یہاں سے رہائی ملتے ہی میں لائبہ کو تمام حالات سے آگاہ کر دوں گا۔

☆☆☆

پانچ بج چکے تھے۔ دانش ابھی تک نہیں آیا تھا۔ گھڑی کی طرف دیکھتے دیکھتے لائبہ کی آنکھیں دکھنے لگی تھیں۔ جب ساڑھے پانچ بجے تو وہ کمرے سے نکلی۔ وقت گزاری کے لیے پوری کوٹھی کا چکر لگا لیا۔ اب چھ بج گئے تھے۔ وہ ٹہلتی ہوئی لان میں آئی۔ فرش پر بچھی ہوئی گھاس اسے کانٹوں کا بچھونا معلوم ہو رہی تھی۔ پھول انگارے لگ رہے تھے۔ دانش اب تک کیوں نہیں پہنچا۔ وہ ٹہلتی رہی ٹہلتی رہی۔ باپ کے کمرے کے سامنے سے گزری۔ شرمندگی نے اندر قدم نہیں رکھنے دیا۔ تھک ہار کر اپنے کمرے میں آگئی۔ اب اسے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ اگر اس کا گھر دیکھ لیا ہوتا تو ابھی گاڑی لے کر پہنچ جاتی۔ اسے لے کر آتی مگر کیوں لے کر آتی، وہ خود کیوں نہیں آیا؟ یہ ایسا سوال تھا جس کا جواب اس کے پاس کوئی نہیں تھا۔ وہ کمرے سے نکلی اور راحیلہ کے کمرے کی طرف چل دی۔ شاید وہ کچھ بتا سکیں۔ انہوں نے دنیا دیکھی ہے۔ شاید وہ کوئی ایسی ترکیب بتائیں کہ میں ڈیڈی کو مطمئن کر سکوں۔

"ممی، دانش نے آج آنے کو کہا تھا۔"

"کیا وہ آگیا۔" انہوں نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"یہی تو کہنے آئی ہوں، ڈیڈی تیار ہوئے بیٹھے ہیں۔ اس کا انتظار کر رہے ہیں اور وہ ابھی تک پہنچا ہی نہیں۔"

"کب تک آنے کو کہا تھا اس نے؟"

"کہہ رہا تھا ٹھیک پانچ بجے آجاؤں گا۔"

"ارے ہاں، اب تو بہت وقت ہوگیا۔ ہوسکتا ہے وہ کسی مصیبت میں ہو۔ میرا مطلب ہے اسے کوئی کام پڑ گیا ہو۔"

"یہاں آنے سے زیادہ ضروری کون سا کام ہوسکتا تھا۔ اب میں ڈیڈی کو کیا جواب دوں۔ آپ ہی کوئی مشورہ دیں۔"

"اپنے ڈیڈی کے سامنے تم مت جاؤ۔ میں جا کر انہیں سمجھائے دیتی ہوں۔"

لائبہ وہیں بیٹھی رہی اور راحیلہ، اعجاز کے کمرے میں چلی گئی۔

"لائبہ میرے پاس آئی تھی۔ بہت پریشان ہے۔ دانش ابھی تک نہیں آیا۔"

"بھئی آج نہیں تو کل آجائے گا۔ ہوسکتا ہے اسے کوئی

مصروفیت ہوگئی ہو۔"

"بڑے اس نواب زادے کے کارخانے چل رہے ہیں جو مصروفیت ہوگئی ہوگی۔ اسے آنا ہوتا تو آچکا ہوتا۔ آپ مانیں نہ مانیں وہ لڑکا مجھے فراڈ معلوم ہوتا ہے۔ اسے شادی کرنی ہی نہیں ورنہ ضرور آتا۔ لائبہ نے اس سے کہہ دیا ہوگا کہ اسے پھوٹی کوڑی بھی ملنے والی نہیں صرف شادی کر لے۔ وہ پاگل تھا جو یہ کہنے آتا کہ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ معاف کیجیے گا اسے آپ کی بیٹی سے تفریح لینی تھی۔ اس کا مطلب نکل گیا۔ اب کیوں آئے گا۔"

"راحیلہ اتنی بے دردی سے بات کیوں کرتی ہو۔"

"سوتیلی ہوں اس لیے میری بات کڑوی معلوم ہو رہی ہے ورنہ حقیقت تو یہی ہے۔"

"تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔ لائبہ کو میرے پاس بھیجو۔"

"لائبہ تو اس کی حمایت ہی کرے گی مگر تم اپنی آنکھیں کھلی رکھنا۔ کسی دن اس کے ساتھ بھاگ گئی تو ہاتھ ملتے رہ جانا۔" اس نے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا تھا اس لیے اس کا ردعمل نہ دیکھ سکی۔

"جاؤ تمہارے ڈیڈی بلا رہے ہیں۔ غصے میں ہیں مگر تم غصے میں مت آنا۔ اس وقت تمہارا مطلب ہے۔ میں تو سوتیلی ماں ہوں، میری بات تو ان کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی۔"

لائبہ نے ڈرتے ڈرتے باپ کے کمرے میں قدم رکھا۔

"تم تو کہہ رہی تھیں کہ اسے تمہاری دولت سے غرض نہیں۔ وہ یہ کہنے میرے پاس آئے گا کہ اسے تمہاری یا میری دولت سے کوئی سروکار نہیں ہوگا۔"

"میں یہ بات اب بھی کہہ رہی ہوں۔"

"پھر وہ کیوں نہیں آیا۔" ان کی آواز اونچی ہوگئی۔ "اس نے میری بے عزتی کی ہے۔ میں انتظار کر رہا ہوں اور وہ نواب صاحب غائب ہیں۔"

"وہ ایسا نہیں ہے ڈیڈی۔ ہوسکتا ہے اس کی طبیعت خراب ہوگئی ہو یا کوئی اور بات ہو۔" اتنا کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"ڈرائیور کو لے کر ابھی اس کے گھر جاؤ۔ تمہیں خود معلوم ہو جائے گا وہ کتنا سچا ہے۔"

"ڈیڈی، میں اس کا گھر نہیں جانتی۔ ہماری ملاقاتیں تو یونیورسٹی میں ہوتی ہیں۔"

"ویلڈن یہ بات یہاں تک پہنچ گئی اور تم نے اس کا گھر تک نہیں دیکھا۔ وہ اگر سنجیدہ ہوتا تو تمہیں اپنے والدین سے ملواتا۔ وہ اتنے اہم معاملے کو بڑوں تک لانا ہی نہیں چاہتا۔ اس لیے وہ میرے پاس نہیں آیا۔ اب میں صاف کہہ سکتا ہوں کہ وہ صرف تمہیں ورغلانا چاہتا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا تم سب کچھ سمیٹ کر اس کے ساتھ چل دو گی۔ وہ تو شکر بھیجو راحیلہ نے تمہاری نگرانی کی اور تم سے سچ اگلوا لیا ورنہ ہم سب اندھیرے میں رہتے اور تم اس کی باتوں میں آ کر وہ سب کچھ کر گزرتیں جو وہ چاہتا تھا۔"

"وہ ایسا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ضرور کچھ گزری ہے۔ میں اس کا ایڈریس تلاش کر کے اس سے ضرور ملوں گی۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔ اگر اسے زبردستی تلاش کر کے یہاں لے بھی آئیں تو کیا فائدہ۔ اب میں تمہاری شادی اس سے نہیں ہونے دوں گا۔"

وہ یہ سوچ کر کمرے سے نکل آئی کہ اس وقت ڈیڈی غصے میں ہیں۔ میں پہلے دانش کی خیر خبر لے لوں، اس کے بعد انہیں بھی منا لوں گی۔

وہ رات بھر مختلف اندیشوں سے لڑتی رہی۔ دانش کبھی اسے بے وفا نظر آتا تھا کبھی بے قصور دکھائی دیتا تھا۔ کبھی سوچنے لگتی تھی اس نے اپنا گھر اسی لیے نہیں دکھایا تھا کہ میں کبھی وقت پڑے تو وہاں پہنچ نہ سکوں۔ کبھی وہ سچا نظر آتا تھا کبھی جھوٹا۔ وہ رات بھر جاگتی رہی۔ صبح ہوتے ہی آنکھوں میں جلن بدن میں تھکن لیے یونیورسٹی پہنچ گئی۔ یہاں اسے اس کے کچھ ایسے دوستوں کو تلاش کرنا تھا جو اس کے گھر سے واقف ہوں۔ اسے امید نہیں تھی کہ کوئی اس کا گھر جانتا ہوگا کیونکہ وہ لیے دیے رہتا تھا۔ وہ اس کے کسی ایسے دوست سے واقف نہیں تھی جس کے ساتھ دانش کو گھومتے پھرتے دیکھا گیا ہو۔ لڑکے اگر ہوتے بھی ہیں تو باہر کے دوست ہوتے ہیں۔ کون ہوگا جو اس کے گھر سے واقف ہو۔ وہ موہوم سی امید لیے کامرس ڈیپارٹمنٹ میں چلی گئی۔

ایک ایک لڑکے سے پوچھ لیا کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ لڑکیوں سے پوچھنا غیر مہذب تھا۔ اس نے اب یہ سوچ لیا تھا کہ وہ چیئرمین کے پاس جائے گی اور سرکاری ریکارڈ سے اس کا ایڈریس نکلوائے گی کہ اتنی دیر میں ایک لڑکا اس کے پاس آیا۔

"آپ دانش کا ایڈریس معلوم کر رہی ہیں؟"

"ہاں۔"

"یہاں اگر کسی کو معلوم بھی ہوگا تو وہ آپ کو بتائے گا نہیں۔ دانش نے سب کو منع کر دیا ہے۔ فزکس ڈیپارٹمنٹ میں ایک لڑکی نگار ہے۔ وہ آپ کو بتا سکتی ہے۔"

"اسے بھی دانش نے منع کر دیا ہوگا۔"

"ان دنوں دانش کی اس سے بول چال نہیں ہے۔ شاید اسے منع نہ کیا ہو۔"

"وہ کیسے جانتی ہے۔"

"ایک زمانے میں دانش کا اس سے کمال کا افیئر چلا تھا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا دونوں کے راستے الگ ہو گئے۔ مجھے معلوم ہے وہ اس کے گھر جاتی رہی ہے۔"

اس نئے انکشاف نے اسے چکرا کر رکھ دیا۔ میں دانش کا پہلا شکار نہیں ہوں۔ مجھ سے پہلے وہ کسی اور کو بھی دھوکا دے چکا ہے۔

"کیا سوچنے لگیں آپ۔ چلیے میں آپ کی ملاقات نگار سے کروا دوں۔ میرے محلے ہی میں رہتی ہے اس لیے میری اس سے دعا سلام ہے۔" لڑکے نے کہا۔ "بلکہ آپ ایسا کریں، یہ سامنے جو کولڈ ڈرنک شاپ ہے یہاں کھڑی ہو جائیں۔ میں نگار کو لے کر وہیں آتا ہوں۔"

وہ ایک درخت کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ فزکس ڈیپارٹمنٹ کامرس ڈیپارٹمنٹ سے کچھ فاصلے پر تھا۔ کچھ دیر میں وہ لڑکا نگار کو بائیک پر بٹھا کر لے آیا۔ وہ تیکھے نقوش اور بڑی بڑی آنکھوں والی ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ جگہ بنائے ہوئے تھی۔ یہ مسکراہٹ لائبہ کو دیکھ کر ابھری تھی۔

"دانش کا پتا آپ کو کیوں درکار ہے؟"

"میرے خیال میں یہ آپ کو پوچھنے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔"

"سائل سے اس کی مجبوری پوچھ لی جائے تو دور کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔"

"ایک قرض ہے جو اس سے وصول کرنا ہے۔"

"قرض راہ چلتے کو نہیں دیا جاتا۔ آپ کا کوئی تعلق اس سے رہا ہوگا۔"

"جب آپ یہ جانتی ہیں تو پوچھ کیوں رہی ہیں۔"

"اس لیے کہ اس نے مجھ سے بھی قرض لیا تھا۔ گھر جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ دو چار دن انتظار کرلیں۔ وہ یونیورسٹی آنے لگے گا۔ پھر اس سے خود ہی پوچھ لیجیے گا۔"

"شاید وہ اب بھی نہ آئے کیونکہ قرض بہت بڑا ہے۔ آپ مجھے اس کا پتا دے دیجیے۔ میں اگر وصول نہ کر سکی تو جتا تو دوں گی۔"

اس لڑکی نے ایک کاغذ پر اس کا ایڈریس لکھ دیا۔ جتنا زبانی سمجھا سکتی تھی زبانی بھی سمجھا دیا۔

"اب میں آپ سے کچھ پوچھوں؟ صرف اس لیے کہ آپ کے تجربے سے مجھے فائدہ ہو۔"

"آپ کیا پوچھیں گی میں خود ہی بتائے دیتی ہوں۔ میں تعلیم کے لیے پہلے سال میں تھی کہ دانش سے میری دوستی ہوئی۔ میں اس کی شاعری پر شیدا تھی۔ اس سے اس نے فائدہ اٹھایا۔ شاعر تو ہوتے ہی حسن پرست ہیں۔ اسے کوئی اور لڑکی پسند آگئی۔ تیسری غالباً آپ ہیں شاید وہ آپ سے مخلص ہو لیکن مجھے لگتا نہیں۔"

"میرا اس سے وہ تعلق نہیں جو آپ سمجھ رہی ہیں۔ میرے کچھ خاندانی مسئلے ہیں جن کا حل اس کے پاس ہے۔ میں اسی سلسلے میں اس سے ملنے کی خواہاں ہوں۔"

"ایک دن میں بھی کسی سے یہی کہتی ہوئی اس کے گھر تک گئی تھی۔ آپ شوق سے ہو آئیں وہ گھر پر ہوگا ہی نہیں اور پھر اچانک نمودار ہو جائے گا۔ کوئی نہ کوئی کہانی گھڑ دے گا۔"

لائبہ نے اس سے اجازت لی۔ اب اسے پارکنگ کی طرف جانا تھا جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ نگار نے جو انکشافات کیے تھے اس کی رگوں میں اس کا خون منجمد کرنے کے لیے کافی تھے۔ پاؤں رکھتی کہیں تھی پڑتا کہیں تھا۔ اسے اپنے ڈیڈی کی باتیں سچ نظر آرہی تھیں۔ دانش جان بوجھ کر غائب ہوا ہے۔ اب وہ مجھ سے تعلق رکھنا نہیں چاہتا۔ یہ واردات اس نے پہلی مرتبہ نہیں کی ہے۔ اس نے بڑی مشکل سے یہ فیصلہ دیا کہ دانش عادی مجرم ہے۔ اسے شاعروں کی حسن پرستی کے قصے یاد آنے لگے۔ میں نے اسے کس شدت سے چاہا تھا اور اس نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اب میں اس کے گھر کیا لینے جا رہی ہوں۔ اس نے خود سے سوال کیا۔ چلنا تو چاہیے، ممکن ہے کوئی اور انکشاف میری آنکھیں کھول دے۔ وہ گاڑی میں بیٹھی اور نگار کے بتائے ہوئے ایڈریس کی طرف چل دی۔ دل میں سوچ رہی تھی میں اچانک جا رہی ہوں۔ اس کے گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ میں اس کے گھر پہنچ سکتی ہوں۔ ممکن ہے وہ گھر پر مل جائے۔

چند گلیوں میں گھومنے کے بعد وہ اس کے مکان تک پہنچ گئی۔ اطلاعی گھنٹی کے جواب میں ایک لڑکی دروازے پر آئی۔

"فرمایئے، آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

"دانش کمال کا گھر یہی ہے نا۔"

"جی ہاں۔ آپ کو کس سے ملنا ہے۔"

"انہی سے ملنا ہے۔"

"وہ تو گھر پر نہیں ہیں۔"

"مجھے اندر آنے دو۔ مجھے تم لوگوں سے بہت سی باتیں

کرنی ہیں۔"

"جب وہ گھر پر ہوں اس وقت آیئے گا۔"

"اس وقت تک تو بہت دیر ہو جائے گی۔ میں چند باتیں پوچھوں گی اور چلی جاؤں گی۔"

"میں دروازہ بند کروں یا آپ جا رہی ہیں۔ اس وقت اماں بھی گھر پر نہیں ہیں ورنہ بلا لیتی۔"

"ڈرو نہیں۔" لائبہ نے دروازے میں ہاتھ پھنساتے ہوئے کہا۔ "میں دانش کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہوں۔ اس کی دوست ہوں۔ اس سے مجھے شکایت ہے جو میں تمہیں بتانے آئی ہوں۔"

"ان کی دوستیں تو ہمارے گھر آتی رہتی ہیں۔ آپ تو کبھی نہیں آئیں۔"

"میں ان کی نئی دوست بنی ہوں۔ تمہیں یقین نہیں تو یونیورسٹی کا کارڈ دیکھ لو۔" اس نے کارڈ نکال کر اسے دکھایا۔

"اچھا اندر آجایئے۔"

وہ اس کے ساتھ گھر میں چلی گئی۔ گھر سے کوئی ایسی غربت بھی نہیں جھلک رہی تھی کہ جسے چھپانے کے لیے دانش اسے اپنے گھر نہیں لایا تھا۔ گھر چھوٹا ضرور تھا لیکن ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ ڈرائنگ روم بھی سلیقے کا تھا۔

"تمہارے دانش بھائی کہاں گئے ہوئے ہیں۔ میں انتظار کرلوں تو آجائیں گے؟"

"وہ تو دو دن سے گھر نہیں آئے ہیں۔"

"کیا اس سے پہلے بھی اس طرح غائب ہوئے ہیں؟"

"ان کی یہی عادت ہے۔ غائب ہو جاتے ہیں پھر فون کرتے ہیں کہ میں دوستوں کے ساتھ ہوں یا خود ہی آجاتے ہیں۔ شاعروں کا تو ایسا ہی ہے۔ کسی کا خیال نہیں بس اپنے مشاعروں کی فکر ہے۔ آپ سے بھی ملنے کا وعدہ کیا ہوگا اور ہو گئے غائب۔"

"ان عادتوں پر کوئی انہیں ٹوکتا نہیں؟"

"سب ٹوکتے ہیں مگر وہ ہیں ہی ایسے۔"

"آپ لوگوں کو ان کی شادی کر دینی چاہیے۔"

"منگنی تو ہو گئی ہے مگر شادی ایک دو سال بعد ہی ہوگی۔ بڑے بھائی کی شادی کے بعد۔"

"ان سے بڑے بھائی بھی ہیں۔"

"ہاں ہیں نا جمال بھائی۔ یہ لگی تو ہے ان کی تصویر۔" لائبہ نے اس لڑکی کے اشارے کی طرف گردن گھما کر دیکھا اور خود تصویر بن گئی۔ یہ وہی جمال احمد تھا جو اس کے باپ کا سیکریٹری تھا جسے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آتا تھا۔

"اب میں چلتی ہوں۔"

"بس اماں آتی ہی ہوں گی۔"

"نہیں اب میں چلوں گی۔ میرے ہر سوال کا جواب مجھے مل گیا۔"

اتنا کچھ جاننے کے بعد وہ وہاں نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ اس کا مطلب ہے دونوں بھائیوں نے مل کر مجھے بے وقوف بنایا ہے اور ہو سکتا ہے اس میں میری سوتیلی ماں بھی شریک ہو۔ اب اگر دانش مجھے مل بھی جائے تو میرے لیے بے کار ہے۔ میں اس گھر میں کیسے رہ سکوں گی جہاں جمال بھی رہتا ہو۔ نہ بھی رہتا ہو تو اس سے ایک رشتہ تو ہو ہی جائے گا۔

اب اس کی سمجھ میں آتا جا رہا تھا کہ دانش اسے اپنا گھر کیوں دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا ہوگا کہ میں اس کے گھر آؤں اور یہ راز مجھ پر کھل جائے کہ جمال اس کا بھائی ہے۔

وہ اپنے بھائی کے کہنے پر محبت کا ڈراما اتنی ہی دیر کھیل سکتا تھا جتنی دیر کھیل لیا۔ اب میں زیادہ بے وقوف بننے والی نہیں۔

☆☆☆

لائبہ کے یونیورسٹی روانہ ہوتے ہی راحیلہ نے گاڑی نکالی تھی اور تیزی سے کوٹھی کا گیٹ پار کر گئی تھی۔ اس نے ملازموں میں سے کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔

اس کی گاڑی شہر سے باہر نکل کر ایک کچی بستی سے گزر رہی تھی۔ ان چھوٹے چھوٹے مکانوں سے ذرا ہٹ کر ایک عمارت بنی ہوئی تھی۔ اس نے گیٹ کے سامنے پہنچ کر گاڑی کا ہارن دیا۔ جواب میں کسی نے گھر کی چھت سے جھانک کر دیکھا۔ اس کی گاڑی پہچان کر کسی نے دروازہ کھول دیا۔ گاڑی اندر داخل ہوئی اور دروازہ بند ہو گیا۔ دو بندوق بردار اس کی گاڑی کے ارد گرد آکر کھڑے ہو گئے۔

"شیرو دادا کہاں ہیں۔"

"جب سے آپ کا فون آیا ہے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"مجھے ان کے پاس لے چلو۔"

یہ عمارت دراصل ظالم خان کا اڈا تھا۔ ظالم خان تو ایک پولیس مقابلے میں مارا گیا تھا۔ اب یہ اڈا اس کا ایک ساتھی شیرو چلا رہا تھا۔ اس کی بھی دہشت ایسی تھی کہ پولیس اس طرف کا رخ نہیں کرتی تھی۔ سر شام جواری آتے تھے۔ لاکھوں روپے کا جوا چلتا تھا۔ راحیلہ کے ایک دوست سیٹھ

بدرالدین بھی یہاں کے مستقل آنے والوں میں سے تھے۔ ایک دو مرتبہ جمال بھی یہاں آچکا تھا۔ راحیلہ عورت ہونے کی وجہ سے یہاں صرف اس وقت آتی تھی جب اسے شیرو سے کوئی خاص کام پڑتا تھا۔ وہ اس وقت فون کر کے آئے تھی اس لیے شیرو اس کا منتظر تھا۔

ظالم خان راحیلہ کے باپ کرم نواز کا تنخواہ دار تھا۔ اس کے مرنے کے بعد یہ خدمت راحیلہ انجام دیتی رہی تھی۔ ظالم خان کے بعد جب شیرو نے تخت سنبھالا تو راحیلہ ایک مخصوص رقم اسے بھیجنے لگی تھی۔ اعجاز احمد اسی لیے اس سے ڈرتے رہتے تھے۔ انہیں شیرو اور راحیلہ کے رابطہ کا علم تھا۔

راحیلہ نے جیسے ہی کمرے میں قدم رکھا شیرو کی نشے میں بوجھل آواز گونجی۔

"ام سالا آج تک کسی سے نہیں ڈرا۔ تمہارا فون نے ام کو ڈرا دیا۔ ایسا کیا حالات ہو گیا کہ تمہارا منہ سے الفاظ نہیں نکل رہا تھا۔ ام زندہ ہے اور تم اتنا گھبرا گیا۔"

"خان صاحب، بات ہی ایسی ہے کہ سنو گے تو تم بھی اچھل جاؤ گے۔"

"تو پھر سناؤ۔"

"تمہارے آدمی جس لڑکے کو اٹھا کر لائے ہیں، وہ کم بخت میرے خیال میں جمال صاحب کا چھوٹا بھائی ہے۔ وہ میرے پاس آیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا، اس کا بھائی دو دن سے گھر نہیں آیا۔ وہ پولیس میں رپورٹ درج کرائے گا۔"

"تم ام کو یہ بتانے آیا ہے کہ پولیس والا ام پر ہاتھ ڈالے گا۔ ام یہاں سے فرار ہو جاوے۔"

"نہیں خان صاحب، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"پھر کیا مطلب ہے، بولو۔ اس لڑکے کو چھوڑ دے۔"

"ایسا کرنا بھی مت۔ وہ یہاں سے جا کر اپنے بھائی کے سامنے سب اگل دے گا کہ اسے کس نے اغوا کیا تھا۔"

"آپ بولو تو جمال صیب کو بھی اس کے بھائی سے ملا دے۔"

"نہیں، ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ ابھی تو تم ایسا کرو اس سے دو خط لکھواؤ۔ ایک اس کی ماں کے نام اور دوسرا لائبہ کے نام۔ اس کے بعد میں بتاؤں گی کہ اسے رہا کرنا ہے یا نہیں۔"

"ابی بولو، خط میں کیا لکھوانا ہے۔"

"میں وہ خط اپنے ہاتھ سے لکھ کر دیتی ہوں۔ دانش سے بولنا دونوں خط اپنے ہاتھ سے لکھ کر اپنے دستخط کر دے۔ وہ دونوں خط ابھی مجھے لا کر دے دو۔"

راحیلہ نے پہلا خط دانش کی ماں کے نام لکھا۔

"اماں، میں دوستوں کے ساتھ جا رہا ہوں۔ چند روز بعد خود ہی آجاؤں گا۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

دوسرا خط اس نے دانش کی طرف سے لائبہ کے نام لکھا۔

"تم سوچ رہی ہو گی کہ میں تمہارے سرمایہ دار باپ سے ملنے کیوں نہیں آیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ میں تمہارے ساتھ ٹائم پاس کر رہا تھا۔ تم تو سنجیدہ ہو گئیں۔ شادی کا سوچنے لگیں۔ میں شاعر ہوں۔ حسن پرست ہوں لیکن یہ پرستش ایک حد تک ہی اچھی لگتی ہے۔ میری عادت یہ بھی ہے کہ ایک صورت سے میرا دل بہت جلد بھر جاتا ہے۔ ویری سوری یار، میرا دل بھر گیا ہے اب کسی اور چہرے کی تلاش ہے۔

کیا تم نے کبھی سوچا کہ میں نے تمہیں اپنے گھر والوں سے کیوں نہیں ملایا۔ اس لیے کہ جب میں غائب ہو جاؤں تو تم میرے گھر نہ پہنچ سکو۔ اگر تم پہنچ بھی گئیں جان من تو میں تمہیں پہچاننے سے انکار کر دوں گا۔ اگر اس بے عزتی سے بچنا چاہتی ہو تو مجھے ڈھونڈتی ہوئی میرے گھر کبھی نہ آنا۔ اگر تم نے یہ غلطی کی تو تمہارے بارے میں ایسی ایسی من گھڑت کہانیاں پریس کو دوں گا کہ منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گی۔ اتنے دن ساتھ رہنے اور اچھی اچھی غزلیں عطا کرنے کا شکریہ۔ بہت جلد میرا نیا دیوان شائع ہو گا۔ اسے پڑھ لینا۔ تمہارا ماضی تمہارے سامنے آجائے گا۔"

"یہ دو خط ہیں۔ دانش سے بولنا ان دونوں خطوں کو اپنے ہاتھ سے لکھ کر اپنے دستخط کر دے۔"

"ام سمجھ گیا۔"

"اور یہ لو، پورے ایک لاکھ ہیں۔" راحیلہ نے نوٹوں کی گڈی میز پر رکھ دی۔

"ام یہ بھی سمجھ گیا۔"

"خان صاحب تم خود جاؤ گے اس کے پاس۔" راحیلہ نے اسے اٹھتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"ہاں ام جائے گا۔ کوئی اور گیا تو وہ چیں پیں کرے گا۔ میں جائے گا تو اس کا دماغ درست ہو جائے گا۔ تم جب تک نشہ پانی کرو۔ میں آتا ہے۔"

"تمہیں معلوم ہے میں دن میں نہیں پیتی۔"

"تمہارا مرضی۔"

شیرو نے اپنے چند مسلح ساتھیوں کو ساتھ لیا اور تہ خانے کی سیڑھیاں اتر کر دانش کے پاس پہنچ گیا۔

"بچہ، یہ دو خط کا نقل تم اپنا ہاتھ سے کرے گا۔" شیر خان نے دونوں خط اس کے حوالے کر دیے۔

دانش نے دونوں خطوں پر ایک نظر ڈالی۔ پہلے خط پر تو اسے کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا لیکن لائبہ کے نام لکھے گئے خط پر نظر ڈالتے ہی اس کے ہوش اڑ گئے۔ اس خط پر دستخط کرنا لائبہ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونے کے مترادف تھا۔

"میں ان خطوں کی نقل نہیں کروں گا۔"

"مستان!" شیرو کی آواز یوں گونجی جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ "اس خنزیر کا ہاتھ پاؤں باندھ دو۔" ایک آدمی اوپر گیا اور رسی لے کر آ گیا۔ شیرو کے آدمیوں نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے اور گٹھری بنا کر ڈال دیا۔ دانش کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ لوگ اس کے ساتھ کیا کرنے والے ہیں۔

"یار اسے سمجھاؤ۔" شیرو نے اپنے ساتھ آئے ہوئے لوگوں سے کہا۔

"ابھی دادا کا بات مان لو۔ اب بھی وقت ہے۔ دادا کا ہاتھ اٹھ گیا تو پھر کوئی نہیں روک سکے گا۔"

"نہیں، میں نہیں مانوں گا۔"

اس کے کانوں میں سانپ کی پھنکاروں جیسی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ شیرو کی دہکتی ہوئی سانسیں تھیں۔ "میرا ہنٹر لے کر آؤ۔"

ہنٹر کا نام سنتے ہی دانش کا بدن خود بہ خود کانپنے لگا۔ یہ لوگ میری چمڑی ادھیڑ دیں گے۔ میری چیخیں سننے والا بھی کوئی نہیں ہو گا۔ بالآخر مجھے ان کا حکم ماننا پڑے گا تو ابھی کیوں نہ مان لوں۔ خط پڑھ کر لائبہ مجھ سے بدظن ہی تو ہو گی۔ ہو جائے۔ میں یہاں سے نکلتے ہی اس کی غلط فہمی دور کر دوں گا بلکہ اس کے باپ کا چہرہ ایسا بے نقاب کروں گا کہ وہ باپ سے بدظن ہو جائے گی۔ اخبارات میں کئی دوست ہیں۔ پریس کا سہارا لوں گا لیکن یہ سب کچھ اس وقت ہو گا جب میں باہر نکل جاؤں گا۔ مجھے ضد چھوڑ کر باہر نکلنے کی فکر کرنی چاہیے۔

"ٹھہرو۔" وہ زور سے چیخا۔ "میں تیار ہوں۔"

"کھول دو اسے۔" شیر خان نے کہا۔

وہ اپنے ساتھ کاغذ اور قلم لے کر آیا تھا۔ دونوں چیزیں دانش کے ہاتھ میں دے دیں۔ راحیلہ کے ہاتھ سے لکھے ہوئے دونوں خط بھی اس کے سامنے رکھ دیے۔

دانش نے دونوں خطوں کی نقل کی اور اس کے حوالے کر دیے۔

"اب تو مجھے رہائی مل جائے گی۔" دانش نے پوچھا۔

"اس کا فیصلہ ام نہیں سیٹھ صیب کرے گا۔ ان کے حکم پر تم کو لایا گیا تھا، ان ہی کے حکم پر چھوڑا جائے گا۔"

یہ لوگ ہدایت کے مطابق راحیلہ کے بجائے بار بار سیٹھ اعجاز احمد کا نام لے رہے تھے تاکہ دانش یہی سمجھے کہ اس کے ساتھ جو بھی ہو رہا ہے وہ اعجاز کے حکم پر ہو رہا ہے۔ وہ باہر جا کر کسی کو بتائے بھی تو اعجاز کا نام لے۔

ان کے جاتے ہی دانش نڈھال ہو کر بستر پر گر پڑا۔

"سیٹھ اعجاز احمد، تیرا دماغ تو میں باہر نکل کر درست کروں گا۔"

شیرو کامیاب واپس آیا تھا۔ اس نے آتے ہی دونوں خط راحیلہ کے حوالے کر دیے۔

راحیلہ نے اپنے پرس سے ایک گڈی اور نکالی اور بستر پر رکھ دی۔ "یہ ایک لاکھ میں اس نیت سے لائی تھی کہ کام ہونے کے بعد دوں گی یہ اور رکھ لو۔"

"ابھی بولو اس کو چھوڑنا کب ہے۔" وہ پوچھ رہا تھا۔

"جب اسے چھوڑنا ہو گا، میں فون کر دوں گی۔ اور ہاں، ایک کام اور کر دو۔ اس کی ماں کے نام جو خط ہے وہ اپنے کسی آدمی کے ہاتھ پہلی فرصت میں اس کے گھر پہنچا دو۔"

"میں ابھی کسی کو بھیجتا ہے۔ وہ لڑکا اپنا ایڈریس خود اگل دے گا۔"

راحیلہ وہاں سے نکلی تو اتنی خوش تھی کہ گھر پہنچتے ہی اس نے پہلے یہ چیک کیا کہ لائبہ واپس آچکی ہے یا نہیں اور پھر اعجاز کو فون کر دیا کہ وہ تمام کام چھوڑ کر فوراً گھر پہنچے۔

لائبہ نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھا کہ اس کے ڈیڈی کی گاڑی پورچ میں داخل ہوئی۔ وہ وقت سے پہلے دفتر سے واپس آ گئے تھے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ اکثر آجاتے تھے۔ غیر معمولی بات تو اس وقت بن گئی جب اسے بلایا گیا۔ ڈیڈی نے آتے ہی اسے بلایا ہے، خدا خیر کرے۔ وہ ان کے کمرے میں پہنچی۔ راحیلہ اس کے پہنچنے سے پہلے وہاں بیٹھی ہوئی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اعجاز احمد اور اس کے تعلقات ایسے نہیں تھے کہ وہ ان کے استقبال کے لیے ان کے کمرے میں آ گئی ہو۔ ضرور کوئی اہم بات تھی۔

"آؤ بیٹھو لائبہ۔" راحیلہ نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر اعجاز احمد سے مخاطب ہوئی۔ "آپ دونوں بہت پریشان تھے کہ دانش کمال وعدہ کر کے کیوں نہیں آیا۔ اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہو چکا ہے۔ لائبہ کو میں نے اس لیے بلا لیا کہ وہ جس صدمے سے دوچار ہے اس سے باہر نکل آئے اور آپ کو بھی آئندہ کوئی فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔ ابھی کچھ دیر پہلے کوئی شخص مجھے یہ خط دے کر گیا ہے۔ اسے آپ بھی پڑھ لیں اور لائبہ کو بھی پڑھوا دیں۔ میں اس خط کو چھپا بھی سکتی تھی لیکن ضروری ہے کہ آپ دونوں اسے پڑھ لیں۔"

اس خط کو پہلے اعجاز نے پڑھا اور پھر مردہ ہاتھوں سے لائبہ کی طرف بڑھا دیا۔ اعجاز تو کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھا لیکن خط پڑھتے ہی لائبہ چیخ اٹھی۔

”یہ جعلی خط ہے۔ کوئی ہے جو میرے خلاف سازش کر رہا ہے۔“ وہ کہہ ضرور رہی تھی لیکن اس کی آواز میں اعتماد نہیں تھا۔ وہ دانش کے گھر ہو آئی تھی اور بہت سی حقیقتیں اس پر ظاہر ہو چکی تھیں۔ اس کی بے وفائی کے لیے نگار کی گواہی بہت تھی۔

”مجھے یہ تو پتا نہیں کہ جعلی ہے یا اصلی ہے۔ مجھے تو کسی نے لا کر دیا اور میں نے تمہیں دے دیا۔“

”ممی، آپ خود سوچیں، اسے اگر نہیں آنا تھا نہ آتا۔ خط کیوں لکھتا۔“

”اس لیے لکھتا کہ آئندہ تم اس سے نہ ملو۔“

”میں پھر کہتی ہوں یہ کوئی سازش ہے۔ یہ خط یا تو اس سے زبردستی لکھوایا گیا ہے یا کسی نے اس کے نام سے لکھا ہے۔ وہ یہی باتیں مجھ سے فون پر بھی کہہ سکتا تھا۔“

”اسے کیا کرنا چاہیے تھا کیا نہیں، میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ تم جانو تمہارے ڈیڈی جانیں۔“

اعجاز بہت دیر سے خاموش تھا مگر اب خاموش نہ رہ سکا۔ وہ لائبہ پر برس پڑا۔

”دھوپ نکلی ہوئی ہے اور تمہیں کچھ نظر نہیں آ رہا۔ تم اب بھی اس بے وفا لڑکے کی حمایت کر رہی ہو۔ اس نے صاف لفظوں میں تمہاری حیثیت تمہیں جتلا دی اور تم اب بھی ہمیں جھوٹا سمجھ رہی ہو۔ اب اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ تم اسے ڈھونڈنے کی کوشش بھی نہیں کرو گی ورنہ وہ تمہاری عزت سرِعام اچھالے گا۔ اگر اب بھی تم نہیں مانیں تو میں تمہارا گھر سے نکلنا بند کر دوں گا۔ جاؤ اپنے کمرے میں اور بیٹھ کر سوچو کہ اپنے باپ کو اور کتنا بے عزت کرو گی۔“

وہ اپنے کمرے میں اس طرح آئی جیسے تیز ہوا میں پتے اڑتے ہیں۔ بادل گھر کے آئے اور پھر جل تھل ایک ہو گیا۔ جتنی دیر وہ رو سکتی تھی روئی۔

اس نے سب کے سامنے دانش کی حمایت ضرور کی تھی کہ کوئی اس کے انتخاب کی ہنسی نہ اڑائے لیکن حقیقت یہ تھی کہ دانش کی طرف سے اس کے دل میں بھی بال آ گیا تھا۔ وہ اس کے گھر سے ہی مایوس ہو کر لوٹی تھی۔ واپس آئی تو یہ خط پڑھ لیا۔ خط کے الفاظ اتنے پُرتاثر تھے کہ جو بھی پڑھتا اسے دانش کی بے وفائی کا یقین آ جاتا۔ یقین لائبہ کو بھی آ گیا تھا لیکن خود کو جھٹلانے کا عمل جاری تھا بالکل اس بچے کی طرح جو کھیل میں ہار جاتا ہے لیکن اپنی ہار ماننے کو تیار نہیں ہوتا۔ بچے اس پر ہنستے ہیں تو وہ سارا کھیل ہی بگاڑ دیتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ وہ ہار گئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ سب اسے بے وقوف سمجھ رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں۔ اس نے بھی کھیل بگاڑ دیا۔

اگر میں یہاں رہی تو اپنے غصے پر قابو نہیں رکھ سکوں گی۔ میں نے جب بھی دانش کو تلاش کر لیا اور اس سے باز پرس کی تو وہ اپنی دھمکی پر عمل کرے گا۔ جھوٹی سچی باتیں پریس میں آئیں تو میرے خاندان کی کیا عزت رہ جائے گی۔ جو اپنے بے وفا ہونے کا اعلان کر رہا ہے، اس سے وفا کی اُمید کیوں رکھی جائے۔

وہ اگر مجھ سے آ کر معافی بھی مانگ لے تو بھی اس زخم کا علاج نہیں ہو سکتا جو وہ مجھے دے چکا۔ وہ مرد ہے۔ رسوائی کا داغ تو مجھے ملا ہے۔ میری سگی ماں ہوتی تو چھپ کر روتی۔ سوتیلی ماں ہے کھل کر ہنسے گی۔ میں سامنے ہوں گی تو زیادہ ہنسے گی۔ اب میں اس کی آوارگی پر طعنہ زن نہیں ہو سکوں گی۔ ڈیڈی سے یہ اُمید نہیں کہ وہ اس کا منہ بند کر دیں گے۔

یہی وہ موسم ہوتا ہے جب دلوں میں خودکشی کے پودے جڑ پکڑتے ہیں۔ اس کے دل میں بھی یہ خیال آیا تھا لیکن اس میں بھی رسوائی تھی۔ باتیں پھر بنیں گی کہ جوان لڑکی نے خودکشی کیوں کر لی۔ ڈیڈی کس کس کو جواب دیتے پھریں گے۔ ہنسنے والے اس وقت بھی ہنسیں گے۔

دانش کا بھائی جمال اسی طرح دندناتا ہوا میرے سامنے سے گزرا کرے گا۔ میں اتنی بے اختیار ہو گئی ہوں کہ نہ اسے روک سکوں گی نہ ڈیڈی سے شکایت کر سکوں گی۔ میرا ثبوت تو ممی کے ہاتھ میں ہے۔ ممی کے اعمال کا میرے پاس کیا ثبوت ہے۔ میں تو وہ سپاہی ہوں جس کی تلوار عین عالمِ جنگ میں ٹوٹ گئی۔ اب فرار ہی مقدر ہے۔

وہ صبح تک فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ یہ ملک چھوڑ کر چلی جائے گی۔ ہمیشہ کے لیے نہیں تو کم از کم اس وقت تک کے لیے جب تک بے وفائی کے زخم بھر نہیں جاتے۔ وقت بڑا استاد بھی ہے اور بڑا معالج بھی۔

ایک زمانہ وہ تھا جب اعجاز احمد اسے دشمنوں کی نظروں سے بچانے کے لیے ملک سے باہر بھیجنا چاہتے تھے۔ ایک وقت یہ آیا کہ وہ خود یہ فیصلہ کر رہی تھی۔

رات میں کسی وقت اس کی آنکھ کھلی تو آنسو پھر اس کے تکیے پر سر رکھ کے رو رہے تھے۔ یہ پچھتاوا ہے یا سب سے بچھڑنے کا دکھ؟ ڈیڈی اکیلے رہ جائیں گے۔ اس کے دل میں ایک تیر سا پیوست ہو گیا۔ میں انہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔ دور

بیٹھ کر بھی ان کی خیریت سے باخبر رہوں گی۔ اس دکھ میں نفرت کی ایک لہر بھی ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ دانش نے مجھے کس حال پر پہنچا دیا ہے۔ کیا کبھی اسے اپنا کہہ سکوں گی؟

وہ رات کو نہ جانے کب تک جاگتی رہی تھی۔ صبح اٹھی تو اعجاز احمد آفس جا چکے تھے۔ اس کا جی نہیں چاہا کہ ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھے اور ماں کا سامنا کرے۔ ان کی آنکھوں سے نکلے ہوئے تیر اس کے دل میں پیوست ہوتے تھے۔ وہ خاموشی سے نکلی اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔

اعجاز احمد نے اسے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تو اتنے پریشان ہوئے کہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کا پریشان ہونا جائز تھا۔ وہ شاید ہی ان کے آفس کبھی آئی ہو اور وہ بھی اس عالم میں کہ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے جیسے بستر سے اٹھ کر سیدھی چلی آئی ہو۔ انہیں یوں لگا جیسے لائبہ کا بچپن ان کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا ہو۔ بچپن میں جب اس کے بال بکھرے ہوتے تھے تو وہ راحیلہ کو ڈانٹتے تھے۔ اب وہ کس کو ڈانٹتے۔

”بیٹا، تم اور میرے آفس میں اور یہ بال کیوں بکھرے ہوئے ہیں۔ شریر بچی، کوئی اس طرح بھی گھر سے نکلتا ہے۔“

”ڈیڈی، میں تو پوری بکھر گئی ہوں آپ بال دیکھ رہے ہیں۔“

”بیٹا میں نے اپنی پوری زندگی تمہاری حفاظت کرتے ہوئے گزاری ہے۔ اب بھی تمہاری حفاظت کروں گا۔ تم پریشان کیوں ہوتی ہو۔ زندگی میں آدمی بہت سے غلط فیصلے کر بیٹھتا ہے۔ تم سے بھی ایک غلط فیصلہ ہو گیا تھا۔ کسی ڈراؤنے خواب کی طرح اسے بھول جاؤ۔“

”اسے بھلانے کے لیے ہی تو آپ کے پاس آئی ہوں۔“

”آؤ انیکسی میں چل کر بیٹھتے ہیں۔“ انہوں نے چپراسی کو بلا کر تاکید کر دی کہ کسی کو اندر نہ بھیجے۔

انیکسی میں پہنچ کر لائبہ نے بات وہیں سے شروع کی جہاں سے چھوڑی تھی۔

”آپ کو یاد ہوگا، میرے بچپن میں آپ مجھے تعلیم کے لیے باہر بھیجنا چاہتے تھے۔ میری تعلیم اب بھی ادھوری ہے۔ میں باہر جا کر اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتی ہوں۔“

”لائبہ، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا بلکہ اس وقت بڑا ضروری ہے کہ تم سال دو سال کے لیے باہر چلی جاؤ۔ میں دیکھتا ہوں تمہارے لیے کون سا ادارہ اچھا رہے گا۔“

”نہیں اس میں بہت دیر ہو جائے گی۔ میں وہاں جا کر خود فیصلہ کروں گی کہ مجھے کہاں داخلہ لینا ہے۔ داخلہ ملنے تک کسی ہوٹل میں رہ لوں گی۔ داخلہ ملنے کے بعد ہوسٹل میں شفٹ ہو جاؤں گی۔ بس آپ سے ایک درخواست ہے آپ کے سوا کسی کو معلوم نہ ہو کہ میں کہاں ہوں اور کیا کر رہی ہوں۔ میرے خلاف سازشیں کرنے والے وہاں بھی میرا تعاقب کرتے رہیں گے بلکہ تھوڑے دنوں تک تو میں آپ کو بھی خبر نہیں ہونے دوں گی کہ میں کہاں ہوں۔ ممی سے ہوشیار رہیے گا اور اپنا خیال رکھیے گا۔“

اس کی ماں کو صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ وہ بیرونِ ملک جا رہی ہے، کہاں؟ یہ صرف اسے معلوم تھا۔

وہ امریکا چلی گئی۔ کس شہر میں گئی ہے یہ اعجاز احمد کو بھی معلوم نہیں تھا۔

☆☆☆

لائبہ کے درمیان سے ہٹتے ہی راحیلہ کو کئی بھولے ہوئے کام یاد آ گئے۔ اس کے تمام کام حسبِ منشا ہو گئے تھے۔ دانش نہ صرف راستے سے ہٹ گیا تھا بلکہ لائبہ کے دل میں اس کی طرف سے نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ دانش کے دل میں اعجاز کی طرف سے ایسی نفرت بھر گئی کہ وہ اسے قتل بھی کر سکتا تھا ورنہ یہ تو کر سکتا تھا کہ اس کی بیٹی کو کبھی اپنی بیوی نہ بنائے۔ ایک لائبہ کا کانٹا تھا وہ بھی نکل گیا۔ اب اعجاز اکیلا رہ گیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ اگر وہ اسے قتل بھی کرا دیتی تو بھی الزام دانش پر ڈال سکتی تھی کیونکہ وہ یہ ثابت کر سکتی تھی کہ دانش کو اعجاز نے اغوا کرایا تھا۔ جواز یہ تھا کہ وہ اپنی بیٹی سے اس کی شادی نہیں چاہتا تھا۔ وہ کسی وقت یہ بھی کر سکتی تھی کہ لائبہ کو یہ باور کرا دے کہ دانش کے اغوا میں اس کے باپ کا ہاتھ تھا۔ جعلی خط بھی اسی نے لکھوایا تھا۔ شیرو اس کی گواہی دے سکتا تھا۔ یہ سب ہتھیار اس کے پاس محفوظ تھے۔

اس نے شیرو کو فون کر دیا۔ ”پنچھی کو آزاد کر دو۔“

یہ پیغام ملتے ہی شیرو نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ دانش کی آنکھوں پر پٹی باندھو اور اسے تہ خانے سے باہر لے آؤ۔

”ہم تمہیں تمہارے گھر کے قریب چھوڑ آئیں گے۔ تم صرف ایک نام یاد رکھو گے اور وہ نام ہوگا سیٹھ اعجاز کا۔ اگر تم نے ہم میں سے کسی کا نام لیا تو تمہاری زندگی کا وہ آخری دن ہوگا۔ تم سبق کی طرح یاد کر لو کہ تمہیں سیٹھ اعجاز نے اغوا کرایا تھا اسی نے تم سے خط لکھوایا تھا تاکہ تم اس کی بیٹی سے بدظن ہو جاؤ۔“

جس طرح آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے لایا گیا تھا اسی طرح اندھیرے میں واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ اسے کچھ

معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں آیا تھا اور کن راستوں سے واپس جارہا ہے۔

اسے ایک جگہ اتار دیا گیا۔ اترنے سے پہلے آنکھوں سے پٹی اتار دی گئی تھی۔ اس نے اترنے کے بعد یہ غور کرنا شروع کیا کہ وہ کہاں ہے، اتنی دیر میں گاڑی اس کی آنکھوں سے دور ہو گئی۔ وہ نہ تو گاڑی کا نمبر نوٹ کر سکا اور نہ یہ دیکھ سکا کہ کون لوگ تھے جو اسے چھوڑ کر گئے ہیں۔

وہ اپنے دروازے پر بھکاریوں کی طرح کھڑا ہوا تھا۔ پندرہ دن سے وہ نہایا نہیں تھا۔ شیو بڑھی ہوئی تھی۔ کپڑے میلے تھے۔ وہ اپنی حالت پر غور کررہا تھا۔ دستک دینے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا پڑوسی اپنے گھر سے نکلا اور اسے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ شاید وہ بھی اسے پہچان نہیں سکا تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے ڈوربیل پر ہاتھ رکھ دیا۔

اس کی بہن دروازے پر آئی۔ کچھ دیر اجنبیوں کی طرح اس کی طرف دیکھتی رہی پھر زاروقطار رونے لگی۔

''بھائی تم کہاں چلے گئے تھے اور اپنی یہ حالت کیا بنالی ہے۔''

''میرا خط نہیں ملا تھا؟''

''ملا تھا مگر تم تھے کہاں۔ اپنے کپڑے دیکھ رہے ہو جیسے جیل سے چھوٹ کر آئے ہو۔''

''پگلی اندر تو آنے دے۔ یہاں کھڑے کھڑے تماشا بن رہا ہوں۔ اماں کہاں ہیں؟''

''اپنے کمرے میں ہوں گی۔''

''تو ایسا کر الماری سے میرے کپڑے نکال کر لے آ۔ میں پہلے غسل کرکے انسان بن جاؤں۔ شیو بھی بنالوں اس کے بعد اماں کو بتانا کہ میں آگیا ہوں۔''

''ٹھیک ہے تم جلدی سے نہالو۔ میں تمہارے کپڑے لے کر ابھی آئی۔''

وہ کپڑے لینے کمرے میں گئی تو اس کی ماں نے پوچھا۔

''تو کس سے باتیں کررہی تھی۔ کون آیا ہے؟''

''اماں، دانش بھائی آگئے۔ انہی سے باتیں کررہی تھی۔''

''اے ہے، آگیا میرا بچہ، ذرا اسے میرے پاس تو بھیج۔ کھینچتی ہوں اس کے کان۔ بھیا اس نے بڑا تنگ کیا ہے۔''

''جیسے ہی نہا کر نکلتے ہیں انہی بھیجتی ہوں۔ اچھی طرح خبر لینا۔ سچی بڑا مزہ آئے گا۔''

وہ کپڑے لے کر گئی اور غسل خانے کا دروازہ کھٹ کھٹا کر کپڑے دے دیے۔ ساتھ ہی یہ بھی بتادیا کہ اماں پوچھ رہی تھیں۔

''اپنے کان جیب میں رکھ کر آنا ورنہ خوب کان کھنچیں گی۔''

وہ غسل خانے سے نکلا تو بالکل بدلا ہوا تھا لیکن بہت دبلا نظر آرہا تھا۔

''بھائی، تم جہاں کہیں بھی تھے کسی اچھی جگہ نہیں تھے۔ کھانے تک کو نہیں مل رہا تھا۔ اپنا منہ دیکھو کیسا پیلا پڑ گیا ہے۔''

وہ ماں کے پاس پہنچا تو وہ بھری بیٹھی تھیں۔ وہ اگر مشاعرے وغیرہ میں جاتا بھی تھا تو دو تین روز میں واپس آجاتا تھا، اس مرتبہ اس نے پندرہ دن لگا دیے تھے۔

ماں نے جب اپنا دل خوب ہلکا کرلیا تو وہ ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

''اماں، میں کسی غلط جگہ نہیں گیا تھا۔ مشاعرے میں گیا تھا۔ پھر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا رہا۔ دوستوں اور پرستاروں میں ٹھہرا رہا۔ میں نے خط لکھ تو دیا تھا۔''

''اچھا اب زیادہ شیخی بھگارنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جمال بہت غصے میں ہے۔ اس سے ذرا نرمی سے بات کرنا۔''

''بھائی سے تو میری یاری ہے انہیں منالوں گا۔''

''بیٹا، وہ تیری پڑھائی کا خرچ اٹھا رہا ہے اور تو پندرہ دن سے یونیورسٹی ہی نہیں گیا۔ کچھ تو ذمے داری کا احساس کرو۔''

''اب میں آگیا ہوں۔ پابندی سے یونیورسٹی جایا کروں گا۔''

پندرہ دن سے اس نے ٹھیک طرح سے آسمان بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے سوچا گھر میں رہا تو طرح طرح کے سوالات ہوتے رہیں گے۔ وہ باہر نکل گیا۔

وہ باہر اس لیے بھی جانا چاہتا تھا کہ کھلی ہوا میں یہ سوچ سکے کہ اسے اب کیا کرنا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا، اس نے بہن اور ماں کو تو کسی نہ کسی طرح بہلا لیا لیکن بھائی سے کیا کہے گا۔ ان غنڈوں نے اسے دھمکی دی ہے کہ ان کا نام درمیان میں نہ آئے۔ وہ بھائی سے کیا کہے گا کہ اسے کون لوگ اٹھا کر لے گئے تھے۔ پھر اسے یاد آیا کہ ان غنڈوں کے کہنے کے مطابق اعجاز احمد نے اسے اغوا کرایا تھا۔ وہ ان غنڈوں کا نام نہیں لے سکتا لیکن اعجاز احمد کا نام تو لے سکتا ہے۔ بھائی کو بھی تو معلوم ہو کہ وہ کس درندے کی نوکری کررہے ہیں۔ وہ جس کی شرافت کا دم بھرتے ہیں انہیں معلوم تو ہو کہ وہ شخص اندر سے کتنا زہریلا ہے۔

وہ ٹہلتا رہا اور سوچتا رہا اور پھر گھر آگیا۔ اب اسے بھائی کے آنے کا انتظار تھا۔ جمال گھر پہنچا تو دانش کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ابھی وہ کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ دانش نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور

دروازہ اندر سے بند کرلیا۔

''آپ مجھ سے یہ ضرور پوچھیں گے کہ میں کہاں چلا گیا تھا۔ میں نے سب کو تو مختلف کہانیاں سنادیں لیکن آپ کو حقیقت بتانا ضروری ہے تاکہ ہم دونوں مل کر کوئی فیصلہ کریں کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔ بھائی، میں گیا نہیں تھا مجھے اغوا کیا گیا تھا اور اغوا کرنے والا کوئی اور نہیں اعجاز احمد تھا جس کی آپ نوکری کرتے ہیں۔''

''تمہیں معلوم ہے تم کیا کہہ رہے ہو۔''

''میں پوری ذمے داری سے کہہ رہا ہوں۔ مجھے یقین بھی تھا کہ وہ یہ حرکت کرے گا۔ مجھے اغوا کرنے والے بھی بار بار کہہ رہے تھے کہ انہوں نے مجھے سیٹھ اعجاز احمد کے حکم پر اغوا کیا ہے۔''

''تمہیں ان غنڈوں کی بات کا یقین کیسے آگیا۔ انہوں نے خود اغوا کیا ہو اور نام اعجاز احمد لے رہے ہوں۔''

''اس لیے یقین آگیا کہ ان غنڈوں سے میری کوئی دشمنی نہیں تھی جبکہ اعجاز احمد سے دشمنی تھی۔''

''اعجاز احمد سے تمہاری کیا دشمنی ہوگئی جناب۔''

''مجھے کچھ باتیں اب تک آپ سے کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی لیکن اب بتانا ضروری ہوگیا ہے۔ ان باتوں کے بغیر آپ میرا یقین نہیں کریں گے۔ اعجاز احمد کی بیٹی لائبہ میرے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ ہم دونوں میں دوستی پروان چڑھی، وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ میری اور اس کی مالی حیثیت میں بہت فرق تھا۔ میں چاہتا تھا بات شادی تک نہ پہنچے صرف دوستی کی حد تک رہے لیکن وہ بضد تھی۔ اس نے اعجاز احمد سے بات کی۔ انہوں نے بڑی ہوشیاری سے مجھے ملاقات کے لیے بلایا اور راستے ہی سے اغوا کرالیا۔ مجھے اغوا کرنے والے یہی کہہ کر مجھے لے گئے تھے کہ سیٹھ صاحب تم سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں لیکن کہیں اور لے گئے۔''

''تمہیں کچھ اندازہ ہوا کہ وہ لوگ تمہیں کہاں لے کر گئے تھے۔''

''ان لوگوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ مجھے مقام کا اندازہ تو نہیں ہوسکا لیکن یہ معلوم ہوگیا کہ جو شخص مجھے اٹھا کر لایا تھا اس کا نام شیرو تھا۔ وہ لوگ مجھے ڈرانے کے لیے یہی نام لے رہے تھے۔''

''تمہیں شیرو نے اٹھایا تھا۔ اف میرے خدا! اس بھیڑیے نے تمہیں زندہ چھوڑ دیا۔ یہ کوئی معجزہ ہی ہوا ہے اور اب ایک بات اور غور سے سن لو۔ یہ اعجاز احمد کی نہیں اس کی بیوی راحیلہ کی حرکت ہے۔ اسی نے تمہیں اغوا کرایا تھا۔''

''یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟''

''اس لیے کہہ سکتا ہوں کہ شیرو اعجاز احمد کا نہیں اس کی بیوی کا تنخواہ دار ہے۔ اس کے لیے کام کرتا ہے۔ مجھے یہ تو معلوم تھا بلکہ راحیلہ نے خود مجھے بتایا تھا کہ لائبہ کسی غریب لڑکے سے شادی کرنا چاہتی ہے لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ تم ہو اور شاید راحیلہ کو بھی نہیں معلوم تھا ورنہ وہ یہ حرکت نہ کرتی۔ اسی نے لائبہ کو تم سے بدظن کرنے کے لیے خط لکھوایا تھا۔ وہ خط میں نے پڑھا نہیں تھا لیکن راحیلہ نے مجھے بتایا ضرور تھا۔ اب تصدیق بھی ہوگئی کہ واقعی ایک ایسا خط لکھا گیا تھا؟

''یہ تو ایسی بات ہے کہ اعجاز احمد کے علم میں ہونی چاہیے۔ مجھے آپ ان کے پاس لے چلیں۔ میں انہیں ان کی بیوی کی حرکتوں کے بارے میں بتاؤں تو سہی۔''

''کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اعجاز احمد اپنی بیوی سے بہت ڈرتے ہیں۔ کچھ بھی نہیں کرسکیں گے۔''

''کچھ نہ کرسکیں معلوم تو ہوا نہیں۔''

''اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اعجاز احمد تمہیں پسند نہیں کرتے۔ وہ لائبہ کی ضد سے مجبور ہوگئے تھے اور اب لائبہ ہے نہیں جو تمہاری حمایت میں کھڑی ہوجائے گی۔''

''کیا ہوا لائبہ کو۔''

''وہ ملک سے باہر چلی گئی ہے۔ غالباً امریکا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے اعجاز احمد نے خود اسے بھیجا ہو۔ میری بات مانو تو اس واقعے کو بھی بھول جاؤ اور لائبہ کو بھی۔ شیرو اتنا خطرناک آدمی ہے کہ نہ میں اس سے لڑسکتا ہوں نہ قانون۔ راحیلہ اس سے تمہاری شادی نہیں ہونے دے گی۔ وہ ایسی عورت ہے کہ لائبہ کو بھی مرواسکتی ہے۔ تم خاموشی اختیار کرلو۔ لائبہ اگر کسی وقت واپس آئی اور تم سے رجوع کیا تو اسے حقیقت بتادینا۔''

''میرا فرضی خط پڑھنے کے بعد اس کے دل میں میرے لیے اتنی نفرت پیدا ہوچکی ہوگی کہ واپس آنے کے بعد بھی مجھ سے رابطہ نہیں کرے گی۔ رابطہ کرنا ہوتا تو جاتی ہی کیوں۔''

''وہ واپس آگئی تو میں خود تمہیں اس کے پاس لے کر چلوں گا اور اس کی غلط فہمی دور کروں گا۔ اس کی غیر موجودگی میں کوئی بات اٹھانا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔''

''وہ امریکا کے کس شہر میں ہے کچھ معلوم ہوسکتا ہے۔''

''میں نے اعجاز صاحب سے پوچھا تھا۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ خود انہیں بھی نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے۔ میرے خیال

میں مکمل رازداری برتی جارہی ہے۔"

جمال ان واقعات کو سن کر کانپ اٹھا تھا۔ اسے اپنے بھائی کی جان خطرے میں نظر آرہی تھی۔ اس کی حفاظت کا کوئی بندوبست جلد سے جلد کرنا تھا۔ اس نے دانش کا غصہ اس وقت تو ٹھنڈا کر دیا تھا لیکن کسی وقت باسی کڑی میں ابال آسکتا تھا۔ اگر اس دوران لائبہ واپس آگئی اور دونوں میں پھر رابطہ ہو گیا تو بات صرف اغوا تک نہیں رہ جائے گی۔ اب اسے اعجاز احمد پر بھی اعتماد نہیں رہا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کو بچانے کے لیے کوئی بھی قدم اٹھا سکتا تھا۔ راحیلہ اور وہ دونوں مل بھی سکتے تھے۔ اعجاز احمد کیوں چاہنے لگا تھا کہ لائبہ کی شادی کسی غریب گھر میں ہو۔ اسے جو کرنا تھا جلدی کرنا تھا۔

اس نے پہلے مرحلے کے طور پر یہ کیا کہ کسی نئی نوکری کی تلاش میں لگ گیا۔ اس کی تعلیم اور شخصیت ایسی تھی کہ اسے کہیں بھی نوکری مل سکتی تھی۔

وہ نوکری ڈھونڈتا رہا لیکن راحیلہ کو ہوا نہیں لگنے دی۔ اس نے راحیلہ کو یہ تو بتایا تھا کہ اس کا بھائی دو دن سے گھر نہیں پہنچا۔ راحیلہ نے خود ہی اندازہ لگا لیا تھا جس لڑکے کو اٹھایا گیا ہے وہ اس کا بھائی ہے۔ اس کے بعد راحیلہ نے پوچھا بھی تھا تو جمال نے ہنستے ہوئے بتایا تھا کہ وہ اغوا نہیں ہوا تھا دوستوں کے ساتھ باہر چلا گیا تھا۔ راحیلہ کو اطمینان ہو گیا تھا کہ اغوا ہونے والا کوئی اور لڑکا ہے۔

جمال کو نئی نوکری مل گئی تھی۔ تنخواہ بھی اس سے زیادہ تھی جو وہ اعجاز احمد سے لے رہا تھا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ نوکری چھوڑے کیسے۔ راحیلہ سے کیا کہے۔ اس کی ترکیب اس نے پہلے ہی سوچ رکھی تھی۔ وہ اعجاز احمد کے پاس گیا اور اپنا استعفیٰ ان کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ کیا ہے جمال صاحب۔ مجھ سے کیا شکایت ہو گئی آپ کو۔"

"آپ سے نہیں، مجھے آپ کی بیگم سے شکایت ہے۔"

"ان سے آپ کا کیا تعلق۔ آپ تو میرے ملازم ہیں۔"

"وہ کہتی ہیں کہ آپ کے کاروباری راز میں ان تک پہنچاؤں۔"

"آپ نہ پہنچائیں۔"

"اب تک میں یہی کرتا رہا ہوں لیکن اب وہ دھمکیوں پر اتر آئی ہیں۔ میرے گھر شیرو نام کے کسی غنڈے کو بھیجا تھا۔" شیرو کا نام سنتے ہی اعجاز احمد کا رنگ اڑ گیا تھا لیکن وہ جمال کے سامنے اپنی کمزوری ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے۔

"یہ شیرو کون ہے؟"

"بیگم صاحبہ کا تنخواہ دار ہے۔"

"تم اپنا استعفیٰ واپس لے لو۔ میں راحیلہ سے بات کروں گا۔"

"ایسا غضب مت کیجیے گا۔ وہ ظاہر ہے انکار کر دیں گی اور میری پہلے سے زیادہ دشمن بن جائیں گی کہ میں نے آپ کو کیوں بتا دیا۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کے گھر میں کوئی تنازع پیدا ہو۔ میں اپنے گھر کا واحد کفیل ہوں۔ اپنی جان خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔ آپ کو بہت ملازم مل جائیں گے۔ مجھے اجازت دیں۔"

اعجاز احمد شیرو کا نام سن کر اتنا ڈر گئے تھے کہ انہوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ جمال کا استعفیٰ منظور کر لیں۔

یہاں سے رخصت ہونے کے بعد وہ پریشان صورت لیے راحیلہ کے پاس گیا۔ اسے یہ بتایا کہ اعجاز احمد نے نوکری سے نکال دیا ہے۔

"صاحب نے اس شک میں مجھ سے استعفیٰ لکھوا لیا کہ میں ان کے کاروباری راز آپ کو بتاتا ہوں۔"

"ارے یہ تو بہت برا ہوا حالانکہ تم بہت سی باتیں چھپا جاتے تھے مثلاً یہی کہ تم نے مجھ سے بھی چھپایا ہوا ہے کہ لائبہ امریکا کے کس شہر میں ہے۔"

"آپ یقین کریں۔ مجھے خود معلوم نہیں۔ اعجاز صاحب سے معلوم کرنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن وہ کہتے ہیں انہیں خود معلوم نہیں۔"

"خیر اب نکال ہی دیا ہے تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ میرے کہنے سے دوبارہ تو رکھ نہیں لیں گے۔ رابطہ رکھنا۔ شاید تمہیں مجھ سے کوئی کام پڑ جائے۔ ہم نے جو اچھا وقت گزارا ہے اسے یاد رکھوں گی۔"

جمال کو شدت سے اپنی شکست کا احساس ہوا تھا۔ وہ تو سمجھ رہا تھا راحیلہ اسے کبھی نہیں چھوڑے گی لیکن اس کے رویے سے تو یہ ظاہر ہو رہا تھا جیسے اسے خوشی ہوئی ہو۔ اس کا یہ رویہ کیوں تھا، یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

اس کے جاتے ہی راحیلہ نے سیٹھ بدرالدین کو فون کیا۔

"آپ نے اپنے بھتیجے کا ذکر مجھ سے کیا تھا۔ اسے فوراً میرے پاس بھیج دیں۔ جمال نوکری چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اعجاز کو نئے سیکریٹری کی ضرورت ہو گی۔ میں اعجاز سے کہہ کر اسے وقت دلوا دوں گی۔ لندن سے ایم۔ بی۔ اے کی ڈگری لے کر آیا ہے۔ اعجاز کو اور کیا چاہیے ہو گا۔"

"یار بھیج تو دوں لیکن نہایت خوب صورت لڑکا ہے اور مجھے تمہاری حسن پرستی سے ڈر لگتا ہے۔"

"بدرالدین، اب میں ایسی بدنیت بھی نہیں ہوں کہ تمہارے بھتیجے پر ہاتھ صاف کروں۔"

"اس لیے اور بھی ڈر لگ رہا ہے کہ جمال سے تمہارا دل بھر گیا ہے۔"

"وہ اور معاملات ہیں۔ تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔ ویسے تمہارے بھتیجے کا نام کیا ہے۔ تم نے بتایا تو تھا۔"

"نام ذرا پرانا ہے ویسے وہ خود نیا ہے۔"

"آپ اسے شام تک بھیج دیں۔ اعجاز گھر پر ہوں گے۔ ان سے بات ہو جائے گی۔"

اعجاز ابھی گھر نہیں پہنچا تھا کہ شمس الدین پہنچ گیا۔ وہ ڈرائنگ روم میں پہنچی تو ستائیس اٹھائیس سال کا ایک لڑکا مردانہ دلکش خدوخال کا نمونہ، وجاہت سے بھرپور اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا زندہ دل اور باذاق بھی ہے۔ راحیلہ نے گھبرا کر سائڈ ٹیبل پر رکھا ہوا ڈن ہل کا پیکٹ اٹھایا اور ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں سے لگالی اور پیکٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"نو تھینک یو۔ میں نہیں پیتا۔"

"پینے لگو گے۔ ابھی عمر ہی کیا ہے۔" راحیلہ نے کہا اور جلا ہوا لائٹر سگریٹ کو دکھا دیا۔

اس کی حسن پرست طبیعت نے ایک ساتھ کئی خواب دیکھ لیے تھے۔

ادھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے خاصی دیر ہو گئی تھی کہ اسے اعجاز احمد کی آمد کی اطلاع ملی۔ وہ خاص مواقع پر ہی ان کے کمرے کا رخ کرتی تھی۔ اس وقت بھی وہ خاص موقع آگیا تھا۔

اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اعجاز احمد نے پوچھا۔

"ڈرائنگ روم میں کون آیا ہے۔ کیا بتانے آئی ہو تم مجھے؟"

"کوئی سیٹھ بدرالدین طیب ہیں۔ یہ لڑکا ان کا بھتیجا ہے۔"

"سیٹھ بدرالدین کو میں جانتا ہوں لیکن ایسا نہیں کہ ان کا بھتیجا مجھ سے ملنے آجائے۔ کیا کہتا ہے؟"

"میری تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ آپ فریش ہو کر آجائیں۔ شاید آپ سے کچھ کہے۔"

"وہ سیٹھ صاحب کا بھتیجا ہے۔ اس کی اچھی طرح خاطر تواضع کرو۔ جب تک میں نہ آؤں سیدھے منہ بات کر لینا۔ بدرالدین مجھے یونین کے اجلاسوں میں ملتے رہتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ انہیں شکایت ہو۔"

راحیلہ نے جان بوجھ کر انہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ اسے اس نے بلایا ہے اور وہ کس مقصد سے آیا ہے۔ اس نے سوچا تھا جب وہ اس سے خوب متاثر ہو چکے ہوں گے اور تعریف کریں گے اس وقت وہ ان سے اس کی سفارش کرے گی۔

اجازت ملتے ہی وہ اسے ڈائننگ ٹیبل پر لے آئی۔ ملازموں نے ناشتا چن دیا۔ راحیلہ کی آنکھیں ناشتے سے زیادہ اس کا طواف کر رہی تھیں۔ گرم آنکھوں کی مسلسل تپش نے لڑکے پر گھبراہٹ طاری کر دی تھی لیکن لندن کی آب و ہوا میں پانچ سال گزار کر آیا تھا۔ ڈھیٹ بن کر ڈٹا بھی رہا۔

اعجاز احمد ٹیبل پر آئے تو اس نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔ براہ راست یہ پوچھنا بدتہذیبی تھی کہ کیسے آنا ہوا۔ گفتگو بھی کرنی تھی لہٰذا وہ اس کی تعلیم کے بارے میں پوچھنے لگے۔ اس کے مشغلوں کی بات نکل آئی۔ انگریزوں کے لب و لہجے میں اس کی شستہ انگریزی سن کر وہ بے حد متاثر ہوئے۔ اس کا تعلیمی ریکارڈ بھی شاندار تھا۔

"آج کل کیا کر رہے ہو؟"

"آج کل تو آرام کی چھٹیوں پر ہوں۔ نوکری کرنے کا ارادہ ہے۔"

"نوکری؟ تمہارے چچا اتنے بڑے بزنس مین اور تم نوکری کرو گے؟"

"کاروبار میرا مزاج نہیں ہے۔ میرے والد بھی سرکاری ملازم تھے۔ ایک ایکسیڈنٹ میں ان کا انتقال ہو گیا۔"

"اوہ، ویری سیڈ، معاف کرنا ان کا ذکر کر کے میں نے تمہیں رنجیدہ کر دیا۔"

"نہیں انکل۔ موت بھی تو زندگی کا حصہ ہے۔ اب وہ میری شکل میں زندہ ہیں۔ میری ممی کہتی ہیں میں بالکل ان کی طرح ہوں۔"

"میرا تو خیال ہے تمہیں بزنس کرنا چاہیے۔ ملازمت میں کیا رکھا ہے۔"

"انکل میں اپنی تعلیم کے بل بوتے پر مشورے تو بہت اچھے دے سکتا ہوں لیکن عمل کرنا میرے بس کی بات نہیں یہ ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر عمل کرنا بھی سیکھ لوں لیکن ابھی نہیں یا شاید کبھی نہیں۔"

"تم بدرالدین سے کہو۔ ملازمت تو وہ بھی دے سکتے ہیں۔"

"انہوں نے کہا تھا لیکن میں اپنوں کے احسان کا قائل نہیں۔ مجھے یہ بھی احساس رہے گا کہ تایا کا آفس ہے۔ کام کروں نہ کروں ہر کام کو "ایزی وے" میں لوں گا۔ غیر جگہ ہو گی تو خود بخود محنت کروں گا۔"

"بہت اچھے خیالات ہیں تمہارے۔ جگہ تو میرے پاس بھی خالی ہے۔ میرا اسیکریٹری چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ تم آجاؤ لیکن میں پہلے بدرالدین سے بات کرلوں۔"

"سچی بات تو یہ ہے کہ انہوں نے ہی مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ مجھے "بک" کرلیں۔ آپ کے کسی آفس میں اگر کوئی جگہ خالی ہو۔"

"تم میرے پاس آجاؤ مگر شرط وہی ہے کہ پہلے میں بدرالدین سے بات کروں گا بلکہ اس سے کہوں گا کہ تمہیں میرے پاس بھیج دے۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔"

راحیلہ بیٹھی ضرور تھی لیکن گفتگو میں حصہ نہیں لے رہی تھی۔ دونوں کی باتیں خاموشی سے سن رہی تھی۔ کسی نے اس سے کچھ پوچھنے کی زحمت کی بھی نہیں تھی۔ شمس الدین رخصت ہوا تو راحیلہ کو موقع مل گیا۔

"آپ نے اتنی جلدی اسے ملازمت کی پیشکش کر دی۔ مجھ سے تو پوچھ لیا ہوتا۔"

"یہ کاروباری معاملات ہیں، تم سے کیا پوچھتا۔"

"یہ تو سوچا ہوتا کہ وہ بدرالدین کا بھتیجا ہے۔ دفتر کی باتیں اس تک پہنچیں گی۔"

"تمہارا ذہن سازشوں کی آماجگاہ ہے۔ جب سوچو گی منفی سوچو گی۔ بدرالدین کا کاروبار مجھ سے بڑا ہے۔ انہیں مجھ سے کیا دلچسپی ہوگی۔ انجمن تاجران کے صدر ہیں، میرے کچھ کام ہی آئیں گے۔ میں نے جو فیصلہ کیا ہے سوچ سمجھ کر کیا ہے۔"

"میں بھی بزنس مین کی بیٹی ہوں۔ میرے پاس بھی عقل ہے۔ میں بھی سمجھتی ہوں ان باتوں کو۔"

"تم بزنس مین کی نہیں اسمگلر کی بیٹی ہو۔ سوچنے کا انداز بھی وہی ہے۔"

"تم سے تو بات کرنا ہی بےکار ہے۔"

راحیلہ پاؤں پٹختے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ وہ مصنوعی اختلاف کر رہی تھی۔ اس کی پلاننگ تو یہ تھی کہ جب وہ اٹھ کر چلا جائے گا تو وہ اعجاز احمد کو مشورہ دے گی کہ اس لڑکے کو جمال کی جگہ رکھ لے لیکن جب اعجاز نے اسے خود ہی پیشکش کر دی تو وہ اختلاف کرنے لگی تاکہ یہ تاثر ملے کہ شمس الدین کو ملازمت اس نے نہیں دلوائی اور اگر کل کلاں کو کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو وہ بری الذمہ ہو۔ اعجاز سے کہہ سکے کہ تم نے خود رکھا تھا اب خود ہی بھگتو۔ بدرالدین کی طرف سے اسے کھٹکا ہی لگا رہتا تھا۔ وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ کیا خبر اس نے کسی خاص مقصد سے اپنے بھتیجے کو بھیجا ہو۔

اسے دراصل یہ اُمید تھی کہ اعجاز اس کی سفارش قبول نہیں کرے گا۔ وہ بدرالدین سے کہہ سکے گی کہ اس نے تو کوشش کی تھی اعجاز نہیں مانا۔ خود اچھی بنی رہے گی اعجاز کو برا بنا دے گی لیکن اب اعجاز نے خود ہی اسے رکھ لیا تھا۔ وہ تو اب یہ سوچ کر پریشان تھی کہ شمس الدین اس کے لیے کام کرے گا یا بدرالدین کے لیے۔

☆☆☆

جمال نے دراصل نوکری اس لیے چھوڑی تھی کہ اس کا رابطہ راحیلہ اعجاز یا لائبہ سے بالکل ہی ختم ہو جائے۔ اس کا بھائی اس سے یہ نہ پوچھ سکے کہ اب وہاں کیا ہو رہا ہے۔ نوکری نہیں رہے گی تو اس کے بھائی کے ذہن سے اعجاز احمد کا نام بھی فراموش ہوتا چلا جائے گا۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ دانش کا بھائی ہونے کی سزا راحیلہ اسے نہ دے۔

دانش کے دل میں لائبہ کی طرف سے نفرت ڈالنے کے لیے اس نے دانش سے یہ کہا کہ لائبہ کو معلوم ہو گیا تھا کہ میں تمہارا بھائی ہوں۔ وہ جب تم سے کوئی تعلق نہیں چاہتی تو میرا وجود کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ اس نے اعجاز احمد کو فون کیا اور انہوں نے مجھے ملازمت سے نکال دیا۔

"ایسے لوگوں کی ملازمت آپ کو کرنی بھی نہیں چاہیے۔ ملازمت کرنی ہی ہے تو کہیں اور سہی۔ اب میں نے سوچ لیا ہے۔ میں بھی ملازمت کروں گا۔ آپ کب تک ہمارا بوجھ اٹھاتے رہیں گے۔"

"نہیں تمہیں ملازمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ شاہدہ کے گھر والے شادی کی ضد کر رہے ہیں۔ پہلے شادی کرو۔ اس کے بعد ملازمت ڈھونڈتے رہنا۔"

"شادی تو آپ کی ہونی چاہیے۔"

"بالکل ہونی چاہیے لیکن تمہاری منگنی ہو چکی ہے۔ وہ لوگ تمہارے انتظار میں ہیں۔ خاندان کی بات ہے انہیں زیادہ دن ٹالا بھی نہیں جا سکتا۔"

"میں ایم بی اے کرنے کے لیے باہر جانا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد شادی کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔"

"تم شادی کے بعد بھی باہر جا سکتے ہو۔"

"شادی کے بعد دس مسئلے اور اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ باہر کی ڈگری جیب میں ہوگی تو ملازمت بھی اچھی ملے گی۔"

جمال اپنے بھائی کو سمجھاتا رہا کہ وہ شادی کر لے۔ ایم بی اے کراچی یونیورسٹی سے کر لے یا باہر ہی جانا ہے تو شادی کے بعد باہر چلا جائے۔ ماں نے بھی سمجھایا لیکن وہ کسی کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اس کے دل میں اب بھی لائبہ کی

محبت آباد تھی۔ وہ باہر رہ کر دراصل کچھ وقت لینا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جب وہ واپس آئے گا اس وقت تک ہو سکتا ہے لائبہ بھی واپس آجائے۔ وہ اس سے مل کر اس کی غلط فہمی تو دور کر سکے گا۔ اس کے بعد اگر اس کا دل صاف نہ ہوا تو پھر وہ شاہدہ سے شادی کر لے گا۔

بڑوں کے درمیان بہت دن اجلاس ہوتے رہے بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ نکاح کر دیا جائے۔ رخصتی اس وقت ہو جب وہ باہر سے پڑھ کر آئے۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ زنجیر پاؤں میں ڈال کر دیوانے کو چھوڑ دیا جائے۔ اب وہ بےچارہ بھاگے تو کہاں بھاگے۔

دانش کو یہ فیصلہ قبول نہیں تھا۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اگر لائبہ کی غلط فہمی دور ہو گئی اور وہ اس سے شادی پر تیار ہو گئی تو وہ تو نکاح کی زنجیر میں بندھ چکا ہوگا۔ شاہدہ بےچاری کی تو زندگی برباد ہو جائے گی۔ میں اسے آزاد رکھنا چاہتا ہوں۔ منگنی توڑی جا سکتی ہے، نکاح کے بعد تو طلاق کا داغ لگ جائے گا۔

اس نے قسمیں کھا کر وعدہ کیا کہ وہ واپس آکر شاہدہ سے ضرور شادی کر لے گا۔ جمال کو اس کی ضد کے سامنے مجبور ہونا پڑا۔ دانش باہر جانے کی کوشش کرنے لگا۔ پیسوں کے حصول اور ویزا وغیرہ میں چھ مہینے لگ گئے۔

جمال مقروض ہو گیا تھا لیکن اس نے دانش کو امریکا بھجوا دیا۔

دانش نے امریکا کو اس لیے بھی منتخب کیا تھا کہ اسے ایک موہوم سی اُمید تھی کہ شاید وہاں لائبہ سے ملاقات ہو جائے۔ شاید وہ اسی شہر میں ہو جہاں وہ جا رہا تھا۔

☆☆☆

راحیلہ جس کلب کی ممبر تھی وہاں عشائیہ تھا۔ عشائیے کے بعد محفلِ موسیقی کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ وہ تو ایسی محفلوں کی رسیا تھی انکار کیسے کرتی۔ اس نے اعجاز سے بھی کہا تھا کہ وہ بھی اس کے ساتھ چلے لیکن اعجاز نے انکار کر دیا۔

"ڈرائیور کو ساتھ لے جانا۔ واپسی میں رات ہو جائے گی۔"

اعجاز نے کہا ضرور تھا لیکن اسے تو جس کام کے لیے کہہ دیا جاتا تھا اس کے برعکس ہی کرتی تھی۔ یوں بھی وہ ڈرائیور کو ساتھ لے جانے کی قائل نہیں تھی۔ اس نے گاڑی نکالی اور خود ہی ڈرائیو کرتے ہوئے کلب چلی گئی۔ وہ جب پہنچ جاتی تھی کلب میں جان سی پڑ جاتی تھی اس وقت بھی اس کے پہنچتے ہی مہمان اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اس کے قہقہوں سے کلب

گونجنے لگا۔ شمس الدین کو بھی اس نے ممبر شپ دلا دی تھی تاکہ کلب میں اس سے ملاقاتیں ہو سکیں۔ وہ بھی اس وقت موجود تھا۔ بڑے گھرانوں کی بڑی بیگمات شمس الدین کی وجاہت سے متاثر بھی ہو رہی تھیں اور راحیلہ کی قسمت پر رشک بھی کر رہی تھیں۔ ایک خاتون نے تو چپکے سے کہہ بھی دیا کہ کس بوڑھی کے ساتھ بیٹھے ہو، کئی لڑکیاں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا "دولت کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔"

راحیلہ اس کے لیے ایک قیمتی گھڑی لائی تھی۔ ابھی تک اسے دینے کا موقع نہیں ملا تھا۔

"چلو کسی اکیلی بینچ پر چل کر بیٹھتے ہیں۔ میں تمہیں کوئی چیز دینے والی ہوں۔" وہ اسے لے کر نسبتاً ایک تاریک گوشے میں چلی گئی۔

"دیکھو میں تمہارے لیے گھڑی لائی ہوں۔"

گھڑی میں لگے ہوئے ڈائمنڈ اندھیرے میں روشنی کر رہے تھے۔

"آپ کو میرا کتنا خیال ہے۔"

"تم میرے خیالوں میں آباد جو رہتے ہو۔"

"اگلے ہفتے اعجاز صاحب امریکا جا رہے ہیں۔" شمس الدین نے مطلع کیا۔

"وہ ضرور لائبہ سے ملنے جا رہے ہوں گے۔ مجھ سے کہتے ہیں انہیں خود خبر نہیں کہ لائبہ کہاں ہے حالانکہ ان سے اس کا رابطہ ہوگا۔"

"مجھ سے تو کہہ رہے تھے وہاں کوئی نمائش ہے۔"

"تم سے اور کیا کہتے۔ خیر یہ باتیں چھوڑو۔ اپنا منہ کیوں کڑوا کرتے ہو۔ وہ جب تک امریکا میں رہیں گے تم میرے پاس رہو گے۔ کہو اس دعوت سے منہ کی کڑواہٹ دور ہوئی؟"

"اب تو میں کوشش کروں گا وہ اگلے ہفتے نہیں کل ہی چلے جائیں۔"

"چلاؤ کوئی چکر۔ مجھے بھی جلدی ہے۔ وہ بوڑھا اب مجھے زہر لگنے لگا ہے۔" راحیلہ نے کہا اور اٹھ کر کھڑی ہوگئی "میں بار روم کی طرف جا رہی ہوں۔ تم تو پیتے نہیں ہو۔ میرے ساتھ بیٹھو گے تو نشہ دوبالا ہو جائے گا۔ آؤ چلیں۔"

کھانے کے بعد موسیقی کا دور شروع ہوا۔ "وہ کچھ تو پان کی بو اور کچھ شراب کی بو" والا معاملہ تھا۔ شراب کے نشے میں موسیقی کا نشہ شامل ہوا تو کسی کو کچھ ہوش نہ رہا۔ وہ بھی بےخود تھی۔ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ شمس الدین کس وقت

اس کے پہلو سے اٹھ کر چلا گیا۔
ساز خاموش ہوئے تو رات کے دو بج رہے تھے۔ مہمان رخصت ہونے لگے۔ ڈرائیور اپنی اپنی گاڑیوں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ راحیلہ کا نشہ اتر چکا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے ڈرائیور کے ساتھ نہ آ کر بڑی غلطی کی ہے۔ شہر کے حالات ٹھیک نہیں ہیں اور وہ اس وقت اکیلی ہے۔ خدا کرے کوئی ڈاکو بھی ملے تو جوان اور حسین ہو۔ وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھی اور وہ ہوا ہو گئی۔ سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ وہ فل اسپیڈ سے گاڑی دوڑا رہی تھی۔ ایک گاڑی مسلسل اس کا پیچھا کر رہی تھی لیکن شاید راحیلہ کی اسپیڈ زیادہ تھی جو اس گاڑی کو قریب نہیں آنے دے رہی تھی۔ ایک جگہ پہنچ کر راحیلہ کو یوٹرن لینا تھا۔ اس کے لیے اسے گاڑی کو آہستہ کرنا پڑا۔ بس یہی غضب ہو گیا پیچھے آنے والی گاڑی اس کے سر پر آ گئی۔ یوٹرن لیتے ہی وہ گاڑی اس کے سامنے آ گئی۔ راحیلہ کو بریک لگانے پڑے۔ اس گاڑی سے دو آدمی باہر نکلے۔ ایک نے پستول کا دستہ مار کر شیشہ توڑا۔ دوسرے نے نہایت قریب سے یکے بعد دیگرے تین گولیاں اس کے سر میں اتار دیں۔
راحیلہ کی گاڑی اور گاڑی میں اس کی لاش صبح تک سڑک پر پڑی رہی۔ صبح ہوئی تو کسی نے پولیس کو فون کر دیا۔ مردہ راحیلہ اسپتال اور گاڑی پولیس اسٹیشن پہنچا دی گئی۔
اعجاز صبح سو کر اٹھا تو ملازموں نے اسے بتایا کہ راحیلہ رات گھر نہیں آئی۔ اس نے سوچا ضرور تھا کہ صبح تک وہ کلب میں کیا کر رہی ہے لیکن ایک امکان یہ بھی تھا کہ رات زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ کسی دوست کے گھر چلی گئی ہو۔
وہ آفس جانے کے لیے گاڑی میں بیٹھنے ہی والا تھا کہ پولیس اسٹیشن سے فون آ گیا۔ راحیلہ کی لاش کو شناخت کیا جا چکا تھا۔ فون پر اس سے کہا گیا تھا کہ وہ فلاں اسپتال میں جا کر اپنی بیوی کو شناخت کر لے۔
دونوں میں تعلقات کشیدہ تھے۔ راحیلہ کی طرف سے اس کے دل میں نفرت کے سوا کچھ نہ تھا لیکن بہرحال وہ اس کی بیوی تھی، فون سن کر وہ سکتے میں آ گیا۔ ملازموں کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ کیا حادثہ پیش آ چکا ہے۔ کچھ دیر توقف کے بعد اس نے اپنے سیکریٹری شمس الدین کو فون کیا۔ دس منٹ کے اندر اندر وہ اور سیٹھ بدرالدین اس کے گھر پہنچ گئے۔ ان کے آنے سے اسے بڑا سہارا ہو گیا۔ اسپتال جا کر لاش کو شناخت کیا گیا۔ اب رپورٹ درج کرانے کا مرحلہ تھا۔

پولیس نے نامعلوم قاتلوں کے خلاف رپورٹ درج کر لی۔
پوسٹ مارٹم اور دوسری قانونی کارروائیوں کے بعد راحیلہ کی لاش کو اعجاز کے حوالے کر دیا گیا۔
پولیس نے جائے وقوعہ کا معائنہ کیا۔ اعجاز سے ضروری معلومات لیں۔ وہی روایتی سوالات تھے کہ آپ کو کس پر شک ہے۔ مرحومہ کی کسی سے دشمنی تو نہیں تھی وغیرہ وغیرہ۔ پولیس کی تفتیش جاری تھی۔ اعجاز کو یہ خبریں اخباروں سے مل رہی تھیں۔ پولیس یہ دعویٰ کر رہی تھی کہ وہ مجرم کے قریب پہنچ گئی ہے۔ بعض ذرائع یہ بھی کہہ رہے تھے کہ پولیس کو کوئی گمنام فون موصول ہوا ہے جس نے پولیس کا کام بہت آسان کر دیا ہے۔ پھر ایک دن پولیس نے اعجاز کی کوٹھی میں قدم رکھ دیا۔
تمام ملازموں سے ایک ایک کر کے پوچھ گچھ کی گئی۔
سب کے بیانات سے جو نتیجہ پولیس نے اخذ کیا وہ یہ تھا کہ میاں بیوی کے تعلقات کشیدہ تھے۔ برسوں سے دونوں کے بیڈروم الگ تھے۔ دونوں کا رویہ ایک دوسرے کے لیے نہایت نفرت آمیز تھا۔ راحیلہ سوتیلی ماں تھی۔ اس لیے اعجاز کو اپنی بیٹی کی حفاظت کا خیال بھی رہتا تھا۔ لائبہ کی شادی کے مسئلے پر دونوں کے شدید اختلافات ہوئے تھے۔ ایک ملازم نے یہ بھی بتایا کہ صاحب دوسری شادی کرنا چاہتے تھے۔ راحیلہ ان کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ کلب جانے سے پہلے راحیلہ نے صاحب سے بھی کہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ چلیں لیکن صاحب نے انکار کر دیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد صاحب بہت پریشان نظر آ رہے تھے۔ ان کے کمرے کی لائٹ رات بھر جلتی رہی تھی۔ وہ بار بار کسی سے فون پر بات بھی کر رہے تھے۔ صبح اٹھ کر انہوں نے ایک ملازم سے صرف اتنا پوچھا تھا کہ راحیلہ نہیں آئی اور پھر وہ مطمئن ہو گئے تھے۔
ایک ملازم نے یہ بھی اطلاع دی کہ وہ فون پر کسی سے کہہ رہے تھے کہ وہ امریکا جا رہے ہیں۔ اس اطلاع کی تصدیق اس طرح ہو گئی کہ جب پولیس نے ان کے کمرے کی ہلکی پھلکی تلاشی لی تو ان کا پاسپورٹ مل گیا جس پر تازہ ویزا لگا ہوا تھا جو دو دن پہلے ہی لیا گیا تھا۔
پولیس اس کے آفس بھی پہنچی۔ وہاں اس کے سیکریٹری سے معلومات لیں۔ اس کی باتوں سے بھی یہ ظاہر ہوا کہ راحیلہ کا چال چلن ٹھیک نہیں تھا۔ شاید اس وجہ سے اعجاز احمد نے اس سے تقریباً ترکِ تعلق کر لیا تھا۔ دونوں ایک چھت کے نیچے رہتے ضرور تھے لیکن دونوں ایک دوسرے کے لیے

اجنبی تھے۔ یہ خوفناک انکشاف بھی ہوا کہ اعجاز احمد اپنا آدھے سے زیادہ سرمایہ بیرون ملک منتقل کر چکا ہے۔
یہ اس کا ذاتی معاملہ تھا لیکن راحیلہ کے قتل کے بعد اس کے دوسرے معنی ہو گئے تھے۔ پولیس نے یہ سمجھا کہ وہ باہر بھاگنے کا منصوبہ تیار کر رہا تھا۔ لائبہ امریکا چلی گئی تھی۔ اس کے امریکا چلے جانے کو بھی اس منصوبے کا حصہ سمجھا گیا۔ پہلے بیٹی کو باہر بھیجا اب خود فرار ہونے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔
ان معلومات کے بعد پولیس نے اعجاز احمد کو راحیلہ کے قتل کے الزام میں باقاعدہ گرفتار کر لیا۔ اس سے جو ابتدائی پوچھ گچھ کی گئی۔ اس سے بھی یہی ظاہر ہوا کہ راحیلہ اور اس کے تعلقات کشیدہ تھے۔ اس نے یہ تو انکار کیا کہ راحیلہ کے قتل میں اس کا ہاتھ ہے لیکن دوسرے شواہد سے انکار ممکن نہ تھا۔
پولیس ایک گمنام ٹیلی فون کے بعد حرکت میں آئی تھی۔ فون کرنے والے نے بتایا تھا کہ وہ اس کا قریبی دوست ہے اور پورے وثوق سے کہہ رہا ہے کہ راحیلہ سے جان چھڑانے کے لیے اس نے راحیلہ کو قتل کرایا ہے۔
اب پولیس کو صرف یہ معلوم کرنا تھا کہ اس نے کرائے کے کن قاتلوں کو استعمال کیا۔
پولیس نے اپنی مدعیت میں مقدمہ درج کر کے چالان عدالت میں پیش کر دیا اور مزید تفتیش کے لیے ریمانڈ بھی حاصل کر لیا۔ معاملہ اتنا دلچسپ تھا کہ ان خبروں سے اخبارات بھر گئے۔ ہر زبان پر یہی چرچے تھے۔ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی جا رہی تھیں۔ اخبارات نمک مرچ لگا کر ان واقعات کو اچھال رہے تھے۔
سیٹھ بدرالدین، اعجاز احمد کی ہمدردیاں خریدنے کے لیے آگے بڑھا۔ اس نے انجمن تاجران کی طرف سے احتجاجی مظاہروں کا آغاز کر دیا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ سیٹھ اعجاز کو بے قصور گرفتار کیا گیا ہے اسے رہا کیا جائے۔
سیٹھ بدرالدین نے اپنی طرف سے ایک وکیل بھی کھڑا کر دیا۔ ریمانڈ کی مدت ختم ہونے کے بعد جب سماعت کا آغاز ہوا تو وکیل نے دلائل پیش کیے اور عدالت کو باور کرایا کہ چونکہ سیٹھ اعجاز احمد ایک معزز شہری ہیں اور ابھی ان پر کوئی الزام ثابت بھی نہیں ہوا اس لیے انہیں ضمانت پر رہا کیا جائے۔ یہ ضمانت دی جاتی ہے کہ وہ ملک سے فرار نہیں ہوں گے۔
اعجاز احمد کو ضمانت پر رہائی مل گئی۔ چند سماعتیں اور ہوئیں۔ اس پر کوئی الزام ثابت نہ ہو سکا۔ وہ باعزت بری ہو گیا لیکن وہ باعزت عدالتوں کے لفظوں میں تھا۔ اسے اپنی بے عزتی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ اس احساس نے اس کی صحت کو تیزی سے متاثر کرنا شروع کیا۔ ایک بات البتہ ہوئی، سیٹھ بدرالدین سے اس کے تعلقات بڑھنے لگے۔ انہوں نے جو اس کا ساتھ دیا تھا وہ اسے ان کا احسان کہتا تھا۔
لائبہ کو گئے ہوئے دو سال ہو گئے تھے۔ ان دو برسوں میں کئی انقلاب آ گئے تھے۔ راحیلہ اس دنیا سے رخصت ہو گئی تھی۔ وہ اس الزام میں جیل جاتے جاتے بچا تھا۔ اسے دل کی تکلیف رہنے لگی تھی۔ لائبہ سے اس کا رابطہ تھا لیکن اس نے کوئی خبر اس تک نہیں پہنچائی تھی۔ یہ تک نہیں بتایا تھا کہ راحیلہ اب اس دنیا میں نہیں رہی بلکہ راحیلہ کے قتل کے بعد تو اس نے سوچ لیا تھا کہ لائبہ کچھ بھی کہے گی تو وہ اسے نہیں آنے دے گا۔ جن ہاتھوں نے راحیلہ کو قتل کیا ہے وہ لائبہ کی طرف بھی بڑھ سکتے ہیں۔
شہر کے حالات روز بروز خراب ہوتے جا رہے تھے۔ کاروباری حالات تو بہت ہی دگرگوں تھے۔ راحیلہ جیسی بھی تھی اس کی بیوی تھی۔ اس کے اٹھ جانے کے بعد وہ بالکل ہی تنہا رہ گیا تھا۔ سیٹھ بدرالدین اسے برابر مشورہ دے رہے تھے کہ وہ اپنا کاروبار وائنڈ اپ کرے اور ملائیشیا چلا جائے۔ لائبہ کو بھی وہیں بلا لے۔ انہی دنوں اس کی ایک فیکٹری میں آگ لگ گئی، لگی کیا تھی لگائی گئی تھی۔ کچھ دنوں پہلے اس کے پاس فون آیا تھا۔ اس سے بیس لاکھ روپے بھتا مانگا جا رہا تھا۔ اس نے انکار کر دیا اور اس کی فیکٹری کو آگ لگا دی گئی۔ آگ سے جو نقصان ہوا وہ الگ۔ متعلقہ محکموں نے رشوت کے لیے منہ پھاڑ دیے۔ لیبر قوانین پر عمل ہو رہا تھا یا نہیں، آگ بجھانے کے آلات مکمل تھے؟ عمارت کی تعمیر ایسی تھی یا نہیں کہ بوقت ضرورت مزدوروں کی جان بچائی جا سکے۔ انشورنس والے یہ تصدیق چاہتے تھے کہ آگ اس نے تو نہیں لگوائی۔ پولیس الگ رشوت طلب کر رہی تھی۔ اس وقت بھی سیٹھ بدرالدین اس کے ساتھ ساتھ تھے۔ یہ ان کا دوسرا احسان تھا جو اس پر ہوا تھا۔
ایک فیکٹری میں انکشاف ہوا کہ لاکھوں روپے کا غبن ہو چکا ہے۔ اس نے اپنی کوٹھی ملازموں پر چھوڑی ہوئی تھی۔ ایک روز معلوم ہوا ایک نہایت ہی بااعتماد ملازم لاکھوں ڈالر لے کر فرار ہو گیا۔
دو اور دو پانچ سوچنے والا ذہن دو اور دو تین کیسے سوچ سکتا تھا۔ اس کا دل یہ صدمے نہ سہہ سکا۔ ایک روز اسے ہارٹ اٹیک ہوا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ اس وقت وہ آفس میں تھا۔ اسے بروقت اسپتال پہنچا دیا گیا۔ ڈاکٹروں نے اس کی

جان بچالی لیکن یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا کہ اگر اب اسے اٹیک ہوا تو اس کا جانبر ہونا مشکل ہو جائے گا۔ اسے مکمل بیڈ ریسٹ کا مشورہ دیا گیا تھا۔

اسے شمس الدین پر بھروسا تھا۔ اسے بیٹوں کی طرح عزیز رکھنے لگا تھا۔ تمام کام اس کے سپرد کر کے خود بستر پر چلا گیا۔ ضروری دستخطوں کے لیے وہ گھر آ جاتا۔ کوئی مشورہ کرنا ہوتا تو فون پر کر لیتا۔

ان بے بسی کے دنوں میں اسے لائبہ بہت یاد آ رہی تھی۔ وہ اگر ہوتی تو میری جگہ آفس میں بیٹھ جاتی۔ کام تو ملازم ہی کرتے لیکن نگرانی کے لیے کوئی اپنا تو ہوتا۔ وہ کبھی کبھی فون کر لیا کرتی تھی بہت دنوں سے اس کا فون بھی نہیں آیا تھا۔ وہ ہر فون پر اسے سب خیریت ہے کی نوید سنا تا رہا تھا لیکن اس نے سوچ لیا تھا کہ اب بات ہوئی تو نہ صرف اپنی طبیعت کا بتائے گا بلکہ زور دے کر کہے گا کہ اب وہ واپس آ جائے۔

وہ اس کے فون کا انتظار کرتا رہا پھر اس نے خود اسے فون کیا۔ راحیلہ کی موت سے لے کر اپنی بیماری تک کے تمام حالات اسے بتا دیے اور یہ بھی کہہ دیا کہ اگر وہ اسے زندہ دیکھنا چاہتی ہے تو فوراً چلی آئے۔

لائبہ پہلی فلائٹ سے چلی آئی۔ دیکھا تو گھر کا نقشہ ہی دوسرا تھا۔ اس کے دل کی طرح اجاڑ، ویران، سنسان۔ ہر کردار اپنی جگہ سے ہٹ چکا تھا۔ راحیلہ نہیں رہی تھی۔ جمال نوکری چھوڑ گیا تھا۔ دانش تو کب کا جا چکا تھا۔ اعجاز احمد بھی کوئی دوسرا ہی کردار لگ رہا تھا نہایت کمزور۔ بات کرے تو سانس پھولتی تھی۔ صرف دو سال میں صدیاں گزر گئیں۔ اس نے آتے ہی باپ کو مشورہ دیا تھا کہ وہ بیرونِ ملک جا کر اپنا علاج کرائے لیکن وہ اپنی طرف سے اتنے مایوس ہو گئے تھے کہ باہر جانے پر تیار نہیں تھے۔

"اب تم آ گئی ہو تو دیکھنا کتنی جلدی ٹھیک ہوتا ہوں۔ تھوڑے ہی دن میں دیکھنا پہچان نہیں سکو گی۔"

"آپ ٹھیک ہو جائیں پھر ایک بڑی سی تقریب کر کے سب کو بتاؤں گی کہ میرے ڈیڈی اب پہلے سے بھی زیادہ جوان ہو گئے ہیں۔"

"میں تو اس وقت ٹھیک ہوں گا جب تم میرے آفس میں جا کر بیٹھو گی۔ آفس والوں کو بھی تو پتا چلے کہ ان کی نگرانی کرنے والا کوئی ہے۔ میرا سیکریٹری ہے شمس الدین۔ بڑا لائق لڑکا ہے۔ وہ تمہیں بریفنگ دیدے گا۔ ابھی سے کاروبار سنبھالنا شروع کرو۔ میں ٹھیک بھی ہو گیا تو دنیا گھومنے نکل جاؤں گا۔ کاروبار تمہیں ہی سنبھالنا ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں میں کل ہی آفس جاتی ہوں۔ آپ کی تمام فیکٹریوں کا دورہ بھی کروں گی۔"

"شمس الدین کو ساتھ لے لینا۔"

وہ اپنے کمرے میں آئی تو ہر چیز اسی طرح سجی ہوئی تھی۔ ایک ایک چیز کو دیکھ کر اسے اپنا ماضی یاد آ رہا تھا۔ صرف دو سال بعد آئی تھی لیکن ہر چیز بدل گئی تھی۔ اسے راحیلہ یاد آئی۔ وہ کیسی بھی تھیں مگر ان کے دم سے کتنی رونق رہتی تھی۔ اب تو اتنی بڑی کوٹھی میں دل لگنا محال ہے۔

دوسرے دن وہ آفس گئی۔ شمس الدین اسے پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔

سیٹھ بدرالدین نے سنا کہ لائبہ آ گئی ہے تو وہ بھی اس سے ملنے آئے۔ اس سے پہلے انہوں نے لائبہ کو دیکھا تک نہیں تھا۔ وہ لائبہ سے ملے اور اس سے گفتگو کی تو کچھ اور سوچنے پر مجبور ہو گئے۔ اب طریقہ تبدیل کرنا پڑے گا۔ اس نے کاروبار سنبھال لیا تو اعجاز احمد کو استعمال کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اگر طریقہ یہ استعمال کیا جائے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے تو اس سے بہتر اور کیا ہوگا۔ شمس الدین تو میری مٹھی میں ہے۔ اگر اعجاز احمد کی دولت شمس الدین کی ہو جائے تو سمجھو میری ہی ہوگی۔ اب راحیلہ تو ہے نہیں جو حصہ دار بنے گی۔ جو کچھ ہے لائبہ ہی کا ہے۔ اگر سونے کی اس چڑیا کو نظر بند کر دیا جائے تو اعجاز احمد کا تمام کاروبار میرا اور شمس الدین ہی کا ہوگا۔

لائبہ کو پاکستان پہنچتے ہی ماضی کا وہ دردناک باب بھی یاد آ گیا تھا جو دانش کمال نے اپنے قلم سے تحریر کیا تھا لیکن اب اس تحریر کو دانش کمال کی بے وفائی نے دھندلا دیا تھا۔ اس نے نفرت کا قلم اٹھایا اور اس تحریر کو جگہ جگہ سے کاٹ دیا۔ وہ اپنے باپ سے یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ میری غیر موجودگی میں وہ بے وفا کبھی مجھے پوچھنے آیا؟

☆☆☆

"اعجاز احمد، میرا منہ چھوٹا ہے لیکن بات بڑی کر رہا ہوں۔ اگر ناگوار ہوئی تو امید ہے تم مجھے معاف کر دو گے۔" سیٹھ بدرالدین نے کہا۔

"بدرالدین کیوں مجھے شرمندہ کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ تمہارے تو مجھ پر اتنے احسان ہیں کہ اتار نہیں سکتا۔ تم مجھ سے کچھ کہو اور میں نہ سنوں۔ تم مجھ سے کچھ مانگو اور میں نہ دوں یہ تو احسان فراموشی ہوگی۔"

"میرے بھتیجے شمس الدین کو تم نے کیسا پایا؟"

"شمس الدین بھی تمہارے احسانوں میں سے ایک احسان ہے۔ میرا اپنا بیٹا ہوتا تو وہ بھی میرے اتنے کام نہ آتا جتنا وہ آیا ہے۔"

"میں نے بھی تمہاری بیٹی لائبہ کو بچپن میں کبھی دیکھا ہوگا یا اب دیکھا ہے۔ مجھے نہایت ذہین اور معاملہ فہم معلوم ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں اگر شمس الدین اور لائبہ کی شادی ہو جائے تو ہم دونوں کے لیے اس سے بڑی خوشی کی اور کوئی بات نہیں ہوگی۔"

"وہ تو ہے بدرالدین لیکن......" اعجاز احمد کچھ کہتے کہتے رک گئے۔ وہ یہ کیسے کہتے کہ لائبہ نے اتنی بڑی ٹھوکر کھائی ہے کہ شاید اب وہ کسی سے شادی نہ کرے۔

"لیکن، لیکن کچھ نہیں۔ جو تم کہنا نہیں چاہتے وہ مجھے معلوم ہے۔ راحیلہ نے ایک مرتبہ مجھے بتایا تھا کہ اعجاز کی بیٹی لائبہ یونیورسٹی میں کسی لڑکے سے ملتی رہی ہے۔ شاید محبت وحبت کا چکر تھا۔ راحیلہ نے کچھ لوگوں کو اس کی نگرانی پر بھی مقرر کیا تھا۔" بدرالدین نے جان بوجھ کر یہ باتیں کیں تا کہ وہ اعجاز احمد کو اس کی حیثیت یاد دلائے۔

"جب تمہیں یہ معلوم ہے بدرالدین تو پھر یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ جس لڑکے سے محبت کرتی تھی میں نے اس سے اس کی شادی نہیں ہونے دی۔"

"نہیں، یہ نہیں معلوم۔ بات اتنی بڑھ گئی تھی۔ یہ مجھے معلوم نہیں۔"

"تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ لائبہ کے دل میں میری طرف سے غصہ ہوگا۔ پتا نہیں بات مانے یا نہ مانے۔"

"تم کہو تو میں اسے سمجھاؤں۔ میری بھی تو بیٹی ہے وہ۔"

"نہیں۔ وہ گھر کی باتیں گھر تک محدود رکھنے کی عادی ہے۔ میں ہی اس سے بات کروں گا۔"

اعجاز احمد نے غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ لائبہ کے لیے اس سے اچھا رشتہ کوئی اور ہو نہیں سکتا۔ شمس الدین آئیڈیل لڑکا ہے اور پھر سیٹھ بدرالدین کی سرپرستی حاصل رہے گی۔ ان کے تجربے سے لائبہ فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ لائبہ کے بارے میں بہت سی باتیں جانتے بھی ہیں۔ اگر بعد میں کوئی بات کھلی تو انہیں پہلے سے معلوم ہوگا۔

سوال یہ تھا کہ لائبہ کیسے تیار ہو۔ انہیں یقین سا تھا کہ ایک مرتبہ انہوں نے اس کے انتخاب کی مخالفت کی تھی اب وہ ان کے انتخاب کو ٹھکرا دے گی۔ اس کے باوجود انہوں نے لائبہ سے بات کی۔

"بیٹا بدرالدین انکل کو تو تم جانتی ہی ہو۔"

"جی ہاں، اس دن آپ کے پاس آئے بھی تھے۔"

"شمس الدین جو میرا سیکریٹری ہے وہ بدرالدین کا بھتیجا ہے۔ اچھا خاندانی لڑکا ہے۔ کاروباری لوگ ہیں ہماری طرح، بدرالدین کا کاروبار تو مجھ سے بھی وسیع ہے۔"

"ڈیڈی، ان میں سے بہت سی باتیں مجھے پہلے ہی سے معلوم ہیں۔"

"میں یہ سب باتیں تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ سیٹھ صاحب اپنے بھتیجے شمس الدین کا رشتہ تمہارے لیے لے کر آئے تھے۔"

"وہ سرمایہ دار ہیں۔ رشتہ لا سکتے ہیں اور آپ قبول بھی کر سکتے ہیں۔"

"لائبہ تمہیں نہیں معلوم ان کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں۔ جب سب میرا ساتھ چھوڑ گئے تھے انہوں نے میرا ساتھ دیا تھا۔"

"ڈیڈی، ایک وقت وہ تھا جب میں شادی کرنا چاہتی تھی اور آپ نہیں چاہتے تھے۔ اب میں شادی کرنا نہیں چاہتی۔"

"میں تمہارے دکھ کو سمجھ سکتا ہوں لیکن تمہیں زندگی گزارنے کے لیے ایک مضبوط سہارے کی ضرورت پڑے گی۔"

"شمس الدین سے بلا کر پوچھ لیں، وہ آپ کی دولت کے بغیر مجھے قبول کرے گا؟"

"تم مجھ پر طنز مت کرو۔ جس لڑکے سے تم شادی کرنا چاہتی تھیں، اس کا خط تم نے پڑھ لیا تھا۔ میں نے انکار نہیں کیا تھا۔ وہ خود ملاقات کے لیے نہیں آیا۔"

"کبھی اس سے ملاقات ہوئی تو خط کی بھی وضاحت ہو جائے گی۔ مجھے یقین ہے اسے آپ تک نہیں آنے دیا گیا تھا۔"

"وہ بعد میں بھی آ سکتا تھا۔"

"کیا خبر وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔"

"لائبہ زندگی پیچھے پلٹ کر دیکھتے رہنے کا نام نہیں ہے آگے بڑھنے کا نام ہے۔ میری زندگی کا اب کوئی بھروسا نہیں۔ میرے بعد یہ کاروبار تمہیں سنبھالنا ہے، تمہیں کسی مرد کے سہارے کی ضرورت ہوگی۔"

"ڈیڈی میں آپ سے بعد میں بات کروں گی۔"

اعجاز احمد بھی اسے سوچنے کا موقع دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے بھی ضد نہیں کی۔

لائبہ کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس نے گاڑی لی اور گھر سے

نکل گئی۔ اس کی کوئی منزل نہیں تھی۔ سڑکوں پر بے مقصد گاڑی گھماتی رہی۔ پھر یوں ہی بے مقصد اعجاز احمد کے آفس کی طرف نکل گئی اور سیدھی شمس الدین کے پاس پہنچی۔

''آپ کو معلوم ہے جمال احمد نے استعفیٰ کیوں دیا تھا۔''

''مجھے معلوم نہیں کیونکہ یہ میرے آنے سے پہلے کی بات ہے۔''

''کہیں ایسا تو نہیں آپ کو لانے کے لیے انہیں نکالا گیا ہو۔''

''میرے خیال میں ایسا نہیں ہے کیونکہ مجھے اعجاز صاحب کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ وہ نوکری چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ میں نے تو اعجاز صاحب سے کچھ کہا بھی نہیں تھا۔ انہوں نے خود ہی کہا تھا کہ ان کا سیکریٹری چلا گیا ہے میں ان کی جگہ لے لوں۔''

''یہ آپ بتا سکتے ہیں کہ اب وہ کہاں نوکری کر رہے ہیں۔''

''ہاں، یہ مجھے معلوم ہے۔ اعجاز صاحب نے خود ہی مجھے بتایا تھا۔'' شمس الدین نے اسے جمال کے آفس کا پتا بتا دیا۔

''بس مجھے یہی معلوم کرنا تھا۔''

وہ وہاں سے نکلی اور سیدھی جمال کے آفس پہنچ گئی۔

''آپ مجھے بتا سکتے ہیں، آپ نے ڈیڈی کے آفس سے استعفیٰ کیوں دیا؟''

''مجھے، ہاں سے اچھی آفر یہاں ملی میں یہاں چلا آیا۔''

''آپ مجھ سے اصل بات چھپا رہے ہیں۔''

''یہ میرا ذاتی معاملہ ہے، آپ کو زیادہ دلچسپی لینی بھی نہیں چاہیے۔ یہ تو آپ اپنے ڈیڈی سے جا کر پوچھیے کہ انہوں نے میرا استعفیٰ قبول کیوں کیا۔''

''دانش کہاں ہے؟''

''آپ اس کا تعاقب چھوڑ دیں۔ اس نے شادی کر لی ہے اور بیرونِ ملک شفٹ کر گیا ہے۔''

''آپ پھر غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔''

''اتفاق سے اپنے دعوے کی تصدیق کے لیے ایک ثبوت میرے پاس موجود ہے۔''

جمال نے اپنے والٹ سے ایک تصویر نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔ اس تصویر میں دانش کمال اپنی منگیتر شاہدہ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ شاہدہ دلہن بنی ہوئی تھی اور دانش کے گلے میں ہار پڑا ہوا تھا۔

یہ اس وقت کی تصویر تھی جب وہ بیرون ملک جا رہا تھا۔ اس کی ماں نے اپنا شوق پورا کرنے کے لیے شاہدہ کو دلہن بنا دیا تھا۔ تصویر سے یہی ظاہر ہوتا تھا جیسے یہ تصویر دانش کی شادی کی ہے۔

''یہ تصویر دیکھنے کے بعد آپ یہ کبھی نہیں چاہیں گی کہ دانش سے ملنے کی کوشش کریں۔ اگر آپ نے اس سے ملنے کی کوشش کی تو ایک معصوم لڑکی کا گھر خراب کریں گی اور اطلاع کے لیے عرض ہے کہ دانش نے یہ شادی اس وقت کی تھی جب آپ امریکا گئی بھی نہیں تھیں۔ اگر اسے آپ سے دلچسپی ہوتی تو وہ شادی کبھی نہ کرتا۔ میری اس سے تفصیلی بات ہوئی تھی۔ وہ آپ میں صرف اتنی دلچسپی رکھتا تھا جتنا لڑکے ہر لڑکی میں رکھتے ہیں۔''

وہ اور نہ جانے کیا کیا کہتا، لائبہ نے کرسی چھوڑ دی۔ بے وفائی کے وہ نقش جو اس نے امریکا میں رہ کر مٹا دیے تھے پھر ابھر آئے۔ اس نے منگیتر کے ہوتے ہوئے میرے ساتھ وقت گزارا۔ اس کی بے وفائی کے لیے یہی ثبوت کافی ہے۔ جمال ٹھیک کہتا ہے، اگر میں اب دانش کے قریب سے بھی ہو کر گزری تو یہ میری خود غرضی ہوگی۔ ڈیڈی ٹھیک کہتے ہیں۔ دانش اب میرا تلخ ماضی بن چکا۔ اسے بھلا دینا ہی بہتر ہوگا۔

وہ گھر پہنچی تو بپھرا ہوا طوفان تھم چکا تھا۔ اس نے چند دنوں اور انتظار کیا کہ یہ طوفان پھر تو سر نہیں اٹھائے گا۔ اب اسے صبر آ چکا تھا۔ جب نہ کشتی اپنی ہو نہ ملاح اپنا تو دریا پار کرنے کا خیال ہی کیسا۔ اب کوئی نہیں جسے خوش کروں۔ ایک ڈیڈی ہیں۔ اگر انہیں بھی خوش نہ رکھ سکی تو پھر میرے وجود کا مقصد ہی کیا۔ وہ بچپن کے ایک ایک لمحے کو یاد کرتی رہی۔ ہر طرف اس کے باپ کا پیار بکھرا ہوا تھا۔ ڈیڈی نے میری ہر فرمائش پوری کی۔ بے جا ضدیں تک پوری کیں۔ اب وہ مجھ سے کچھ مانگ رہے ہیں۔ وہ مانگ رہے ہیں جو میرے اختیار میں ہے۔ کیا میں انہیں یہ خوشی نہیں دے سکتی؟ میری زندگی تو یوں بھی بنجر ہے۔ گرم ہوا کے چند تھپیڑے اور لگ جائیں گے تو کیا فرق پڑے گا۔

وہ اعجاز احمد کے پاس گئی اور سر جھکا کر خاموش کھڑی ہو گئی۔

''بیٹی، میں نے تو یہ آرزو کی تھی کہ تم ہر وقت مسکراتی، کھل کھلاتی رہو گی۔ میں نے تمہیں اس لیے نہیں پالا تھا کہ یوں اداس میرے سامنے کھڑی ہو جاؤ۔ میں زبردستی نہیں کروں گا۔ اگر تم شادی نہیں کرنا چاہتیں تو نہ کرو۔ میری بات رکھ لیتیں تو مجھے وہ خوشی مل جاتی جو مجھے کبھی نہیں ملی تھی۔''

''ڈیڈی، میں آپ کی خوشی میں خوش ہوں۔ میں شادی کے لیے تیار ہوں۔ آپ کا انتخاب بہت اچھا ہے۔ مجھے قبول ہے۔''

اعجاز احمد نے آگے بڑھ کر اسے اپنی بانہوں کی آغوش میں لے لیا۔ دونوں بلک بلک کر رو رہے تھے۔ کب کے رکے ہوئے آنسو تھے جو دونوں کو بھگو رہے تھے۔

”بیٹی میری طرف تو دیکھو۔ میں نے صرف تمہاری خاطر راحیلہ جیسی عورت کے ساتھ اتنے برس گزار دیے۔ میں کوئی کام اپنی مرضی سے نہ کرسکا۔ ایک کام تو مجھے اپنی مرضی سے کرنے دو۔ میں نے تمہاری ماں کے کہنے میں آکر تمہارے ساتھ کئی زیادتیاں کیں۔ اب ان کے ازالے کا وقت آگیا ہے۔ شمس الدین بہت اچھا لڑکا ہے۔ وہ تمہیں خوش رکھے گا۔“

”ڈیڈی، میری خوشی تو آپ ہیں۔ میں نے آپ کو خوش کردیا۔ اس کے بعد کوئی دکھ میرا دکھ نہیں۔“

اعجاز احمد سیٹھ بدرالدین کے سامنے سرخرو ہوگئے۔ شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔

شہر کے بہت بڑے گراؤنڈ میں قناتوں کے بازار لگے تو یوں لگتا تھا جیسے اعجاز احمد کے پاس جتنی دولت ہے اس میں سے کچھ بھی نہیں بچا سکیں گے۔

مہمانوں کے ہجوم میں جمال احمد بھی تھا۔ اعجاز احمد اسے بھی بلانا نہیں بھولے تھے۔

لائبہ رخصت ہوکر اعجاز احمد کی دی ہوئی سجی سجائی کوٹھی میں پہنچی تو اعجاز احمد کا تمام کاروبار اپنے ساتھ جہیز میں لے کر گئی تھی۔

”اعجاز احمد، کچھ تو اپنے لیے بھی بچا کر رکھ لو۔“ اس نے خود سے کہا تھا۔

”میں کتنے دن کا ہوں جو کچھ بچا کر رکھوں۔ لائبہ کو میں نے کیا دیا ہے جو کچھ بچاؤں۔“ اس نے خود کو جواب دیا۔

جب کشتی ڈوبنے لگتی ہے تب بوجھ اتارا کرتے ہیں۔

وہ واقعی سارے بوجھ اتار چکا تھا۔ سانسوں کی کشتی تھی جو ادھر اُدھر ڈول رہی تھی۔ پھر ایک رات اس کشتی میں سوراخ ہوگیا۔ رات کو کسی وقت ہارٹ اٹیک ہوا۔ صبح جب وہ بہت دیر تک باہر نہ نکلا تو ملازموں نے دروازہ توڑا۔ وہ وہاں تھا کہاں جو آواز دیتا۔ وہاں تو ایک مردہ لیٹا ہوا تھا۔ سیٹھ اعجاز احمد مرحوم۔

☆☆☆

دانش کمال تقریباً تین سال بعد ایم بی اے کی ڈگری لے کر آگیا۔ وہ اس نیت سے آیا تھا کہ اگر لائبہ واپس آگئی ہوگی تو وہ آخری کوشش کے طور پر اس سے ملے گا اور اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کرے گا۔ اگر وہ اس کے دل میں جگہ بنانے میں کامیاب ہوگیا تو ٹھیک ورنہ شاہدہ سے شادی کرلے گا۔

وہ تین سال بعد آیا تھا اور بڑی بات یہ کہ آگیا تھا ورنہ کوئی اور تو نہیں جمال یہ سمجھ رہا تھا کہ اب وہ واپس نہیں آئے گا کیونکہ اسے حقیقت معلوم تھی۔ جب وہ آگیا تو گھر میں خوشی کا طوفان آگیا۔ شاہدہ کی آنکھیں اس کے قدموں میں جھک گئیں۔ وہ چچازاد تھی اس لیے منگنی کے بعد بھی پردہ نہیں ہوا تھا۔ آزادانہ آتی جاتی تھی۔

دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو لائبہ سے ملاقات کا دن ٹلتا رہا۔ وہ شاعر تھا، حساس تھا۔ بار بار شاہدہ کی طرف دیکھتا اور سوچتا تھا کہ اس بے چاری کا کیا قصور۔ جب میری منگنی ہوہی گئی تھی تو مجھے لائبہ کے قریب نہیں جانا چاہیے تھا۔ اب بھی اگر لائبہ سے دوبارہ مراسم ہوگئے تو شاہدہ کا دل کتنا ٹوٹے گا۔ وہ سوچتا رہا لائبہ سے ملے یا نہ ملے۔ اب اگر ایک مرتبہ ترک تعلق ہوہی گیا ہے تو اسے بھول جائے۔ اس نے بھی اب تک بھلا دیا ہوگا۔ پھر سوچتا تھا بھلا تو دیا ہوگا لیکن میرے نام سے بھلایا ہوگا۔ زندگی کے کسی موڑ پر اگر مل گئے تو اس کے دل میں نفرت کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ پھر یہ سوچنے لگتا کہ اس کا ایک دل ہے جو ٹوٹے گا یہاں کتنے دل ہیں جو ایک ساتھ ٹوٹیں گے۔ ان میں میری ماں بھی شامل ہوگی۔ میں دنیا بنانے کے لیے آخرت خراب کرلوں؟ وہ کشمکش میں جلا تھا۔ دل کچھ اور کہتا ذہن کچھ اور کہتا تھا۔

ایک روز وہ اس کشمکش سے باہر نکل آیا۔ ذہن ہار گیا دل کی جیت ہوگئی۔

”بھائی، آپ نے کہا تھا جب لائبہ واپس آجائے گی تو آپ خود مجھے اس کے پاس لے کر چلیں گے تاکہ میں اپنی صفائی پیش کرسکوں۔“

”اب کوئی فائدہ نہیں۔ اب تم اسے بھول ہی جاؤ۔ وہ واپس ضرور آگئی ہے لیکن اس کی شادی ہوچکی ہے۔ اب تمہاری ہمدردی کی چھوٹی سی چنگاری بھی اس کے نشیمن کو جلانے کے لیے بہت ہوگی۔“

یہ خبر دانش کے دل پر بجلی بن کر گری تھی۔ وہ ابتدا میں یہی سمجھا تھا کہ اس کا بھائی اس کی شادی کی فرضی خبر دے رہا ہے تاکہ وہ اس کی طرف سے بالکل ہی مایوس ہوجائے۔

”تم سمجھ رہے ہوگے میں تم سے جھوٹ بول رہا ہوں۔ میں تمہیں ایک ثبوت دیتا ہوں لیکن وعدہ کرو اس کے بعد تم لائبہ سے نہیں ملوگے۔ تمہاری شرافت کا تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ تم کسی شادی شدہ عورت کو اس کا ماضی یاد مت دلاؤ۔“

جمال نے لائبہ کی شادی کا دعوت نامہ اسے دکھایا۔

”اعجاز صاحب نے مجھے بھی بلایا تھا اور یہ دعوت نامہ میں نے اسی لیے سنبھال کر رکھا تھا کہ تمہیں دکھاؤں گا۔ میں خود اس شادی میں شریک تھا اس لیے قسم کھاسکتا ہوں کہ لائبہ کی شادی ہوچکی ہے۔“

”میں اعجاز احمد کے پاس جاؤں گا۔ انہیں بتاؤں گا کہ خط میں نے نہیں لکھا تھا، مجھ سے لکھوایا گیا تھا اور اگر آپ نے مجھے اغوا نہیں کرایا تھا تو آپ کے نام پر مجھے کس نے اغوا کیا تھا۔“

”میری جان، اب ان سے بھی ملاقات نہیں ہوسکتی۔ لائبہ کی شادی کو چھ مہینے بھی نہیں ہوئے ہوں گے کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے۔“

”اف میرے خدا! میرے تمام راستے بند ہوگئے۔ اب مجھے لائبہ کی نظروں میں بے وفا بن کر زندہ رہنا پڑے گا۔ کوئی میری فریاد سننے والا نہیں۔“

”میرے بچے، قدرت خود تیری صفائی کے ذرائع پیدا کرے گی۔ میری بات یاد رکھ کوئی ذریعہ ایسا ضرور نکلے گا کہ لائبہ کو تیری حقیقت کا علم ہوگا اور وہ تجھ سے خلوص دل سے ملے گی۔ تیری قدر کرے گی۔ بس تو اس وقت یہ نیکی کرلے کہ لائبہ کو اس طرح بھول جا جیسے وہ کبھی تیری زندگی میں آئی ہی نہیں تھی۔ تیری محبت یقیناً یہ چاہے گی کہ وہ خوشگوار زندگی گزارے۔“

اس نے دلیلوں کے سب ہتھیار رکھ دیے اور شاہدہ سے شادی کرلی۔

☆☆☆

سیٹھ بدرالدین کے تمام منصوبے بہ آسانی پورے ہوگئے تھے۔ افسوس تھا تو یہ کہ مفلسی کا ذائقہ چکھنے سے پہلے ہی اعجاز احمد دنیا سے اٹھ گیا تھا۔ اعجاز احمد سے اس کی رقابت کی کہانی بہت پرانی تھی جسے اس کے اور اعجاز احمد کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ جوانی کے دنوں میں بدرالدین اور راحیلہ کے درمیان زوردار عشق چلا تھا۔ اعجاز احمد بھی راحیلہ کے امیدواروں میں تھا۔ بدرالدین اس وقت معمولی سا تاجر تھا جبکہ اعجاز احمد کو محنت کیے بغیر باپ کا تمام کاروبار ورثے میں مل گیا تھا۔ راحیلہ کے باپ کرم نواز نے جو اس وقت خود بھی معمولی درجے کا بزنس مین تھا، اعجاز کے حق میں فیصلہ دیا۔ حالانکہ اعجاز احمد کی پہلی بیوی کا انتقال ہوچکا تھا اور اس کی ایک بیٹی بھی تھی۔

راحیلہ اس وقت ایسی خودسر نہیں تھی جیسی بعد میں ہوگئی۔ اس کے باوجود اس نے بہت شور مچایا تھا۔ وہ مخالفت کرتی رہی اور اعجاز احمد جیت گیا۔

بدرالدین کو شکست اس لیے ہوئی تھی کہ اعجاز احمد کے پاس اس سے زیادہ دولت تھی۔ کم از کم وہ یہی سمجھتا تھا۔ اس نے اس دن کے بعد سے راحیلہ کے حصول کے بجائے اعجاز احمد کی دولت کے حصول کے لیے کوشش شروع کردی تھی۔ ایسے منصوبے وضع کرتا رہتا تھا کہ اعجاز احمد قلاش ہوجائے۔ کئی مرتبہ وہ اعجاز کو نقصان پہنچانے میں کامیاب بھی ہوگیا لیکن سمندر سے چند قطرے نکل بھی جائیں تو سمندر، سمندر ہی رہتا ہے۔

بدرالدین بالآخر یہ سمجھنے لگا کہ اعجاز احمد اسے اپنا دشمن تصور کرتا ہے اس لیے اس کی طرف سے ہوشیار رہتا ہے۔ اگر وہ اس کا ہمدرد بن کر اس کے قریب جائے تو زیادہ کامیابی مل سکتی ہے۔ راحیلہ کے قتل کے بعد اسے یہ موقع مل گیا کیونکہ اب اعجاز یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ راحیلہ کی وجہ سے اس کے قریب آرہا ہے۔ اس میں بدرالدین کامیاب رہا۔ اعجاز احمد اسے نہ صرف اپنا دوست بلکہ محسن سمجھنے لگا۔ یہ بدرالدین کی بڑی کامیابی تھی کہ وہ اس کی بیٹی لائبہ کو اس کے تمام کاروبار سمیت اپنے خاندان میں لے آیا۔ اپنے منصوبے کے مطابق وہ اعجاز کی طرح لائبہ کو بھی قلاش کرکے گھر سے نکلوانے میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ اعجاز کی ساری جائداد لائبہ کے نام ہے لیکن شمس الدین گھر کا بھیدی بن کر لنکا ڈھا سکتا ہے۔ شادی سے پہلے اس سلسلے میں شمس الدین سے اس کی بات بھی ہوئی تھی۔

لائبہ کی شادی کو ایک سال ہوگیا تھا۔ ابھی کوئی اولاد بھی نہیں ہوئی تھی لہٰذا موقع اچھا تھا۔ اس نے شمس الدین کو اعتماد میں لے کر یاددہانی کرائی۔

”میں اعجاز کی بیٹی کو اس کی دولت سمیت تمہارے گھر میں لے آیا ہوں۔ چابیاں پاس ہوں تو تجوری کھولنا مشکل نہیں ہوتا۔ اب آہستہ آہستہ لائبہ کی تجوریاں خالی کرنا شروع کردو۔ وہ تمہاری بیوی ہے اسے شیشے میں اتارنے کے کئی مواقع ملیں گے۔ میں نے قسم کھائی تھی کہ اعجاز احمد کو فٹ پاتھ پر لے آؤں گا۔ میں اس میں آدھا کامیاب ہوا، آدھا نہیں ہوا۔ اس کام کو تم مکمل کروگے۔ وہ نہ سہی اس کی بیٹی سہی۔“

”انکل وہ اتنی سیدھی نہیں کہ اپنی دولت میرے حوالے کردے گی۔ اس نے دنیا دیکھی ہے۔“

”میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ صبح اٹھتے ہی یہ کام

شروع کردو۔"

"میں یہ کام شاید کبھی نہ کرسکوں۔ اگر آپ کی کوئی دشمنی تھی تو اعجاز صاحب سے تھی۔ اب وہ نہیں رہے تو ان کی بیٹی سے کیوں بدلہ لیتے ہیں۔ اس بے چاری کا کیا قصور۔"

"میں دیکھ رہا ہوں تمہاری نیت بدل گئی ہے۔ تم لائبہ کی تمام دولت اکیلے ہڑپ کرنا چاہتے ہو جبکہ یہ طے ہوا تھا کہ اعجاز کی پانچ فیکٹریوں میں سے دو تم میرے حوالے کردو گے۔ باقی اپنے پاس رکھو گے اور لائبہ کو بے ثمر چھوڑ دو گے۔"

"انکل، سچی بات تو یہ ہے کہ میں لائبہ کو دیکھتے ہی دل دے بیٹھا تھا۔ اگر آپ کو یہ لالچ نہ دیتا تو آپ اس سے میری شادی نہ کراتے۔ اب وہ میری بیوی ہے۔ اس کے پاس جو کچھ ہے میرا ہے، میرے پاس جو کچھ ہے اس کا ہے۔ شادی ہوئی ہے تو بچے بھی ہوں گے۔ میں اپنے بچوں کو دربدر نہیں کرسکتا۔"

اس صاف انکار کے بعد بدرالدین کو چپ ہوجانا چاہیے تھا لیکن انتقام کی آگ نے انہیں اندھا کردیا تھا۔ وہ اپنی بدفطرتی پر اتر آئے۔

"کبھی اپنی بیوی کا ماضی کریدا ہے؟"

"مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں اس کے ماضی میں جھانکوں۔ اس کا "حال" اچھا ہے میرے لیے یہی بہت ہے۔"

"اس سے کبھی پوچھ تو لینا، دانش نام کے لڑکے سے تمہارا کیا تعلق تھا۔"

"اس سے کیا پوچھوں۔ آپ ہی بتا کر اپنا دل ہلکا کرلیں۔"

"دانش سے اس کے ناجائز تعلقات تھے۔ اسے معلوم تھا کہ اعجاز احمد اس اوباش لڑکے سے اس کی شادی نہیں کریں گے لہٰذا لائبہ نے اس لڑکے کے ساتھ بھاگنے کی تیاری کرلی۔ وقت مقام سب طے ہوچکا تھا۔ وہ تو راحیلہ کو ہوش آگیا۔ ماں سوتیلی تھی لیکن تھی تو ماں اور پھر اس کے شوہر کی عزت کا سوال تھا۔ اس نے عین وقت پر لڑکے کو اغوا کرالیا۔ لائبہ یہ سمجھی کہ لڑکے نے بے وفائی کی ہے۔ وہ اس کی طرف سے مایوس ہوکر امریکا چلی گئی۔ اب بڑی مشکل سے باپ کے کہنے پر واپس آئی۔ اعجاز احمد نے اسے تمہارے سر تھوپ دیا۔"

"انکل جب لائبہ اتنی خراب تھی اور آپ کو معلوم تھا تو آپ نے اس سے میری شادی کیوں کرائی؟"

"یہی تو میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کررہا ہوں۔ صرف اس لیے شادی کرائی کہ تم آسانی سے اس کی دولت پر قبضہ کرسکو۔ تم جب بہت بڑے سیٹھ بن جاؤ تو اسے نکال باہر کرو اور دوسری شادی اپنے معیار کی کرلو۔ تمہیں ایک راز میں نے دے دیا ہے۔ اسے بلیک میل کرتے رہو۔ وہ اپنی ساری دولت دے کر بھی اپنی عزت بچانے پر مجبور ہوجائے گی۔ میرا کہنا مانو اور کسی روز اس سے پوچھ کر تو دیکھو کہ دانش کون تھا۔"

"وہ ظاہر ہے انکار کرے گی۔ اس نے اگر جھٹلایا تو میرے پاس اسے جھٹلانے کے لیے کیا ثبوت ہوگا۔"

"تمہیں ثبوت چاہیے؟ وہ لڑکا مر نہیں گیا ہے۔ اسی شہر میں ہے۔ اس سے مل لو، وہ سب بتادے گا۔"

"مجھے آپ اس کا ایڈریس دیں۔"

"وہ اعجاز احمد کے سابق سیکریٹری جمال کا سگا بھائی ہے اور ایک ملٹی نیشنل فرم میں اکاؤنٹس آفیسر ہے۔ یہ تو اب تم سمجھ ہی گئے ہوگے کہ اعجاز احمد نے جمال کو نوکری سے کیوں نکالا تھا۔ اس کا سبب بھی دانش اور لائبہ کا چکر ہی تھا۔"

جمال کا نام آیا تو وہ چونک اٹھا۔ اسے یاد آیا کہ شادی سے پہلے لائبہ اس کے پاس آئی تھی اور جمال کے بارے میں پوچھ رہی تھی کہ ڈیڈی نے اسے نوکری سے کیوں نکال دیا۔ پھر اس نے اس کا ایڈریس بھی لیا تھا۔ اس سے ملی بھی ہوگی...... کیوں؟

بدرالدین نے اس کے دل میں وہ شک کے بیج بودیے تھے جو کسی بھی مرد کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتے ہیں۔ وہ کئی دن الجھا الجھا رہا۔ کئی بار خیال آیا کہ لائبہ سے پوچھے لیکن یہ مناسب معلوم نہ ہوا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے چچا نے اس کا دل برا کرنے کے لیے یہ قصے دل سے گھڑے ہیں یا نمک مرچ لگا کر سنائے ہیں اس لیے نظرانداز کرنا ہی بہتر ہے لیکن ایک گمنام خلش اس کے دل میں شور بھی مچارہی تھی کہ کسی طرح غلط ثابت کرکے چچا کو شرمندہ تو کرے۔ چچا کی بیان کردہ کہانی کے دو کردار دنیا سے اٹھ چکے ہیں ان سے تو کچھ معلوم ہو نہیں سکتا۔ دانش سے ملا جائے۔ دیکھا جائے کہ اس کے بیان اور چچا کے بیان میں کتنا تضاد ہے۔

وہ دو تین دن سوچنے کے بعد دانش کمال سے ملنے اس کے آفس چلا گیا۔

"میرا نام شمس الدین ہے۔ میں لائبہ کا شوہر ہوں۔"

لائبہ کا نام سنتے ہی دانش کے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ اس کا شوہر اس کے سامنے کھڑا تھا اور وہ اسے دیکھتے رہنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اب اگلا سوال کیا ہوگا۔

"مسٹر دانش، میں نے آپ سے اپنا تعارف کرایا ہے اور آپ نے ہاتھ تک ملانے کی زحمت نہیں کی۔"

یہی ایک لمحہ تھا جب اسے ایک جواب سوجھ گیا۔

"مسٹر میں یہ سوچ رہا ہوں کہ لائبہ میری خالہ زاد بہن کا نام ہے۔ اس کے شوہر کو تو میں جانتا ہوں۔ آپ کس لائبہ کی بات کررہے ہیں اور مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟"

"آپ لائبہ کو نہیں جانتے؟"

"آپ کوئی اشارہ دیں۔ اس وقت تو اپنی کزن کے علاوہ کوئی دوسری لائبہ میرے ذہن میں نہیں آرہی ہے۔"

"یہ وہ لائبہ ہے جو یونیورسٹی میں آپ کے ساتھ پڑھتی رہی ہے۔"

"اوہ! اب میں سمجھا۔ آپ سیٹھ بدرالدین کے بھتیجے تو نہیں ہیں؟" جمال اسے بتا چکا تھا کہ لائبہ کی شادی کس سے ہوئی ہے۔

"جی، میں ان کا بھتیجا ہی ہوں۔"

"آیئے پھر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" وہ اسے کانفرنس روم میں لے گیا۔ دانش کی ذہانت کو حرکت میں آنے کے لیے اتنا وقت بہت تھا۔ اس کی ذرا سی لغزش لائبہ کی زندگی کو جہنم بناسکتی تھی۔ اس کے تخلیقی ذہن نے ایک کہانی گھڑلی۔

"آپ کے چچا کو آپ سے کیا دشمنی ہے؟"

"کوئی دشمنی نہیں۔ آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں۔"

"اس لیے کہ وہ کیوں چاہتے ہیں آپ اپنی بیوی کو طلاق دے دیں۔ کیا نام بتایا آپ نے اپنی بیوی کا...... ہاں لائبہ۔"

"وہ میرے چچا ہیں۔ وہ کیوں چاہیں گے کہ میں اپنی بیوی کو طلاق دے دوں۔ اور یہ آپ ان کا ذکر لے کر کیوں بیٹھ گئے؟"

"اس لیے کہ وہ کل ہی میرے پاس ہوکر گئے ہیں اور آج آپ آگئے۔ آپ کو دیکھ کر وہ خودبخود یاد آگئے، مجھے آپ کی شادی پر رحم آرہا ہے۔"

"وہ آپ کے پاس کیوں آئے تھے؟"

"بتادوں؟ آپ جاکر ان سے جھگڑا تو نہیں کریں گے؟"

"میں جو بھی کروں۔ آپ بتائیں وہ کیوں آئے تھے۔"

"آپ کی مرضی، بتائے دیتا ہوں۔" دانش نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

"وہ مجھے دس لاکھ روپے سکہ رائج الوقت کی پیشکش کرکے گئے ہیں۔ اب یہ آپ کو بتانا ہوگا کہ قبول کرلوں یا ٹھکرادوں۔"

"یہ پیشکش آپ کو کس کام کے لیے ہے۔ کیا کام لینا چاہتے ہیں وہ آپ سے؟"

"وہ کہہ رہے تھے کہ تم سے کوئی پوچھنے آئے تو اسے بتانا کہ لائبہ نام کی ایک لڑکی جو سیٹھ اعجاز احمد کی بیٹی تھی۔ تمہارے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔ تم سے محبت کرنے لگی تھی اور اپنا سب کچھ تم پر نچھاور کرکے تمہارے ساتھ بھاگنے پر تیار تھی تم بھی تیار ہوگئے تھے لیکن عین وقت پر تم اغوا کرلیے گئے۔ لائبہ یہ سمجھی کہ تم نے بے وفائی کی ہے۔ وہ بدنامی کے ڈر سے امریکا چلی گئی۔ تمہیں اس سے دلچسپی نہیں رہی تھی۔ تم نے بھی پلٹ کر نہیں پوچھا اور اب پتا نہیں لائبہ کہاں ہے۔"

یہ سب وہی باتیں تھیں جو بدرالدین پہلے ہی شمس الدین سے کہہ چکے تھے۔

"اس کہانی میں سچ کتنا ہے؟" شمس الدین نے پوچھا۔

"سچ صرف اتنا ہے کہ لائبہ نام کی ایک لڑکی یونیورسٹی میں تھی۔ بہت حسین تھی اس لیے لڑکے لڑکیوں میں بہت مقبول تھی مغرور سمجھی جاتی تھی۔ لڑکیوں تک سے اس کی دوستی نہیں تھی اور مجھ سے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ میں کامرس میں تھا اور وہ آرٹس کی طالبہ تھی۔ ایک دو مرتبہ اسے دیکھا ضرور تھا لیکن اسے دوستی نہیں کہہ سکتے۔"

"سوال یہ ہے کہ میرے چچا نے تمہارا ہی انتخاب کیوں کیا۔ وہ تمہارے پاس ہی کیوں آئے؟"

"وہ مجھے جانتے تھے۔ انہوں نے ایک مشاعرے میں مجھے دیکھا تھا۔ آپ کو یہ بتادوں کہ میں شاعر بھی ہوں۔ انہیں میرا کلام اتنا پسند آیا تھا کہ اپنی کوٹھی پر بلا کر مجھ سے میرا کلام بھی سنا تھا اور انعام میں کچھ رقم بھی دی تھی جو مجھے اب یاد نہیں۔ اس وقت میں یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ یہ بات سیٹھ صاحب کو معلوم تھی۔ یہ بات تو یقیناً معلوم ہوگی کہ لائبہ بھی یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ بس یہی سوچ کر وہ اب میرے پاس چلے آئے۔ دس لاکھ کی پیشکش بھی کی کہ میں ان کی سنائی ہوئی جھوٹی کہانی کو سچ بنا کر پیش کردوں۔"

"آپ نے انہیں کیا جواب دیا ہے؟"

"آپ خود سوچیں میں ایسی گھٹیا پیشکش قبول کرسکتا تھا؟ اور اب تو بالکل نہیں۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ اپنے بھتیجے کے ساتھ یہ حرکت کررہے ہیں ورنہ میں نہ صرف انکار کرتا بلکہ انہیں ذلیل بھی کرتا۔"

"بس مجھے آپ سے یہی معلوم کرنا تھا۔ صرف ایک بات اور بتادیجیے، آپ کو اغوا کیوں کیا گیا تھا۔"

"سراسر جھوٹ۔ مجھے کسی نے کبھی اغوا نہیں کیا۔

مشاعروں میں جاتا تھا تو کئی کئی دن گھر سے غائب ہو جاتا تھا۔ اب تو وہ بھی نہیں رہا۔''

شمس الدین مطمئن ہو کر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی اس نے جمال کو فون کیا اور اسے تمام باتیں بتائیں۔ یہ تاکید بھی کی کہ اگر اس کے پاس کوئی آئے تو وہ بھی اس سے بچ کے رہے۔

شمس الدین یہ تو سمجھتا تھا کہ اس کے چچا اعجاز احمد کی دولت پر آنکھ لگائے بیٹھے ہیں لیکن وہ ایسا گھٹیا راستہ اختیار کریں گے یہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

اس نے لائبہ سے کچھ نہیں پوچھا۔ صرف اتنا کہا کہ وہ اس کے چچا سے ہوشیار رہے۔ ''وہ ہر طرح سے ہمیں برباد کرنے کی کوشش کریں گے۔ ان کی کسی بات پر عمل نہ کرنا اور کسی بات کا یقین نہ کرنا بلکہ ان سے اس بے رخی سے ملو کہ ان کی یہاں آنے کی ہمت ہی نہ ہو۔''

''میں تو اس لیے ان کی عزت کر لیتی ہوں کہ وہ آپ کے چچا ہیں، ورنہ مجھے وہ اچھے آدمی نہیں لگتے۔''

''میں تمہیں اجازت دے رہا ہوں۔ تم یہ خیال مت کرنا کہ میرے چچا ہیں ورنہ دھوکا کھا جاؤ گی۔''

شمس الدین کے اپنے چچا سے تعلقات خراب ہوتے چلے گئے۔ اب دونوں کھلے دشمن تھے۔ بدر الدین نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اسے برباد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے گا۔

قدرت نے یہ موقع اسے دیا ہی نہیں۔ کسی کا پردہ فاش کرنا سب سے بڑا اخلاقی جرم ہے۔ اس نے لائبہ کو بے پردہ کرنا چاہا تھا۔ قدرت نے اس کی سزا دے دی۔ اس پر فالج کا حملہ ہوا۔ وہ زبان ہی بند ہو گئی جس سے اس نے بہتان لگائے تھے۔ اس دماغ ہی نے کام کرنا چھوڑ دیا جس سے وہ سازشیں سوچتا رہتا تھا۔ وہ نہ زندہ تھا نہ مردہ تھا۔ ایک گوشت کا لوتھڑا تھا جو بستر پر پڑا رہتا تھا۔ منہ سے رال بہتی رہتی تھی۔ ایک ملازم تھوڑی تھوڑی دیر بعد آ کر صاف کر دیا کرتا تھا۔ کچھ دنوں میں یہ ملازمین بھی تنگ آ گئے۔ اس کے منہ پر اسے گالیاں بکتے تھے۔ وہ سنتا تھا لیکن بول نہیں سکتا تھا۔

☆☆☆

لائبہ کی شادی کو پچیس سال ہو گئے تھے۔ اس کا بیٹا جوان ہو گیا تھا۔ پڑھنے کی طرف اس کا رجحان نہیں تھا۔ کاروباری ذہن تھا لہٰذا گریجویشن کے بعد باپ کے ساتھ آفس میں بیٹھنے لگا تھا۔ اس کی بیٹی تانیہ اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا چلی گئی تھی۔

وہ ابھی ابھی اسے ایئرپورٹ چھوڑ کر آئی تھی۔ اس کی طبیعت آج کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ بیٹی کے اتنی دور چلے جانے کا غم بھی تھا۔ کچھ تھکن بھی ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کامران کو فون کر کے بتایا کہ تانیہ خیریت سے جہاز میں بیٹھ گئی ہے۔ اس کے بعد شمس الدین کو فون کیا اور آرام کرنے کے لیے لیٹ گئی۔ لیٹی اس غرض سے تھی کہ کچھ دیر سو جائے گی لیکن لیٹتے ہی تانیہ کا خیال آ گیا۔ وہ لائبہ کے ساتھ دو ایک مرتبہ امریکا گئی ضرور تھی لیکن گھومنے پھرنے کے لیے جانے اور چند سالوں کے لیے مستقل قیام کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

اسے ابھی سے اپنی تنہائی کا شدت سے احساس ہونے لگا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ الماری سے البم نکال کر تانیہ کی تصویریں دیکھنے لگی۔ دل پر عجیب سی گھبراہٹ تھی۔ وہ اٹھ کر باہر آ گئی۔ کچھ دیر کے لیے ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئی جیسے اس گھر میں مہمان آئی ہو۔ دل پھر بھی نہیں بہلا تو ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا حکم دے کر کمرے میں آ گئی۔ اس نے سوچا تھا کچھ دیر کے لیے آفس چلی جائے۔ شاید وہاں طبیعت بہل جائے۔ اسی وقت چوکیدار نے انٹرکام پر اطلاع دی کہ کوئی بوڑھا آدمی ہے جو آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ وہ اپنا نام بتانے پر تیار نہیں ہے۔ کہتا ہے آپ نام سن کر ملنے سے انکار کر دیں گی اور ملنا ضروری ہے۔

وہ سوچنے لگی ایسا کون ہو سکتا ہے جس کا نام مجھے ناپسندیدہ ہو اور ملنے سے انکار کر دوں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کا نام میں جانتی ہوں ورنہ وہ یہ کیوں کہتا کہ نام سن کر میں ملنے سے انکار کر دوں گی۔ اس نے کیمرا آن کیا۔ چھوٹے سے ٹی وی اسکرین پر گیٹ کا منظر صاف نظر آنے لگا۔ ایک بوڑھا آدمی چوکیدار سے الجھ رہا تھا۔ آدمی بوڑھا ضرور تھا لیکن صحت بہت اچھی تھی۔ اس نے بہت کوشش کی لیکن اسے شناخت نہ کر سکی۔ یہ گمان تک نہ ہوتا تھا کہ اس بوڑھے کو اس نے پہلے کہیں دیکھا ہے۔

''اس بوڑھے سے کہو اگر کچھ امداد چاہیے ہے تو بتا دے۔''

''وہ کہتا ہے کہ میں کچھ لینے نہیں لائبہ بی بی کو کچھ دینے آیا ہوں۔ اگر مجھے نہ ملنے دیا گیا تو ان کا نقصان ہوگا میرا کچھ نہیں جائے گا۔'' چوکیدار نے بتایا۔

لائبہ کو تعجب ہوا کہ یہ بوڑھا تو اس کا نام بھی جانتا ہے اور کہہ رہا ہے کچھ دینے آیا ہے، ایسی کیا چیز ہے جو وہ مجھے دے سکتا ہے۔

''اس کی اچھی طرح تلاشی لو اور میرے پاس بھیج دو۔''

لائبہ نے اسکرین پر دیکھا۔ چوکیدار نے تلاشی لی اور اسے اپنے ساتھ لے کر اندر آیا۔ لائبہ نے کیمرا آف کیا اور

ملاقات کے کمرے میں جا کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد چوکیدار اسے لے کر آ گیا۔ بوڑھے کو دیکھ کر لائبہ کے بدن میں خون جمنے لگا۔ اس کے چہرے پر بزرگانہ شفقت نہیں کرختگی اور وحشت تھی۔ اب کچھ کچھ یوں لگنے لگا جیسے اس چہرے کو اس نے کہیں دیکھا ہے۔ وہ خوف زدہ سی ہو گئی۔

''کیا چاہتے ہو؟''

''پہلے اپنے اس چوکیدار کو باہر بھیجو۔ اس کے سامنے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔''

''تم کیا بتانا چاہتے ہو؟''

''میں نے کہہ دیا کہ اس کے سامنے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔''

''اگر تم نے مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں کہ جو کہوں گا تمہارے فائدے کی بات ہوگی۔ اگر میں نقصان پہنچانا چاہوں تو اب بھی مجھ میں اتنی طاقت ہے کہ اس کی موجودگی میں بھی تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہوں۔ تم مجھ پر بھروسا کرو۔ تم میری بیٹی کی طرح ہو۔''

لائبہ نے دیکھا کہ بیٹی کا لفظ ادا کرتے ہوئے بوڑھے کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے ہیں اور اس کی آواز کمزور پڑ گئی ہے۔ اس نے چوکیدار کو واپس بھیج دیا۔

''تم نے یہ ہوشیاری تو نہیں کی ہے کہ یہاں ہونے والی باتیں کوئی چھپ کر سن رہا ہو۔ کوئی آلہ ایسا تو نہیں لگا ہوا ہے کہ آواز باہر سنی جا سکے۔''

''نہیں ایسا کوئی انتظام نہیں ہے۔''

''اگر کوئی ہوشیاری کی تو نقصان تمہارا ہوگا۔''

''تم بات کو طول کیوں دے رہے ہو۔ جو کہنا ہے جلدی کہو۔''

''تم نے مجھے پہچانا؟''

''پہچان لیتی تو یا تو بلاتی نہیں یا اتنی احتیاط نہیں کرتی۔''

''میرا نام تو ضرور سنا ہوگا۔''

''تم نے اپنا نام اب تک نہیں بتایا۔''

''میرا نام شیرو ہے۔ ظالم خان کا گدی نشین شیرو۔''

لائبہ کا بدن ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس نے چاہا کہ چیخ کر کسی کو اپنی مدد کے لیے بلائے لیکن چیخنے کی طاقت ہی نہیں رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے طاقت جمع کی۔

''تم کیوں آئے ہو۔ کیا چاہتے ہو، کتنی دولت چاہیے تمہیں؟''

''مالکن میں اب تک آپ ہی کے گھر کی دولت پر پلتا رہا ہوں۔ اب تو میں کچھ لوٹانے آیا ہوں۔''

''میرے پاس سب کچھ ہے۔ مجھے کچھ لوٹانے کی ضرورت نہیں۔ تم یہاں سے چلے جاؤ۔''

''مالکن آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ میں آپ کا گناہ گار ہوں۔ اپنے گناہوں کا اعتراف کرنے اور آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ آپ مجھ سے خوف زدہ نہ ہوں۔ میں شیرو ضرور ہوں لیکن میں اب پہلے والے شیرو کو دفن کر چکا ہوں۔ میں تو اس کی پرچھائیں ہوں۔ میں نے تمام برے کاموں سے توبہ کر لی ہے۔ اب تو میں حج پر جا رہا ہوں۔ حج پر جانے سے پہلے آپ سے معافی مانگنا ضروری تھی۔ میں چلا آیا۔''

''میں نے تمہیں معاف کیا۔''

''ایسے نہیں۔ پہلے مجھے بتانے دو کہ میں نے تمہارے ساتھ کیا، کیا ہے۔ میرے گناہ سن کر اگر تم نے مجھے معاف کیا تو سمجھوں گا میری معافی ہو گئی۔''

''جلدی کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔''

''مالکن، آپ کو وہ لڑکا یاد ہے جو آپ سے محبت کرتا تھا اور جسے آپ کے والد نے ملاقات کے لیے بلایا تھا؟''

''ہاں یاد ہے، کیا ہوا اسے۔ وہ زندہ تو ہے۔''

''اس کو اغوا کر لیا گیا تھا۔''

''یہ بھی یاد ہے۔''

''آپ کی ماں راحیلہ کے کہنے پر میں نے ہی اسے اغوا کیا تھا۔ میں نے ہی دھمکی کے زور پر اس سے تمہارے نام خط لکھوایا تھا جو تم تک بھی پہنچا ہوگا۔ وہ الفاظ اس کے نہیں تھے۔ راحیلہ نے یہ خط لکھ کر دیا تھا کہ میں اس خط کی نقل اس لڑکے سے کرا دوں۔ وہ بہت باوفا لڑکا تھا۔ کسی طرح خط کی نقل کرنے پر تیار نہیں تھا لیکن جب میں نے تشدد کے لیے ہنٹر اٹھایا تو وہ ڈر گیا اور اس نے خط اپنے ہاتھ سے لکھ دیا۔ مجھے معلوم ہے یہ کتنا بڑا جرم تھا۔ اس خط نے تمہارا دل توڑ دیا اور تم اسے بے وفا سمجھنے لگیں، تمہیں اپنا گھر چھوڑ کر امریکا جانا پڑا۔ میں نے دو ملنے والوں کو جدا کر دیا۔ اس سے بھیانک جرم کیا ہوگا۔

تمہاری ماں کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے۔ وہ جاتے وقت اس لڑکے کا خط لے گئی تھیں اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا خط میرے اڈے پر ہی چھوڑ گئی تھیں۔ میں نے سنبھال کر رکھ لیا تھا۔ اب اپنے ساتھ لایا ہوں تاکہ آپ مجھے جھوٹا نہ سمجھیں۔ یہ دیکھیے۔'' اس نے وہ خط لائبہ کے ہاتھ میں دے دیا۔

لائبہ نے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے خط پڑھا۔

ایک ایک لفظ وہی تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا ”ممی آپ کا میں نے کیا بگاڑا تھا جو آپ نے میرے ساتھ یہ کھیل کھیلا۔“

”راحیلہ مر چکی ورنہ میں اس کے خون سے اپنی توبہ کا منہ دھوتا۔ اب آپ سے ہاتھ جوڑ کر معافی کا طلب گار ہوں۔ میں معافی کے قابل نہیں ہوں لیکن آپ مجھے معاف کر دیں۔ اعجاز صاحب بھی اس دنیا میں نہیں رہے ورنہ ان سے بھی معافی مانگتا۔“

لائبہ کی آنکھوں تلے اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ وہ کچھ کہنے سننے کے قابل نہیں رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اس کی آواز ابھری۔

”شیرو، میں تمہیں دل سے معاف کرتی ہوں۔ اب تم جلدی سے چلے جاؤ۔ کہیں میری معافی کے الفاظ تبدیل نہ ہو جائیں۔“

”مالکن، اس لڑکے کو بھی معاف کر دینا جس کی طرف سے آپ کے دل میں برائی آ گئی تھی۔ میں اس کا بھی مجرم ہوں لیکن میں اسے کہاں ڈھونڈوں۔ میں اس کے گھر گیا تھا لیکن وہ وہاں سے کہیں اور شفٹ ہو چکا ہے۔“

”شیرو تم حج پر جاؤ تو دعا کرنا کہ جس لڑکے کو میں برا سمجھتی رہی اسے دونوں جہان کی خوشیاں مل جائیں اور کبھی میرا اس سے سامنا ہو تو میرے دل میں اس کے لیے نفرت نہ ہو۔“

شیرو نے اس سے اجازت لے کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور کمرے سے نکل گیا۔

وہ چلا گیا تھا۔ لائبہ کمرے میں اکیلی بیٹھی رہ گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہوا اور اب کیوں ہوا۔ اس کے خلاف سازشیں ہوتی رہی تھیں۔ وہ سوچ رہی تھی یہ بھی کوئی سازش نہ ہو۔ کہیں شیرو مجھ سے ملنے کے بعد میرے بیٹے یا میرے شوہر کے پاس نہ گیا ہو۔ اس نے انہیں بتا نہ دیا ہو کہ میرے ساتھ کبھی کیا معاملہ پیش آیا تھا۔ وہ ان سے پوچھ بھی نہیں سکتی تھی۔ انہیں وہ خط دکھا بھی نہیں سکتی تھی جو شیرو دے کر گیا تھا۔

وہ اس خط کو لے کر کمرے میں آ گئی۔ اس خط کو حفاظت سے رکھ دیا کہ شاید کبھی کام آئے۔ شاید کسی موڑ پر دانش سے ملاقات ہو۔ وہ اسے یہ خط دکھا کر کہہ سکے کہ وہ اسے بے وفا نہیں سمجھتی۔ حالات ہی ایسے ہو گئے تھے کہ ہم دونوں ایک نہ ہو سکے۔

بادل امڈ کر آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے گھٹا برسنے لگی۔ کمرا اندر سے بند تھا۔ کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ جتنا رو سکتی تھی روئی پھر ایک عزم کے ساتھ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اب میں کسی کی بیوی ہوں۔ میری ہنسی بھی اسی کی ہے میرے آنسو بھی اسی کے ہیں۔ میں کسی کے لیے آنسو کیوں بہا رہی ہوں۔ اب کسی اور کے بارے میں سوچنا بھی میرے لیے گناہ ہے۔ شیرو تو اپنے گناہوں کی معافی مانگ کر چلا گیا میں کیوں گناہ گار ہو رہی ہوں۔ دانش اب میرے لیے خواب سے زیادہ نہیں اور خوابوں کو بار بار نہیں دہرایا جاتا۔ اب میرے لیے دانش ایک بے قصور آدمی ہے جو کبھی کچھ دور میرے ساتھ چلا تھا۔ ایک ایسا مجرم ہے جسے پھانسی دینے کے بعد یہ عقدہ کھلا کہ وہ بے قصور تھا۔ اس کی کوئی نشانی بھی میرے پاس نہ ہو جسے دیکھ کر اس کی یاد آ جائے۔ وہ اٹھی اور وہ خط پرزے پرزے کر کے کھڑکی سے باہر پھینک دیا جو شیرو دے کر گیا تھا۔ پھر اسے خیال آیا کہ ایک مرتبہ دانش نے اس کا ہاتھ چوم لیا تھا۔ وہ بہت دیر تک اپنے ہاتھ کو دیکھتی رہی اور پھر نہ جانے جی میں کیا آئی کہ اٹھ کر گیس ہیٹر آن کیا اور ہاتھ کی پشت کا وہ حصہ جس پر دانش کے ہونٹ ثبت ہوئے تھے ہیٹر پر رکھ دیا۔ ایک دلدوز چیخ ابھری اور اس نے ہاتھ ہٹا لیا۔ ملازم دوڑتے ہوئے آئے۔ اتفاق سے اسی وقت شمس الدین نے گھر میں قدم رکھا۔ اسے گاڑی میں ڈالا اور ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ہاتھ زیادہ نہیں جلا تھا۔ تکلیف کا احساس ہوتے ہی اس نے ہاتھ ہٹا لیا تھا۔ ہاتھ کی رگیں متاثر نہیں ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر نے مرہم پٹی کر کے رخصت کر دیا۔

”تمہیں سوجھی کیا تھی ہیٹر آن کرنے کی۔ کسی ملازم کو بلا لیتیں۔ کوئی ایسی سردی بھی نہیں تھی۔“

”مجھے شک تھا کہ ہیٹر کام نہیں کر رہا ہے۔ ذرا جلا کر دیکھوں۔ اسی وقت میں بیڈ سے ٹکرائی اور ہاتھ ہیٹر پر چلا گیا۔“

”شکر ہے زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ آئندہ خیال رکھنا۔ ثانیہ جا چکی ہے۔ وہ اگر ہوتی تو کتنی پریشان ہو جاتی۔“

”اب اس کا فون آئے تو مت بتا دیجیے گا۔ سن کر اور پریشان ہو جائے گی۔“

ثانیہ کے جانے کے بعد وہ بالکل تنہا رہ گئی تھی۔ اتنے بڑے گھر میں وہ گھنٹوں ٹہلتی رہتی تھی۔ پھر اس نے مصروفیت کا ایک طریقہ یہ وضع کر لیا کہ دوپہر کے وقت شمس الدین کے آفس چلی جاتی اور شام کو اس کے ساتھ واپس آ جاتی۔

وقت دبے پاؤں گزرتا جا رہا تھا۔ اب اسے بیٹے کی شادی کی فکر تھی لڑکیاں دیکھنے کی دلچسپ مصروفیت نکل آئی تھی۔

☆☆☆

اس دوران بدر الدین کی اذیتوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ بیٹے اپنی بیویوں کو لے کر بیرون ملک شفٹ ہو گئے۔ آخری وقت میں ان کی بیوی نے بھی ان سے وفا نہ کی۔ البتہ قدرت کی مہربانی سے کچھ دیر کے لیے بولنے کی اجازت ملی تو انہوں نے شمس

الدین اور لائبہ کے سامنے اعتراف گناہ کرتے ہوئے ان سے معافی مانگ لی تھی، اور انہوں نے معاف بھی کر دیا۔

بدر الدین کی موت عبرت کا نمونہ تھی۔ انہوں نے لائبہ اور اس کے باپ کے ساتھ جو کچھ کیا تھا اس کی انہیں معافی مانگنی پڑی تھی۔ جو دولت انہوں نے جمع کی تھی ان کے کوئی کام نہ آ سکی۔ اس دولت کا یہ مصرف البتہ ہوا کہ ان کی بیوی منیجر کے ساتھ مل کر انہیں سلو پائزن کے انجکشن دیتی رہی۔ انہیں اپنے ہی پالے ہوئے سانپ ڈستے رہے۔ حرام کی دولت سانپ بن کر ڈستی ہے اگر یہ مثل صادق آتی تھی تو بدر الدین پر۔ سچ ہے آدمی جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔ ان کی دولت کسی کے کیا کام آتی خود ان کے کام نہ آ سکی۔

رات کو وہ دونوں سونے کے لیے لیٹے تو دونوں کے ذہنوں میں بدر الدین کی موت کا سماں گردش کر رہا تھا۔ دونوں خاموش تھے۔ پھر شمس الدین کی آواز ابھری۔

”لائبہ کیا سو گئیں؟“

”نہیں تو۔ چچا جان کا خیال ذہن سے نہیں اتر رہا ہے۔“

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ انسان کتنی ہی دولت جمع کر لے سب یہیں چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ انہیں دولت کی کتنی ہوس تھی مگر ہوا کیا۔ نہ خود زندگی بھر اچھا پہنا نہ محتاجوں کی مدد کی۔ گناہ ساتھ لے کر گئے، دولت یہیں چھوڑ گئے۔ ایسے لوگ عبرت کا سامان ہوتے ہیں، ان سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔“

دونوں طرف پھر خاموشی پھیل گئی۔ لائبہ کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ شمس الدین کی آواز پھر ابھری۔

”لائبہ، دولت تو ہمارے پاس بھی بہت ہے۔ ہم بھی صرف جمع کر رہے ہیں۔ ہماری ضرورت سے زیادہ دولت ہمارے پاس ہے۔ میں نے یہ سوچا ہے کہ کسی ادارے سے بات کرتا ہوں۔ یہ ادارہ ہمیں ایسی لڑکیوں کی نشاندہی کرے جو شادی کے لیے بیٹھی ہوئی ہیں اور ان کے والدین کے پاس اتنی رقم نہیں کہ شادی کر سکیں۔ ہم نے ہر مہینے دو لڑکیوں کی بھی شادی کرائیں تو سال میں چوبیس بار یہ نیک کام کر سکیں گے۔“

”آپ کسی ادارے کے محتاج کیوں ہوتے ہیں۔ اس میں کسی فراڈ کا بھی شائبہ ہے۔ آپ خود ایک ادارہ قائم کریں۔ ”مفت شادی دفتر“ لوگ وہاں آ کر اپنی بچیوں کے نام رجسٹرڈ کرائیں۔ ہم چھان بین کے بعد ان کی شادی کا اہتمام کریں۔ اس دفتر کا انتظام آپ میرے ہاتھ میں دے دیں۔ میری مصروفیت بھی ہو جائے گی۔“

”آئیڈیا تمہارا بھی برا نہیں ہے۔ میرے پاس ایک پلاٹ خالی پڑا ہوا ہے۔ میں کل ہی اس پر تعمیر شروع کراتا ہوں۔ اس ادارے کو ہم رجسٹرڈ بھی کرا لیں گے۔“

”لائبہ۔“

”جی۔“

”کوئی ایسی بات نہیں کرنی چاہیے جو مرنے والے کی چغلی ہو لیکن چچا جان کی ایک بات میں تم سے کہے بغیر رہ نہیں سکتا۔ ان کی موت نے ایک بہت بڑا بوجھ میرے دل سے اتار دیا ہے۔ انہوں نے تمہارے بارے میں مجھ سے کچھ بے سروپا باتیں کی تھیں۔ انہوں نے ایک جھوٹی کہانی مجھے سنائی تھی کہ شادی سے پہلے تمہارے کسی لڑکے سے تعلقات تھے اور تم اس کے ساتھ بھاگنے والی تھیں کہ عین وقت پر تمہاری ماں کو علم ہو گیا۔ انہوں نے اس لڑکے کو اغوا کرا لیا۔ مجھے ان باتوں پر یقین تو نہیں آیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ یہ سب تم سے مجھے بدظن کرنے کے لیے کہہ رہے ہیں۔ لیکن میں بھی انسان ہوں۔ کچھ کچھ شک میرے دل میں پیدا ہوا تھا۔ اب جو مرتے وقت انہوں نے تم سے معافی مانگی تو مجھے یقین کامل ہو گیا کہ ان باتوں میں کوئی صداقت نہیں تھی۔

”یہ بات میں نے تمہیں اس لیے بتا دی کہ اگر کبھی اس شک کی وجہ سے میرے رویے میں تمہیں کوئی تبدیلی محسوس ہو یا میں نے کوئی زیادتی کی ہو تو مجھے معاف کر دینا۔“

”اتنی بڑی بات سننے کے بعد آپ نے اپنے رویے سے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ یہ آپ کی عظمت ہے۔ چچا جان کی اللہ مغفرت کرے۔ میں انہیں معاف کر چکی۔ انہوں نے جو کچھ کیا، اللہ دیکھنے والا ہے۔ اگر اب بھی آپ کے دل میں کوئی بات ہے تو مزید تصدیق کر لیں۔“

”لائبہ، میں نے کہہ دیا میرے دل میں معمولی سا شک تھا۔ اب وہ بھی نہیں رہا۔ مجھے کسی تصدیق کی ضرورت نہیں۔“

اس نے جان بوجھ کر یہ ذکر نہیں کیا تھا کہ وہ اس لڑکے سے ملا تھا۔

لائبہ یہ سوچ رہی تھی کہ دانش اسی شہر میں تو ہوگا۔ کہیں شمس الدین اس سے مل نہ لے۔ دونوں کے دل میں چور تھا۔ دونوں خاموش تھے اور پھر نیند نے انہیں آواز دے لی۔

دوسرے دن اس نے ایک تعمیراتی کمپنی کے لوگوں کو بلایا اور اپنے مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے ایک موزوں عمارت کی تعمیر کا ٹھیکا انہیں دے دیا۔

تعمیر شروع ہوئی تو لائبہ نے کام کی نگرانی سنبھال لی۔ صبح ہوتے ہی پلاٹ پر چلی جاتی اور شام تک واپسی ہوتی۔ وہ اس شوق سے نگرانی کر رہی تھی جیسے عبادت کر رہی ہو۔

چھ مہینے میں عمارت تعمیر ہوگئی۔ فرنیچر ڈال دیا گیا۔ چند ملازم رکھ لیے۔ اخباروں میں اشتہار دیے گئے اور لوگوں نے رجوع کرنا شروع کیا تو اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ اس کے ملک میں کتنی غربت ہے اور کتنی لڑکیاں ہیں جو شادی کے بغیر بوڑھی ہوجاتی ہیں۔

یہ کام ایک ادارے کے بس کا نہیں اس کے لیے کئی ادارے درکار ہیں۔ خدا اوروں کو بھی توفیق دے۔

اگلے چھ مہینوں میں اس نے کئی اجتماعی شادیاں کرائیں اور محسوس کیا کہ نیک کام کرکے دل کو کیسی تقویت ملتی ہے۔ یہ بھی دیکھا کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے دولت میں کمی نہیں ہوتی بلکہ اضافہ ہی ہوتا ہے۔

☆☆☆

انسان کو کتنا ہی سکھ مل جائے کوئی نہ کوئی دکھ اس کی زندگی میں رہتا ضرور ہے۔ تانیہ کو گئے ہوئے تین سال ہوگئے تھے، اس کی تعلیم بھی مکمل ہوگئی تھی لیکن وہ آنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ فون پر بات ہوجاتی تھی لیکن تانیہ کوئی نہ کوئی بہانہ کرکے ٹال دیتی تھی۔ لائبہ کے لیے امریکا دور نہیں تھا لیکن اب اس کی مصروفیات ایسی ہوگئی تھیں کہ نکلنا مشکل ہورہا تھا۔ پھر بھی اس نے تنگ آکر تانیہ کو فون کیا کہ اگر تم نہیں آسکتیں تو میں آرہی ہوں۔ تانیہ نے اسے خوش خبری سنائی کہ آپ کے آنے کی ضرورت نہیں میں اگلے ہفتے پاکستان آرہی ہوں۔ فلائٹ کا دن اور وقت وہ اگلی کال اگلے ٹیلی فون پر بتاؤں گی۔

لائبہ کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ اس نے ایک ہفتے پہلے ہی سے تیاری شروع کردی تھی۔ کپڑوں کا انتخاب کررہی تھی۔ جیولری نکال نکال کر دیکھ رہی تھی۔ یہ سب پہنتی ہوئی کیا اچھی لگوں گی۔ اس نے ایک سادہ سا جوڑا نکال کر رکھ لیا۔

فلائٹ والے دن شمس الدین اور کامران کی کوئی ایسی مصروفیت نکل آئی کہ دونوں ایئرپورٹ نہیں جاسکتے تھے۔ گورنر کی طرف سے تاجروں کو عشائیہ دیا جانا تھا۔ اسے اپنے ایک پروجیکٹ کی منظوری لینی تھی لہٰذا وہ اس موقع کو ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کامران کو بھی ساتھ لے جانا ضروری تھا۔ کیونکہ کچھ لوگوں سے اس کا تعارف کرانا تھا۔

لائبہ کو ڈرائیور کے ساتھ تنہا ایئرپورٹ جانا پڑا۔

فلائٹ آنے میں کچھ دیر تھی۔ وہ اِدھر اُدھر ٹہل رہی تھی کہ ایک جگہ دو گھورتی ہوئی آنکھوں نے اس کا راستہ روک لیا۔ ان آنکھوں میں مردانہ ہوس نہیں تھی بلکہ پہچاننے کی آرزو تھی۔ پھر ان آنکھوں میں چراغ جلنے لگے۔

"آپ لائبہ ہیں؟"

"اور آپ دانش کمال۔"

"ہم لوگ کتنے برسوں بعد مل رہے ہیں۔"

"اسی کو قسمت کہتے ہیں۔"

"آپ سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ میں وضاحت پیش ہی نہ کرسکا۔"

"اب اس کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ اب تو ہمارے بچوں کی خوشیوں کے دن ہیں۔ ارے ہاں مجھے معلوم ہوا تھا تم نے شادی کرلی ہے۔"

"ایک بیٹا ہے۔ امریکا سے وہی تو آرہا ہے۔ اسی کو لینے آیا ہوں۔ اور تم نے؟"

"مجھے بھی شادی کرنی پڑی تھی۔ عجیب اتفاق ہے۔ میری بیٹی بھی امریکا ہی سے آرہی ہے۔ اسی کو لینے آئی ہوں۔"

"فلائٹ آنے والی ہے۔ اب وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔ تم میرے بیٹے کو دیکھنا۔ بالکل میری جوانی ہے۔"

"میری بیٹی تانیہ بھی بالکل میری کاپی ہے۔" اچانک دو آوازیں ایک ساتھ آئیں۔

"ممی۔"

"پاپا۔"

تانیہ دوڑتے ہوئے آئی اور لائبہ کے گلے سے جھول گئی۔ لائبہ ابھی ابھی اپنے ماضی سے ملی تھی۔ دل تو بھرا ہوا ہی تھا، بیٹی سے گلے ملی تو آنسو بہنے لگے۔

"ممی آپ رو کیوں رہی ہیں؟"

"بیٹا رو تھوڑی رہی ہوں۔ یہ آنسو تو تیرے استقبال کے لیے ہیں۔ یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔"

"آپ کی خوشی میں مزید اضافہ کروں۔ آپ کو اپنے شوہر سے ملواؤں۔"

"تم نے شادی کرلی۔ میں تمہاری کچھ نہیں تھی۔ مجھے بتایا تک نہیں؟"

"بس ممی ہم نے سوچا آپ کو سرپرائز دیں گے۔ بلال نے بھی اپنے پاپا کو کچھ نہیں بتایا۔ ابھی آپ سے ملواتی ہوں۔" پھر اس نے آواز دی۔ "بلال چھوڑ دو اپنے پاپا کی جان۔ ادھر آؤ میری ممی سے ملو۔"

لائبہ نے دیکھا، ایک لڑکا تیز تیز قدم اٹھاتے اس کی طرف آیا۔ اسے لگا دانش کمال اس کے سامنے آگیا ہو لیکن دانش کمال تو اس کے پیچھے پیچھے آیا تھا۔

"بلال، یہ ہیں میری سویٹ ممی۔"

"اور یہ ہیں میرے پاپا۔ ایک مشہور شاعر دانش کمال۔"